آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستان حدیث کے
مہکتے گلابوں کا روح پرور دلآویز
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

تالیف: ضیاء الدین اصلاحی
تقریظ: فضیلۃ الشیخ ابو الحسن مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ تعالیٰ

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

تذکرۃ المحدثین

جلد دوم

تالیف .... ضیاء الدین اصلاحی

اعداد .... محمد طاہر نقاش

اشاعت اول .... مئی 2014ء

پاکستان میں ہماری کتب مندرجہ ذیل اداروں سے مل سکتی ہیں

● لاہور۔ ابلاغ (چیل روڈ 35717842 گلبرگ 35717842 ماڈل ٹاؤن 35942233)
● راولپنڈی۔ تجلیات طیبہ کشمیری بازار 5535168 دار الفکر اسلامی 0321-5216287 مکتبہ عائشہ 0321-5075075
● اسلام آباد۔ المسعود اسلامک بکس 2261356 البلاغ 2281420 دارالسلام شوروم 0321-5370378
الھدیٰ انٹرنیشنل 4434615, 0321-8014008 ● کراچی۔ فضلی سنز 32212991 علمی کتب خانہ 32628939
● فیصل آباد۔ مکتبہ اسلامیہ بیرون امین پور بازار، 631204۔ مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار 0300-6628021
● پشاور۔ معراج کتب خانہ 214720۔ ● واہ کینٹ: البلاغ 051-4541148

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4453358, 042-37361428

ضروری نوٹ: اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور انسانی بساط وطاقت کے مطابق ہم نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ خاص طور پر عربی عبارات میں تصحیح اغلاط میں پوری طرح احتیاط کی ہے۔ لیکن پھر بھی بشری تقاضے کے تحت اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔
آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (ادارہ)

کے نام سے شروع کرتا ہوں
جو بڑا ہی مہربان
نہایت رحم کرنیوالا ہے

فہرست مضامین

حصہ دوم

19

امام ابوبکر بن حسین بیہقی

20
امام ابن عبد البر قرطبی

21

امام ابوبکر خطیب بغدادی

22
امام ابو عبداللہ محمد بن ابو نصر فتوح حمیدی

23
امام شیرویہ بن شہردار دیلمی

24

امام ابومحمد حسین فراء بغوی

25
امام ابوالحسن رزین بن عماویہ عبدری سرقسطی

26
امام ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی

27

امام قاضی ابوالفضل عیاض

28
امام ابوالسعادات مبارک بن اثیر جزری

29
امام ابوعبداللہ محمد ضیاء مقدسی

30
امام ابوزکریا یحییٰ نووی

31
امام ابو محمد عبد المومن دمیاطی

32
امام ولی الدین خطیب تبریزی

33
امام جمال الدین زیلعی

حصہ سوم

2 شیخ علی متقی

3
شیخ محمد بن طاہر

4

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

5
شیخ نورالحق دہلوی

6 شیخ الاسلام محمد

7 مولانا سلام اللہ محدث رامپوری

8 مولانا نور الاسلام

9 شیخ محمد سالم

حامداً و شاکراً ومصلیًا ومسلّماً

دین اسلام کا دوسرا بڑا ماخذ حدیث رسول ﷺ ہے جو بذریعہ وحی آپ ﷺ کو عطا کیا گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لیے وہی بڑے اسباب و ذرائع پیدا فرمائے جو قرآن حکیم کے لیے پیدا کیے۔ یعنی حفظ و کتابت۔ نبی اکرم ﷺ سے دین اسلام کا سماع کرنے اور لکھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دونوں طریقوں سے اس کو ضبط کیا۔ اپنے سینوں میں بھی اور دفاتر میں بھی۔ آپ جب بولتے تھے تو سن کر بھی آپ کے فرامین کو محفوظ کیا جاتا تھا اور آپ کا اس کے متعلق حکم بھی تھا۔ جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا، آپ نے انہیں اللہ اکیلے کی توحید پر ایمان، رسالت، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، صیام رمضان اور غنائم میں سے خمس کی ادائیگی کا امر فرمایا، اور کدو، سبز مٹکے، تارکول کے برتن اور کھجور کے تنوں سے کرید کر بنائے گئے برتنوں سے منع کیا۔ اور آخر میں حکم دیتے ہوئے فرمایا:

((إِحْفِظُوْهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مِنْ وَرَاءِ كُمْ .)) ❶

''ان احکامات کو حفظ کر لو اور اپنے پچھلوں کو بھی ان کی خبر دو۔''

سیّدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آپ کی باتیں، ارشادات، فرامین اور معمولات لکھا کرتے تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ میں حفظ کے ارادے سے آپ کی ہر بات جو سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا۔ مجھے قریش نے یہ کہہ کر روکا کہ تو جو کچھ بھی اللہ کے رسول سے سنتا ہے لکھ لیتا ہے، آپ تو انسان ہیں، غصے اور غضب میں بھی بولتے ہیں اور خوشی و رضا مندی میں بھی تکلم فرماتے ہیں۔ میں لکھنے سے رک گیا اور اللہ کے رسول ﷺ سے یہ بات بیان کر دی۔ آپ نے اپنی انگلی سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

((اُكْتُبْ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ .)) ❷

❶ صحیح البخاری، کتاب الإیمان : ۵۳.

❷ سنن أبی داؤد کتاب العلم باب کتابة العلم: ۳٦٤٦، مسند احمد: ۲/ ۱٦۲، تقیید العلم، ص: ۸۰، تھذیب الکمال: ۳/ ۳۸۔ ۳۹، ابن ابی شیبه: ۹/ ٤۹۔ ۵۰، جامع بیان العلم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

''(اے عبداللہ ابن عمر!) تو لکھ، اس ذات باری تعالیٰ کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری (محمد ﷺ) کی جان ہے، میری زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔''

یہ دونوں صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول معظم ﷺ نے خود اپنی احادیث کو حفظ کرنے اور لکھنے کا حکم دیا۔ اور امام ابوداؤد نے اس حدیث پر کتاب علم کا باب باندھ کر حدیث لکھنا ثابت کیا ہے۔ امام بخاری نے صحیح البخاری میں کتاب العلم کے اندر باب کتابة العلم۔ اور۔ باب حفظ العلم۔ قائم کر کے یہ دونوں باتیں ثابت کی ہیں۔

صحابہ کرام سے لے کر تدوین حدیث کے دور تک بلکہ اس کے بعد اس کی اشاعت اور ترویج کے لیے آج تک جتنے علماء محدث پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک کی زندگیوں کو بھی ضبط کیا کہ فلاں محدثین کب اور کہاں پیدا ہوا، کتنی عمر میں قرآن مجید اور حدیث کے حفظ کرنے اور لکھنے کی طرف متوجہ ہوا، حصول علم کے لیے کن کن بلاد اسلامیہ کے سفر کیے اور کن کن اساتذہ کرام سے ملا اور کتنا عرصہ ان کے ہاں مقیم رہا۔ اس کا قوت حفظ کس قدر تھا۔ پیدائشی طور پر حافظے کا مضبوط تھا یا کمزور تھا۔ اگر شروع سے ہی حافظے کا مضبوط اور قوی ہے تو کیا بعد میں کسی حادثے کی وجہ سے ضبط میں خلل وارد ہوا یا نہیں۔ اس کے ضبط میں خلل واقع ہونے سے قبل کون کون اس سے روایت کیا کرتے اور ضبط میں تخلل کے بعد کون ان سے روایت کرتے ہیں۔ اس کی صداقت و عدالت کیسی ہے، یہ اپنی عام گفتگو اور حدیث کے بیان کرنے میں کذب بیانی سے کام لیتا ہے یا نہیں۔ اپنے اساتذہ سے حدیث بیان کرنے میں تدلیس اور دھوکہ دہی تو نہیں کرتا۔ اس نے علم حدیث کے نشر کرنے، پھیلانے اور بیان کرنے میں کہاں کہاں ڈیرہ ڈالے رکھا اور اس کی وفات کب اور کہاں واقع ہوئی۔ الغرض ایک ایک راوی حدیث کے حالات ضبط کیے گئے جسے علم الرجال کا نام دیا گیا اور یہ صرف امت محمدیہ کی خصوصیت ہے اس امت سے پہلے کسی بھی نبی کی امت نے یہ کام سرانجام نہیں دیا۔ ہر بات کی سند ضبط کی اور ہر ہر راوی کے حالات زندگی قلمبند کیے اور اس میں کمال دیانت داری کا مظاہرہ کیا۔

بڑے علم وعمل کے پہاڑ اور دیانتداری میں عروج پر پہنچے ہوئے لوگوں نے اس میں حظ وافر پایا ہے، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام حمیدی،

(گزشتہ صفحہ حاشیہ) و فضلہ، ص: ۸۹۔ ۹۰، مسند الدارمی: ۱/۱۲۵، المستدرك للحاكم: ۱/۱۰۵۔ ۱۰۶، امام حاکم نے اسے صحیح کہا اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

امام بزار، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام دارقطنی، امام حاکم، امام بیہقی، امام یعقوب بن سفیان، امام ابن عساکر، امام ابونعیم اصبہانی، امام ابو القاسم اصبہانی، خطیب بغدادی، امام عبدالغنی المقدسی، امام مزی، امام ذہبی، امام بن کثیر، حافظ ابن حجر وغیرہم نے اس میں کارہائے نمایاں سر انجام دیے اور بڑی بڑی ضخیم کتب اس فن میں مرتب کیں۔

ان ہی آئمہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے برصغیر پاک و ہند کے ایک معروف عالم دین ضیاء الدین اصلاحی نے تین حصوں پر مشتمل "تذکرۃ المحدثین" مرتب کی جس میں اس پاک بازگروہ کی مثالی سیرت و کردار اور عظیم کارناموں پر مشتمل ایک علمی دستاویز تیار کر کے امت پر احسان کیا ہے، پہلے حصے میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کئی ایک آئمہ حدیث کے حالات زندگی، سوانح حیات، اور خدمت حدیث کے کارنامے مرتب کیے،۔ دوسرے حصے میں چوتھی صدی کے نصف آخر سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف علماء کے حالات زندگی اور علم حدیث کے لیے خدمات جمع کیں اور تیسرے حصے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دیگر حدیث کی خدمت کرنے والے متعدد علماء کا تذکرہ ہے۔

بلا اختلاف عقیدہ و منہج ہر اس شخص کا تذکرہ کیا جس نے حدیث کی خدمت میں جس بھی صورت میں حصہ لیا۔ اس کے بارے تفصیلی معلومات کا ذخیرہ اس دستاویز میں جمع کر دیا، اور اس کتاب کا مقدمہ برصغیر کے مشہور مؤرخ شاہ معین الدین احمد ندوی رحمہ اللہ نے لکھا اور اس عنوان کی افادیت اور اہمیت کو اجاگر کیا۔

یہ کتاب حدیث کے خدمت گاروں کا ایک قیمتی خزینہ اور معرفت و علم کا دفینہ ہے اور متلاشیان علم حدیث کے لیے گراں قدر تحفہ ہے، جسے ہر طالبِ علم حدیث اور مکتبہ و لائبریری کی زینت ہونا چاہیے تاکہ ان علم کے درخشندہ ستاوں کی سیرت و کردار سے راہنمائی لے کر حدیث کی معرفت اور خدمت میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ اللہ رب العزت ہر طالبعلم، کتاب کے مؤلف، ناشر اور معاون کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور نجات کا وسیلہ و ذریعہ بنائے۔ اور اس سلسلہ ذھبیہ میں پرو دے۔ آمین یا رب العالمین۔

خویدم العلم و أهله

ابوالحسن مبشر احمد ربانی عفا اللہ

رئیس مرکز الحسن p/882 سبزہ زار لاہور

۲۵ فروری ۲۰۱۴ _ ۲۴ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ

حرف تمنا

گلستان حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی!..... کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار راتکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزاریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمتِ حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نماں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، آج ہی اس کا مطالعہ کریں۔ تاکہ حدیث رسول ﷺ فرمان رسول اور حکم رسول کی اہمیت، فضیلت اور محبت آپ کے دل و دماغ میں راسخ ہو، آپ اپنی نسل کو بھی اس روشن شاہراہِ حیات پر چلانے کی منصوبہ بندی کر کے اپنی آخرت کی یقینی کامیابی کا سامان کر سکیں۔

خادم کتاب و سنت

محمد طاہر نقاش

۲۲ فروری ۲۰۱۴ء لاہور

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ ①

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ○ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ○ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ○ ②

---

① ((مسلم' الجمعة' باب تخفیف الصلوٰة و الخطبة' حدیث ٨٦٨ و ٨٦٧- والنسائی' ٣٢٧٨))

② ((رواه الاربعة واحمد والدارمی و روی البغوی فی شرح السنه مشکوٰة مع تعلیقات الالبانی' النکاح' باب اعلان النکاح ... وقال الالبانی حدیث صحیح۔))

تنبیہات:

- صحیح مسلم' سنن نسائی اور مسند احمد میں ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی حدیث میں خطبہ کا آغاز ((ان الحمدلله)) سے ہے لہٰذا ((الحمدلله)) کی بجائے ((ان الحمدلله)) کہنا چاہیے۔
- یہاں ((نومن به ونتوكل عليه)) کے الفاظ صحیح احادیث میں موجود نہیں ہیں۔
- یہ خطبہ نکاح' جمعہ اور عام وعظ وارشاد یا درس وتدریس کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اسی خطبہ حاجت کہتے ہیں اسے پڑھ کر آدمی اپنی حاجت وضرورت بیان کرے۔

''بلا شبہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے، اسی سے مدد مانگتے اور اسی سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ راہ دکھائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ دھتکار دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے، وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

''حمد وصلوٰۃ کے بعد! یقیناً تمام باتوں سے بہتر بات اللہ کی کتاب اور تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا ہے اور تمام امور میں سے برے کام (دین میں) خود ساختہ (بدعت والے) کام ہیں، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔''

''اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں اس حال میں موت آئے کہ تم مسلمان ہو۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (پھر) اس سے اس کی بیوی کو بنایا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور انہیں (زمین پر) پھیلا دیا۔ اللہ سے ڈرتے رہو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے (بچو)۔ یقیناً اللہ تم پر نگران ہے۔ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (سچی اور کھری) بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، یقیناً اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔''

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی

(متوفی ۴۵۸ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابو بکر کنیت، نسب نامہ یہ ہے: احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۱)۔

ولادت ووطن: امام ابو بکر بیہقی شعبان المعظم ۳۸۴ھ میں بیہق میں پیدا ہوئے، بیہق خراسان کے مشہور مردم خیز شہر نیشاپور کے مضافات میں اس سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، (۲) یاقوت کا بیان ہے کہ یہ بڑا زرخیز، نہایت آباد اور وسیع مقام اور تقریباً تین سو اکیس گاؤں پر مشتمل ہے، شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں کہ بیہق چند گاؤں کا نام ہے، جو باہم متصل اور نیشاپور سے تیس کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں، یہ اسی طرح ہے جس طرح نواح دہلی میں بارہہ وہریانہ ہیں، ان دیہاتوں میں سب سے بڑا گاؤں خسروجرد ہے۔ (۳)

خسروجرد کو سب سے بڑا گاؤں ہونے کی وجہ سے مرکزیت حاصل تھی، امام بیہقی کے زمانہ تک اس کی مرکزیت قائم رہی لیکن بعد میں سبزہ وار مرکزی مقام بن گیا تھا۔ (۴)

ظہیر الدین بیہقی کا بیان ہے کہ اگرچہ امام بیہقی کے اسلاف کا تعلق شامکان اور نوبہار سے تھا لیکن ان کی ولادت اور نشوونما بیہق میں ہوئی۔ (۵)

امام ابو بکر ان مقامات کی نسبت سے بیہقی، خسروجردی اور نیشاپوری کہلاتے ہیں

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ و کتاب الانساب ورق ۱۰۱ (۲) ایضاً (۳) بستان المحدثین ص ۵۱ (۴) کتاب الانساب ورق ۱۹۹ و معجم البلدان ج ۲ ص ۳۴۶ و ج ۳ ص ۴۳۷ (۵) تاریخ بیہق مطبوعہ حیدر آباد ص ۳۱۸۔

لیکن ان کی مشہور نسبت بیہقی ہے۔

اساتذہ وشیوخ: امام بیہقی کے شیوخ کی تعداد سو سے متجاوز تھی، ان میں چند مشہور کے نام یہ ہیں:

ابن یعقوب ایادی، ابوبکر بن فورک، ابوزکریا مزکی، ابوعبداللہ بن لطیف، ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابوعلی روذباری، ابوالحسن بن بشران، جناح بن تدیر محاربی، حسن بن احمد بن فراس، عبداللہ ابن یوسف بن ناموبہ، ابوالحسن محمد بن حسین علوی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم، ابوطاہر محمد بن زیادی، ہلال بن محمد حفار۔

فقہ کی تعلیم وتحصیل مشہور فقیہ ابوسہل صعلوکی اور ابوالفتح ناصر بن محمد عمری مروزی سے کی تھی۔

بیہقی کو اپنے اساتذہ میں ابوالحسن محمد بن حسین علوی اور ابوعبداللہ حاکم سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا، خصوصاً حاکم کے جلیل القدر تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ (۱)

تلامذہ: امام بیہقی سے بیشمار لوگوں نے روایت اور تحصیل علم کی ہے، بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

اسماعیل بن احمد (امام بیہقی کے فرزند) حسین بن احمد بن علی، ابوالقاسم زاہر بن طاہر سحامی، عبدالجبار بن عبدالوہاب دھان، عبدالجبار بن محمد خواری، عبدالحمید بن محمد خواری، ابوالحسن عبداللہ بن محمد بن احمد (امام بیہقی کے پوتے) عبدالمنعم قیشری، ابوعبداللہ محمد فراوی، ابوالمعالی محمد بن اسماعیل فارسی۔ (۲)

شیخ الاسلام ابواسماعیل انصاری کو بھی امام بیہقی سے اجازت حاصل تھی اور علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۳۲۸ و ۳۲۹ وطبقات الشافعیہ ج ۳ص ۳ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ص ۳۵ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۳۳۰۔

أدركت عشرة نفر من أصحابه الذين حدثوني عنه۔ (۱)	میری امام بیہقی کے دس تلامذہ سے ملاقات تھی، انھوں نے مجھ سے ان کے واسطہ سے حدیثیں بیان کی ہیں۔

طلب حدیث کے لیے سفر: امام بیہقی بچپن ہی سے حدیث کے مبارک علم کی تحصیل وتکمیل اور اس کی جمع وتحریر میں مشغول ہو گئے تھے اور انھوں نے اس کے لیے متعدد مقامات اور علمی مرکزوں کا سفر بھی کیا تھا، پہلے بیہق سے نیشاپور تشریف لے گئے، خراسان کے اکابر علماء ومحدثین سے استفادہ کرنے کے بعد انھوں نے عراق، جبال اور حجاز کے مختلف اہم شہروں بغداد، مکہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر کیا۔ (۲)

حفظ وثقاہت: امام بیہقی کے حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان پر ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے، ابوالحسن عبدالغافر فارسی کا بیان ہے کہ "وہ اپنے زمانہ میں حفظ میں یکتا اور اپنے تمام معاصرین میں ضبط واتقان کے اعتبار سے یگانہ تھے، حافظ ذہبی نے ان کو حافظہ میں قوی بتایا ہے، ابن ناصر الدین فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور قابل اعتماد تھے، اہل سیر اور ارباب تذکرہ نے ان کو الحافظ الکبیر المشہور کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ (۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حفظ وضبط کی طرح معرفتِ حدیث میں بھی عدیم المثال تھے اور احادیث کے علل واسقام کی تمیز میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے جمع وتلفیق حدیث ان کی امتیازی خصوصیت تھی، حدیث اور اس کے متعلقات میں اس درجہ عبور ہونے کی بنا پر ان کا شمار نامور محدثین اور اکابر فن میں ہوتا ہے، علامہ ابن عساکر نے ان کو شیخ السنہ (۴) اور ابن عماد نے شیخ خراسان (۵) لکھا ہے، ظہیر الدین بیہقی لکھتے ہیں کہ فن حدیث میں ان

(۱) کتاب الانساب ورق ۱ (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲٦٦ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۴ (۴) تبیین کذب المفتری ص ۲٦٦ (۵) شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۵۔

کا کوئی ہمسر اور ثانی نہ تھا، ان کے زمانہ میں خراسان کے اندر کسی کو ان کی مرضی وسند کے بغیر کوئی حدیث بیان کرنے یا اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کی مجال نہ تھی۔

وہ ایک روز اپنے استاذ حاکم کی مجلس میں جہاں متعدد علما واصحاب فضل وکمال موجود تھے، حاضر ہوئے، حاکم نے ایک حدیث بیان کرتے ہوئے اس کے کسی راوی کا نام ترک کر دیا، امام بیہقی نے فوراً اعتراض کیا، حاکم کو غصہ آ گیا لیکن جب اصل سے مقابلہ کیا گیا تو بیہقی کی بات درست نکلی۔(۱)

گو حدیث کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کو دستگاہ حاصل تھی، تاہم اس فن میں ان کو زیادہ نمایاں مقام اور بلند درجہ حاصل تھا، اسی لیے ان کی شہرت اسی کی نسبت سے ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

غلب علیہ علم الحدیث واشتھر بہ۔(۲)	ان پر علم حدیث خاص طور سے غالب تھا اور اس میں ان کو نہایت نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ تو امام بیہقی کے شیوخ کی تعداد اور محدثین کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی اور حدیث کی کئی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہی ان کی نظر سے گذری تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اس فن میں یگانہ روزگار اور یکتائے زمانہ تھے اور ان سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں، نیز اس فن میں ان سے متعدد بے نظیر کتابیں بھی یادگار ہیں۔(۳) علامہ سمعانی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس احادیث کا بڑا وسیع ذخیرہ تھا اور انھوں نے متعدد بے مثال تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، علامہ یافعی تحریر کرتے ہیں کہ ''بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے شیوخ کی تعداد تقریباً ایک سو ہے اور یہ تعداد درحقیقت بیہقی کے علوم وکمالات کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے کاموں میں خاص برکت عطا کی تھی، گو ان کو

(۱) تاریخ بیہقی ص ۱۱۷ (۲) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ (۳) کتاب الانساب ورق ۱۰۱۔

متعدد کتب حدیث کے سماع کا شرف حاصل تھا تاہم بعض کتابوں کے استفادہ سے وہ محروم بھی رہ گئے تھے، چنانچہ مسند امام احمد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی وغیرہ کتابیں ان کے پاس نہیں تھیں۔" (۱)

علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ "علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ بیہقی کا دائرہ علم حدیث میں زیادہ وسیع نہیں تھا تاہم خدا نے ان کے مرویات میں بڑی برکت عطا کی تھی اور وہ حدیث کے ابواب ورجال کے بارے میں پوری مہارت اور مکمل واقفیت رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی فرماتے ہیں:

باوجود اس تبحر اور علو ے اسناد کے امام بیہقی کے پاس سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ نہیں تھیں، اس لیے ان تینوں پر جیسی اطلاع ہونی چاہیے تھی ان کو نہیں تھی، مگر حق تعالیٰ نے ان کے علم میں غیر معمولی برکت اور فہم میں نہایت بصیرت عطا کی تھی، ان کی یادگار ایسی عجیب تصنیفات ہیں جو ان سے پہلے کے لوگ بھی نہیں لکھ سکے تھے۔ (۲)

فقہ: امام بیہقی کو فقہ واصول میں بھی پورا درک حاصل تھا، فقیہ جلیل اور اصولی ان کے نام کا جز بن گیا تھا، ان کی تصنیفات حدیث میں گوناگوں فقہی معلومات ومسائل موجود ہیں اسی لیے ان کو علم حدیث وفقہ کا جامع کہا جاتا ہے، حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں:

انھوں نے اپنی کتابوں میں علم حدیث وفقہ دونوں کے مسائل ومعلومات جمع کیے ہیں اسی کے ساتھ عللِ حدیث، صحیح وسقیم روایتوں کی نشاندہی، احادیث کے درمیان جمع وتطبیق کے وجوہ اور فقہ واصول وغیرہ مختلف النوع مباحث بیان کیے ہیں۔ (۳)

عربیت وشعروسخن: ان کو عربیت اور شعروسخن کا اچھا ذوق تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے حسنِ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور ان سے منقول بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

(۱) مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۸۲ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ (۲) بستان المحدثین ص ۱۵ (۳) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶۔

من عزّ بالمولی فذاک جلیل　　　ومن رام عز سواہ ذلیل

جس شخص کو خدا نے عزت دی وہ بزرگ ہے اور جس نے خدا کے سوا کسی دوسرے سے عزت طلب کی وہ ذلیل ہے۔

ولو ان نفسی مذبر أھا ملیکھا　　　مضی عمرھا فی سجدۃ لقلیل

اگر میرا نفس اس وقت سے لے کر جب سے کہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے، عمر بھر خدا کی عبادت کرتا ہے تو بھی یہ بہت کم ہے۔

احب مناجاۃ الحبیب باوجہ　　　ولکن لسان المذنبین کلیل (۱)

میں عمدہ طور سے اپنے حبیب کی مناجات پسند کرتا ہوں لیکن گنہ گار کی زبان گونگی ہے۔

گو حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عربیت وغیرہ میں امام صاحب کو امتیازی شہرت حاصل تھی تاہم دوسرے علوم وفنون میں بھی عاجز نہ تھے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں ''وہ علوم وفنون میں اپنے زمانہ میں اپنے معاصرین میں یکتا اور بے نظیر تھے۔ (۲)

تحقیق وانصاف پسندی: امام بیہقی کی ایک خصوصیت حقیقت بینی اور انصاف پسندی بھی ہے، مورخین واصحاب سیر نے علمی وفنی مباحث میں امام صاحب کی غیر معمولی تحقیق وتدقیق اور انصاف پسندی کا ذکر کیا ہے۔ صاحب تاریخ بیہق کا بیان ہے:

وتحقیقات درعلوم بسیار دارد ودر مباحثہ ومناظرۂ علوم غایت انصاف مرعی میداشت۔ (۳)	علوم میں بڑی تحقیق سے کام لیتے تھے اور مباحثہ ومناظرہ میں انصاف کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔

امامت ومرجعیت: امام بیہقی کے گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مسلمانوں کا امام ومقتدیٰ اور اصحاب علم وفن کا مرجع بنا دیا تھا، تمام ارباب سیر وتذکرہ نے ان کی امامت فن کا

(۱) بستان المحدثین ص ۵۱ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ (۳) تاریخ بیہق واتحاف النبلاء ص ۱۹۰۔

اعتراف کیا ہے، امام صاحب کی مرجعیت و مقبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہوکر اپنے وطن بیہق میں درس وافادہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے تو بڑے بڑے ائمہ فن اور نامور اصحاب کمال نے ان سے نیشاپور تشریف لانے کی فرمائش کی تاکہ اس مرکزی مقام میں لوگوں کو ان سے استفادہ میں سہولت اور ان کی کتابوں کے سماع کا زیادہ موقع ملے، لوگوں کی اس طلب و خواہش کو دیکھ کر آپ ناحیہ سے ۴۴۱ھ میں نیشاپور پہنچے، وہاں کے شائقین نے امام صاحب کا شایان شان استقبال کیا اور جب مجلس درس آراستہ کی گئی تو اس میں جہابذۂ فن اور نامور اصحابِ کمال شریک ہوکر آپ کی کتابوں کا سماع کرتے اور آپ سے استفادہ کرتے تھے اور آپ کے لیے دعائے خیر و برکت کرتے تھے، یہ تمام لوگ آپ کے ذوقِ علم اور کثرتِ استحضار کے معترف تھے۔(۱)

اعتراف کمالات: امام بیہقی کے اوصاف و کمالات کا ان کے معاصرین، ارباب کمال اور مورخین واصحاب سیر نے اعتراف کیا ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ''امام بیہقی مسلمانوں کے ائمہ ہداۃ اور دین متین کے داعیوں میں تھے، وہ علم و فضل کا پہاڑ اور اپنے پورے دور میں عدیم المثال، یکتائے روزگار، میدان علم کے شہ سوار، حاذق الفن محدث، سرعت فہم، جودت طبع اور ذہن کی درّاکی میں بے نظیر تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں یکتا اور اپنے معاصرین میں بے مثال تھے، ظہیر الدین بیہقی کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جن سات آدمیوں کی تصنیفات اسلامی کتابوں کا بہترین ذخیرہ خیال کی جاتی ہیں ان میں ایک امام بیہقی بھی ہیں اور ان سے مسلمانوں کو بڑا فیض پہنچا ہے اور امام حاکم کے اجل تلامذہ میں ہونے کے باوجود بعض حیثیتوں سے ان سے فائق و برتر سمجھے جاتے تھے، ابن خلکان ذہبی اور ابن عساکر کا بیان ہے کہ ''گو وہ امام ابوعبداللہ حاکم کے تلامذہ میں تھے، تاہم متعدد علوم وفنون میں یکتا ہونے کی بنا پر ان سے بڑھ کر تھے۔'' امام سیوطی فرماتے ہیں کہ محدثین کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۳۲۹ و تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶۔

اتفاق ہے کہ حاکم کے شاگرد امام بیہقی حدیث کی طلب میں ان سے فائق تھے۔(۱)

فقہی مذہب: امام بیہقی شافعی المذہب تھے، ان کو اس مذہب سے غیر معمولی شغف تھا، اس کی نشرو اشاعت اور تہذیب و تنقیح میں انھوں نے اہم اور نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں، اس مذہب کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا، ابن سبکی کا بیان ہے کہ کوئی شافعی المذہب ان کی تصنیفات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، امام الحرمین ابوالمعالی جوینی سے منقول ہے کہ ''امام بیہقی کے علاوہ کوئی ایسا شافعی المذہب نہیں ہے جس پر امام شافعی کے احسانات نہ ہوں لیکن امام بیہقی کا خود امام شافعی پر احسان ہے کیوں کہ ان کی تصنیفات سے ان کے مذہب و مسلک کی بڑی تائید و اشاعت ہوئی ہے، وہ تمام شوافع میں اس مذہب کے اصول و فروع کی حمایت میں نہایت پیش پیش رہے اور اس کی تفریع و تخریج اور اس کے مختصر مجمل کی توضیح و تشریح کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔

ابن خلکان اور ذہبی نے لکھا ہے کہ وہ امام شافعی کے نصوص جمع کرنے والے پہلے شخص ہیں'' لیکن علامہ ابن سبکی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ خلاف واقعہ ہے، درحقیقت جامعین نصوص میں وہ بالکل آخری شخص ہیں، انھوں نے متقدمین کے تمام مباحث اور ان کی کتابوں کے اکثر امور و مسائل کا استیعاب کرلیا ہے، ان کے بعد کسی اور شخص کے بارے میں مجھ کو نہیں معلوم کہ اس نے امام شافعی کے نصوص جمع کیے ہوں کیوں کہ امام بیہقی اس کو اس قدر جامع اور مکمل طور پر مرتب کر چکے تھے کہ بعد والوں کے لیے مزید کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔''(۲)

کلامی مذہب: امام صاحب اشعری المذہب اور اہل سنت والجماعت میں تھے، علامہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹ و تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۳ و ۴ و تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵۔

ابن سبکی لکھتے ہیں کہ انھوں نے اشعری مذہب کے مطابق علم کلام پڑھا اور حافظ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں ان کا اشاعرہ کے تیسرے طبقہ میں ذکر کیا ہے، بعض اکابر محدثین کی طرح ان کی جانب بھی شیعیت کی نسبت کی گئی ہے لیکن یہ سراسر غلط الزام ہے۔

زہد و ورع: امام بیہقی زہد و ورع میں بھی ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو دیندار، صاحب ورع، زاہد، قانت اور عفیف وغیرہ لکھا ہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وفات سے ۳۰ر سال پہلے سے انھوں نے مسلسل روزے رکھنا شروع کر دیے تھے۔(۱)

عادات و اخلاق: اصحاب سیر و تذکرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے عادات و خصائل نہایت پاکیزہ تھے، عفت و قناعت ان کی سیرت کا اہم جوہر تھی، زہد و ورع اور شمائل و اخلاق میں وہ سلف صالحین اور علمائے ربانیین کے اوصاف کے حامل تھے، علامہ ابن عبدالغافر کا یہ بیان تمام کتابوں میں ملتا ہے۔

كان البيهقي على سيرة العلماء	امام بیہقی علمائے سلف کی طرح معمولی
قانعا من الدنيا باليسير	اور تھوڑی چیز پر قانع اور زہد و ورع میں
متجملا في زهده وورعه وبقي	ممتاز تھے، وفات تک ان کا یہی حال
كذالك الى ان توفي۔(۲)	تھا۔

وفات: امام بیہقی نے ۷۴ر سال کی عمر میں شنبہ ۱۰ر جمادی الاولی ۴۵۸ھ کو نیشاپور میں انتقال کیا، ان کی نعش مبارک وہاں سے بیہق لائی گئی اور یہیں سپرد خاک کیے گئے۔(۳)

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اولاد: ان کی اولاد میں ابو علی اسماعیل اور محمد کا ذکر ملتا ہے، اول الذکر صاحب کمال محدث

---

(۱) شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۵ (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۷ (۳) ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۰ و المنتظم ج ۸ ص ۲۸۲۔

اور عہدۂ قضا پر فائز تھے، امام صاحب کے تلامذہ کے ضمن میں ان کا نام گذرا ہے، دوسرے صاحبزادے محمد کے بیٹے ابوالحسن عبداللہ بھی جلیل القدر محدث تھے، ان کو اپنے دادا سے روایت وسماع کا فخر حاصل تھا۔(۱)

تصنیفات: امام بیہقی مایہ ناز مصنف تھے، ان کے فضل وکمال کا سب سے بڑا ثبوت ان کی تصنیفات ہیں جو ایک ہزار جز کے بقدر ہوں گی، ان کے علمی کاموں میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی تھی، اس لیے ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ ہے اور وہ کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں، مورخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ ان کی تمام تصنیفات نہایت جامع، پر مغز، مفید، بے نظیر اور عدیم المثال ہیں، امام بیہقی کا شمار ان علمائے اسلام میں ہوتا ہے جن کی کتابوں سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے، کتب صحاح کی شہرت وعلوئے منزلت کے بعد جن محدثین کی تصنیفات کو عالم اسلام میں بقائے دوام حاصل ہوا اور جن کی علمی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان میں امام الحدیث وشیخ السنۃ ابوبکر بیہقی بھی ہیں، ان کا شمار ان ائمہ وحفاظ سبعہ میں ہوتا ہے جن کے متعلق حافظ ابن صلاح کا بیان ہے کہ انھوں نے عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کیں۔"(۲)

بالخصوص شافعی مذہب کو ان سے زیادہ کسی اور مصنف کی تصنیفات سے فائدہ نہیں ہوا، اس مذہب کی تائید وحمایت، اس کی تفریع وتخریج نیز ضبط وتحقیق اور شرح وبسط ان کا خاص اور اہم کارنامہ ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ کوئی شافعی المذہب نہ ان کے احسانات سے سبکدوش ہوسکتا ہے اور نہ ان کی کتابوں سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ "امام بیہقی کی امانت، تدین، فضل وکمال اور ضبط واتقان کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے چہار جانب کے لوگوں کو نفع بخشا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳ (۲) ایضاً۔

ان کی کتابوں کو مختلف شہروں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں تصنیف وتالیف میں یکتا تھے، ان کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں بے نظیر اور مفید ہیں، علامہ ابن سبکی کہتے ہیں کہ ان کی تمام تصنیفات بیش قیمت، بلند پایہ اور ترتیب وتالیف میں عمدہ ہیں، متقدمین کی کتابیں بھی اس درجہ کی نہیں ہیں۔(۱)

ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے متعلق مختصر معلومات درج کئے جاتے ہیں:

۱- کتاب البعث والنشور (ایک جلد)، ۲- بیان خطاء من اخطاء علی الشافعی، ۳- ترغیب الصلاۃ، ۴- کتاب الترغیب والترتیب (ایک جلد)، ۵- جامع ابواب وجوہ قرأۃ قرآن، ۶- کتاب الرؤیۃ، ۷- کتاب فضائل الاوقات، ۸- فضائل الصحابہ یا المصنف فی فضائل الصحابہ، ۹- کتاب القدر، ۱۰- کتاب مناقب احمد، ۱۱- کتاب مناقب الشافعی، ۱۲- کتاب المعارف، ۱۳- کتاب ینابیع الاصول، ۱۴- کتاب اثبات عذاب القبر، اس کا قلمی نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں ہے۔(۲)

۱۵- کتاب الاسرار: ذہبی نے اس کا نام کتاب الاساری اور صاحب کشف الظنون نے کتاب الاسرار لکھا ہے۔

۱۶- کتاب المعرفۃ: معرفۃ العلوم، معرفۃ الحدیث اور معرفۃ علوم الاحادیث بھی اس کے نام تحریر کئے گئے ہیں، غالباً اس میں علم حدیث کے مصطلحات بیان کئے گئے ہیں۔

۱۷- کتاب الآداب: ایک جلد، مکارم اخلاق، بروصلہ اور آداب وغیرہ سے متعلق احادیث پر مشتمل ہے۔(۳)

۱۸و۱۹- کتاب الدعوات الصغیر وکتاب الدعوات الکبیر: دونوں امام بیہقی کی اہم اور عمدہ کتابیں ہیں۔(۴)

---

(۱) العبر ج ۳ ص ۲۴۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۴ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ (۲) رسالہ معارف ج ۱۸ ص ۳۳۳ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۶ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴۔

۲۰- کتاب الاربعین: یہ اخلاق سے متعلق ۱۰۰ احدیثوں کا مجموعہ اور چالیس ابواب پر مرتب کی گئی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اربعین صغری واربعین کبریٰ کے نام سے دونوں کتابوں کا ذکر کیا ہے۔(۱)

۲۱- کتاب احکام القران: احکام القرآن کے نام سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں سب سے پہلی کتاب امام شافعی کی بتائی جاتی ہے، بیہقی نے اس میں ان کے اقوال کی تلفیق کی ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ میں ہے۔(۲)

۲۲- کتاب الخلافیات: دوجلدوں میں ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ ایسی فاضلانہ کتاب وہی لکھ سکتا ہے جوفقہ وحدیث دونوں میں جامع اور نصوص کا ماہر ہو۔ صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ اس میں ان مسائل کا ذکر ہے جو امام اعظم اور امام شافعی کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔(۳)

۲۳- نصوص الشافعی: یہ دس جلدوں میں ہے(۴) لیکن حافظ ذہبی نے تین جلدیں بتائی ہیں، ابن خلکان اور ذہبی کا خیال ہے کہ امام شافعی کے نصوص جمع کرنے میں اولیت کا شرف بیہقی کو حاصل ہے لیکن ابن سبکی نے اس کی تردید کی ہے۔

۲۴- دلائل النبوۃ: یہ تین جلدوں میں ہے، علامہ ابن سبکی نے اس کو بے نظیر کتاب کہا ہے اور ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کی تحصیل ضروری ہے، مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، سراج الدین عمر بن علی المعروف بابن ملقن نے اس کا مختصر لکھا ہے۔(۵)

۲۵- کتاب ماوردفی حیات الانبیا بعدوفاتہم ۱۳۴۹ھ میں یہ حیاۃ الانبیا کے نام

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۷۷ وبستان المحدثین ص ۵۱ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۶ ومعارف ج ۱۸ ص ۲۳۱ (۳) کشف الظنون ج ۱ ص ۷۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ (۴) ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۵ (۵) معارف ج ۱۸ ص ۱۰۴ کشف الظنون ج ۲ ص ۴۹۵۔

سے محمد بن محمد خانجی کی تعلیق کے ساتھ مصر سے پندرہ صفحات میں شائع ہوئی ہے،(۱) صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ یہ ایک ہزار مسائل پر مشتمل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطبوعہ رسالہ اصل کتاب کا مختصر ہے۔

۲۶ و ۲۷- کتاب الزہد: اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، امام احمد اور ابن مبارک کی کتابیں زیادہ اہم اور مشہور ہیں، امام بیہقی نے زہد میں کتاب الزہد الکبیر اور کتاب الزہد الصغیر کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں، کتاب الزہد الکبیر کا ایک قلمی نسخہ مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں اور دوسرا مکتبہ سندیہ میں ہے۔(۲)

۲۸- کتاب الاعتقاد: اس میں عقائد کے وہ اصول وفروع بیان کیے گئے ہیں جن کو جاننا اور ان پر اعتقاد رکھنا مکلف لوگوں کے لیے ضروری ہے، اس کی ترتیب ابواب پر ہے، امام برہان الدین ابراہیم بن عمر بقائی (م ۸۸۵ھ) نے خیر الزاد المنتقی من کتاب الاعتقاد کے نام سے اس کا انتخاب کیا تھا، اس کا مکمل نام کتاب الاعتقاد والھدایہ الی سبیل الرشاد ہے بعض نے کتاب المعتقد بھی لکھا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ بڑی نفیس اور عمدہ کتاب ہے۔"(۳)

۲۹- کتاب المبسوط: یہ عظیم الشان کتاب بیس جلدوں میں ہے، امام بیہقی خود فرماتے ہیں کہ امام شافعی کے قدیم قول نقل کرنے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے توفیق الٰہی سے ان کے دلائل تحریر کیے ہیں اور اس کو امام مزنی کی مختصر کی ترتیب پر اس لیے مدون کیا گیا ہے کہ جو لوگ مفصل اور مبسوط مباحث دیکھنے کے خواہش مند ہوں وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں۔

---

(۱) ایضاً ص ۲۹۸ وفوائد جامعہ ص ۷۷ و ۷۸۔ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۹ والرسالۃ المستطرفہ ص ۴۴ ومعارف ج ۱۸ ص ۳۲ وتذکرۃ النوادر ص ۱۹۱ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۳ والرسالۃ المستطرفہ ص ۴۰ وبستان المحدثین ص ۶۴۔

۳۰- کتاب القرأۃ خلف الامام: یہ رسالہ مولانا تلطف حسین مرحوم کے زیر اہتمام مئی ۱۹۱۵ء میں مطبع پرنٹنگ ورکس دہلی سے متوسط تقطیع کے ۱۷۶ صفحات میں شائع ہوا تھا، اصل کتاب ۱۶۰ صفحوں پر مشتمل ہے، سولہ صفحات میں مضامین اور اغلاط کی فہرست ہے، اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امام، مقتدی اور منفرد سب کو خواہ سری نماز ہو یا جہری سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی، مصنف نے اس بحث کی تمام روایات واحادیث جمع کر کے شوافع کے مسلک کو قوی اور مرجح ثابت کیا ہے اور دوسرے فقہا کے مسالک اور ان کی موید حدیثیں بھی ذکر کی ہیں، حدیث ورجال کی فنی بحثیں اور اہل لغت وادب کے بیانات بھی جہاں ضروری معلوم ہوئے ہیں دیدیئے گئے ہیں۔

۳۱- کتاب الاسماء والصفات: بیہقی کی اس مفید اور جامع کتاب کو علامہ ابن سبکی نے عدیم النظیر اور بے مثال بتایا ہے، ۱۳۱۳ھ میں یہ پہلی مرتبہ مطبع انوار احمدی الٰہ آباد اور پھر مصر سے شیخ محمد زاہد کوثری کے حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس میں خدا کے ناموں اور صفتوں پر مبسوط بحث کی گئی ہے اور ہر مبحث کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، ضمناً تفسیر وکلام اور حدیث ورجال کی بعض فنی بحثیں بھی آ گئی ہیں، علامہ کوثری اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مصنف نے ہر باب سے متعلق جتنی حدیثیں مروی ہیں ان سب کو اکٹھا کر دینے کی کوشش کی ہے اور صحیح وغیر صحیح حدیث کی تصریح اور اسماء وصفات سے متعلق وارد نصوص کی توجیہ وتاویل، ماہرین فن اور اہل نظر کے بیان کردہ مرادی معانی بھی بیان کیے ہیں۔
>
> چند مقامات سے قطع نظر مصنف کی اکثر بحثیں نہایت عمدہ اور خوب ہیں۔'' (۱)

۳۲- کتاب المدخل: یہ دراصل کتاب السنن الکبیر کا مقدمہ ہے، اسی لیے اس کا

(۱) بحوالہ فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص ۱۴۴ و ۱۴۵۔

پورا نام المدخل الی السنن ہے، اس میں امام بیہقی نے فن حدیث کے نکات اور ضروری اصولی مباحث کی تشریح کی ہے تاکہ سنن سے استفادہ کرنے والوں کو سہولت ہو، یہ مقدمہ بعض حیثیتوں سے خود ایک مستقل کتاب ہے جو کئی ابواب پر مشتمل ہے، راقم کو اس کے صرف ایک ہی قلمی نسخہ کا علم ہوسکا ہے، جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ کی زینت ہے مگر ناقص الاول ہے اور صرف ۵۷ ورقوں پر مشتمل ہے، اس کے متعلق مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کا ایک مبسوط مقالہ معارف اپریل ومئی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب ابواب پر کی گئی ہے اور بارہ جزوں پر مشتمل ہے، ہر باب کے مطابق سرد روایات کے بعد نتائج کا استنباط بھی کیا گیا ہے، کتاب معرفۃ السنن میں اس کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں، علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے کتاب المدخل کی تلخیص کی تھی، انھوں نے مقدمہ ابن صلاح کے مختصر میں جن فوائد کا اضافہ کیا ہے، ان میں سے بعض کے متعلق خود یہ بیان کیا ہے کہ وہ بیہقی کی کتاب المدخل سے ماخوذ ہیں، اسی طرح امام سیوطی کی تدریب الراوی میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں۔

۳۳-شعب الایمان: اس کتاب کا پورا نام الجامع المصنف فی شعب الایمان ہے، یہ بیہقی کی مفید ومشہور کتاب ہے جو دو جلدوں اور ۷۷ ابواب پر مشتمل ہے، امام صاحب کے پوتے ابوالحسن عبیداللہ اور ابوالقاسم زاہر بن طاہر شحامی اس کے راوی ہیں، (۱) اس میں مصنف نے صحیحین وغیرہ کی مشہور حدیث الایمان بضع وسبعون شعبۃ الخ کے مطابق ایمان کے ستر شعبوں کی تفصیل تحریر کی ہے، نیز ہر ہر شعبہ کے متعلق دوسری روایتیں اور قرآنی آیتیں بھی استشہاد میں پیش کرکے ان کی شرح وتوضیح کی گئی ہے۔

شمس الدین تونوی اور معین الدین محمد بن حمویہ نے اس کے مختصر اور جلال الدین سیوطی نے ایک جلد میں زوائد تحریر کیے ہیں، (۲) اس کا مختصر مصر سے عربی میں اور اردو

(۱) مختصر شعب الایمان ص ۵و۶ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵۔

ترجمہ کارخانہ تجارت کتب کراچی سے شائع ہوا ہے۔

۳۴- کتاب معرفۃ السنن والآثار: یہ امام بیہقی کی معرکۃ الآرا کتاب ہے، امام صاحب ابھی اس کی ترتیب وتالیف سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بعض لوگوں نے اس کی اہمیت اور مقبولیت کے خواب دیکھے، اس کے شروع میں حدیث وسنت کی اہمیت روایت، اسناد میں احتیاط اور بعض ضروری فنی مباحث، اجماع، اجتہاد، قیاس، عام وخاص، امر ونہی دلیل خطاب اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ کی نوعیت، امام شافعی کے حالات وکمالات اور اجتہادی مرتبہ پر لطیف بحث کی گئی ہے، اس کے بعد فقہی ابواب کی ترتیب پر احکام ومسائل سے متعلق روایات جمع کی گئی ہیں، روایات کے نقل میں سرد واستقصا سے کام لیا گیا ہے اور ایک نوع کی روایتوں کے متعدد طرق واسناد کی تخریج، ان کی صحت وسقم، ان سے استنباطات کا ذکر اور امام شافعی کے آرا واقوال کی تصریح کی گئی ہے، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ کوئی شافعی المذہب اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہ کتاب کئی اجزا پر مشتمل ہے، اس کا ایک جز جو طہارت اور نماز کے ابواب پر مشتمل ہے مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری کے ہاتھ کا لکھا ہوا، دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، موصوف نے اس کا ایک مختصر جز بانکی پور پٹنہ سے شائع بھی کیا ہے، اس میں طہارت کے اکثر ابواب آ گئے ہیں۔

۳۵و۳۶- کتاب السنن: امام بیہقی کی سنن میں دو کتابیں ہیں، ایک السنن الکبیرہ یا سنن کبریٰ اور دوسری السنن الصغیرہ یا سنن صغریٰ کے نام سے موسوم ہے اور جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے، احکامی احادیث پر مشتمل ہیں، ان کو امام مزنی کی مختصر کی طرح پر فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، دونوں کی ابوالقاسم زاہر بن طاہر شحامی نے امام صاحب سے روایت کی ہے، بعض علمائے اسلام کا بیان ہے کہ اسلامیات کے ذخیرہ میں ایسی عظیم الشان کتابیں نہیں لکھی گئیں، سنن صغریٰ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، اس کے ناقص قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہیں۔(۱) سنن کبریٰ مکمل دس جلدوں میں دائرۃ المعارف

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اص ۳۵۱ و ۳۵۲۔

حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، اس کا مختصر تعارف اور اس کے متعلق بعض معلومات درج ذیل ہیں:

سنن کبریٰ، امام بیہقی کی مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے جو نہ صرف بیہقیات بلکہ پورے ذخیرۂ حدیث کی ممتاز اور اہم کتاب ہے، اس کی عظمت اور اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کے بعد جن کتابوں کو غیر معمولی شہرت اور بقائے دوام نصیب ہوا، ان میں یہ بھی ہے، حافظ ابن صلاح نے صحاح ستہ کے بعد کی عمدہ اور پر منفعت اور علامہ سیوطی نے معتبر و مستند کتابوں میں اس کو شمار کیا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے، اس کی اہمیت کی بنا پر بعض اساطین فن کا بیان ہے کہ ''اسانید، علل، اسماء الرجال اور صحاح کے متون کے علاوہ جن متون کا علم و سماع ایک محدث اور طالب فن کے لیے ضروری ہے، ان میں کتاب السنن الکبیر کا متن بھی ہے، اس کو مصنف کی زندگی ہی میں پوری شہرت و مقبولیت اور مکمل اعتبار و استناد حاصل ہو گیا تھا، ان کے استاذ امام ابومحمد عبداللہ بن یوسف جوینی نے بہ صرف کثیر اس کا نسخہ حاصل کر کے بڑے شوق سے ملاحظہ فرمایا اور اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار کیا، (۱) امام بیہقی نے اس کی ترتیب و تالیف اور متون و اسناد کی صحت و جودت میں بڑی احتیاط اور نہایت چھان بین سے کام لیا ہے، اہل فن کو اعتراف ہے کہ سنن میں دیدہ و دانستہ کوئی موضوع حدیث شامل نہیں کی گئی ہے۔

خصوصیات: سنن بیہقی کی چند اہم اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱- جامعیت، ضخامت اور حجم وغیرہ سے قطع نظر اس میں متعدد ایسی حدیثیں شامل ہیں جو حدیث کی معروف و معتبر کتابوں میں نہیں ہیں اور بے شمار ایسی حدیثیں بھی ہیں جو اگرچہ دوسری کتابوں میں موجود ہیں لیکن بیہقی کے اسناد و متون میں بعض مفید اضافے ہیں، چنانچہ جو حدیثیں دوسری کتابوں میں مختصر و مجمل یا عام و مطلق مروی ہیں وہ اس میں مطول

(۱) معرفۃ السنن والآثار مطبوعہ ص ۵۵۔

ومفسر اور خاص ومقید نقل کی گئی ہیں، اسی طرح جو کتابیں دوسری کتابوں میں ضعیف سندوں یا موقوف، مرسل اور منقطع نقل ہوئی ہیں، وہ اس میں صحیح سندوں سے مرفوع، مسند اور متصل درج کی گئی ہیں۔

درحقیقت وجوہ وطرق کی کثرت اور تعداد اسناد کو محدثین کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ یہ حدیث کی قوت کا موجب ہے، سنن بیہقی اس اعتبار سے بڑا امتیاز رکھتی ہے، امام بیہقی نے تعدد طرق، کثرت اسانید اور متحد المعنی روایات کو جمع کرنے کی طرف خاص دھیان دیا ہے۔

۲- تراجم کی کثرت بھی سنن بیہقی کی امتیازی شان ہے، انھوں نے ہر ہر مسئلہ کے لیے مستقل اور جداگانہ ابواب قائم کیے ہیں، اس کی وجہ سے ایک روایت کے گوناگوں پہلو اور مختلف گوشے سامنے آگئے ہیں۔

۳- معانی ومطالب کی وسعت وتنوع اور استدلال، استنباط اور استخراج کے لحاظ سے سنن بیہقی بے نظیر کتاب مانی جاتی ہے، عنوانات اور ابواب قائم کرکے آیات واحادیث سے لطیف استنباط کیے گئے ہیں جن کی طرف عموماً ذہن منتقل نہیں ہوتا، اس طرح استدلال میں بھی نہایت دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے، اس خصوصیت کا آگے مزید ذکر آئے گا۔

۴- علامہ ابن سبکی نے اس کو ترتیب وتہذیب اور جودت تصنیف وغیرہ کے لحاظ سے بے نظیر کتاب قرار دیا ہے، مصنف نے اس کی تالیف وترتیب میں نہایت لطیف اسلوب اور عمدہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، طرز استدلال، تقسیم ابواب اور حدیثوں کی وضع وترتیب میں ندرت کے باوجود بڑی موزونیت اور مناسبت پائی جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابواب کے تفنن اور اسالیب کے تنوع کے اعتبار سے اس کا درجہ اکثر کتب سنن ومسانید سے بڑھا ہوا ہے، امام بخاری کی طرح امام بیہقی کے ابواب بھی حدیث سے ماخوذ ہوتے ہیں کہیں کہیں مناسبت کا پہلو بہت دقیق اور کہیں کہیں نہایت معمولی ہوتا ہے، بعض ابواب کے آخر

میں ایسی حدیثیں درج کی ہیں جن کی آنے والے باب وترجمہ سے مناسبت بالکل واضح ہوتی ہے، جیسے باب قتل الرجل بالمرأۃ کے خاتمہ کی حدیث میں ایک یہودی کے ایک مسلمان بچی کے قتل وقصاص کا ذکر ہے اور اس کے بعد فیمن لا قصاص بینہ باختلاف الدینین لائے ہیں،(۱) بعض ابواب ظاہری مفہوم کے لحاظ سے باہم دگر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل ان مختلف ابواب سے امام صاحب کا مقصد کسی خاص مسلک کو جو ان کے نزدیک بالکل محقق ہوتا ہے، الفاظ اور عبارتوں کے تنوع، تجدید ابواب اور تخریج احادیث کے ذریعہ مدلل طور پر ثابت کرنا ہوتا ہے۔

۵- امام بیہقی نے حوالے اور حدیثوں کے مآخذ کی نشاندہی کر دی ہے، اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ حدیث اور کن کن کتب حدیث میں مذکور ہے، صحیحین کے حوالے اس کثرت سے دیئے ہیں گویا سنن بیہقی المستخرج علی الصحیحین بن گئی ہے، حوالہ دینے کے ساتھ انھوں نے اس فرق واختلاف کو بھی واضح کر دیا ہے جو ان کی اور دوسری کی روایت کے سند ومتن میں پایا جاتا ہے۔(۲)

---

(۱) السنن الکبریٰ ج ۸ ص ۳۰ (۲) صحیحین کے حوالوں کے سلسلہ میں یہ واضح رہنا چاہئے کہ امام بیہقی نے الفاظ ومعانی اور متون وغیرہ کی ہو بہو اور بالکل ٹھیک ٹھیک مطابقت کا التزام نہیں کیا ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی روایت میں ان الفاظ واسناد کا ذکر کیا ہے جو ان کو اپنے شیوخ سے ملے ہیں، اس لیے ان کے اور صحیحین کے الفاظ ومعانی میں اکثر معمولی اور خفیف سا فرق ہوتا ہے اور اس کی انھوں نے عمدہ تصریح ووضاحت کر دی ہے، علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

وھکذا ما اخرجه المولفون فی	اسی طرح جن مصنفین نے جیسے امام بیہقی
تصانیفهم المستقلة كالسنن	اور ابو محمد بغوی نے اپنی مستقل تصنیفات
الکبیر للبیهقی وشرح السنة	سنن کبیر وشرح السنۃ وغیرہ میں جو یہ کہا
لابی محمد البغوی وغیرهما مما	ہے کہ "اس حدیث کی امام بخاری ومسلم

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

۶۔ سنن بیہقی فقہی مسائل ومعلومات کا گنجینہ ہے، اس کے ابواب وتراجم فقہی مسائل ہی کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں، علاوہ ازیں ایک ایک حدیث سے مختلف مسائل کو مستنبط اور متعدد ابواب کی تفریع کی گئی ہے، اس سے امام بیہقی کے فقہی کمال اور اجتہادی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، صحابہ وتابعین کے آثار اور ائمہ مابعد کے اقوال ومسالک بھی جمع کیے گئے ہیں اور ضعیف وقوی اور مرجوح وراجح اقوال میں محاکمہ بھی کیا گیا ہے، امام شافعی کے قدیم وجدید اقوال، شوافع کے مذہب، اصول اور دلائل خصوصیت سے ذکر کیے گئے ہیں،

قالوا فیه اخرجه البخاری او مسلم فلایستفاد بذالك اکثر من ان البخاری او مسلما اخرجا اصل ذالك الحدیث مع احتمال ان یکون بینهما تفاوت فی اللفظ وربما کان تفاوتافی بعض المعنی فقد وجدت فی ذالك مافیه بعض تفاوت من حیث المعنی واذا کان الامر فی ذالك علی هذا فلیس لك ان تنقل حدیثا منهما وتقول هوعلی هذا الوجه فی کتاب البخاری او کتاب مسلم الا ان تقابل لفظه او یکون الذی خرجه قد قال اخرجه البخاری بهذا اللفظ۔

(مقدمہ ابن صلاح ص ۱۲

مطبع قیم بمبئی ۱۳۵۷ھ)

نے تخریج کی ہے" تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اصل شیخین کے یہاں موجود ہے، ورنہ دونوں کے درمیان لفظ اور بعض اوقات معنی میں بھی فرق وتفاوت کا احتمال رہتا ہے، ایسی حالت میں تم اس طرح کی کتابوں سے کوئی حدیث نقل کر کے یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ وہ بعینہٖ اسی شکل میں بخاری یا مسلم کی کتابوں میں بھی موجود ہے، تا آں کہ تم دونوں کے الفاظ کا مقابلہ نہ کرلو یا یہ کہ خود تخریج کرنے والا اس کے متعلق یہ واضح کردے کہ اس کی ان ہی لفظوں کے ساتھ امام بخاری نے تخریج کی ہے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے امام شافعی پر احسان کیا ہے، اس ضمن میں ان کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے مختلف فیہ امور ومسائل کے متعلق صرف اپنے فقہی مسلک کی موید روایات واحادیث نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مذہب کی موید حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے۔

۷- امام بیہقی جرح وتعدیل کے بھی امام تھے، اس لیے اس میں اسانید ومتون کے متعلق مبسوط ومفصل کلام کیا گیا ہے اور احادیث ورجال کی قوت وضعف، جرح وعدالت صحت وسقم اور ترجیح وتضعیف وغیرہ کے متعلق بڑا وافر مواد جمع کر دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ناقدین ومبصرین فن کے اقوال خاص اہتمام سے منضبط کیے گئے ہیں، اس طرح اسناد ورجال اور روایات ومتون کے بارے میں اس کے اندر مختلف النوع مفید اور معلومات افزا وضاحتیں اور تصریحات آ گئی ہیں۔

۸- بعض کتب وابواب کے شروع مین ان کی مناسبت اور محل کے اقتضا کے لحاظ سے کلام مجید کی آیتیں اور حدیثوں کے ٹکرے بھی نقل کیے گئے ہیں جو معنی خیز ہونے کے علاوہ امام بیہقی کی وسعت علم ونظر اور قوت استدلال کا نمونہ بھی ہیں۔

۹- امام بیہقی نے احادیث کی مناسب توجیہ وتطبیق، ان کے مصالح وحکم، ان کی کسی خاص دلالت، ان سے ثابت ہونے والے مخصوص مسئلہ اور ان سے استدلال واستنباط کے کسی اہم نکتہ اور پہلو کا تذکرہ بھی کیا ہے، بعض بحثوں کے سلسلہ میں شارحین حدیث کے آرا اور اہل لغت کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، کہیں کہیں فنی اور اصطلاحی تشریحات بھی کی گئی ہیں، سنن بیہقی کے ان گوناگوں خصوصیات اور جامعیت نے اس کو حدیث کی امہات کتب کی صف میں جگہ دی ہے، درحقیقت یہ امام بیہقی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے سامنے ارباب کمال اور ائمہ سرنگوں نظر آتے ہیں، چنانچہ ان کو اعتراف ہے کہ متاخرین خصوصا چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں امام دارقطنی کے بعد ان پایہ اور مرتبہ کا کوئی اور

محدث نہیں گذرا ہے، علامہ ابن صلاح سنن کی عظمت واہمیت اور جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ماتم كتاب في السنة اجمع لـلا دلة من كتاب السنن الكبرى للبيهقي كانه لم يترك في سائر اقطار الارض حديثا الا وقد وضعه في كتابه۔ (۱)	دلائل کے لحاظ سے بیہقی کی سنن کبریٰ سے زیادہ جامع اور مکمل تصنیف حدیث وسنت کے ذخیرہ میں موجود نہیں گویا امام صاحب نے تمام حدیثوں کو چھان بین کر کے اس میں جمع کر دیا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تمام تر صحیح وثابت حدیثوں کا ہی ذخیرہ نہیں ہے، جب ضعیف اور غیر معتبر روایتوں سے حدیث کی مشہور ومتداول کتابیں بھی یکسر خالی نہیں ہیں تو اتنے ضخیم مجموعہ میں ضعیف اور کمتر درجہ کی حدیثوں کا شامل ہو جانا نہ تو تعجب انگیز ہے اور نہ اس سے سنن بیہقی کی اہمیت وعظمت میں کوئی فرق آسکتا ہے، امام بیہقی نے استقصاء تعدد طرق اور کثرت اسانید کے پیش نظر بھی ضعیف ومتروک حدیثیں درج کی ہیں اور امکان کی حد تک ان کے سقوط وضعف کی تصریح کر دی ہے۔

امام بیہقی کی اس عظیم الشان اور شہرۂ آفاق تصنیف کو پہلی دفعہ شائع کرنے کا فخر دائرۃ المعارف حیدر آباد کے حصہ میں آیا، دائرہ نے اس کو دس جلدوں میں (۱۳۴۴ھ تا ۱۳۵۶ھ) مختصر مفید حواشی کے ساتھ اہتمام سے شائع کیا ہے، ہر جلد کے آخر میں ابواب (مضامین) اور ناموں (راویوں) کے لحاظ سے دو مفصل فہرستیں دی گئی ہیں، ترتیب وتصحیح کی خدمت دائرہ کے مشہور رکن مولانا محمد ہاشم ندوی مرحوم نے اپنے بعض رفقائے کار کے تعاون سے انجام دی ہے۔

---

(۱) مقدمہ ابن صلاح

ان سب جلدوں کی تصحیح میں مصر، حضرموت، سندھ، مدراس، بمبئی اور رام پور وغیرہ کے نو قلمی نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

قاضی القضاۃ شیخ علاء الدین علی بن عثمان ترکمانی (م ۷۵۰ھ) نے سنن کا ایک ضخیم حاشیہ لکھا تھا، یہ الجواہر النقی فی الرد علی البیہقی کے نام سے موسوم اور سنن کے مطبوعہ نسخہ کے حاشیے پر دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا ہے۔

علامہ ترکمانی اپنے زمانہ کے مشہور حنفی فاضل تھے، فقہ واصول میں ماہر اور حدیث ورجال مین تبحر رکھتے تھے، الجواہر النقی میں انھوں نے سنن بیہقی پر بطریق معارضہ مناقشات اور بیہقی کے نقد ونظر اور رجال اور روایات کی تصحیح وتضعیف میں تساہل اور استدلال واستنباط کی بعض خامیوں کا تذکرہ اور اسی نوع کے بعض دوسرے تعقبات کئے ہیں، یہ حاشیہ دو حصوں میں ہے، ترکمانی کے بعض استدراکات اور تنقیدیں ضرور اہم ہیں لیکن بعض میں بحث وکلام کی گنجائش ہے، زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی نے ترصیع الجواہر النقی کے نام سے حروف معجم پر اس کی تلخیص کی تھی مگر وہ ناتمام رہ گئی تھی۔ (۱)

بیہقی وسنن بیہقی پر اعتراض: امام بیہقی پر کئے جانے والے اعتراضات میں تعصب اور شافعیت میں غلو کا اعتراض اہم اور قابل ذکر ہے، ان کے زمانہ میں شخصی تقلید کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی اور فقہی وجماعتی عصبیت میں بڑی شدت بھی پیدا ہوگئی تھی، چنانچہ بعض اکابر علما کی طرح ان کا دامن کمال بھی اس سے آلودہ نظر آتا ہے، ان کی کتابوں میں شافعیت کی پرزور وکالت اور امام شافعی سے پرجوش عقیدت بہت نمایاں ہوگئی ہے، اس حد تک بھی مضائقہ نہ تھا لیکن بعض مسائل میں ان کا رویہ انصاف اور حق پسندی پر مبنی نہیں معلوم ہوتا، علاوہ ازیں انھوں نے معرفۃ السنن والآثار میں حنفی مذہب کے ممتاز فقیہ ومجتہد امام طحاوی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ''انھوں نے بعض کمزور حدیثوں کو جو ان کی رائے کے موافق تھیں تصویب اور بعض صحیح

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۶ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۳۰۔

حدیثوں کی اپنی رائے ومسلک کے خلاف ہونے کی وجہ سے تردید کی ہے۔" یہ اعتراض بے جا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد میں امام طحاوی کے تذکرہ میں اس پر تبصرہ گذر چکا ہے۔

تاہم امام بیہقی نے سنن میں بعض جگہ شوافع کے مسلک اور امام شافعیؒ کے آرا کو مرجوح بھی قرار دیا ہے، کہیں کہیں امام شافعی کے ان اقوال کو صحیح اور اولیٰ قرار دیا ہے، جو متعارف اور مشہور قول کے خلاف ہوتے ہیں جیسے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امام شافعی مسح میں تکرار کے قائل تھے، لیکن امام بیہقی نے اس کی تردید کی ہے، بعض جگہ انھوں نے امام شافعی کے قول کی تردید کر کے ان کی جانب سے توجیہ پیش کی ہے، جیسے صیام عن المیت کے باب میں مختلف روایتیں اور حدیثیں بطور دلیل نقل کر کے ان کے قول کی تردید کی ہے، مگر آخر میں ان کی جانب سے یہ عذر بھی پیش کیا ہے کہ:

ولو وقف الشافعي رحمه الله على جميع طرقها ونظائرها لم يخالفها انشاء الله. (۱)	اور اگر امام شافعیؒ ان تمام حدیثوں کے طرق سے واقف ہوتے تو ان کی مخالفت نہ کرتے۔

اسی طرح انھوں نے سنن میں اپنے مسلک ومذہب کے مخالف اقوال اور دوسرے فقہا کے مذاہب کی موید حدیثیں بھی اسی فراخدلی کے ساتھ بیان کی ہیں، جس طرح خود اپنے مذہب ومسلک کی موید روایتیں نقل کی ہیں، یہ الگ بحث ہے کہ ان کے نزدیک روایات کا پایہ اور درجہ کیا ہے۔

☆☆☆

(۱) سنن بیہقی ج ۴ص ۲۵۷۔

حافظ ابن عبدالبر قرطبی

(متوفی ۴۶۳ھ)

نام و نسب: یوسف نام، ابوعمر و کنیت اور ابن عبدالبر عرفیت ہے، صحیح شجرۂ نسب یہ ہے:
یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم۔(۱)

ولادت: بروز جمعہ ۲۵ ربیع الآخر ۳۶۸ھ کو پیدا ہوئے۔(۲)

خاندان و وطن: ابن عبدالبر کا وطن قرطبہ ہے جو اندلس کا پایہ تخت اور دنیائے اسلام کا عظیم الشان اور ممتاز شہر ہے، گو آپ کا مولد بلاد مغرب ہے لیکن آباء واجداد عرب نژاد اور قبیلہ نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد بزرگوار ابومحمد عبداللہ (متوفی ۳۸۰ھ) قرطبہ کے اکابر علما وفقہا اور ممتاز لوگوں میں تھے، ان کو شعر وادب سے بھی شغف تھا،(۳) ابن عبدالبر کی نشوونما اسی صاحب کمال باپ کی آغوش میں ہوئی تھی، وہ وطن کی نسبت سے قرطبی اور خاندان کی نسبت سے نمری کہلاتے ہیں۔

اساتذہ: حافظ ابن عبدالبر نے جن ائمہ کمال سے استفادہ کیا تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوزکریا اشعری، ابوسعید نصر، ابوعمر باجی، ابوعمر طلمنکی، ابوالقاسم بن ابوجعفر، ابومحمد بن اسد، ابوالولید بن فرضی، ابراہیم بن نصر، ابوعمر احمد بن حسور، احمد بن فتح الرسان، احمد بن قاسم نزار، حسین بن یعقوب، خلف بن سہل، ابوالقاسم خلف بن قاسم، سعد بن نصر، سعید بن قزاز، ابوزید عبدالرحمٰن بن یحییٰ، عبداللہ بن محمد جہنی، ابومحمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمومن،

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۶ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۷ وتدریب الراوی ص ۲۶۱ (۳) الدیباج الذہب ص ۳۵۹۔

ابوعبداللہ محمد بن عبدالملک بن ضیغون، عبدالوارث بن سلیمان، یحییٰ بن وجہ الحیۃ۔

دور دراز کے حسب ذیل علما نے ان کو روایت حدیث کی اجازت تحریراً عطا کی تھی۔

ابوذر ہروی، ابوالفتح بن سی بخت، عبدالغنی منذری مصری، ابوالقاسم عبداللہ بن سقفی، مصری اور ابومحمد نحاس مصری وغیرہ ان کو حافظ ابوالولید بن فرضی کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا زیادہ موقع ملا، ان سے حدیث، رجال اور ادب وغیرہ علوم حاصل کئے۔(۱)

تلامذہ: ابن عبدالبر سے جن لوگوں نے استفادہ کیا تھا اُن کے نام یہ ہیں:

ابوالعباس والائی، ابوعبداللہ حمیدی، ابومحمد بن ابی قحافہ، ابواحمد جعفر بن حجاف (امیر بلنسیہ) ابوعلی حسین بن احمد غسانی، ابوبحر سفیان بن عاصی، ابوداؤد سلیمان بن ابوالقاسم مقری، ابوالحسن ظاہر بن مفوز، محمد بن فتوح انصاری۔(۲)

رحلت وروایت کی ابتدا: ان کے علم وفن کی تحصیل اور سماع حدیث کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کا پتہ نہیں چلتا، تاہم وہ اپنے معاصر خطیب کی ولادت کے وقت علم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو چکے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بچپن ہی میں اس فن کی تحصیل شروع کر دی تھی، بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ نہ اندلس سے باہر تشریف لے گئے اور نہ ان ستر علما کے علاوہ جو اس زمانہ میں یکتا تھے، کسی کو دیکھا اور نہ ان کے علاوہ کسی سے علم حاصل کیا لیکن صحیح یہ ہے کہ گو ان کا قیام عموماً زیادہ اندلس ہی میں رہا اور انھوں نے بلاد مغرب کے باہر قدم نہیں نکالا، مگر اندلس کے شرق وغرب اور مغرب کے اکثر شہروں میں تشریف لے گئے، چنانچہ مختلف وقتوں میں دانیہ، بلنسیہ اور شاطبیہ میں سکونت اختیار کی، ان پر علم کا شوق ہمیشہ مستولی رہا اور وہ کبھی علم کی طلب وتحصیل سے غافل نہیں ہوئے۔(۳)

(۱) کتاب الانساب ورق ۴۴۷ و ۵۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۷ والدیباج ج ۱ ص ۳۵۷ (۲) تذکرہ والدیباج، حوالہ سابقہ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷ وبستان المحدثین ص ۶۹۔

حفظ وضبط اور ثقاہت: علامہ ابن البر کے حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان پر محدثین اور علمائے فن کا اتفاق ہے، حفظ واتقان میں سرآمد روزگار اور تمام معاصرین سے فائق ہونے کی بنا پر حافظِ اندلس کہلاتے تھے، ابوالولید باجی فرماتے ہیں کہ اہل مغرب میں ان سے بڑھ کر نامور اور ممتاز حافظ حدیث کوئی اور نہ تھا، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ اندلس کی سرزمین میں وہ سنن ماثورہ کے سب سے بڑے حافظ تھے، اہل سیر نے ان کی توثیق وتعدیل کرتے ہوئے ان کو ثقہ وحجت بتایا ہے۔(۱)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: تمام علمائے فن نے حدیث میں ان کے کمال وامتیاز کا اعتراف کیا ہے، گو ان کو متعدد علوم سے مناسبت تھی لیکن زیادہ اور اصلی اشتغال وانہماک اسی فن سے تھا، اس لیے حدیث ورجال میں وہ نہایت ممتاز تھے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مغرب کے باہر قدم نہیں نکالا مگر اس کے باوجود بقول شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ان کا پایہ خطیب، بیہقی اور ابن حزم جیسے ارباب کمال واساطین فن سے کمتر نہیں تھا بلکہ وہ بعض حیثیتوں سے ان سب میں ممتاز تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ حدیث واثر کے حافظ اور ان کے متعلقہ علوم میں امام عصر تھے، ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ مکثر حفاظ میں تھے، نیز علم حدیث ورجال کے ممتاز عالم تھے، انھوں نے فن حدیث میں ایسی مہارت اور پختہ استعداد بہم پہنچائی کہ متقدمین میں علمائے اندلس پر گوئے سبقت لے گئے، ابوالولید باجی کا بیان ہے کہ اندلس میں ابوعمرو سے زیادہ حدیث میں کوئی بلند پایہ شخص نہیں تھا، صاحب دیباج رقمطراز ہیں کہ وہ علمائے اندلس کے شیخ اور محدث کبیر تھے، غسانی فرماتے ہیں کہ ابن عبدالبر کہتے تھے ہمارے شہر میں قاسم بن محمد اور احمد بن جلد حباب کے ہم پایہ اور ہمسر کوئی شخص نہیں، حالانکہ وہ خود ان لوگوں سے کمتر نہ تھے۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷ وبستان المحدثین ص ۶۹۔

حدیث میں ان کی عظمت و بلند پائیگی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صلاح اور نووی نے ائمہ صحاح کے بعد کے سات اہم اور برگزیدہ محدثین کی فہرست میں ان کا نام بھی لکھا ہے اور شاہ عبدالعزیزؒ نے مالکیہ میں ان کو سب سے بڑا صاحب کمال شارح حدیث قرار دیا ہے، ان کے علوے اسناد سے بھی ان کے کمال کا پتہ چلتا ہے، تمام محدثین نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں امامت فن کی طرح علوئے اسناد کا بھی ان پر خاتمہ ہو گیا، ان کے علوئے اسناد کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ (وکان سندہ مما یتنافس فیہ) یعنی ان کی سندیں، قابل رشک ہوتی ہیں، ان کے عوالی اسناد میں ابوداؤد کی سنن اور زعفرانی کی کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے، کیوں کہ ان کے اور مصنفین کے درمیان صرف دو ہی واسطے ہیں۔(۱)

رجال اور جرح و تعدیل میں امتیاز: حافظ ابن عبدالبر کی حدیث میں جلالت قدر کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے ماہر تھے، محدثین اور علمائے رجال نے حدیث کی طرح اسماء الرجال سے بھی ان کے شغف کا ذکر کیا ہے، ابوعبداللہ حمیدی فرماتے ہیں ''وہ علوم حدیث و رجال کے عالم اور قدیم السماع تھے۔'' محمد بن عبدالباقی زرقانی (م۱۰۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ وہ حدیث و رجال کے عالم تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی سند عالی اور وہ توثیق و تضعیف کے ماہر تھے، انھوں نے مؤطا کی جو شرحیں لکھی ہیں، ان سے ان کی حدیث اور جرح و تعدیل دونوں میں مہارت کا پتہ چلتا ہے، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ابن عبدالبر نے متن و سند کی تصحیح، مرسل و مسند کی تمیز موصول و منقطع میں تفریق اور ضعفا و ثقات میں امتیاز کر کے صحیح و سقیم کو پوری کوشش سے الگ کر دیا اور مخفی و مستور حدیثوں کا کھوج لگا کر ان کے علل کی نشاندہی اور اسقام و عیوب پر متنبہ کر دیا، مؤطا کے شروح میں سندوں کی وضاحت پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور مرسل و منقطع اور ملاقات مؤطا پر لطیف

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۳۲۵و ۳۲۶ و ابن خلکان ج ۳ص ۳۱۷و ۳۱۸ و الدیباج ص ۳۵۷، ۳۵۸۔

بحث وکلام کیا ہے۔(۱)

تفقہ واجتہاد: فقہ میں بھی نہایت ژرف نگاہ اور صاحب بصیرت تھے، ابوعلی غسانی فرماتے ہیں کہ ہمارے استاد ابن عبدالبر قرطبی نے اپنے وطن میں فقہ کی تحصیل کی اور اس میں نمایاں قابلیت اور بصیرت پیدا کی اور مشہور فقیہ ابوعمر احمد بن عبدالملک ابن ہاشم اشبیلی کی صحبت اختیار کی اور ان سے مسائل کی تحصیل کی ابن خلکان اور ذہبی نے علم حدیث واثر کی طرح فقہ میں بھی ان کے تقدم اور فقہی بصیرت کا ذکر کیا ہے، ابوعبداللہ حمیدی فرماتے ہیں کہ وہ فقیہ اور خلافیات کے عالم تھے۔

ابن عبدالبر اپنے فقہی کمالات کے اعتبار سے مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، حافظ سید عبدالحی کتانی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ ائمہ مجتہدین کے مقام ومرتبہ پر فائز تھے اور مالکی ہونے کے باوجود بعض مسائل میں دوسرے ائمہ کے ہمنوا اور بعض میں منفرد رائے رکھتے تھے۔(۲)

دیگر علوم: اوپر گذر چکا ہے کہ ابن عبدالبر تنہا فقہ وحدیث ہی میں ممتاز نہ تھے، بلکہ ان کو متعدد علوم وفنون سے مناسبت تھی، چنانچہ قرأت وتفسیر، تاریخ وانساب، سیر واخبار اور ادب وعربیت وغیرہ مختلف علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ علم انساب واخبار میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ذہبی نے ان کی عربیت، ادب اور معانی وبیان میں تبحر کا ذکر کیا ہے اور صاحب مطمح الانفس کا بیان ہے کہ فن ادب میں ان کا تبحر مسلم ہے۔(۳)

شعروسخن: شعروسخن کی طرف بھی میلان تھا، چند شعر ملاحظہ ہوں:

تذکرت من یبکی علیّ مداوما   فلم ار الاالعلم باالدین والخبر

---

(۱) تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۵ و ۳۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۰ و ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۵ و ۳۵۸ فہرس الفہارس ص ۴۰۰ (۲) ایضاً (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۸ ومطمح الانفس ص ۷۰۔

علـوم کتاب الله والسنن التی　　انت عن رسول الله مع صحة الاثر
وعلم الاولیٰ من ناقدیه وفهمنا　　لما اختلفوا فی العلم بالرای والنظر

(ترجمہ) میں نے اس چیز کو یاد کیا جو مجھ پر ہمیشہ بکا کرتی رہے تو دین وحدیث کے علم کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آئی یعنی اللہ کی کتاب اور رسولؐ اللہ سے بطریق صحت مروی حدیثوں اور نقادان فن کے علوم اور خود ہماری فہم وبصیرت ان چیزوں کے بارے میں جن کے علم میں لوگوں نے اختلاف رائے کیا ہے۔

یہ دو شعر بھی ان سے منسوب ہیں:

مـقالة ذی نصح وذات فوائد　　اذا من ذوی الالباب کان استماحها
عـلیکـم بـآثـار الـنبی فانـه　　من افضل اعمال الرشاد اتباعها

(ترجمہ) عقلمندوں کی پر موعظت اور فائدہ مند گفتگو کو سن لو، رسولؐ اللہ کے آثار وحدیث کی پیروی کو لازم سمجھو کیوں کہ تمام اعمال رشد سے بڑھ کر اس کا اتباع ہے۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں:

اذاهـان حـرعـنـدقوم اتـاهم　　ولـم یـنـأ عنهم کان اعمیٰ واجهلا
ولـم تـضـرب الامثـال الالعالم　　ومـاعوتب الانسان الالیعقلا (۱)

(ترجمہ) جب کوئی شریف آدمی کسی قوم کے نزدیک ذلیل ہو جائے اور پھر بھی یہ ان سے دور نہ ہو تو وہ اندھا اور جاہل ہے اور مثلیں تو عالم ہی کے لیے بیان کی جاتی ہیں اور انسان کو فہمائش ہی کے لیے جھڑکا جاتا ہے۔

اعتراف کمالات: علامہ ابن عبدالبر کی عظمتِ شان، بلند پائیگی اور علمی کمالات کا تمام معاصرین فضلاء، ائمہ فن اور ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے، ذہبی نے احدالاعلام اور

(۱) بستان المحدثین ص ۱۷۰۔

صاحب شذرات نے العلامۃ العلم لکھا ہے، سمعانی کا بیان ہے کہ وہ جلیل القدر امام فاضل تھے، صاحب تذکرہ نے ان کو الامام وشیخ الاسلام بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اندلس میں وہ بڑے عظیم مقام ومرتبہ کے مالک تھے، ان کی شہرت کا ساری دنیائے اسلام میں غلغلہ تھا، لوگ ان کے پاس سماع کے لیے سفر کر کے آتے اور تمام علمائے زمانہ ان کے علمی کمالات کے سامنے سرنگوں ہو جاتے، سید عبدالحی کتانی فرماتے ہیں کہ ان کی تصنیفات ان کی وسعتِ علم، قوتِ فہم اور ابتکارِ ذہن کا ثبوت ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ وہ بلادِ مغرب کے کبار اور منتخب علماء میں تھے، ان کا علمی پایہ خطیب، بیہقی اور ابن حزم سے کمتر نہیں تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات کی وجہ سے نہایت مقبول، مرجع انام، یگانہ روزگار اور امام وقت سمجھے جاتے تھے۔ (۱)

فقہی مذہب: بلاد مغرب کے اکابر وفضلا کی طرح وہ بھی امام دارالہجرت کے مکتب فقہ واجتہاد سے وابستہ تھے، عبدالحی کتانی لکھتے ہیں کہ وہ مالکی تھے اور مالکیہ کے لیے قابل فخر تھے، اوپر گذر چکا ہے کہ ان میں اجتہادی شان تھی، اس لیے مسائل میں آزادانہ غور وفکر کر کے مستقل رائیں رکھتے تھے، پہلے وہ اثری اور ظاہری تھے، پھر مالکی ہوئے اور آخر تک اسی پر قائم رہے مگر مالکی ہونے کے باوجود اس مذہب کے جامد مقلد نہ تھے، چنانچہ بعض مسائل میں وہ شافعیہ کے ہم نوا تھے، حافظ ذہبی اور ابوعبداللہ حمیدی وغیرہ نے امام شافعیؒ کے اقوال ومذاہب کی طرف ان کے میلان کا ذکر کیا ہے، ان کے اس میلان کی وجہ سے ابن کثیر نے ان کا طبقات الشافعیہ میں تذکرہ کیا ہے، ان کی بعض تصنیفات میں بھی شافعی مذہب کی جانب میلان کی جھلک موجود ہے، مثلاً مالک وشافعی کے اختلاف پر انھوں نے جو کتاب تالیف کی ہے، اس میں شافعی مذہب کی طرف ان کا رجحان نظر آتا ہے، اسی طرح

(۱) کتاب الانساب ورق ۴۴۷، العبر ج ۳ ص ۲۵۵ شذرات ج ۳ ص ۳۱۴ تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۴ فہرس الفہارس ص ۲۰۱ وبستان المحدثین ص ۶۹۔

رسالۂ الجہر یا بسملہ میں بھی انھوں نے شوافع کے مذہب کی تائید کی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ مالکی تھے، البتہ ان میں اجتہادی بصیرت تھی اور ان کا شمار صاحب اختیار فقہا میں ہوتا ہے، اسی لیے اپنے مذہب کے خلاف شوافع کی جانب ان کے میلانات کو قابل ردو انکار نہیں قرار دیا گیا ہے، سید عبدالحی کتانی لکھتے ہیں کہ ابن عبدالبر کی تصنیفات کے تتبع واستقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندھی تقلید سے دور تھے اور امام مالکؒ کے مذہب واصول سے مراجعت کر کے اپنے اعتماد پر کوئی قول اختیار کرتے تھے۔(۱)

عہدۂ قضا: فقہی جامعیت اور اجتہادی بصیرت کی وجہ سے محکمۂ قضا بھی ان کے سپرد کیا گیا، چنانچہ مظفر ابن افطس کے زمانۂ امارت میں وہ اشبونہ اور دشنترین کے قاضی رہے۔(۲)

امرا و وزرا سے تعلقات: امرا وسلاطین سے تعلقات بھی تھے اور ان کے ہدایا وتحائف ابن عبدالبر کے پاس آتے تھے، شاطبیہ کے زمانۂ قیام میں کچھ لوگوں نے سلطان کے دسترخوان پر کھانا کھانے اور اس کے ہدایا وتحائف قبول کرنے کی وجہ سے اعتراض کیا تو انھوں نے اس کے رد میں اشعار کہے اور متعدد صحابۂ کرام، تابعین اور فقہائے امصار کا اس کے متعلق طرز عمل بیان کر کے واضح کیا کہ یہ حضرات بھی امرا وسلاطین کے تحائف قبول کرتے تھے۔(۳)

تدین: علم وفضل کی طرح ورع وتدین میں بھی ممتاز تھے، مورخین نے ان کے صدق دیانت، حسنِ عقیدہ، عفت، پاکدامنی اور اتباع سنت کا ذکر کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ جو صدق ودیانت، حسن عقیدہ اور اتباع سنت ان کے حصہ میں آیا وہ کسی اور کے حصہ میں کم آیا ہے۔(۴)

---

(۱) تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶ وبستان المحدثین ص ۷۰ وفہرس الفہارس ص ۲۰۱ و ۲۰۲ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۲۱۸ وتذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶ (۳) نفح الطیب ص ۱۶۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وبستان المحدثین ص ۶۹ و ۷۰۔

ابتلا و آزمائش: حافظ ابن عبدالبر کو ابتلا و آزمائش سے بھی دوچار ہونا پڑا، چنانچہ وہ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر اندلس اور مغرب کے دوسرے علاقوں میں چلے گئے، ابن خلکان اور صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ:

رحل عن وطنه في الفتنة	فتنہ کے وقت وہ اپنے وطن سے رحلت
فجال الغرب الاندلس۔ (۱)	کر کے مغربی اندلس چلے گئے۔

لیکن اس کی مزید تفصیل معلوم نہیں ہوسکی کہ ان کو کس بنا پر ابتلاء کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

وفات: اسی غریب الوطنی میں اندلس کے ایک شہر شاطبیہ میں داعیِ اجل کا پیغام آ گیا اور ۹۵ رسال سے زیادہ عمر میں جمعہ کا دن گذار کر ربیع الآخر کی آخری تاریخ کو ۴۶۳ھ میں انتقال ہوا۔(۲) اِنَّالِلّٰهِ وَاِنَّـا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

اولاد: آپ کی اولاد میں ابو محمد عبداللہ بن یوسف کا ذکر ملتا ہے، یہ بھی ذی کمال اور صاحب تصنیفات تھے، اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ یہ ادب و بلاغت کے فن کے عارف اور شاعر تھے، سن وفات ۴۸۰ھ بتایا جاتا ہے۔(۳)

تصنیفات: وہ ممتاز اور بلند پایہ مصنف تھے، تصنیف و تالیف کا ان کو فطری اور عمدہ ذوق تھا، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ”تصنیف و تالیف میں توفیقِ الٰہی اور تائیدِ ایزدی ان کے شامل حال تھی۔“ اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے بڑا فائدہ پہنچایا“ علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ ”ان کی کتابیں مختلف حیثیتوں سے اہم اور بے مثال ہیں، حافظ ابن کثیر رقم طراز ہیں کہ ”ابن عبدالبر عمدہ اور عظیم الشان کتابوں کے مصنف تھے۔“(۴) سید عبدالحی کتانی

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۷ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶، العبر ج ۳ ص ۲۵۵، ابن خلکان ج ۳ ص ۴۲۱ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۴۲۱ (۴) ایضاً و نفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و البدایۃ ج ۱۲ ص ۱۰۴۔

لکھتے ہیں کہ وہ عدیم النظیر مصنف تھے، ان کی تصنیفات کو بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱-البستان فی الاخدان، ۲-البیان عن تلاوۃ القرآن یا البیان فی تاویلات القرآن (۱)، ۳-کتاب اخبار ائمۃ الامصار (سات جزوں کے بقدر)، ۴-اختصار تاریخ احمد بن سعید، ۵-اختصار التحریر، ۶-اختصار التمییز لمسلم، ۷-کتاب اختلاف اصحاب مالک ابن انس واختلاف روایاتہم عنہ (چوبیس جزوں میں)، ۸-کتاب الاستظہار فی حدیث عمار، ۹-کتاب الشواہد فی اثبات خبر الواحد (ایک جز میں)، ۱۰-کتاب الفرائض، ۱۱-کتاب المدخل فی القراآت یا کتاب التجوید والمدخل الی علم القراآت بالتجرید (۲ جزوں میں)، ۱۲-فہرست الشیوخ۔

۱۳-کتاب جمہرۃ الانساب: یہ عربی قبائل وانساب کے بیان میں ہے۔ (۲)

۱۴-الاحتیال بمافی شعر ابی العتاہیۃ من الامثال، کتب خانہ شیخ الاسلام (مدینہ) میں اس کا قلمی نسخہ ہے۔ (۳)

۱۵-الاجوبۃ المرعیۃ علی المسائل المستغربۃ من صحیح البخاری بھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں صحیح بخاری کے مشکلات حل کیے گئے ہوں گے۔

۱۶-کتاب العقل والعقلا: موضوع نام سے ظاہر ہے، اس میں عقل اور عقلا کے بارے میں علما، حکما کے ملفوظات ایک جزو میں درج ہیں۔

۱۷-کتاب الکنیٰ: اس میں ان رواۃ کا ذکر ہے جو ناموں کے بجائے کنیتوں سے مشہور ہیں، اسی لیے بعض لوگوں نے اس کا نام کتاب اسماء المعروفین بالکنیٰ لکھا ہے، یہ سات جزوں میں ہے۔

۱۸-کتاب الاکتفاء فی قرأۃ نافع وابی عمرو: اس میں قرائے سبعہ کے ان دونوں

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۲۱۸ (۳) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۶۳۔

ائمہ کے اختلافات کی توجیہ اوران کے دلائل بیان کئے گئے ہیں، یہ ایک جز میں ہے۔

۱۹- کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر: اس میں رسول اللہ (ﷺ) کے حالات اورغزوات کے واقعات تحریر کئے گئے ہیں، یہ دراصل ابن اسحاق وابنِ عقبہ کی کتابوں کا خلاصہ ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے(۱) اور اب شائع بھی ہو چکی ہے۔

۲۰- کتاب بہجۃ المجالس وانس المجالس: اس میں ادب ومحاضرات کی بلند پایہ کتابوں سے نادر واقعات، دلچسپ حکایتیں، منتخب اشعار اور حکیمانہ اقوال جمع کئے گئے ہیں، ایک سو چوبیں ابواب (۲) پر مشتمل یہ رسالہ دو یا تین جلدوں میں ہوگا، ابن خلکان نے اس کتاب کے مندرجہ ظریفانہ واقعات نقل کئے ہیں، اس کے بعض اجزا چھپ گئے ہیں۔

۲۱- کتاب الکافی: صاحبِ کشف الظنون نے اس کا نام کافی فی فروع المالکیہ لکھا ہے، یہ فقہ مدینہ اورمذہب مالکی کے فروع وجزئیات میں ایک مبسوط کتاب ہے جو پندرہ یا سولہ جزوں پر مشتمل ہے، اس میں ان باتوں کا ذکر ہے، جن کی معرفت مفتی کے لیے ضروری ہے، مدینہ کے کتب خانہ سیدنا عثمانؓ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ (۳)

۲۲- القصد والامم: پورا نام القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم ومن اول تکلم بالعربیۃ من الامم ہے، اس سے موضوع کا پتہ چل جاتا ہے، یعنی بعدِ وطن، مرورِ ایام اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے عربی وعجمی قبائل واقوام کے حسب ونسب میں گڈمڈ اور خلط ملط ہو جانے کا ذکر ہے، (۴) ابتدا میں یہ بحث کی گئی ہے کہ سب سے پہلے کس شخص نے عربی میں بات چیت کی، یہ رسالہ ۱۳۵۰ھ میں قاہرہ سے چھپا ہے۔

۲۳- الانباہ علی قبائل الرواۃ: یہ دراصل استیعاب کا دیباچہ ہے، اس میں ان اہم

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۵ ص ۵۳ وتذکرۃ النوادر ص ۸۰ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ (۳) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۴۷ (۴) مقدمہ القصد والامم۔

قبائل کا ذکر ہے جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت واتصال اور روایت کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ اس میں انھوں نے مندرجہ ذیل اصحاب کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

۱-ابوبکر محمد بن اسحاق، ۲-ابومنذر ہشام بن محمد بن سائب کلبی، ۳-ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ، ۴-محمد بن عبدہ بن سلیمان، ۵-محمد بن حبیب، ۶-ابوعبداللہ احمد بن محمد بن عبید عدوی، ۷-زبیر بن بکار، ۸-مصعب بن عبداللہ زبیری، ۹-علی بن کیسان کوفی، ۱۰-علی بن عبدالعزیز جرجانی، ۱۱-عبدالملک بن حبیب اندلسی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب بڑی محنت ومطالعہ کا نتیجہ ہے، اس میں مذکورۂ بالا حضرات کے اقوال کے علاوہ احادیث وآثار اور اہل اخبار وسیر کے بیانات بھی شامل ہیں، (۱) اور عرب کے مختلف قبائل کے انساب اور علم انساب کی اہمیت کا تذکرہ کیا گیا ہے، القصد والامم کے ساتھ یہ کتاب بھی ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی ہے، جلال الدین سیوطی نے اس کا ذیل لکھا تھا۔ (۲)

۲۴-الانصاف فیما فی بسم اللہ من الخلاف: اس میں بسم اللہ کے متعلق صحابہ وتابعین، ائمہ سلف اور فقہا کے مذاہب، ان کے مسالک واختلافات نقل کیے گئے ہیں کہ وہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ اور نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اس کو بھی پڑھنا چاہیے یا نہیں اور اگر پڑھنا چاہیے تو زور سے یا آہستہ سے، نیز وہ تمام قرآنی سورتوں کی آیت ہے یا صرف سورۂ نمل کی؟ مصنف نے ان امور کے متعلق تین مستقل مذاہب تحریر کیے ہیں، کہیں کہیں ان مذاہب کے جزوی اختلافات کا ذکر بھی آ گیا ہے، ہر ہر مذہب کے دلائل اور اس کی مؤید حدیثیں بھی جمع کی گئی ہیں، اس سے مصنف کی غیر جانب داری کا اندازہ ہوتا ہے، یہ رسالہ ۱۳۴۳ھ میں مصر سے شائع ہوا تھا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب ہذا (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۵۳۔

۲۵- الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء ومالک والشافعی وابی حنیفہ: یہ فقہ اسلامی کے ائمہ ثلاثہ کے فضائل ومناقب اور اوصاف وکمالات کا مجموعہ اور تین جزوں پر مشتمل ہے، پہلے جز میں امام مالک کا دوسرے میں امام شافعی کا اور تیسرے میں امام ابوحنیفہ کا تذکرہ ہے، مصنف نے ان اساطینِ فقہ کے تذکرہ میں ضمناً ان کے نامور تلامذہ اور ممتاز اصحاب کا بھی مختصر تذکرہ شامل کر دیا ہے، یہ رسالہ مکتبہ قدسی قاہرہ سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا ہے، شروع میں مصنف کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔

۲۶- جامع بیان العلم وفضلہ: یہ علم کی حقیقت، علما کی فضیلت وعظمت اور ان کے فرائض وغیرہ کے متعلق ایک اور جامع کتاب ہے، اس میں طلب علم کی اہمیت اس کے ضروری آداب، طلبہ، شیوخ اور علماء کے اوصاف اور دین میں علم ونظر، فکر واستدلال، قیاس واجتہاد، فہم وبصیرت اور دلیل وبرہان کی ضرورت اور تقلید واتباع کا فرق واضح کیا گیا ہے اور بحث ومباحثہ، قیاس ورائے اور تقلید کی مختلف قسموں پر گفتگو کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کی کون سی صورتیں پسندیدہ اور کون سی ناروا اور ناپسندیدہ ہیں، مصنف نے ان امور کے متعلق روایات وآثار اور سلفِ صالحین کے اقوال کا عمدہ ذخیرہ جمع کر دیا ہے اور روایتوں کی صحت وسقم اور سندوں کی قوت وضعف پر فنی کلام بھی کیا ہے، یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی، احمد بن عمر محمصانی بیروتی ازہری نے اس کا مختصر شائع کیا ہے، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایما سے اس مختصر کا اردو ترجمہ کر کے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کیا تھا، اس کے مقدمہ میں انھوں نے اسلام سے پہلے اور بعد کی علمی حالت، اسلام میں علم کی اہمیت اور مسلمانوں کے علم وفن میں اشتغال وانہماک کا ذکر کیا ہے۔

علامہ ابن عبدالبر نامور محدث تھے، خصوصاً حدیثوں کی شرح وتوجیہ میں وہ بڑے ممتاز سمجھے جاتے ہیں، مالکیہ میں اس پایہ کا اور کوئی شارح حدیث نہیں گذرا، انھوں نے مؤطا امام مالک کی کئی شرحیں لکھی تھیں، ذیل میں ان شرحوں کے متعلق معلومات درج کیے

جاتے ہیں۔

۲۷- کتاب الاستذکار: اس کا پورا نام الاستذکار بمذاہب علماء الامصار فیما تضمنہ الموطا من معانی الرای والآثار ہے، یہ مصنف کی عظیم الشان شرح تمہید کا خلاصہ اور اسی طرح شروحِ حدیث میں بڑی اہم کتاب خیال کی جاتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

> "یہ موطا کی بہترین اور عمدہ شرحوں میں ہے، اس کے ابواب کی تنسیق میں بڑی فنی مہارت سے کام لیا گیا ہے اور مختصر ہونے کی وجہ سے نہایت مقبول ومتعارف ہے۔" (۱)

مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ اور سیدنا عثمانؓ کے علاوہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ (۲)

۲۸- التقصی لحدیث الموطا، ۲۹- التقصی بحدیث الموطاء: بعض لوگوں نے ان دونوں کو ایک ہی تصنیف قرار دیا ہے لیکن یہ دو مستقل کتابیں معلوم ہوتی ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا بیان ہے کہ التقصی موطا کی احادیث مسند ومتصل کے انتخاب وترتیب وبیان اور التقصی موطا کی منقطع، مرسل، منفصل اور بلاغات کے وصل ورفع واسناد پر مشتمل ہے، (۳) صاحب کشف الظنون کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (۴)

التقصی امام مالک کے شیوخ کے ناموں پر مرتب کی گئی ہے، باجی اور ابوعمران فارسی نے اس کو قابسی کے ملخص پر ترجیح دی ہے، مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ (۵)

---

(۱) بستان المحدثین ص ۷۰ (۲) مقالات سلیمان جلد دوم ص ۳۷۰ و ۳۷۴ و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر جلد اص ۲۶۷ (۳) حیات امام مالک ص ۱۰۳ و ۱۰۵ (۴) کشف الظنون جلد دوم ۲۵۷ (۵) مقالات سلیمان جلد دوم۔

التغطا کے متعلق کتانی نے لکھا ہے کہ یہ مرسل، منقطع اور معضل روایات کے وصل میں ہے، موطا میں جو حدیثیں بلغنی عن الثقۃ کہہ کر مسند بیان کی گئی ہیں، ان کی تعداد اکسٹھ ہے، ان میں سے چار کے علاوہ سب دوسرے طرق سے مروی ہیں۔ (۱)

۴/۳۰- یہ کتاب التمہید کا دیباچہ یا مختصر ہے جو ۱۳۵۰ھ میں مکتبہ قدسی قاہرہ سے چھپی ہے، اس کا نام ٹائیٹل پر ''تجرید التمہید لمافی المؤطاء من المعانی والاسانید او التقصی لحدیث المؤطاء وشیوخ مالک'' درج ہے اور ناشر نے اس کو تمہید کا خلاصہ بتانے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا دوناموں تجرید التمہید او التقصی سے موسوم کیا جانا عجیب نہیں ہے کیوں کہ پہلے زمانہ میں مصنفین عموماً اسی طور پر نام رکھتے تھے۔ (۲)

اس بیان سے یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ تمہید اور تقصی ایک ہی کتاب ہے، کیوں کہ تجرید کے مقدمہ سے بداہتاً ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہید کا مقدمہ یا خلاصہ ہے چنانچہ مصنف لکھتے ہیں:

> ''تمہید کی طوالت کی وجہ سے ہم نے مؤطا کی احادیث وسنن کو اس میں علاحدہ جمع کر دیا ہے اور مسند، مرسل، متصل ومنقطع کو ممیز کر دیا ہے، کیوں کہ یہ سب امام مالک اور ان کے اتباع کے نزدیک حجت وواجب العمل ہیں، پس اس کو کتاب التمہید کا ایک ایسا آسان مدخل (مقدمہ) خیال کرنا چاہیے جس میں امام مالک کے رواۃ کے وصل وارسال پر مختصراً تنبیہ کی گئی ہے۔'' (۳)

اس کی ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے اور اس میں امام مالک کے شیوخ کے نام ونسب، کنیت، سنین وفات، روایت میں ان کا درجہ، ضبط وثقاہت ان سے امام مالک کی مرویات کی تعداد، حدیثوں کے رفع واتصال اور وقف وانقطاع اور اسناد وارسال پر بحث کی گئی ہے اور حدیثوں کا متن بھی دیا گیا ہے اور آخر میں بلاغات ومراسیل کا علاحدہ باب ہے

(۱) الرسالۃ المستطرفہ ص۱۴و۱۵ (۲) تجرید ص۳ (۳) ایضاً ص۱۰و۱۱۔

مطبوعہ نسخہ کے اخیر میں تمہید کے بعض اجزا بھی شامل کئے گئے ہیں۔

امام مالک کے رواۃ کے متعلق تجرید ایک عمدہ کتاب ہے۔

۵/۳۱۔ التمہید لمافی الموطا من المعانی والاسانید: یہ موطا کی ضخیم اور عظیم الشان شرح ہے، اس کو حدیث کی عمدہ اور بہترین شرحوں میں خیال کیا جاتا ہے، اسی کی بدولت حافظ ابن عبدالبر کو ممتاز محدث اور مالکیہ میں سب سے بلند پایہ شارح حدیث قرار دیا گیا ہے، ابن خلکان نے اس کو ستر جزوں پر مشتمل بتایا ہے، بعض علما کا خیال ہے کہ یہ پندرہ یا بیس جلدوں میں تھی، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان بیانات سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ "فقہ حدیث میں ایسی عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔"

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "ابن عبدالبر سے پہلے کسی نے ایسی عظیم الشان کتاب نہیں لکھی تھی۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب رقم طراز ہیں "یہ فقہ حدیث میں نادرۂ روزگار اور روشن ضمیر مجتہدوں کے لیے سرمہ بصیرت ہے، مذہب مالکی کے متعلق تنہا یہی کتاب کافی ہے۔"(۱)

مولانا محمد سورتی مرحوم اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں "شروح حدیث میں ابن عبدالبر کی قابل قدر اور بہترین کتاب ہے جس کی نظیر اب تک کوئی شرح نہیں دیکھی گئی، ابن حزم نے اس کی بے حد تعریف کی ہے اور یہ اس کا استحقاق بھی رکھتی ہے...... یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب اور اعلیٰ ترین علمی کارنامہ ہے۔"(۲)

اس کی ترتیب بھی امام مالک کے رواۃ اور شیوخ کے ناموں پر کی گئی ہے اور اس میں موطا کی حدیثوں کی تشریح، ان کے معانی و مطالب کی وضاحت اور ان کی اسانید کی

(۱) نفح الطیب ج ۳ ص ۱۳۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و ابن خلکان ج ۳ ص ۲۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷ و بستان المحدثین ص ۲۹ (۲) معارف فروری ۳۲ء۔

تحقیق کے علاوہ فقہ وحدیث کے گوناگوں فوائد ونکات تحریر کیے گئے ہیں، مصنف کا خود بیان ہے کہ:

''ہم نے تمہید میں سنن وروایات کے معانی ووجوہ اور ان کی بابت علما کے آرا ومذاہب تفصیل سے لکھے ہیں، اس لیے یہ شرح بہت طویل ہوگئی ہے، علاوہ ازیں اس میں شواہد وادلہ کی کثرت ہے، شروع میں امام مالک کے فضائل وکمالات، نقل وروایتِ حدیث میں ان کی احتیاط اور چھان بین اور حدیث کے اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں، مؤطا کے مراسیل کا وصل بھی ثقہ راویوں کے طرق سے بیان کردیا گیا ہے، تاکہ مراسیل کی صحت پوری طرح ظاہر ہوجائے۔''(۱)

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ ''اس ترتیب وتصحیح میں ابن عبدالبر نے مؤطا کے بارہ مستند اور مشہور نسخوں سے مدد لی تھی،''(۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کتنی جانفشانی اور کس قدر اہتمام سے یہ شرح لکھی تھی۔

تجرید کے مطبوعہ ایڈیشن کے آخر میں اس کے جو اجزا شائع کیے گئے ہیں، ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بڑی مفید محققانہ اور معلومات افزا شرح ہے، مگر غالباً ابھی تک یہ بے نظیر شرح شائع نہیں ہوئی ہے، تمہید کے قلمی نسخے ہندوستان، حجاز اور مصر کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں مگر وہ ناقص ہیں۔

تمہید کی اہمیت اور ضخامت کی وجہ سے اس کے مختصرات لکھے گئے ہیں خود مصنف نے استذکار وتجرید کے نام سے اس کے دوخلاصے لکھے تھے، جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے صاحب کشف الظنون نے ابوالولید، سلیمان بن خلف باجی (م ۴۷۴ھ) شیخ زین الدین عمر حلبی اور ابوعلی حسن ابن رشیق قیروانی (م ۴۵۶ھ) کے مختصرات کا ذکر کیا ہے۔(۳)

تجرید ص ۹ و ۱۰ (۲) مصفی ص ۷ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۳۔

۳۲- الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: یہ نہایت مفید اور اہم کتاب ہے اور مغرب کی طرح بلادِ مشرق میں بھی اس کا آوازہ شہرت پوری طرح بلند تھا اور لوگ اس کو بڑی قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس میں ۲۵۸۵ صحابہ کرام کے حالات و مناقب بیان کیے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی صحابہؓ کرام کے حالات میں کئی مستقل کتابیں لکھی جا چکی تھیں مگر استیعاب کو ان میں یک گونہ اہمیت حاصل ہے، اہل فن کے نزدیک طبقات صحابہ میں ابوعبداللہ بن مندہ، حافظ ابونعیم اور قاضی ابوعمر بن عبدالبر کی کتابیں زیادہ مشہور و مقبول خیال کی جاتی ہیں جو متاخرین کی کتابوں کا مآخذ ہیں۔"

علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۳۰ھ لکھتے ہیں:

> "صحابہ کے حالات میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر سب میں جامع ابن مندہ، ابونعیم اور ابن عبدالبر قرطبی کی کتابیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے ان کی تصنیفات عمدہ اور سعی بلیغ کا نتیجہ ہیں...... اس لیے میں نے ان کے مواد و محتویات کو یکجا کر کے ان میں بعض اضافے کرنے کا ارادہ کیا ہے۔"(۱)

حافظ ذہبی ابن اثیر کی کتاب کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "اسد الغابہ ان تمام صحابہ کے ناموں پر مشتمل ہے جو معرفت صحابہ میں لکھی جانے والی چاروں کتابوں میں مذکور ہیں، یہ ابن مندہ اور ابوعمر بن عبدالبر کی کتابوں کا ذیل ہونے کے باوجود بعض اہم اور مفید اضافوں پر مشتمل ہے۔"(۲)

اس موضوع کی عظیم الشان اور معرکۃ الآرا کتاب حافظ ابن حجر کی الاصابہ فی تمییز الصحابہ ہے جو بعد میں لکھی جانے کی وجہ سے بڑی جامع اور مکمل ہے، تاہم قدما کی تصنیفات خصوصاً ابن عبدالبر کی کتاب اس کا ماخذ ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

(۱) مقدمہ اسد الغابہ ص۳و۴ (۲) تجرید اسماء الصحابہ ص۲و۳۔

جمع فیہ مافی الاستیعاب وذیلہ۔ (۱) | جو کچھ استیعاب میں ہے اصابہ اس کی جامع بھی ہے اور اس پر ذیل بھی۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ معرفت صحابہ میں لکھی جانے والی اہم کتابوں میں استیعاب بھی ہے، بلکہ ابن مندہ اور ابو نعیم کی کتابوں پر اس کو یک گونہ ترجیح بھی حاصل ہے، علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ ''معرفت صحابہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں لیکن متقدمین میں کسی کی کتاب ابن عبدالبر کی کتاب کے ہم پایہ نہیں ہے۔'' باجی سے منقول ہے کہ اس موضوع پر کوئی کتاب استیعاب کے برابر نہیں ہے، ابن خلکان اور صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ ''اس فن میں یہ مفید اور بلند پایہ کتاب ہے۔''(۲)

دوسرے متقدمین کی طرح اب ابن مندہ اور ابو نعیم کی کتابیں بھی معدوم اور ناپید ہیں مگر ابن عبدالبر کی کتاب موجود ہے، اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ابن اثیر اور حافظ ابن حجر کی کتابیں جو محفوظ رہ گئی ہیں، بڑی اہم اور جامع ہیں، تاہم استیعاب کو زمانی تقدم حاصل ہے۔

ترتیب: استیعاب کو حروف معجم کی ترتیب کے مطابق علاحدہ علاحدہ ابواب پر مرتب کیا گیا ہے لیکن مصنف کا تعلق بلاد مغرب سے ہے اور اہل مغرب کے یہاں حروف معجم کی ترتیب اہل مشرق سے مختلف ہے، اس لیے اس میں اسی کا لحاظ کیا گیا ہے، پہلے ناموں اور کنیتوں کے لحاظ سے صحابہ کرام کا اور آخر میں ناموں اور کنیتوں کے اعتبار سے صحابیات کا ذکر ہے، ہر حرف کے خاتمہ کے بعد جداگانہ فصل قائم کر کے اسی حرف کے باقی ماندہ اسماء کو بلا ترتیب باب الافراد کے عنوان کے تحت جمع کیا ہے۔

صحابہ کرام سے پہلے شروع میں مصنف نے تبرک کے خیال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مختصر اور جامع تذکرہ لکھا ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج۱ص ۱۱۰ (۲) وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷۔

مقصد تصنیف: ابن عبدالبر نے استیعاب کی تصنیف کی یہ وجہ لکھی ہے:

''کتاب اللہ کی مراد کو واضح کرنے کا اصل ذریعہ اور اس کے بعد سب سے اہم اور مقدس چیز سنن نبوی کا علم ہے اور سنت کے حفظ وضبط میں سب سے زیادہ مفید ومعاون چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری وصحابہ کی معرفت ہے، کیوں کہ انھیں لوگوں کے نقل وبیان سے سنتیں ہم تک پہنچی ہیں، پس یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان واسطہ ہیں ان کی فضیلت، تعدیل اور تزکیہ کا خود خدا اور رسول نے ذکر کیا ہے۔''(۱)

شرائط: صحابی کی تعریف میں محدثین اور علما کا اختلاف ہے، مصنف نے جس معیار اور شرط کے مطابق صحابہ کے ناموں کو اس میں جمع کیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''صحابی کی تعریف میں ہم نشینی ...... صحبت اور مجالست وغیرہ کی جو قید بیان کی گئی ہے، ہم نے اس پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں مزید وسعت دے کر ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا ہے، جنھوں نے حالتِ ایمان میں آپ سے ملاقات کی تھی، خواہ ان کی ملاقات ایک ہی دفعہ کی رہی ہو، اسی طرح جن لوگوں نے آپ کو ایک بار دیکھا تھا یا آپ سے کوئی ایک لفظ سن کر بیان کیا ہے اور یہ اصول روایت کے مطابق ہم تک پہنچا ہے یا جو لوگ آپ کے عہد میمون میں مسلمان والدین کے یہاں پیدا ہوئے اور آپ نے ان کو دیکھ کر ان کے لیے خیر وبرکت کی دعا فرمائی یا جن لوگوں نے آپ پر ایمان لا کر آپ کی خدمت میں صدقات بھجوائے مگر خود آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے، ان سب کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔''(۲)

خصوصیات: استیعاب کی بعض نمایاں اور اہم خصوصیات یہ ہیں:

(۱) مقدمہ استیعاب ج ۱ ص ۱ و ۹ (۲) ایضاً ص ۱۰ و خاتمہ ج ۲ ص ۸۰۶۔

۱- قدما کی کتابوں کی غیر ضروری تفصیل اور واقعات کے تکرار نے صحابہ کے صحیح مقام و مرتبہ، ان کے اصلی واقعات و کارنامے اور حقیقی فضائل و کمالات کو اوجھل کر دیا ہے لیکن استیعاب میں اختصار کے باوجود ضرور نکات اور مفید مباحث ہی درج کیے گئے ہیں تا کہ قاری غیر متعلق بحثوں میں الجھے بغیر اصل مقصود سے خاطر خواہ واقف ہو جائے۔

۲- یہ ان کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، جو اس سے پہلے لکھی گئی تھیں مگر اختصار کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ان طویل و ضخیم کتابوں کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، اس اعتبار سے قدما کی ناپید کتابوں کی اس سے تلافی ہو گئی ہے، اس میں ان کے مختلف بیانات نقل کر کے مشہور و مرجح قول کی تعیین و تصریح بھی کی گئی ہے۔

۳- گو اس کتاب کا اصل مقصد صحابہ کرام کے سادہ واقعات زندگی بیان کرنا ہے تاہم اس ضمن میں ان کے انساب و احساب کے متعلق معلومات اور روایات و اسناد پر اصول روایات کے مطابق محققانہ بحث و کلام بھی کیا گیا ہے وہ خود لکھتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرام کے ناموں اور اہم واقعات کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ ان سے واقف ہو جانے کے بعد علم و معرفت حدیث میں بھی پورا درک حاصل ہو سکتا ہے کیوں کہ اس میں مرسل و مسند وغیرہ کے متعلق مفید معلومات ہیں۔(۱)

۴- استیعاب نہایت معتبر و مستند کتاب ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ میں نے اس کی تالیف میں علمائے سیر و انساب کے مشہور اقوال کو نقل کرنے میں ان معروف و معتبر کتابوں پر اعتماد کیا ہے، جن پر علما نے اسلامی عہد کے وقائع و احوال اور اہل اسلام کے سیر و سوانح کی معرفت کے سلسلہ میں اعتماد کیا ہے، اسی طرح اس میں پہلے کی تمام کتابوں یا سماعی روایات سے جو کچھ مصنف کو معلوم ہو سکا اس کو تحقیق و انتخاب کے بعد شامل کیا ہے، مصنف نے مقدمہ میں ان تمام کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ان کا ماخذ تھیں، اس سے اُن کی محنت

(۱) خاتمہ ج ۲ ص ۸۰۶۔

تحقیق اور وسعتِ علم ونظر اور کثرتِ مطالعہ وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعد میں یہ تمام کتابوں کا ماخذ بن گئی ہے۔

تلخیصات وذیول: استیعاب کی اہمیت کی وجہ سے اس کے مختصرات وذیول بھی لکھے گئے اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے بھی کیے گئے، بعض خلاصوں کے نام یہ ہیں۔

۱- شہاب الدین احمد بن یوسف بن ابراہیم اذرعی مالکی نے روضۃ الاحباب فی مختصر الاستیعاب لکھا۔(۱)

۲- محمد بن یعقوب بن محمد بن احمد خلیلی نے اعلام الصحابہ باعلام الصحابہ کے نام سے اختصار وتلخیص کی۔(۲)

۳- شیخ ابومحمد زکی الدین بن عبدالقوی منذری شافعی مصری (م ۶۵۶ھ) نے استیعاب کے مختصر کا مختصر لکھا، اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔(۳)

۴- ابن ابی طی یحییٰ بن حمیدہ حلبی (م ۶۳۰ھ) نے استیعاب کی تہذیب وتنقیح کی تھی۔

۵- سلطان احمد خاں عثمانی نے اپنے امام مولیٰ مصطفیٰ کو اس کے ترجمہ کا حکم دیا لیکن وہ حرف ح تک مکمل کرنے کے بعد انتقال کر گئے، ان کے بعد مولیٰ کمال الدین محمد بن احمد المعروف بطاش کبریٰ زادہ نے اس کو شروع کر کے حرف را تک مکمل کیا تھا کہ سلطان کی وفات ہوگئی اور ترجمہ ناقص رہ گیا۔(۴)

جامعیت کے باوجود استیعاب میں بعض صحابہ کے حالات رہ گئے تھے، اس لیے ں اصحاب علم نے اس کے ذیول لکھے۔

۱- ابوبکر بن فتحون مالکی اندلسی (متوفی ۵۱۹ھ) نے جو قاضی عیاض کے شیوخ

---

(۱) فہرست کشف الظنون ج ۱ص ۹۳ (۲) الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۶۵ (۳) فہرست کتب خانہ رام پور ج ۱ ص ۱۳۸ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳ و ۹۴۔

میں ہیں ایک عمدہ اور سیر حاصل ذیل لکھا، اس میں ابوعمر کے شرائط کے مطابق ان پر استدراک کر کے متعدد ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۲- ابن فتحون کے معاصر ابواسحاق بن امین نے بھی ذیل لکھا تھا۔

۳- ابوالقاسم محمد بن عبدالواحد غافقی غرناطی (متوفی ۶۱۹ھ) نے ذیل لکھا۔

۴- ابوالحجاج یوسف بن محمد مقلد جماہری (متوفی ۵۵۸ھ) نے الارتجال فی اسماء الرجال کے نام سے ذیل لکھا، اس میں استیعاب پر استدراک بھی کیا گیا ہے۔(۱)

اس گراں مایہ کتاب کو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے پہلی دفعہ دو جلدوں میں ۱۹،۱۳۱۸ھ میں شائع کیا، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۸۰۸ اور ۹۶ صفحے فہرست کے ہیں، مولانا حسن بن احمد حنفی نے تصحیح کی اور مختصر حواشی لکھے ہیں، دوسری مرتبہ اس کو ابن حجر کی اصابہ کے حاشیہ پر مصر سے ۱۳۲۸ھ میں چار جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ: حافظ ابن حجر اصابہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "ابن عبدالبر نے اس خیال سے کہ انھوں نے متقدمین کی کتابوں کے تمام مواد و معلومات کو اس میں شامل کر دیا ہے، اس کا نام استیعاب رکھا ہے لیکن اس میں بہت سارے صحابہ کا ذکر نہیں آسکا ہے، اسی لیے اس کے متعدد ذیول لکھے ہیں۔"

اس بیان سے استیعاب کی عظمت و اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ فی الواقع اس کے اندر کوئی خاص اعتراض کی بات ہے، کیوں کہ اس کا تجزیہ کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱- چوں کہ یہ متقدمین کی کتابوں کے مباحث و معلومات پر مشتمل ہے اس لیے اس کا نام استیعاب رکھا گیا ہے۔

۲- اس میں بہت سارے صحابہ کا تذکرہ نہیں ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۲۵۔

پہلے جز سے اعتراض ثابت نہیں ہوتا، دوسرے جز میں جو اعتراض کی بات معلوم ہوتی ہے، وہ اسی وقت درست ہو سکتی ہے جب ابن عبدالبر نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ انھوں نے اس میں تمام صحابہ کے ناموں کا احاطہ کرنے کی وجہ سے اس کا نام استیعاب رکھا ہے لیکن جب ان کا یہ دعویٰ ہی نہیں ہے، بلکہ انھوں نے اس کا نام استیعاب اس لیے رکھا ہے کہ یہ متقدمین کی کتابوں کے مباحث کو حاوی ہے، علاوہ ازیں ان کا یہ خود بیان بھی ہے کہ ''مجھے امید ہے کہ میری یہ کتاب ان لوگوں کی نسبت سے جن کا اس میں تذکرہ ہے، نیز دوسرے فوائد کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ثابت ہوگی اور اس کے مطالعہ میں ترتیب و بیان وغیرہ کے لحاظ سے دشواری بھی کم پیش آئے گی تاہم میں احاطہ و استقصا کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اس تقصیر کا اعتراف کرتا ہوں جو انسان کا خاصہ (۱) ہے، اس بنا پر یہ بیان بطور واقعہ تو صحیح ہو سکتا ہے لیکن بطور اعتراض درست نہیں ہو سکتا۔

(۱) مقدمہ استیعاب ص۹۔

امام ابوبکر خطیب بغدادی

(متوفی ۴۶۳ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت، خطیب لقب اور سلسلہ نسب یوں ہے: احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت۔(۱)

ولادت ووطن: امام ابوبکر خطیب کی ولادت پنجشنبہ کے دن ۲۴/جمادی الاخریٰ ۳۹۲ھ کو عراق کے قریہ درزیجان میں ہوئی، یہ بغداد کے قریب اس کے مغرب جانب دریائے دجلہ کے کنارے ایک بڑا گاؤں تھا(۲) لیکن امام صاحب کی اصل نشو ونما دنیائے اسلام کے مشہور شہر دارالسلام بغداد میں ہوئی، اسی لیے وہ بغدادی کہلاتے ہیں، ان کے والد بزرگوار کو علم وفن خصوصاً حدیث سے اشتغال ومناسبت تھی اور وہ درزیجان میں خطیب تھے، اسی لیے یہ ان کے اور ان کے فرزند کے نام کا جز ہو گیا تھا، امام سمعانی لکھتے ہیں کہ خطیب کی نسبت ممبر پر خطبہ دینے کی طرف ہے، اس نسبت سے جو علما ومحدثین منسوب ہیں ان میں ابوبکر احمد زیادہ مشہور ہیں۔

اپنے صاحب علم وکمال باپ کی توجہ سے ابوبکر خطیب بچپن ہی سے علم وفن کی تحصیل میں منہمک ہو گئے تھے۔(۳)

اساتذہ: خطیب کے اساتذہ میں مختلف اسلامی ملکوں اور مرکز حدیث کے فضلا شامل ہیں

(۱) ابن خلکان ج۱ ص۴۶ (۲) معجم البلدان ج۴ ص۵۲ (۳) کتاب الانساب ورق ۲۰۴ طبقات الشافعیہ ج۳ ص۱۲ تذکرہ ج۳ ص۳۲۱۔

ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن مخلد باقرجی، ابونصر احمد بن حسین کسار، ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی، ابوبکر حیری ابو حازم عبدوی، ابوسعید مالینی، ابوعمر بن مہدی فارسی، ابوالفتح بن ابوالفوارس، ابوالحسن بن رزقویہ، ابوالحسن بن صلت اہوازی، ابوالحسن بن عبدکویہ، ابوالحسن بن بشران، ابوالحسین بن تیم، حسین بن حسن جوالیقی، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن سراج، ابوعمر قاسم بن جعفر ہاشمی، محمد بن عبداللہ بن شہریار محمد بن عیسیٰ اور ہلال حفار وغیرہ۔

علوم فقہ کی تحصیل ابوالحسن محاملی، قاضی ابوالطیب طاہر بن عبداللہ طبری اور ابونصر بن صباغ اور شیخ ابواسحاق وغیرہ۔ سے کی، امام ابوداؤد صاحب سنن کے وہ دو واسطوں سے شاگرد ہیں۔

تلامذہ: خطیب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، ان میں بعض وہ ہیں جن سے خود خطیب کو شرف تلمذ حاصل ہے، احمد بن احمد متوکلی، ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن خاصیہ، ابوعبداللہ حمیدی، ابوالفضل بن خیرون، ابوالقاسم ازہری، ابومنصور بن خیرون، ابونصر بن ماکولا، طاہر بن سہل اسفرائنی، عبداللہ ابن احمد سمرقندی، عبدالرحمٰن بن محمد شیبانی، عبدالعزیز بن احمد کتانی، عبدالکریم ابن حمزہ، عبیداللہ بن احمد بن عثمان، علی بن احمد بن قیس غسانی، مبارک بن طیوری، محمد بن علی بن ابوالعلا مصیصی، محمد بن مرزوق زعفرانی، ابوالفتح نصراللہ بن محمد مصیصی، ہبۃ اللہ بن عبداللہ شروطی، یوسف بن ایوب ہمدانی۔

علامہ سمعانی فرماتے ہیں کہ میں نے خطیب کے پندرہ تلامذہ سے سماع کیا ہے اور حافظ ابن عساکر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو چوبیس شاگردوں سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ (۱)

رحلت وسفر: خطیب اپنے علم وفن کے دلدادہ والد ماجد کی ترغیب وتشویق سے بچپن ہی میں

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۰۴، طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۲ وتذکرہ ج ۳ ص ۲۳۱۔

تحصیلِ علم میں لگ گئے تھے، ۴۰۳ھ میں اگیارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے باقاعدہ حدیث کا سماع شروع کرایا، اس کے بعد بیس سال کی عمر تک وہ اپنے وطن ہی کے علما واساطینِ فن سے کسبِ فیض کرتے رہے، اس کے بعد بصرہ، کوفہ، نیشاپور، اصفہان، دینور، ہمدان، رے، مکہ، مدینہ قدس، دمشق اور صور تشریف لے گئے۔

خطیب کو علم وفن سے اشتغال اور مطالعۂ حدیث کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ راستہ چلتے تھے تو ان کے ہاتھ میں کسی نہ کسی کتاب کا جز ہوتا تھا اور وہ اس کو پڑھتے رہتے تھے۔(۱)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: خطیب کی حدیث میں متعدد تصنیفات ہیں گو ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے تاہم خطیب کا شمار محدثین اور حفاظ میں ہوتا ہے، علمائے فن نے ان کے حفظ وضبط، ثقاہت واتقان اور روایت ودرایت میں اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

ابوسعد بن سمعانی فرماتے ہیں کہ ''وہ ثقہ، حجت اور کثیر الضبط تھے اور ان پر حفظ وضبط کا خاتمہ ہو گیا، ابوالعینان رواسی کا بیان ہے کہ وہ اس فن میں امام تھے، ان کے جیسا باکمال شخص میں نے نہیں دیکھا، خطیب کے نامور شاگرد ابن ماکولا جو علم حدیث ورجال میں بہت ممتاز تھے، فرماتے ہیں کہ ''حدیثِ رسول کی معرفت، حفظ وضبط، اتقان اور فنونِ علل واسناد، صحیح وغریب، فرد ومنکر اور سقیم وغیرہ نیز روایتوں کی شناخت ا ر تمیز میں وہ آخری اور نامور محدث تھے، جن کو ہم نے دیکھا ہے، درحقیقت اہل بغداد میں امام دارقطنی کے بعد ان کے جیسا صاحب کمال محدث پیدا نہیں ہوا، میں نے صوری سے خطیب اور ابونصر سجزی کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے واضح طور پر خطیب کو افضل وبرتر قرار دیا، ہم کو اس فن میں جو کچھ حاصل ہوا وہ دراصل اسی امامِ فن کے فیض وبرکت کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔''

مؤتمن ساجی فرماتے ہیں کہ ''بغداد میں امام دارقطنی کے بعد خطیب سے بڑا حافظ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶ و منتظم ج ۸ ص ۲۶۷۔

حدیث پیدا نہیں ہوا، ابوعلی بردانی کا بیان ہے کہ "شاید خطیب نے بھی اپنے جیسا صاحبِ فن نہ دیکھا ہو، ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں کہ خطیب معرفت وحفظِ حدیث میں دارقطنی اوران کے ہم پایہ لوگوں کے ہم سر تھے۔" ابواسحاق شیرازی خطیب کے اساتذہ میں تھے لیکن وہ ان کی مہارتِ فن اوراحادیث میں بلند پائیگی کی وجہ سے ان کے نہایت مداح ومعترف تھے، ایک دفعہ خطیب ان کے درس میں حاضر ہوئے تو شیخ نے ایک حدیث بحر بن کثیر سقاء کے واسطہ سے بیان کر کے کہا کہ ان کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ خطیب نے ادب سے ان کا حال بیان کرنے کی استاذ سے اجازت لی، اس وقت شیخ ان کے سامنے سنبھل کر نہایت ادب سے شاگرد کی طرح بیٹھ گئے، جب خطیب نے شرح وبسط سے ان کا حال بیان کیا تو شیخ ابواسحاق نے بے اختیار آفریں کہا اور فرمایا کہ "خطیب اپنے وقت کے دارقطنی ہیں۔" علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ متقدمین حفاظ اور ائمہ کبار یحییٰ بن معین، علی بن مدینی اور احمد بن ابی خیثمہ وغیرہ کے ہم پایہ اور علامہ عصر تھے اور اپنے اقوال ومنقولات اور تصنیفات کے جمع وانتخاب میں ثقہ، حجت، صدوق اور معتمد تھے۔"

ابن عبدالبر کی طرح جو خطیب کے معاصر، نہایت بلند پایہ محدث اور اپنے کمالات کی وجہ سے حافظِ مغرب کہلاتے تھے، یہ بھی اپنے زمانہ میں حافظِ مشرق کہلاتے تھے۔" شجاع ذہلی کا بیان ہے کہ وہ بےنظیر محدث تھے۔" سعید مودب فرماتے ہیں کہ وہ کثیرالروایات اور جمع وتحریر حدیث پر خاص دھیان دینے والے ثقہ، ضابط، متقن اور نہایت باخبر محدث تھے، علامہ ابن صلاح اور حافظ نووی نے ائمہ صحاح کے بعد جن سات اکابر محدثین کا ذکر کر کے ان کی تصنیفات کو بیش قیمت اور پُر منفعت قرار دیا ہے، ان میں طبقہ ثانیہ کے لوگوں میں خطیب کا نام بھی لیا ہے، علامہ ابن کثیر ان کو مشاہیر محدثین میں بتاتے ہیں اور ابن خلکان فرماتے ہیں کہ "وہ حفاظ متقنین میں تھے، ابوالحسن ہمدانی نے خطیب کی وفات کو "علم حدیث کی موت قرار دیا ہے"، ابن جوزی کا بیان ہے کہ "وہ فنونِ حدیث میں

فائق تھے، ان پر یہ علم تمام ہو گیا۔'' حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ امام و حافظ کبیر اور شام و عراق کے محدث تھے، ضبط و اتقان اور حفظِ حدیث کا ان پر خاتمہ ہو گیا۔'' علامہ ابن سبکی اور ابو بکر بن ہبۃ اللہ نے بھی ان کی مہارتِ فن، عظمتِ شان اور حدیث میں امامت و جلالت کا ذکر کیا ہے۔

خطیب کی حدیث میں عظمت و بلند پائیگی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جرح و تعدیل کے فن میں یکتا اور روایات و احادیث کی شناخت و تمییز میں ماہر تھے، حدیث، رجال، جرح و تعدیل اور اصولِ اسناد و روایات میں ان کی کئی کتابیں ہیں، حدیث کے متعلقہ علوم میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں انھوں نے کتابیں نہ لکھی ہوں، حدیث میں ان کے وثوق و اعتبار کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ بادشاہ وقت نے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ ''واعظین، علما اور محدثین ان کے سامنے پیش کیے بغیر کوئی حدیث نہ بیان کریں، جس حدیث کی روایت کی خطیب اجازت دیں، وہ بیان کی جائے اور جس کی ممانعت کریں لوگ اس کو بیان کرنے سے باز رہیں۔''

حدیث میں ان کی غیر معمولی بصیرت، گہری تحقیق اور وسیع نقد و نظر کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کچھ یہودیوں نے جو خیبر میں رہتے تھے اور حضرت عمرؓ فاروق کے زمانے میں شام کے اطراف و جوانب میں آباد ہو گئے تھے، خلیفہ کے سامنے ایک خط پیش کیا اور اس کے متعلق دعویٰ کیا کہ وہ رسولؐ اللہ کا ہے، جس کو حضرت علیؓ نے لکھا ہے، اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر اور بعض صحابہ کرام کی شہادتیں بھی ثبت تھیں اس خط کا مضمون یہ تھا کہ ''ہم نے یہود کے فلاں فلاں قبیلے سے جزیہ معاف کر دیا'' خلیفہ نے خط کی اصلیت کا پتہ لگانے کے لیے اس کو خطیب کے پاس بھیجا، انھوں نے اس کو بالکل جعلی اور من گھڑت قرار دیا ہے، وجہ دریافت کرنے پر بتایا کہ اس میں حضرت امیر معاویہؓ اور سعد بن معاذ کی گواہیاں بھی درج ہیں، حالانکہ فتح خیبر کے وقت حضرت معاویہؓ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور حضرت سعدؓ کو

غزوۂ خندق میں ایسا کاری زخم لگا کہ جانبر نہ ہو سکے اور ان کی وفات غزوۂ بنی قریظہ کے قریبی زمانہ میں ہوگئی تھی، اس لیے وہ فتح خیبر کے وقت زندہ ہی نہ تھے۔(۱)

فقہ: خطیب ممتاز اور نامور فقیہ بھی تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ وہ اصلاً فقیہ تھے لیکن فن حدیث و تاریخ سے ان کو زیادہ سروکار رہا، اسی لیے ان علوم کا ان پر غلبہ ہوگیا، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ وہ اکابر و اعیان فقہا میں تھے اور جید و نامور فقہا سے اس فن کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان کی تحقیقات سے ان کی فقہی جزرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ: حدیث کی طرح تذکرہ و تراجم اور تاریخ بھی ان کا خاص موضوع تھا، اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں ان کے سوانح نگاروں نے ان کو بلند پایہ مورخ بتایا ہے، حافظ ابن کثیر فنِ تاریخ میں ان کے کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

مازلت تدأب فی التاریخ مجتهدا ☆ حتی رأیتك فی التاریخ مکتوبا(۲)

قرأت و علم قرآن: فن قرأت و تجوید اور علوم قرآنی میں بھی ممتاز تھے، بڑے خوش الحان تھے اور قرآن مجید نہایت ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے، مورخین نے ان کے حسن قرأت اور فصیح اللہجہ ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔(۳)

شعر و ادب: خطیب اسلامی علوم ہی کے یگانہ و فاضل نہ تھے، بلکہ شعر و ادب میں بھی صاحبِ کمال تھے، ان کی تصنیفات، ادبی شکوہ، حسن تحریر، لطافت بیان اور سلاست کلام سے معمور ہیں، ان کو لغت و اعراب کے فن سے پوری واقفیت تھی، احادیث صحیح اعراب کے ساتھ پڑھتے تھے، شعر و ادب کے بڑے عارف تھے اور اس پر ان کی اچھی نظر تھی، خود بھی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶ و طبقات الشافعیہ ج ۳ و المنتظم ج ۸ مختلف صفحات و ابن خلکان ج ۱ ص ۶۴ و کتاب الانساب ورق ۲۰۴ و البدایہ ج ۱۲ ص ۱۰۱ و مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ و بستان المحدثین وغیرہ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۳ (۳) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۷۔

دادِ سخن دیتے تھے، یاقوت نے معجم الادبا میں اسی حیثیت سے ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے، ابن جوزی کہتے ہیں کہ ادب کے واقف کار اور اچھے شاعر تھے، تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں ان کے متعدد اشعار درج ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ان کنت تبغی الرشاد محضا   لامر دنیاك والمعاد

فخالف النفس فی هواها   ان الهوی جامع الفساد

ترجمہ: اگر دنیا وعقبیٰ کے معاملہ میں خالص ہدایت کے طلب گار ہو تو ہوائے نفس کی مخالفت کرو کیوں کہ یہ مفاسد اور برائیوں کا سر چشمہ ہے۔

لاتغبطن اخا الدنیا لزخرفها   ولا للذة وقت عجلت فرحا

فالدهر اسرع شیء فی تقلبه   وفعله بین للخلق قد وضحا

کم شارب عسلا فیه منیته   وکم تقلد سیفا من به ذبحا

ترجمہ: دنیا کی رعنائی ودلفریبی کی وجہ سے دنیا والوں پر رشک نہ کرو اور نہ عارضی لذت وآسودگی پر اتراؤ، کیوں کہ زمانہ کا انقلاب نہایت تیز اور اس کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ بہت کھلا ہوا ہوتا ہے (دنیا کی بے ثباتی اور تدبیر کی درماندگی کا یہ حال ہے کہ) شہد کا شربت پینے والے کتنے لوگوں کی اسی سے موت ہو جاتی ہے اور کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنی گردنوں میں (حفاظت کے خیال سے) تلواریں لٹکائے ہوئے ہوتے ہیں مگر وہ انہی سے موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔

طلبت اخا صحیح الود محضا   سلیم الغیب مامون اللسان

فلم اعرف من الاخوان   الانفاقا فی التباعد والتلافی

وعالم دهرنا لاخیر فیه   تری صورا تروق بلامعانی

ترجمہ: میں نے پر خلوص آپ کی محبت کرنے والے اور ایسے دوستوں کو تلاش کیا جن کا ظاہر وباطن یکساں قابل اعتماد ہو تو مجھے اپنے تمام دوستوں میں نفاق اور

دور نے پن کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں نظر آئی اور ہمارے زمانے کے علما اس قدر بے فیض ہیں کہ ان کی صورتیں تو چمکدار ہیں لیکن ان میں کوئی کیفیت و معنی نہیں ہے۔

یہ تو پند و نصائح اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے متعلق حکیمانہ اشعار تھے، اب تغزل کی رنگینی و رعنائی ملاحظہ ہو۔

الشمس تشبهه والبدر يحكيه   والدر يضحك والمرجان من فيه

من سرى وظلام الليل معتكر   فوجهه عن ضياء البدر يغنيه

ترجمہ: میرے ممدوح کا حسن و جمال شمس و قمر سے بڑھ کر ہے اسی لیے وہ اس کے جمال کی نقل کرتے ہیں، اس کے دانت اتنے آبدار، چمکدار اور خوبصورت ہیں کہ جب وہ ہنستا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتی و مرجان ہنس رہے ہیں، اگر کوئی شخص گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں سفر کرے تو محبوب کے جلوۂ جمال آرا اور رخ زیبا کی تابنا کی اس کو بدر کامل کی روشنی سے مستغنی کر سکتی ہے۔

وكم حكيم رآه ظنه ملكا   وردد الفكر فيه انه بشر (۱)

ترجمہ: بعض دانشوروں نے (اس کی عفت و معصومیت کی وجہ سے) اس کو فرشتہ خیال کیا لیکن جب انھوں نے اس کو بغور دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ انسان ہے۔

دیگر کمالات: اس گونا گوں کمالات کے ساتھ ان کا خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا اور وہ خطاطی اور خوشنویسی کے لیے مشہور تھے، بڑے فصیح البیان تھے، آواز اتنی بلند تھی کہ جامع منصور میں حدیث بیان کرتے تو آخری کونے میں سنائی دیتی تھی۔

ذہانت و فطانت اور مطالعہ سے دلچسپی: ان کی دماغی قوت و صلاحیت بڑی حیرت انگیز اور ذہانت و ذکاوت نہایت غیر معمولی تھی، ہر وقت علم و مطالعہ کا شغل جاری رکھتے تھے، صبر آزما اور مشقت طلب کاموں میں لگے رہنے کے باوجود علمی مشاغل میں بھی مصروف

---

(۱) بستان المحدثین ص ۳۷۔

تھے، حج کے زمانہ میں پورا قرآن مجید غروب آفتاب کے وقت تک ختم کر دیتے۔ اس کے بعد لوگ ان کے پاس آتے اور حدیثیں بیان کرنے کی فرمائش کرتے تو ذرا بھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے بلکہ پورے انشراح صدر کے ساتھ ان کو حدیثیں سناتے۔

مکہ کے زمانہ قیام میں کریمہ بنت احمد مروزی ستی سے جو مرو کے ایک گاؤں کشمیہن کی صالح، عبادت گذار اور صاحب فضل وکمال خاتون اور صحیح بخاری کی مشہور راویہ تھیں، صحیح بخاری کو صرف پانچ روز میں ختم کر دیا، اسی طرح بخاری کے ایک اور مشہور راوی ابوعبدالرحمٰن اسماعیل بن احمد فربری سے تین مجلس میں اس کو ختم کیا، دو روز مغرب کے وقت سے پڑھنا شروع کیا اور فجر تک پڑھتے رہے، تیسرے روز چاشت کے وقت سے شروع کر کے مغرب کے وقت تک مکمل کر لیا، علامہ ذہبی نے اس حیرت انگیز دماغی قوت اور ذہانت کو بالکل عجوبہ بتایا ہے۔ (۱)

اعزاز ومقبولیت: علمی حیثیت سے خطیب کا پایہ بہت بلند تھا، ابن خلکان نے ان کو علمائے متبحرین میں بتایا ہے، ان کے علمی کمالات اتنے متنوع اور گوناگوں تھے کہ بقول سمعانی (فضله اشهر من ان يوصف) ان کو شمار اور بیان نہیں کیا جا سکتا، ان کمالات نے ان کو امامت ومقبولیت کا درجہ عطا کیا تھا، خصوصاً فنونِ حدیث میں تو وہ مسلم امام عصر تھے، سمعانی کا بیان ہے کہ وہ بلا پس وپیش امام عصر اور حافظِ دہر تھے، انھوں نے اپنی مقبولیت اور اعزاز کے لیے اللہ تعالیٰ سے حرم کی حاضری کے موقع پر زمزم کا پانی پی کر دعا کی تھی، ان کی یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ بغداد میں کسی کو ان کے سامنے پیش کیے بغیر حدیث بیان کرنے کی اجازت نہ تھی۔ (۲)

شکوہ ودبدبہ اور وقار ومتانت: علمی کمالات کے ساتھ ان میں شان وشوکت، ظاہری وجاہت اور رعب وداب بھی تھا اور بڑے وقار، متانت اور سنجیدگی سے رہتے تھے،

(۱) بستان المحدثین ص ۲۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶۔

علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

وکان مھیبا وقورا نبیلا خطیرا ثقة۔ (۱)

ذی ہیبت، باوقار، پرعظمت اور ثقہ وسنجیدہ آدمی تھے۔

ان کی مجلس درس بھی نہایت آراستہ ہوتی تھی، بغداد کی سب سے اچھی اور عمدہ جگہ کو درس کے لیے منتخب کیا تھا۔

زہد وتدین: خطیب زہد وتقویٰ میں بھی نمایاں تھے، عبادت وتلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذوق بہت بڑھا ہوا تھا، تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور مطالعہ حدیث سے جو وقت بچتا وہ عبادت اور تلاوت قرآن میں بسر ہوتا، ہر روز وشب میں ایک قرآن ختم کرنے کا معمول تھا، اس میں فرق نہیں آنے دیتے، غیر معمولی اوقات وحالات اور سفر میں بھی یہ معمول جاری رہتا، چنانچہ حج بیت اللہ کے سفر میں بھی ہر روز غروب آفتاب کے وقت تک الحان وترتیل کے ساتھ قرآن مجید ختم کردیتے تھے، مستجاب الدعوات تھے، ایک دفعہ زمزم کا پانی پی کر خدا سے تین باتوں کی دعا مانگی، اول یہ کہ میری کتاب ''تاریخ بغداد'' کو شرف قبول اور حسن اعتبار حاصل ہو، دوسرے بغداد کی جامع منصور میں سب سے عمدہ اور مقدس جگہ میں حدیث کی تعلیم واملا میں مشغول رہنے کی مجھ کو توفیق وسعادت میسر آئے اور آخری دعا یہ تھی کہ بشر حافی کی قبر کے متصل ان کے پہلو میں دفن کیا جاؤں، خدا نے ان کی تینوں دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا۔ (۲)

دولت وثروت کی فراوانی اور جذبہ خیر وخیرات: اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی اعزاز وجاہت اور مال ودولت سے بھی اچھی طرح نوازا تھا، بڑے دولت مند شخص تھے لیکن ان کی دولت وثروت غریبوں اور ناداروں کے لیے وقف تھی، اصحاب علم اور محدثین کی خدمت کے لیے خطیر رقمیں خرچ کرتے تھے، حافظ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ وہ حدیث کے طلبہ کو زر وجواہر

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۰۴ (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۸ وتذکرہ ج ۳ ص ۳۳۴۔

سے نوازتے تھے۔ ابوزکریا تبریزی کا بیان ہے کہ ”میں جامع دمشق کے منارہ میں رہتا تھا اور خطیب سے ادب و محاضرات کی کتابیں پڑھتا تھا، ایک روز وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے اوپر تشریف لائے اور کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا اور کہا یہ اچھا تحفہ ہے، اس کو لے کر قلم خرید لو، میں نے دیکھا تو اس میں چار دینار تھے، پھر دوسری دفعہ بھی وہ اوپر آئے اور اسی طرح کا برتاؤ میرے ساتھ کیا۔

وفات سے پہلے بیماری کے زمانہ میں اپنا سارا مال و اثاثہ محدثین، فقہا اور فقرا میں تقسیم کر دیا اور اپنا کتب خانہ مسلمانوں کے لیے وقف کر گئے، یہ وصیت بھی کی کہ مرنے کے بعد جسم کا کپڑا صدقہ و خیرات کر دیا جائے۔(۱)

امرا و وزرا سے تعلقات: خطیب کے بعض امرا و اعیان دولت سے بھی تعلقات تھے اور وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے، عزالدولہ کے زمانہ میں جو نہایت سخی و فیاض تھا، خطیب صور تشریف لے گئے، تو اس نے بڑا اعزاز و اکرام کیا اور مال و زر سے نوازا، حدیث کے استناد کے سلسلہ میں خلیفہ بغداد کو ان پر جس قدر اعتبار تھا، اس کا حال پہلے گذر چکا ہے، جب حج بیت اللہ سے بغداد واپس آئے تو ابوالقاسم بن مسلمہ سے بڑے گہرے تعلقات ہو گئے تھے اور اس نے امام صاحب کی قدر و عظمت شناسی کا خوب حق ادا کیا۔(۲)

استغنا و بے نیازی: امرا و وزرا سے قربت و توسل کے باوجود مزاج میں نہ تو تملق تھا اور نہ حرص و جاہ کی طلب کا جذبہ، مال و دولت سے ہمیشہ بے نیاز اور کنارہ کش رہتے، فضل ابن عمر نسوی کا بیان ہے کہ ایک روز میری موجودگی میں جامع منصور کے اندر ایک علوی شخص ان کے پاس کچھ دینار لے کر آیا اور کہا کہ فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ ہدیہ دیا ہے تاکہ آپ اس کو اپنی ضرورت میں صرف کریں خطیب نے کہا مجھے ضرورت نہیں، اس نے کہا غالباً آپ اس کو کم سمجھ رہے ہیں، اس لیے اس نے تھیلی کھول کر مصلیٰ پر بکھیر دیا، اس میں تین

(۱) تبیین کذب المفتری ص ۲۶۸ و تذکرہ ج ۳ ص ۳۴۴ (۲) المنتظم ج ۸ ص ۲۵۶۔

سو دینار تھے، خطیب برافروختہ ہوگئے اور مصلیٰ اٹھا کر دیناروں کو نہایت تمکنت سے زمین پر جھٹک دیا اور خود مسجد سے باہر چلے آئے، اس پر وہ شخص بہت خفیف ہوا۔(۱)

فقہی مسلک: خطیب شافعی المذہب تھے، حافظ ذہبی نے ان کو اکابر شافعیہ میں بتایا ہے، اسی لیے مذہب میں ان کے غلو و تعصب کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

عقیدہ: محدثین اور اصحاب روایت کی طرح وہ عقائد میں امام ابوالحسن اشعری کے ہم نوا تھے، حافظ ابن عساکر نے تبیین میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

وکان یذھب فی الکلام الی مذھب ابی الحسن الاشعری.(۲)	وہ کلام وعقیدہ میں مذہب اشعری پر کاربند تھے۔

ابتلا و آزمائش: امام ابوبکر خطیب کے زمانہ میں اسلامی ممالک خصوصاً بغداد میں سخت خلفشار اور ہیجان برپا تھا، ایک طرف شیعی و سنی تصادم اور فقہی مذاہب کے ماننے والوں کے باہمی اختلاف نے ملت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کردیا تھا اور دوسری طرف حکام و امرا کے اقتدار کی باہمی کشمکش اور افتراق نے حکومت و سلطنت کے نظام کو تہہ و بالا کردیا تھا، ان حالات کا اثر خطیب کی زندگی پر بھی پڑا، ان کے بعض اعیان دولت سے تعلقات کا پہلے تذکرہ کیا جاچکا ہے، قائم بامراللہ کے دور حکومت میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے کچھ امرا و وزرا ان کے درپے آزار ہوگئے اور ان پر بغداد کی سرزمین تنگ ہوگئی اور وہ بغداد چھوڑ کر قید و بند کی زندگی گذارنے کے لیے مجبور ہوگئے۔

۴۴۰ھ اور ۴۵۰ھ کے درمیان بغداد میں ارسلان المعروف بہ بساسیری نے جو دیالمہ کا ایک ترکی غلام اور بغداد کے ترکوں کا سردار تھا، اتنا عروج و اقتدار حاصل کرلیا کہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۲ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ؟؟ (۲) تبیین کذب المفتری ص ۲۷۱۔

خلیفہ قائم بامراللہ کے خلاف بغاوت کردی، یہ اگرچہ آخر میں طغرل بک کے ہاتھوں مارا گیا لیکن ایک زمانہ میں وہ دولت عباسیہ کا مختار کل بن گیا تھا اور امرا اور حکام اس سے لرزہ براندام رہتے تھے، عراق وخوزستان میں اس کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جانے لگا تھا، غرض عباسی حکومت کے اکثر علاقوں پر اس کا قبضہ وتصرف ہوگیا تھا، قائم بامراللہ کو اس نے اتنا زیر اور مجبور کرلیا تھا کہ وہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا تھا، یہ شخص باطنی شیعہ تھا لیکن بغداد کا رئیس الرؤساسنی تھا، اس لیے دونوں میں اندرونی کشمکش اور مخالفت رہتی تھی بساسیری نے ۴۵۰ھ میں بغداد پر قبضہ کرکے مستنصر علوی کا خطبہ جاری کردیا، اس کا یہ عروج واقبال اور شیعی غلبہ وتسلط دیکھ کر خطیب بغداد سے دمشق چلے گئے لیکن وہاں بھی ان کو سکون نہ ملا، وہاں کا حکمراں بھی شیعی تھا، اس کے بعض افعال پر خطیب نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اس نے ان واقعات کو بہانہ بنا کر ان کو قتل کردینا چاہا اور پولیس کو گرفتاری کا حکم بھی دیدیا مگر وہ شریف زینبی کی پناہ میں آگئے، شریف نے خوبصورتی سے معاملہ کو رفع دفع کردیا تاہم امیر نے دمشق سے خطیب کی جلاوطنی کا فرمان جاری کردیا اور یہ پہلے صور پھر حلب وطرابلس ہوتے ہوئے عراق واپس آئے۔(۱)

بعض مورخین کا بیان ہے کہ خطیب نے جامع دمشق میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ مسجد کے آخری حصے میں سنائی دیتی تھی، ایک روز اسی شان سے انھوں نے حدیث کا درس دیتے ہوئے فضائل عباس کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیں تو روافض اور فاطمیہ سخت مشتعل ہوگئے، یہاں تک کہ انھوں نے خطیب کو قتل کردینے کا ارادہ کیا لیکن وہ پھر شریف زینبی کی پناہ میں آگئے، ان کی کوشش وسفارش سے اگرچہ لوگ ان کے قتل کے ارادہ سے باز آگئے مگر وہ جلاوطن کردیئے گئے۔(۲)

ان دونوں بیانوں میں معمولی اختلاف کے باوجود خطیب کے آلام ومصائب اور

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ص۳۳۶ وطبقات الشافعیہ لابی بکر ص۵۷ (۲) البدایہ والنہایہ ج۱۲ص۱۰۲۔

شدائد ومحن میں مبتلا ہونے کی تصریح موجود ہے۔

خطیب کو اپنی فقہی اور جماعتی عصبیت کی وجہ سے بھی ابتلا ومحن سے دوچار ہونا پڑا، وہ شافعی المذہب تھے اور متکلمین واشاعرہ سے ان کے تعلقات بھی تھے، اس کی وجہ سے حنابلہ نے ان کو زدوکوب کیا۔

وفات: خطیب رمضان المبارک ۴۶۳ھ میں بیمار ہوئے، بیماری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ذی الحجہ کی ابتدائی تاریخوں میں ان کی حالت زیادہ خراب ہوگئی اور بالآخر دوشنبہ ۷/ذی الحجہ کو اکہتر سال کی عمر میں داعی اجل کا پیام آگیا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شوال ہی میں انتقال ہوا۔

دوسرے روز یعنی منگل کو تجہیز وتکفین کی گئی، جنازہ اٹھانے اور کندھا دینے والوں میں خطیب کے استاذ اور مشہور شافعی فقیہ شیخ ابواسحٰق شیرازی بھی تھے، جنازہ میں ایک جم غفیر شریک تھا، ایک جماعت یہ منادی کررہی تھی:

هذا الذي كان يذب عن رسول الله ﷺ هذا الذي كان ينفي الكذب عن رسول الله ﷺ هذا الذي كان يحفظ حديث رسول الله ﷺ۔	یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے سینہ سپر ہوکر آپ کی طرف سے کذب وافترا کی تردید کرتا تھا اور آپ کی حدیثوں کو یاد کرتا تھا۔

ابوالحسین بن مہتدی باللہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور ان کی آرزو کے مطابق باب حرب میں بشر حافی کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے، تکفین وتدفین کے بعد کئی قرآن ختم کیے گئے اور بعض لوگوں نے ان کی عنداللہ مقبولیت اور بخشش کے خواب بھی دیکھے۔(۱)

حلیہ: خطیب بڑے وجیہ وشکیل تھے، اہل سیر لکھتے ہیں کہ:

(۱) تاریخ ابن خلکان ج اص ۴۶ تبیین کذب المفتری ص ۲۶۹ و ۲۷۰ و تذکرہ ج ۳ ص ۳۳۹۔

وكان في درجة الكمال والرتبة خلُقا وخَلقا وهيئة ومنظراً۔ (۱)	وہ خلق وخلقت (صورت وسیرت) اور ہیئت ومنظر ہر اعتبار سے نہایت کامل تھے۔

اولاد: مورخین نے تصریح کی ہے کہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی، چنانچہ مرض الموت میں اپنا سارا مال واسباب جو آئندہ بیت المال کی ملکیت ہونے والا تھا، خلیفہ سے اجازت لے کر فقرا اور اہل علم میں خرچ کر دیا۔

تصنیفات: خطیب کی تصنیفات کی تعداد ایک سو کے قریب بتائی جاتی ہے، ان میں بہت سی معدوم اور نایاب ہیں، ان کی اکثر کتابیں فنونِ حدیث سے متعلق گوناگوں مسائل ومباحث اور مفید ومتنوع معلومات پر مشتمل ہیں، ان میں ادب وانشاء، حسنِ تحریر، سلاست وروانی اور طرزِ ادا وطریقۂ بیان کی دلکشی بھی ہے، حافظ ابن جوزی ان کی تصنیفات گنانے کے بعد لکھتے ہیں "جو شخص ان کا بغور مطالعہ کرے گا وہ خطیب کی قدر وعظمت اور عدیم المثال کارنامے کا اعتراف کرے گا، انھوں نے ایسا عظیم الشان علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے جو ان سے پہلے کے ان سے کہیں فائق محدثین وائمہ مثلاً دار قطنی وغیرہ بھی نہیں انجام نہیں دے سکے۔ (۲)

خطیب کی معلوم کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱-ابطال النکاح بغیر ولی، ۲-الاسماء المتواطئۃ والانساب المتکافئۃ، ۳-امالی الخطیب، ۴-بیان اہل الدرجات العلی، ۵-کتاب التبیین لاسماء المدلسین یا کتاب اسماء المدلسین، ۶-کتاب البسملۃ وانہا جزء من الفاتحہ، بعض لوگوں نے اس کا نام کتاب نہج الصواب فی ان البسملہ من فاتحۃ الکتاب اور بعض نے نہج الصواب فی ان البسملۃ آیۃ من فاتحۃ الکتاب بھی لکھا ہے، ۷-کتاب الجہر بالبسملہ (ایک جز میں)، ۸-کتاب التفصیل لمبہم المراسیل یا کتاب مبہم المراسیل، ۹-کتاب تمییز المزید فی متصل الاسانید، ۱۰-کتاب التنبیہ

(۲) تبیین کذب المفتری وکتاب الانساب (۲) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶۔

والتوقیف علی فضائل الخریف، ۱۱- کتاب الاجازۃ للمعلوم والمجھول یا اجازۃ المجھول والمعدوم، ۱۲- کتاب الاحتجاج بالشافعی فیما اسند الیہ والرد علی الطاغین یعظم جہلہم علیہ، ۱۳- جزء حدیث اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ، ۱۴- جزء حدیث الامام ضامن والمؤذن موتمن، ۱۵- جزء حدیث الستۃ من التابعین وطرقہ واختلاف وجوہہ، ۱۶- جزء حدیث طلب العلم فریضۃ، ۱۷- جزء حدیث النزول، ۱۸- جزء حدیث عبدالرحمن بن سمرۃ وطرقہ، ۱۹- کتاب الدلائل والشواہد علی صحۃ العمل بخبر الواحد، ۲۰- کتاب الرحلۃ یا الرحلۃ فی طلب الحدیث (ایک جز میں)، ۲۱- کتاب الرواۃ عن مالک، ۲۲- کتاب روایات الصحابہ عن التابعین، ۲۳- کتاب روایۃ الابناء عن الآباء یا کتاب روایۃ الآباء عن الابناء، ۲۴- کتاب السابق واللاحق، ۲۵- کتاب الاسماء والالقاب، ۲۶- صلوٰۃ التسبیح والاختلاف فیہا (ایک جزء میں)، ۲۷- کتاب صوم یوم الشک یا کتاب النہی عن صوم یوم الشک (ایک جز میں)، ۲۸- کتاب طرق حدیث قبض العلم (تین جزوں میں)، ۲۹- عوالی مالک بن انس، ۳۰- کتاب غسل الجمعۃ (تین جزوں میں)، ۳۱- کتاب الفصل للوصل والمدرج فی النقل، ۳۲- کتاب الفقیہ والمتفقہ، ۳۳- کتاب الفنون یا کتاب الفتون، ۳۴- الفوائد للصحاح والغرائب، ۳۵- القضاء بالیمین مع الشاہد (۲ جزوں میں)، ۳۶- کتاب القنوت والآثار المرویۃ فیہ (تین جزوں میں)، ۳۷ کتاب القول فی النجوم یا کتاب القول فی علم النجوم، ۳۸- کشف الاسرار، ۳۹- کتاب المتفق والمفترق، ۴۰- کتاب المسلسلات للرباعیات (تین جزوں میں)، ۴۱- مسند ابی اسحاق الشیبانی (۳ جزوں میں) ۴۲- مسند ابی بکر الصدیق علی شرط الصحیحین (ایک جز میں)، ۴۳- مسند بنان بن بشر، ۴۴- مسند صفوان بن سلیم، ۴۵- مسند صفوان غسانی، ۴۶- مسند محمد بن حجادہ، ۴۷- مسند محمد بن سوقۃ، ۴۸- مسند مسعر بن کدام یا مسند مطر الوراق، ۴۹- مسند نعیم بن حماد الغطفانی، ۵۰- کتاب معجم الرواۃ عن مالک، ۵۱- کتاب معجم الرواۃ عن شعبۃ، ۵۲- کتاب المکمل فی بیان المہمل (ایک

جلد میں)، ۵۳-مناقب احمد بن حنبل ۵۴-مناقب الشافعی، ۵۵-کتاب من حدث ونسی، ۵۶-کتاب من وافقت کنیتہ اسم ابیہ مما لا یومن وقوع الخطاء فیہ، ۵۷-کتاب الموضح یا کتاب موضح اوہام الجمع والتفریق، ۵۸-الاسماء المبہمہ فی الانباء المحکمۃ، ایک جز میں، حروف معجم کے مطابق مرتب کی گئی ہے، ۵۹-کتاب البخلاء اس کا قلمی متحف بریطانی میں ہے اور تین جزوں پر مشتمل ہے، ۶۰-کتاب تقیید العلم تین جزء کے بقدر ہے اور اس کا مخطوطہ برلن میں ہے، ۶۱-کتاب الحیل تین جز میں ہے، بعض مصنفین نے سہواً اس کا نام کتاب الخیل لکھا ہے، جو دراصل ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ) کی تصنیف ہے۔(۱)

۶۲-کتاب رافع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والالقاب یا کتاب مقلوب الاسماء (ایک جلد میں رجال حدیث کے متعلق لکھی گئی ہے۔)(۲)

۶۳-کتاب المؤتلف والمختلف: یہ ضخیم کتاب امام دارقطنی کی المؤتلف والمختلف فی اسماء الرجال سے ماخوذ ہے، مگر اس میں بکثرت اضافے بھی ہیں، برلن میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

۶۴-کتاب المؤتنف، کتاب المؤتلف والمختلف کا تکملہ ہے، اسی لیے اس کا نام المؤتنف لتکمۃ المؤتلف والمختلف بھی ہے۔

۶۵-کتاب اقتضاء العلم: اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''یہ نہایت عمدہ کتاب ہے، بعض محدثین نے اس کا انتخاب کیا ہے، جو ملک عرب میں مشہور ہے اور اکثر جگہ تحصیل واجازت کے وقت اس منتخب کو پڑھاتے ہیں۔(۳)

۶۶-کتاب الجامع فی ادب الراوی والسامع یا کتاب الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع: الجامع اور جامع خطیب کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے، اس میں اصول حدیث کے مباحث اور راوی وسامع کے آداب وشرائط کا ذکر ہے۔(۴)

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۷۶ (۲) ایضاً ج ۱ ص ۵۳۲ (۳) بستان المحدثین ص ۶۵ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۶۔

٦٧-كتاب التطفيل يا كتاب الطفيليين: دمشق سے ۱۳۴۶ھ میں چھپ گئی ہے، خطیب نے اپنے کسی دوست کی فرمائش پر اس میں طفیلیوں کے واقعات وحکایات اور نادر اقوال واشعار جمع کیے ہیں، اس کا شمار ادب ومحاضرات کی عمدہ اور دلچسپ کتابوں میں ہوتا ہے، اس کے شروع میں ناشر نے خطیبؒ کے مختصر حالات وسوانح بھی لکھے ہیں۔

٦٨- كتاب شرف اصحاب الحديث: اس کا مخطوطہ برلن اور مدینہ میں موجود ہے، جماعت اہل حدیث کے ایک صاحب علم مولانا محمد صاحب مدرس مدرسہ محمدیہ واڈیٹر اخبار محمدی نے حج بیت اللہ کے سفر میں مدینہ کے نسخہ کی نقل لے کر ۱۳۴۵ھ میں محبوب المطابع دہلی سے اس کو شائع کیا تھا، عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے، اس میں حدیث کے ناقلین اور راویوں کے مراتب وفضائل کے متعلق احادیث وآثار اور علمائے اسلام کے اقوال درج کیے گئے ہیں۔

٦٩-كتاب غنية المقتبس في تمييز الملتبس: اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اس کو ۱۳۳۵ھ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ نے حیدر آباد میں نقل کرایا تھا، یہ کسی شخص کے استفسار میں لکھی گئی ہے اور اس میں مشتبہ ناموں کے بارے میں اشتباہات کو رفع کیا گیا ہے، ۱۲ جزوں پر مشتمل ہے اور رجال پر مفید کتاب ہے۔

٧٠، ٧١-كتاب تلخيص المتشابه في الرسم وحماية ماأشكل منه عن نوادر التصحيف والوهم: یہ رجال پر ایک ضخیم کتاب ہے، علاء الدین بن علی بن عثمان ماروینی نے اس کا مختصر لکھا تھا، راویوں کے نام ونسب اور ان کے واقعات واخبار کی تحقیق کے لحاظ سے یہ بڑی مفید کتاب ہے، اس کا قلمی نسخہ سات سو صحیفے میں کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے مگر ناقص الآخر ہے،(۱) خود مصنف نے تالی التلخيص یا

(۱) کشف الظنون ج ا ص ۳۲۳ وجلد ۲ ص ۹۷ وتاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۲ ص ۳۲۵۔

باقي التلخيص کے نام سے اس کا ایک ضمیمہ بھی لکھا تھا۔

۷۲- كتاب الكفاية: تیرہ جزوں پر مشتمل مصطلحاتِ حدیث میں اہم کتاب ہے، اس میں روایات واحادیث کے اصول وضوابط کے متعلق اصحابِ فن اور محدثین کے اقوال سنداً بیان کیے گئے ہیں جن مباحث میں علمائے جرح وتعدیل کے اختلافات منقول ہیں، ان کو درج کر کے ان کے متعلق اپنی ترجیحی رائے تحریر کی اور بعض مبہم اقوال کا مفہوم اور دقیق استدلال کی تشریح بھی کر دی ہے، اس کی جامعیت واہمیت کے متعلق حافظ ابن حجر جیسے ماہر فن کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ''مصطلحاتِ حدیث میں قاضی ابومحمد رامہرمزی نے سب سے پہلے المحدث الفاصل لکھی لیکن اس میں استیعاب سے کام نہیں لیا گیا ہے، اس کے بعد ابوعبداللہ حاکم کی تصنیف ہے لیکن یہ مہذب ومرتب نہیں، ابونعیم نے حاکم کی کتاب کا مستخرج لکھا لیکن اس میں بھی آئندہ آنے والے کے لیے بعض چیزیں چھوڑ دی گئی ہیں، ان لوگوں کے بعد خطیب نے قوانینِ روایت میں کفایہ اور آدابِ روایت میں الجامع لآداب الراوی والسامع لکھی، حدیث سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں ان کی علاحدہ تصنیف نہ ہو، ابوبکر بن نقطہ کا بیان ہے کہ جو شخص انصاف سے ان کی کتابیں پڑھے گا اس کو معلوم ہوگا کہ خطیب کے بعد کے محدثین ان کی کتابوں کے محتاج ہیں۔''

اس کے قلمی نسخے برلین، لیڈن، مصر اور ہندوستان میں حیدرآباد، سندھ اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، خدابخش لائبریری پٹنہ کا نسخہ بڑا گرانقدر ہے، یہ سلطان صلاح الدین کے بیٹے احمد کی ملکیت میں رہ چکا ہے، اس پر شہزادہ کی خودنوشتہ تحریر ہے، یہ بہت سے محدثین اور علما کے استعمال میں بھی رہا ہے۔

حیدرآباد کے دائرۃ المعارف نے ۱۳۵۷ھ میں اس کا متن مختصر حواشی کے ساتھ

شائع کیا ہے، تعداد صفحات ۴۵۱ ہے، چند صفحوں میں خطیب کے حالات وکمالات دیے گئے ہیں، تصحیح ومقابلہ کا کام مولانا سید ہاشم ندوی مرحوم نے اپنے بعض رفقا کی معاونت سے انجام دیا ہے۔

۳۷- **تاریخ بغداد:** خطیب کی سب سے ضخیم، عظیم الشان اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ اگر ان کی اور تصنیفات نہ بھی ہوتیں تو تنہا یہی کتاب ان کے فخر وشرف اور فضل وکمال کے لیے کافی تھی اور اس سے ان کے علمی تبحر ووسعت مطالعہ اور دقتِ نظر وغیرہ کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے، خطیب کو خود بھی اس کتاب پر بجا طور سے فخر تھا، پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے اس کی مقبولیت کے لیے خدا سے جو دعا مانگی تھی وہ قبول ہوئی اور تاریخ بغداد کو بے نظیر اور حیرت انگیز حسنِ قبول حاصل ہوا، بغداد کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، خطیب کو اولیت کا شرف بھی حاصل نہیں ہے تاہم اس کے جیسی شہرت ومقبولیت کسی کے حصہ میں نہیں آئی، خطیب اس کے موضوع ومحتویات کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب مدینۃ السلام (بغداد) کی تاریخ ہے، اس میں اس کی آبادی اور تعمیر کا ذکر اور یہاں کے مشاہیر واعیان، واردین، علما وفضلا کا تذکرہ ہے۔(۱)

دوسری جگہ اس کی نوعیت وترتیب وغیرہ کے متعلق مزید تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس میں دارالسلام بغداد کے خلفا، اشراف، کبرا، قضات، فقہا، محدثین، قرا، زہاد، صلحا اور اربابِ شعر وادب کا ذکر ہے جو لوگ یہاں پیدا ہوئے، یا پیدا تو کسی دوسری جگہ ہوئے لیکن یہاں سکونت اختیار کرلی یا جو یہاں کی سکونت ترک کرکے دوسری جگہ فوت ہوئے، یا دوسرے مقامات کے جو لوگ یہاں آئے، ان سب کا نیز بغداد کے مضافات اور نواح میں رہنے والوں کا اس میں تذکرہ ہے، ان کی کنیت، حسب ونسب، ان کے مشہور واقعات، مناقب وفضائل، مدت

(۱) تاریخ بغداد ج ۱ص ۳۔

عمر، تاریخِ وفات اور عام حالات غرض ان لوگوں کے بارے میں جو روایتیں بزرگوں سے محفوظ و منقول چلی آ رہی ہیں سب جمع کر دی گئی ہیں، خواہ ان کا تعلق مدح و قبول اور تعدیل سے ہو یا ذم و قدح یا جرح سے، ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے لیکن جن لوگوں کا نام محمد ہے، ان کا تبرک کے خیال سے میں نے پہلے ذکر کیا ہے''(۱)

اس زمانہ کے دستور کے مطابق خطیب نے حالات و واقعات بسلسلۂ روایت واسناد لکھے ہیں، اس کے اسلوب و طریقۂ بیان کے متعلق نامور مبصر و فاضل اجل مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم لکھتے ہیں:

''تاریخِ خطیب جس طرح بہترین زمانہ کی تاریخ ہے، اسی طرح طرز بیان کے لحاظ سے مسلمان مورخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معانی استعمال کیے ہیں، عبارت آرائی مدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح و تعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکۃ الآرا مقامات میں قوتِ فیصلہ کی کمی نمایاں ہے، محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ، منطقیانہ تذبذب پاس نہیں۔'' (معارف ج ۳۲ عدد ۲ ص ۱۰۸)

پہلی جلد کا نصف حصہ بغداد کے متعلق مختلف النوع علمی، فقہی، کلامی اور تاریخی معلومات پر مشتمل ہے، مثلاً بغداد کی زمین کی بیع و شرا اور اس کی پیداوار کا کیا حکم ہے، چونکہ حضرت عمرؓ نے سواد (عراق) کی زمین کو مسلمانوں کے لیے وقف فرمادیا تھا، اس لیے اس پر مالکانہ قبضہ و تصرف فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک ناجائز و مکروہ ہے، بعض علما کو اسی لیے بغداد کی سکونت میں کلام تھا، خطیب نے اس مبحث پر موافق و مخالف دونوں پہلوؤں سے مبسوط بحث کی ہے اور فیصلہ جواز کے حق میں دیا ہے، دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۱۲ و ۲۱۳۔

حضرت عمرؓ نے ارضِ سواد فاتحین میں تقسیم کیوں نہیں فرمایا، اسی سلسلہ میں عہدِ فاروقی کے بندوبستِ آراضی کا ذکر آتا ہے، اس بیان میں بندوبست شدہ آراضی کی شرح لگان، پیداوار کی قسمیں، تعداد رقبہ وغیرہ سب کچھ آ گیا ہے، آگے ایک باب میں ان روایتوں کا ذکر ہے جو بغداد کی مذمت سے متعلق ہیں، مصنف نے ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد ان پر بحث وتنقیح کر کے ان کو ضعیف وسقیم قرار دیا ہے، اس کے بعد بغداد کے مناقب اور اہل بغداد کے اوصاف کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں بغداد کی معتدل آب وہوا اور ساکنینِ بغداد کی عقل واخلاق کی تعریف اور ان کے علمی کارناموں اور خدمات حدیث کا تذکرہ ہے، پھر بغداد کی دو مشہور نہروں دجلہ وفرات کے فوائد ومنافع کا ذکر ہے، اس کے بعد بغداد کی وجہ تسمیہ کا بیان شروع ہوتا ہے اور بانی بغداد، ابوجعفر منصور عباسی کے حالات ومناقب، بغداد کی بناء، سن تعمیر، مصارفِ تعمیر، طریقۂ تعمیر، پایہ تخت حکومت، محل شاہی، بازاروں، محلات، شوارع، مساجد، مقابر اور پلوں کا ذکر ہے، تعمیر میں جو ترمیمات اور اضافے ہوئے ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بغداد سے متصل ہی چوں کہ مدائن واقع ہے، اس لیے اس کے متعلق بھی معلومات بیان کیے گئے ہیں اور مدائن کا تذکرہ ان پچاس صحابہ کرام کے ذکر کی تقریب بن گیا ہے، جن کے قدوم سے مدائن مشرف ہوا تھا، مدائن کے اسی شرف ومزیت کی بناء پر اس کا بغداد سے متصل دیگر قصبات نہروان وانبار وغیرہ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس تاریخ میں مدائن ہی کے تعلق ومناسبت سے صحابہ کرام کا تذکرہ شامل ہے، ورنہ بغداد میں کسی صحابی کا آنا ثابت نہیں ہے، اس کے بعد بغداد کے ساکنین، واردین وصادرین کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو چودہ جلدوں پر جا کر تمام ہوتا ہے۔

تاریخِ بغداد صرف رجالِ بغداد کا ترجمہ وتذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ رجال کے حالات کے ضمن میں علمی دقائق اور مجتہدانہ مباحث بھی محدثانہ قوت کے ساتھ حل کیے گئے

ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

فكتب على طريقة المحدثين	اس میں محدثین کے انداز اور طریقہ
جمع فيه رجالها ومن	کے مطابق بغداد کے رجال و واردین کا
وردبها وضم اليه فوائد جمة	تذکرہ اور دیگر بے شمار فوائد شامل کئے
فصار كتابا عظيم الحجم	ہیں، اس لیے یہ کتاب نہایت ضخیم اور
والنفع۔ (۱)	پر منفعت ہوگئی ہے۔

بغداد کے لوگوں کے تذکرہ کی ابتدا تبرکاً محمد کے نام سے کی ہے اور سب سے پہلے محمد بن اسحاق صاحب سیرت کا ذکر کیا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ ان سے زیادہ کوئی کبیر السن، عالی الاسناد اور قدیم العہد شخص نہ تھا۔ (۲)

ان کو تاریخِ بغداد کی ترتیب اور اہل بغداد کا تذکرہ لکھنے کا خیال غالبًا حافظ ابوالفضل صالح بن احمد تمیمی کے اس قول کی وجہ سے ہوا کہ "طالب حدیث کے لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اپنے شہر کی کتب حدیث اور ان کے مؤلفین کے حال سے آغاز کرے اور ان کی فہم میں ملکہ بہم پہنچائے تاکہ صحیح وسقیم کی مکمل معرفت حاصل ہو، اس کے بعد دوسرے شہروں کو لے۔" (۳)

پہلے گذر چکا ہے کہ خطیب نے رجال کی مدح وثنا، ذم وقدح، قبول ورد اور جرح وتعدیل کے بارے میں جو کچھ منقول ہے، سب جمع کر دیا ہے، اس لیے بعض ائمہ واساطینِ فن کے مناقب وفضائل کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق نقد وجرح کے اقوال بھی تحریر کیے ہیں، اسی حیثیت سے حنفی مذہب کے اساطین ثلثہ امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے بارے میں بھی مدح ومنقبت اور ردوجرح پر مشتمل اقوال نقل ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ خطیب کی اپنی رائے نہیں ہے بلکہ وہ ان حضرات کے عظمت شناس اور کمالات کے معترف تھے، رہے

(۱) کشف الظنون ج اص۲۲۱ (۲) تاریخ بغداد ج اص۲۱۴ (۳) ایضاً۔

مخالفانہ اقوال تو وہ محض مورخانہ فرض ادا کرنے کے لیے جمع کیے گئے ہیں۔

تاریخ بغداد سات ہزار آٹھ سو اکتالیس مشاہیر رجال کا جو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں تذکرہ ہے، یہ مصر سے مختصر حاشیوں کے ساتھ ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں چودہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، رجال کی فہرست اور صفحے پر سطروں کا شمار بھی دیا گیا ہے، صفحات کی تعداد ۶۷۹۱ ہے، اس میں فہرست کے صفحے بھی شامل ہیں۔

ذیول: اس تاریخ کی اہمیت کی وجہ سے اس کے متعدد ذیول لکھے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱- امام ابوسعد عبدالکریم سمعانی صاحب کتاب الانساب (م۵۶۲ھ) نے خطیب کے نہج واسلوب پر پندرہ جلدوں میں ذیل لکھا۔

۲- عماد الدین ابوعبداللہ محمد بن حامد کاتب ووزیر (م۵۹۷ھ) نے سمعانی کے ذیل پر تین جلدوں میں ذیل لکھا، اس میں اس پر بعض اضافے کیے ہیں۔

۳- ابوعبداللہ محمد بن سعید المعروف بابن الدبیثی وسطی (م۶۳۷ھ) کے ذیل میں بھی سمعانی کے ذیل پر اضافے ہیں۔

۴- ابن قطیعی نے ابن دبیثی کے ذیل پر ایک ضمیمہ لکھا۔

۵- حافظ شمس الدین ذہبی (م۷۴۸ھ) نے ابن دبیثی کے ذیل کی تلخیص واختصار کیا اور اس کا نام المختصر المحتاج الیہ من تاریخ بغداد رکھا۔

۶- تاریخ خطیب کا سب سے طویل وضخیم ذیل حافظ محب الدین محمد بن محمود المعروف بابن النجار بغدادی (م۶۶۳ھ) نے لکھا اس میں مذکورہ بالا تمام ذیول کے مقابلہ میں زیادہ اضافے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ تیس جلدوں میں ہے۔

۷- ابن نجار کے ذیل پر تقی الدین محمد بن رافع متوفی ۷۷۴ھ نے عمدہ اور بہتر ذیل لکھا۔

۸- ابن نجار کے ذیل پر ابوبکر مارستانی کا بھی ایک ذیل ہے۔

۹- مارستانی کے ذیل پر تاج الدین علی بن انجب شاعر بغدادی نے ایک ذیل لکھا۔

۱۰- خطیب کے شاگرد ابوالیمن مسعود بن محمد بخاری (م ۴۹۱ھ) نے تاریخ کا مختصر اور خلاصہ لکھا، اس کا قلمی نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں ہے، جو فلسکیپ سائز کے ۳۸۱ صفحے پر مشتمل ہے۔(۱)

۱۱- مشہور مستشرق (Salomon) نے تاریخ خطیب کے شروع کے حصہ کو جس میں بغداد کے نام اور تاریخ بناء وغیرہ کا ذکر ہے اور جس کی حیثیت مقدمہ کی ہے، ۱۹۰۴ء میں پیرس سے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

۱۲- تاریخ خطیب جب پہلی دفعہ شائع ہوئی تو نواب صدر یار جنگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے معارف کے کئی نمبروں میں اس پر ایک مبسوط، پرمغز اور معلومات افزا تبصرہ لکھا جو ۳۷ء میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے، اس میں پہلے خطیب کے مختصر و جامع حالات ہیں، اس کے بعد تاریخ بغداد کے خصوصیات اور اس کے مندرجات و مشمولات کا تعارف اور آخر میں اس کے بعض حصوں پر مدلل اور جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۳- امام محمدی: مولوی محمد صاحب اڈیٹر اخبار محمدی دہلی نے اس میں تاریخ بغداد سے امام ابوحنیفہؒ کے ترجمہ و سوانح حیات کا حصہ علاحدہ جمع کر کے اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۴۵ھ میں دہلی سے شائع کیا تھا، یہ امام صاحب کے ردوقدح اور مناقب و مثالب دونوں پر مشتمل ہے، معلوم نہیں اس کی اشاعت کی ضرورت ہی کیا تھی؟

تاریخ بغداد کی غیر معمولی شہرت اور حیرت انگیز مقبولیت کے باوجود اس پر بعض اعتراضات کیے گئے ہیں اور اس کے رد میں مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان کتابوں میں

(۱) یہ کتب خانہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا ہے۔

اکثر کا تعلق ان جرحوں سے ہے جو رجال خصوصاً امام ابوحنیفہ وغیرہ کے متعلق اس میں نقل کی گئی ہیں۔

۱-السهم المصيب في رد الخطيب: اس کو سلطان (۱) عیسیٰ بن ابوبکر ایوبی نے ۶۲۱ ھ میں خطیب کے رد اور امام ابوحنیفہ کی تائید کے لیے تالیف کیا تھا، طرز بیان الجھا ہوا ہے، مولانا اعزاز علی دیوبندی مرحوم نے جدہ کے قلمی نسخہ سے نقل کر کے اس کو ۱۳۵۰ھ میں مطبع جامعہ ملیہ دہلی سے شائع کیا تھا۔

۲-الانتصار لامام ائمة الامصار: ابوالمظفر یوسف بن عبداللہ المعروف بسبط ابن الجوزی نے دو جلدوں میں امام ابوحنیفہ کی تائید اور خطیب کی تردید کی ہے۔

۳-جامع المسانيد: اس کے مقدمہ میں ابوالموید الخوارزمی نے خطیب کا رد لکھا ہے۔

۴-تانيب الخطيب: یہ مصر کے مشہور محقق و نامور فاضل محمد زاہد بن حسن کوثری کی تصنیف ہے، اس میں امام ابوحنیفہ اور مذہب حنفی کے اساطین ابویوسف، محمد بن حسن اور حسن بن زیاد کے متعلق خطیب کے بیانات کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے اور ان روایتوں کو جو ان بزرگوں کے رد و قدح اور جرح و ذم سے متعلق ہیں، غیر صحیح قرار دیا گیا ہے، مصنف نے ان روایتوں کو جن کو خطیب نے مورخانہ فرض و دیانت سمجھ کر نقل کیا تھا اور ان کے بارے میں معذرت کر دی تھی، خود خطیب کی رائے قرار دیا ہے، اسی غلط فہمی نے ان کی تحریر میں مناظرانہ رنگ پیدا کر دیا ہے اور انھوں نے خطیب پر بعض ناروا ذاتی تنقیدیں بھی کی ہیں، خطیب کا تعصب مسلم سہی مگر ان کو امام ابوحنیفہ کی عظمتِ شان میں کلام نہ تھا۔

کوثری صاحب نے خطیب کے بارے میں اس انصاف سے بھی کام نہیں لیا جو خطیب نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں کیا تھا، چنانچہ انھوں نے خطیب کے ترجمہ میں

(۱) صاحب کشف الظنون نے اس کا نام عیسیٰ بن ابوبکر ایوبی حنفی (م ۶۲۴ ھ) لکھا ہے۔ (جلد ۲)

صرف ان کے مثالب ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس ضمن میں بعض غیر معتبر واقعات کو زیادہ نمایاں طور پر پیش کر کے تاریخ کو جھوٹ پوٹ کا انبار اور خطیب کی بدنیتی پر مبنی قرار دے کر ان کے علمائے جرح و تعدیل میں شمار کیے جانے کو خلافِ انصاف قرار دیا ہے، اس کتاب کے جواب میں بھی بعض کتابیں لکھی گئی ہیں، دائرۃ المعارف العثمانیہ کے ایک مصحح مولانا عبدالرحمٰن بن یحییٰ معلمی یمانی نے بھی جواب تحریر کیا تھا، جو ہماری نظر سے نہیں گذرا مگر کوثری صاحب کا جواب الجواب ہم نے دیکھا ہے، تانیب الخطیب دو سو صفحے پر مشتمل ہے اور ۱۹۴۲ میں مصر سے شائع ہوئی ہے۔

خطیب پر بعض اعتراضات: دوسرے اکابر علما کی طرح خطیب اور ان کی تصنیفات پر بھی اعتراضات ہوئے ہیں، ذیل میں ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔تعصب: خطیب پر زیادہ اہم اعتراض یہ ہے کہ ان کو حنبلی و حنفی مذہب سے سخت کد تھا، حنبلی مذہب سے عناد کا ذکر حافظ ابن جوزی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''خطیب پہلے حنبلی تھے لیکن مبتدعین (۱) کے بارے میں نرم اور ان کی جانب مائل تھے، اس لیے حنابلہ ان کے درپے آزار ہوئے، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے شافعی مسلک اختیار کر لیا اور اپنی کتابوں میں جہاں ممکن ہوا ہے، اشارۃ و صراحۃ امام احمدؒ، ان کے تلامذہ اور حنبلی مذہب کے خلاف تعصب سے کام لیا ہے،
>
> مثلاً:
>
> انھوں نے امام احمدؒ کو سید المحدثین اور امام شافعی کو تاج الفقہا لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امام احمد کے تفقہ و اجتہاد کے معترف نہ تھے، حسین

(۱) غالباً اس سے اشاعرہ متکلمین مراد ہیں جن کے متعلق خطیب کی نرمی و مداہنت کا ذکر کیا جاتا ہے اور اگر اہل بدعت واقعتاً مراد ہیں تو خطیب کے ان کی جانب میلان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ حنابلہ کی غلط فہمی اور شدت پسندی کا نتیجہ ہے۔

کرابیسی کے ترجمہ میں امام احمد کے متعلق ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

ایش نعمل بهذا الصبی ان قلنا لفظنا بالقرآن مخلوق قال بدعة وان قلنا غیر مخلوق قال بدعة. (۱)	آخر ہم کیا کریں! اگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارا تلفظ بالقرآن مخلوق ہے تو یہ (امام احمد) اس کو بدعت کہتے ہیں اور اگر ہم اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں تب بھی وہ اس کو بدعت بتاتے ہیں۔

اسی طرح امام احمد کے بعض اصحاب وتلامذہ کے بارے میں بھی خطیب کے ردوقدح کی بعض مثالیں تحریر کی ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور حنفی مذہب کے خلاف خطیب کے تعصب کا مولانا عبدالرشید نعمانی نے اس طرح ذکر کیا ہے:

''امام ابوحنیفہ سے سخت عداوت ونفرت رکھنے والوں میں خطیب بھی ہیں، علامہ محمد معین سندھی دراسات اللبیب میں لکھتے ہیں:

''امام دارقطنی کی طرح خطیب بغدادی بھی امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں مفرط وغالی تھے لیکن ان کی اور ان کے متبعین کی رائے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ امام ابوحنیفہؒ کی توثیق، جلالت قدر اور عظیم مرتبہ ومنقبت پر مکمل اتفاق ہے۔''

حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہ کی عظمتِ شان کو مجروح کرنے والے ان بیانات سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، جو خطیب بغدادی نے نقل کیے ہیں، انھوں نے امام صاحب کے مداحوں کی رائیں بھی تحریر کی ہیں، لیکن آخر میں مذمت کرنے والوں

---

(۱) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۷، ۲۶۸۔

کے اقوال ذکر کر کے اپنی کتاب میں زبردست دھبہ لگا دیا ہے۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"ابن القطان خطیب کی طرح امام ابوحنیفہ کے معاملہ میں مفرط تھے، اس لیے امام صاحب کے بارے میں ان دونوں کی جرحیں خواہ مفسر ہی کیوں نہ ہوں قبول نہیں کی جائیں گی، درحقیقت یہ دونوں خود اسی غلو اور افراط شنیع کی وجہ سے مجروح ہو گئے ہیں۔(۱)

تعصب کے متعلق ان بیانات کی تنقیح سے پہلے یہ وضاحت کر دینا مناسب ہوگا کہ خطیب کے زمانے میں فقہی و جماعتی عصبیت میں قدرے شدت پیدا ہو گئی تھی، بلکہ ان کے بعد بغداد حنابلہ اور شوافع کی معرکہ آرائیوں کا مرکز بھی بن گیا تھا، اگر حافظ ابن جوزی کا یہ بیان صحیح مان لیا جائے کہ وہ ابتداءً حنبلی تھے تو اس مذہب کے خلاف ان کا ردعمل بالکل قدرتی امر ہے لیکن یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ان جیسے صاحب علم وکمال شخص نے محض حنابلہ کی سختیوں سے تنگ آ کر اپنی رائے کو تبدیل کر دیا ہو، یہی وجہ ہے کہ عام مورخین نے اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، البتہ یہ ضرور مسلم ہے کہ شافعی ہونے کی بناء پر حنابلہ نے خطیب کو زدوکوب کیا تھا اور یہ بات بھی درست ہے کہ حنابلہ سخت گیری اور تشدد کے لیے مشہور ہیں، اس کے برخلاف خطیب کے مزاج میں نرمی، اعتدال اور توسع پسندی تھی، اس لیے حنابلہ سے ان کی ہم آہنگی مشکل تھی۔

ان حالات میں خطیب کے اندر اگر اشتعال پیدا ہو گیا ہو اور وہ دوسرے مذاہب کے خلاف یک گونہ عصبیت سے کام لیتے رہے ہوں تو یہ بعید نہیں ہے لیکن اس کی جو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ان سے خطیب کا تعصب ثابت نہیں ہوتا، اس کی وجہیں حسب ذیل ہیں:

خطیب کو امام احمد کے فقیہ و مجتہد ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا، انھوں نے

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲ بحوالہ ذب ذبابات الدراسات ص ۴۴۴۔

امام احمد کے ترجمہ میں کئی جگہ ان کے تفقہ و اجتہاد کا ذکر کیا ہے، خود امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''میں نے جب بغداد چھوڑا تو وہاں اس وقت امام احمد سے بڑا صاحبِ ورع و تقویٰ اور فقیہ و عالم شخص کوئی نہیں تھا۔'' اسی طرح اور بھی متعدد اصحابِ علم و فن کے ایسے بیانات نقل کئے ہیں جن سے امام احمد کی فقہ و اجتہاد میں عظمت و مرتبت پوری طرح واضح ہوتی ہے، اس بنا پر یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امام احمد کے تفقہ و اجتہاد کے معترف نہیں تھے، البتہ یہ ممکن ہے کہ اکثر متقدمین کی طرح خطیب کو ان کے امامِ فقہ و صاحب مذہب ہونے میں کلام رہا ہو، کیوں کہ چوتھی صدی ہجری تک امام صاحب کی اس حیثیت سے شہرت نہیں ہوئی تھی، علامہ ابن جریر نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ (انما هو رجل حديث لا رجل فقه) خطیب کے معاصر اور مشہور مالکی محدث علامہ ابن عبدالبر نے انتقاد میں صرف ائمہ ثلاثہ کے تذکرہ پر اکتفا کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہا کے بجائے محدثین کے زمرہ میں شامل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں امام احمد کی اصل شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ تھی لیکن بعد میں وہ امام فقہ اور صاحبِ مذہب کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے اور یہ شہرت اس قدر بڑھی کہ اب لوگ ان کو محدث کے بجائے فقیہ و مجتہد ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، چنانچہ ساتویں صدی میں فقہائے ثلاثہ کے ساتھ ان کا بھی نام لیا جانے لگا اور وہ ان چار مشہور ائمۂ اسلام اور فقہائے مجتہدین میں شمار کئے جانے لگے، جن کے فقہی و اجتہادی مذاہب پر مسلمانوں کا اب تک عمل ہے، اس کی تفصیل اس کتاب کی پہلی جلد میں امام احمد کے تذکرہ میں گذر چکی ہے، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بس خطیب کا امام احمد کو امامِ فقہ و اجتہاد کی حیثیت سے ذکر نہ کرنا ان کی عظمت شان کے منافی ہے اور نہ اس سے ان کا مقصد امام احمد کا استخفاف ہے، رہی وہ رد و قدح جو مثالاً پیش کی گئی ہے تو اس کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ ''خطیب نے واقعات

واقوال کو ذکر کرنے میں مورخانہ فرض و دیانت سے کام لیا ہے، اس لیے جہاں ائمہ اور رجال کے مناقب سے متعلق اقوال جمع کیے ہیں وہیں مخالفانہ اور نقد و جرح سے متعلق آرا بھی تحریر کیے ہیں، اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خود خطیب اس کے قائل تھے یا یہ واقعی ان کی رائے تھی۔

اس حیثیت سے حسین کرابیسی کا قول امام احمد کے متعلق صرف بطور واقعہ نقل کیا گیا ہے، اس کا مقصد ان کی مذمت وتنقیص نہیں ہے، امام احمد اور کرابیسی کے درمیان عقائد کے سلسلہ میں شدید اختلافات تھے، اس سلسلہ میں دونوں میں بعض مناقشات بھی ہوئے، امام احمد ان کے سخت نکتہ چیں تھے، دوسرے محدثین نے بھی کلام سے دلچسپی کی وجہ سے کرابیسی کے بارے میں ردوقدح کی ہے، امام احمد خلق قرآن کے باب میں جس قدر متشدد تھے، اس کا حال پہلی جلد میں گذر چکا ہے لیکن کرابیسی پر خلقِ قرآن کا الزام عائد کیا گیا ہے، خطیب نے مورخ کی حیثیت سے ان باتوں کا تذکرہ کیا ہے، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص نے کرابیسی سے دریافت کیا کہ قرآن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا وہ غیر مخلوق ہے، اس شخص نے پوچھا کہ جو قرآنی الفاظ آپ کے منہ سے ادا ہوتے ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کرابیسی نے جواب دیا کہ وہ مخلوق ہیں، اس شخص نے امام احمد سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے اس پر ردونکیر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بدعت ہے، سائل نے دوبارہ کرابیسی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے تلفظ بالقرآن کو غیر مخلوق قرار دیا، چنانچہ اس شخص نے امام احمد کو کرابیسی کے رجوع کی خبر دی، انھوں نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے اس کو بھی بدعت قرار دیا ہے۔(۱)

---

(۱) غالباً امام احمد نے یہ جواب اس لیے دیا ہوگا کہ محدثین اور متدین علما ان مباحث میں غور وخوض سے بھی محترز رہتے تھے اور اس کو سخت ناپسند کرتے تھے، چنانچہ امام بخاری جب نیشاپور تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں نے اس کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے تلفظ بالقرآن کو (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

شخص مذکور نے جب کرابیسی سے امام صاحب کی رائے کو بیان کیا تو انھوں نے کہا آخر ہم کیا کریں، اس شخص کا منشا کیا ہے، ہم اگر کہتے ہیں کہ تلفظ بالقرآن مخلوق ہے تو وہ اس کو بدعت قرار دیتا ہے اور اگر غیر مخلوق کہتے ہیں تب بھی بدعت ہی قرار دیتا ہے، جب امام احمد اور ان کے تلامذہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ لوگ بہت برہم ہوئے اور ان لوگوں کی حسین پر نکتہ چینی کی یہی وجہ ہے۔(۱)

ظاہر ہے اس واقعہ کا امام احمد کی تنقیص سے کوئی تعلق نہیں ہے، خطیب کا اگر واقعی کوئی جرم ہے تو وہ محض نقلِ حکایت اور بیان واقعہ، اب واقعہ کی صحت وعدمِ صحت تو قابلِ بحث ہو سکتی ہے لیکن مجرد اس کے نقل کو اعتراض کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، اگر دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کرابیسی اور امام احمد کے اختلافات کے درمیان خطیب کا رجحان امام احمد کے موقف کی جانب تھا، اگر چہ انھوں نے کرابیسی کے بعض کمالات کا اعتراف کیا ہے لیکن کلام کے متعلق ان کی رایوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، اسی لیے خاص طور پر اس کے متعلق محدثین اور اہلِ فن کی جرحیں اور کرابیسی کے بارے میں بعض علما کے سخت آرا تحریر کیے گئے ہیں۔(۲)

اس کے مقابلہ میں امام احمد کی تعریف میں وہ نہایت رطب اللسان نظر آتے ہیں، چنانچہ ان کے ترجمہ میں ان کے جملہ محامد وفضائل اور خدماتِ حدیث کا مفصل تذکرہ کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل امام احمد کی محبت وعقیدت سے معمور وسرشار تھا، جس شخص نے امام احمد کے متعلق اس قسم کے اقوال نقل کیے ہیں:

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مخلوق بتایا، اس پر سخت ہنگامہ برپا ہوگیا اور امام ذہلی نے جن کو اس مسئلہ میں بڑا غلو تھا یہاں تک کہا کہ ''جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرے منھ سے نکلنے والے قرآنی الفاظ مخلوق ہیں وہ بدعتی ہے، نہ اس کے پاس بیٹھنا چاہیے اور نہ اس سے گفتگو کرنی چاہیے۔'' (طبقات الشافعیہ ترجمہ بخاری)

(۱) تاریخ بغداد ج ۸ص ۶۵ (۲) ایضاً۔

من سمعتموه يذكر احمد بن حنبل بسوء فاتهموه على الاسلام.

اگر کسی شخص کو امام احمد کا تذکرہ برائی سے کرتے ہوئے سنو تو اس کے اسلام پر تہمت عائد کرو۔

آگے لکھتے ہیں:

''امام احمد کی ذات مبارک ایسی کسوٹی ہے جس پر مسلم وکافر کو پرکھا جاسکتا ہے، ان کی مذمت کرنے والا فاسق ہے۔''

نیز فرماتے ہیں:

اضحى ابن حنبل معنة مامونة ويحب احمد يعرف المتنسك
واذا رأيت لاحمد متنقصا فاعلم بان ستوره ستهتك (۱)

(یعنی امام ابن حنبل کی ذات درحقیقت ایک ابتلا وآزمائش ہے، ان کی محبت زہد وتقویٰ کی علامت ہے، اگر کوئی شخص ان پر نکتہ چینی کرے تو سمجھ لو کہ اس کا پردہ چاک ہوکر رہے گا۔)

اس کے دل میں اس امام جلیل کے استخفاف اور نکتہ چینی کا خیال بھی کس طرح آسکتا ہے، اگر واقعی ایسا ہوتا تو وہ ان کی مذمت کے متعدد واقعات واقوال تحریر کرتے لیکن معترضین کو تاریخ بغداد جیسی ضخیم کتاب میں خوردہ گیری کے باوجود اس کے سوا اور کوئی مثال نہیں مل سکی جو بالکل بے بنیاد ہے، یہی حال ان الزامات کا بھی ہے جو ان پر امام احمد کے تلامذہ کی نکتہ چینی کے بارے میں لگائے گئے ہیں، اس لیے ان کی بحث وتنقیح کو غیر ضروری سمجھ کر ہم نے نظر انداز کر دیا، کتاب الکفایہ کے آخر میں خطیب کے سوانح نگار نے لکھا ہے۔

ثم ذكر امثلة ممازعمه تعصبا من الخطيب على الحنابلة ومن نظر بعيني الانصاف

ابن جوزی نے اپنے گمان کے مطابق خطیب کے حنابلہ کے بارے میں تعصب کی جو مثالیں بیان کی ہیں، اگر

(۱) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲۰ و ۴۲۱۔

لم یجد فیها مثالا واحدا یظهر منه التعصب۔ (۱)	ان پر کوئی شخص انصاف سے غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی مثال سے بھی ان کا تعصب ظاہر نہیں ہوتا۔

امام ابوحنیفہؒ کے خلاف خطیب کے تعصب کی بنیاد تاریخ بغداد کے ان بیانات کو قرار دیا گیا ہے۔ جو ان کے ترجمہ میں درج ہیں، لیکن اس کے متعلق یہ وضاحت پہلے کی جاچکی ہے کہ خطیب نے ایک مورخ کی حیثیت سے وہ سب اقوال و بیانات جمع کر دیئے ہیں جو انھوں نے سنے تھے یا جن کا ان کو علم ہوا تھا، خواہ ان کا تعلق مناقب ومحامد سے ہو یا مثالب ومعائب سے، علاوہ ازیں انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق جو جرحیں تحریر کی ہیں ان کے بارے میں پہلے ہی معذرت کر دی ہے، نیز انھوں نے کہیں سے اس کو ظاہر نہیں ہونے دیا ہے کہ یہ ان کی اپنی رائے بھی تھی، بلکہ اس کے برعکس وہ امام صاحب کی جلالتِ قدر کے پوری طرح معترف معلوم ہوتے ہیں، البتہ چوں کہ محدثین کی ایک جماعت امام ابوحنیفہ کو حدیث میں زیادہ بلند پایہ نہیں سمجھتی تھی، اس لیے اس سے ان کے متعلق بعض سخت رائیں منقول ہیں، ممکن ہے، خطیب پر اس کا اثر رہا ہو، نیز چوں کہ ان کے زمانہ میں جماعتی عصبیت کا رجحان پیدا ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے ممکن ہے ان کے اندر بھی عصبیت کا شائبہ آگیا ہو لیکن تاریخ کے ان بیانات کو اس کا ثبوت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

۲- اشاعرہ و متکلمین سے تعلق، حافظ ابن جوزی نے خطیب پر اس اعتراض کا بھی ذکر کیا ہے کہ:

''ان کو اشاعرہ و متکلمین سے بڑی شیفتگی تھی، حالاں کہ یہ محدثین کے شایان شان نہیں، حدیث میں کلام کی مذمت کی گئی ہے اور خود امام شافعیؒ سے بھی

---

(۱) خاتمہ کتاب الکفایہ ترجمۃ المؤلف۔

اس کی تردید منقول ہے۔"(۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ اشاعرہ و متکلمین سے دلچسپی اہل بدعت کی جانب میلان کا نتیجہ نہیں ہے، جیسا کہ حنابلہ نے غلطی سے سمجھا ہے، عقائد وصفات کے بارے میں خطیب کی رائے سلف کے موافق تھی، رہی امام ابوالحسن اشعری کی ہمنوائی تو یہی قدیم وجدید محدثین کا مذہب تھا محتاط اور ثقہ علما نے کلام وعقائد میں غور وخوض کو ممنوع اس لیے قرار دیا ہے کہ ان مسائل میں توغل وانہماک سے لوگ مہماتِ دین سے غافل ہو جاتے تھے۔

۳-عامیانہ جرح وتعدیل کا اعتراض: حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ "جرح وتعدیل کے معاملہ میں خطیب کا حال ان عوام محدثین کی طرح ہے جو قلت فہم کی وجہ سے خلاف واقعہ جرحیں کرتے ہیں، خطیب نے کتاب الجہر وکتاب القنوت میں غیر صحیح حدیثیں بیان کی ہیں اور مسئلہ صوم یوم الغیم کے بارے میں ایک موضوع حدیث ذکر کر کے اس سے استدلال کیا ہے اور اس کے سقم وجرح اور وضع کے بارے میں اصحابِ فن کے بیانات نہیں نقل کیے ہیں، حالاں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ جس نے جان بوجھ کر جھوٹی حدیث بیان کی وہ بھی جھوٹا ہے۔"(۲)

عامیانہ جرح وتعدیل کا الزام خطیب پر اس لیے عائد کیا گیا ہے کہ ان کو جو کچھ معلوم ہوا اور انھوں نے جو کچھ سنا اس کو بلا نقد وتبصرہ اور بلا بحث وتحقیق جمع کر دیا ہے لیکن دراصل اس معاملہ میں انھوں نے ایک مورخ کا فرض ادا کیا ہے، باقی غیر صحیح حدیثوں کے نقل واحتجاج کا جہاں تک معاملہ ہے تو اس کے بارے میں ہم کچھ تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ ان کی تصنیفات ہماری نظر سے نہیں گذریں ممکن ہے کہ انھوں نے کچھ غیر صحیح حدیثیں ذکر کی ہوں لیکن اس میں قصد وارادہ کو دخل نہیں اور نہ وہ جان بوجھ کر موضوع حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں کیوں یہ ان کے اصول ومذہب کے خلاف ہے، غیر صحیح

(۱) المنتظم ج۸ ص۲۶۹ (۲) ایضاً ص۲۶۸، ۲۶۹۔

حدیثوں سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں اور خطیب کی عظمتِ شان اگرچہ مسلم ہے لیکن پہلے گذر چکا ہے کہ ان کی تصنیفاتِ حدیث کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کو چوتھے طبقہ کی کتب حدیث میں محسوب کیا ہے، اس لیے ان میں ضعیف وساقط الاعتبار ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

۴۔ ناصبیت کا الزام: خطیب پر ایک الزام ناصبیت کا بھی ہے، اس کی وجہ پہلے گذر چکی ہے کہ جامع دمشق میں حدیث کا درس دیتے ہوئے انھوں نے فضائلِ عباس کی روایتیں بیان کی تھیں،(۱) مگر یہ ناصبیت کا کوئی ثبوت نہیں ہے کیوں کہ وہ صحابہ کے فضائل اور مراتب ودرجات کے قائل اور اہل بیت سے محبت رکھتے تھے، البتہ یہ ممکن ہے کہ فضائلِ عباس کی حدیثیں بیان کرنے کی وجہ سے چوں کہ روافض اور فاطمیہ اس قدر مشتعل ہوگئے تھے کہ وہ خطیب کو قتل کردینا چاہتے تھے، اس لیے اس اشتعال اور ان کے زمانہ میں دمشق میں شیعیت کے استیلا اور فاطمیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے ردعمل میں خطیب میں نمایاں جوش وخروش پیدا ہوگیا ہو اور انھوں نے اس معاملہ میں شدت سے کام لیا ہو جس کا ان کو خمیازہ بھگتنا پڑا تھا لیکن یہ ناصبیت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۵۔ تصنیفات کے متعلق اعتراض: ایک اعتراض یہ ہے کہ ان کی اکثر کتابیں حافظ محمد بن عبداللہ ساحلی صوری (م ۴۴۱ھ) کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں، صوری جن کتابوں کو شروع کرنے کے بعد مکمل نہیں کر سکے تھے، خطیب نے انہی کی تکمیل کی اور صوری کی کتابوں کی بنیاد پر اپنی کتابیں مرتب کیں۔(۲)

گو خطیب کی بعض کتابیں واقعتاً صوری کی کتابوں کی تخریج ہیں تاہم اس کی وجہ سے ان کی سب کتابوں کو صوری کی کتابوں کا چربہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس کے متعلق ابن جوزی کا یہ بیان قابل غور ہے:

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۷ (۲) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶۔

''ایک شخص کی نکالی ہوئی راہ پر لامحالہ دوسرے لوگ بھی چلنے ہی لگتے ہیں، اس لیے خطیب کا کسی ڈھانچہ کو اصلی قالب اور نیا رنگ وروپ دیدینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے، اصل میں یہ چیز دیکھنی چاہیے کہ ان کے کارناموں کی نوعیت کیا ہے؟ سو اس حیثیت سے خطیب کسی طرح قاصر نظر نہیں آتے، ان کی تصنیفات عدیم المثال اور بے نظیر ہیں، ان کا بغور مطالعہ کرنے سے ان کی قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ دار قطنی وغیرہ کی تصنیفات بھی اس معیار اور پایہ کی نہیں ہیں۔''(۱)

(۱) المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶۔

ابو عبداللہ محمد ابو نصر فتوح حمیدی

(المتوفی ۴۸۸ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابو عبداللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن ابو نصر فتوح بن عبداللہ بن فتوح بن حمید بن یصل۔(۱)

ولادت: حمیدی سے منقول ہے کہ میں ۴۲۰ھ سے پہلے پیدا ہوا، عام مورخین نے اسی بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ وہ ۴۲۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے تھے،(۲) لیکن صاحب اعلام نے تصریح کی ہے کہ وہ ۴۹۸ھ (مطابق ۱۰۲۷ء) میں پیدا ہوئے،(۳) ابن عماد کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "حمیدی کا انتقال تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوا،(۴) ان کا سن وفات ۴۸۸ھ ہے، اس لحاظ سے سن ولادت ۴۱۸ھ ہوگا۔

وطن: حمیدی کا اصل وطن رصافہ ہے لیکن ان کے والد میورقہ میں جو شرق اندلس کے قریب ایک جزیرہ ہے، آباد ہو گئے تھے، یہیں حمیدی کی ولادت ہوئی۔ اس جزیرہ کی نسبت سے جو اکابر منسوب ہیں ان میں حمیدی کا نام زیادہ ممتاز ہے، آخر عمر میں وہ بغداد چلے آئے تھے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔(۵)

نسبتیں: ان کی سب سے مشہور نسبت حمیدی ہے جو ان کے پردادا حمید بن یصل کی جانب

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۷ و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و کتاب الانساب ورق ۵۴۸ (۲) ایضاً (۳) اعلام ج ۳ ص ۹۲۳ (۴) شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۹۲ (۵) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۷ و المنتظم ج ۹ ص ۹۶ و معجم البلدان ج ۸ ص ۲۲۹ و بستان المحدثین ص ۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵۔

ہے، بعض مورخین نے اس کی نسبت مشہور صحابی حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کے صاحبزادے حمید کی جانب بتائی ہے مگر ابن خلکان نے اس کی تردید کی ہے۔

ان کی دوسری معروف نسبت میورقی ہے جو ان کے مولد میورقہ کی جانب ہے، ایک نسبت ازدی بھی ہے، یہ غالباً خاندان کی جانب ہوگی، وہ ظاہری بھی کہلاتے تھے، اس سے ان کے فقہی مذہب کا پتہ چلتا ہے۔

مغربی اوراندلسی کی نسبتوں سے ان کا اندلسی اور مغربی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

اساتذہ: انھوں نے جن اساتذہ سے علم وفن کی تحصیل کی تھی، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن علی خطیب، ابوجعفر بن سلمہ، ابوعبداللہ قضاعی، ابوعمر بن عبدالبر، ابوغالب ابن بشران اموی، ابوالقاسم جیانی دمشقی، ابوالحسن عبدالدائم بن حسن ہلالی، ابوزکریا عبدالرحیم بخاری، عبدالصمد بن مامون، عبدالعزیز بن احمد کتانی، ابومحمد عبدالعزیز بن حسن ضراب، ابومحمد بن حزم علی بن احمد، ابوتمام علی بن محمد واسطی۔

صحیح بخاری کی مشہور راویہ کریمہ مروزیہ سے انھوں نے مکہ معظمہ میں ملاقات کی تھی، ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ ان کا ابن حزم سے خاص تعلق تھا اور وہ ان کے اجل تلامذہ میں تھے۔(۱)

تلامذہ: حمیدی کے مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابواسحق بن نبہان رمی، ابوعامر عبدری، اسماعیل بن سمرقندی، اسماعیل بن محمد طلحی، حسین بن حسن مقدسی، ابوعبداللہ حسین بن نصر، صدیق بن عثمان بربری علی بن علی امینی، ابوالفتح محمد بن بطی، محمد بن طرخان، محمد بن علی خلال، محمد بن ناصر، یوسف بن ایوب نہرانی زاہد۔

ان کے شیوخ میں خطیب نے بھی ان سے روایت کی ہے۔(۲)

(۱) ابن خلکان ج۲ص۲۸۵ وتذکرہ ج۴ص۱۷ وکتاب الانساب ورق ۵۴۸ وبستان المحدثین ص۸۲

(۲) ابن خلکان ج۲ص۲۸۵ وتذکرہ ج۴ص۱۷ کتاب الانساب ورق ۵۴۸ وبستان المحدثین ص۸۲۔

طلب علم اور سماع حدیث کے لیے سفر: حمیدی نے مشہور ممالک اسلامیہ اور مراکز حدیث کا دورہ کر کے علم وفن کی تحصیل کی اور حدیث اور اس کے متعلقہ فنون میں درک ومہارت بہم پہنچائی، اس سلسلہ میں انھوں نے اندلس، عراق، قیروان، حجاز، شام، افریقہ اور مصر وغیرہ کا سفر کیا اور ان مقامات کے علمائے فن اور ارباب کمال سے استفادہ کیا، شروع میں وہ بلاد مغرب میں مقیم رہے۔ ۴۴۸ھ میں بلاد مشرق کا سفر کیا اور پہلی دفعہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے، یہیں ان کی کریمہ مرو زیہ سے ملاقات ہوئی، وہ نہایت کم سنی میں علم وفن کی تحصیل اور حدیث کی روایت وسماع میں مشغول ہو گئے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ سب سے پہلے میں نے ۴۲۵ھ میں فقیہ اصبغ بن راشد سے سماع کیا، گو اس وقت میری عمر کم تھی تاہم ان کے سامنے جو کچھ پڑھا جاتا تھا، اس کو سمجھ لیتا تھا، (۱) صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں کہ ''وہ لوگوں کے دوش پر بیٹھ کر سماع کے لیے جاتے تھے۔'' (۲)

اشتغال علم: ان کو علم وفن سے بڑا تعلق تھا اور وہ برابر اس کی طلب وتحصیل اور نشر واشاعت میں منہمک رہتے تھے، ابن ماکولا کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ میں نے علم سے اشتغال رکھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔'' یافعی کا بیان ہے کہ وہ علم اور تحصیل علم کے دلدادہ تھے، ہمیشہ پورے شوق اور نہایت توجہ ومحنت سے علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے، یہاں تک کہ گرمی کی تکلیف دہ راتوں میں بھی وہ علمی اشغال کو انہماک کے ساتھ جاری رکھتے تھے، علم سے تعلق اور اس کی نشر واشاعت سے ان کی دلچسپی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا اور ان کا کتب خانہ طلبہ اور شائقین علم کے لیے وقف رہتا تھا۔ (۳)

---

(۱) تذکرہ ج۴ ص۱۷، العبر ج۳ ص۳۲۳، وابن خلکان ج۲ ص۲۸۵ (۲) نفح الطیب ج۱ ص۳۷۵

(۳) نفح الطیب ج۱ ص۳۷۵ و۳۷۶، ابن خلکان ج۲ ص۲۸۵، تذکرہ ج۴ ص۱۸، المنتظم ج۹ ص۹۶، مرآۃ الجنان ج۳ ص۱۴۹، شذرات ج۳ ص۳۹۲، تاریخ ابن اثیر ج۱ ص۸۸۔

ضبط وثقاہت: ان کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت میں کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، ان کے معاصرین، تلامذہ اور سوانح نگاروں نے ان کو حافظ الحافظ المشہور، الحافظ الکبیر، احد حفاظ عصرہ، ثقہ، ثبت حجت، قدوہ اور متقن وغیرہ کہا ہے۔

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حمیدی کا درجہ حدیث وروایت میں مسلم ہے، ارباب فن نے ان کو صاحب حدیث، اور حافظ مکثر کہا ہے جو اس فن میں ان کی عظمت وجلالت کا ثبوت ہے، ابن ماکولا نے ان کے تیقظ کی تعریف کی ہے، یحییٰ بن ابراہیم سلماسی فرماتے ہیں کہ ''وہ حدیث اور اس کے علل ورواۃ کے عارف وامام اور اس کے ضبط وتحقیق اور تطبیق واصول میں ماہر تھے۔'' ذہبی کا بیان ہے کہ ان کو حدیث سے ویسی ہی واقفیت تھی جیسی ہونی چاہیے تھی، صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں کہ وہ حدیث کے حفظ وضبط اور معرفت، نیز ثقاہت واتقان اور صدق وغیرہ میں امام تھے، ان کی یہ خصوصیت بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ حدیثیں بڑے دلکش اور عمدہ انداز میں پڑھتے تھے۔ (۱)

علم رجال: حدیث کی طرح اس کے متعلقہ علوم یعنی علل حدیث اور فن رجال میں بھی ماہر تھے، علم حدیث کے سلسلہ میں اسماء الرجال کے فن کو جو اہمیت حاصل ہے حمیدی کو اس کا پورا اندازہ تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ علم حدیث کے سلسلہ میں تین چیزوں پر خاص طور سے دھیان دینے اور ان کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک کتاب العلل اس میں سب سے عمدہ تصنیف امام دارقطنی کی ہے، دوسری مؤتلف ومختلف، اس فن میں امیر ابن ماکولا کی اکمال سب سے عمدہ کتاب ہے، تیسری وفیاتِ مشائخ، اس میں کوئی کتاب نہیں ہے، اس لیے میں نے اس کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہے لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ وہ صحیحین میں اشتغال کی وجہ سے اس کی جانب اعتنا

(۱) تذکرہ ج ۴ صفحات ۱۸، ۱۹، ۲۰، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وبستان ص ۸۲، ونفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵ و ۳۷۶۔

نہیں کر سکے اور ان کی وفات ہو گئی۔(۱)

ذہانت و وسعتِ علم: مورخین نے حمیدی کی ذہانت و فطانت، وسعتِ علم و مطالعہ اور کثرتِ معلومات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ علوم کا مخزن تھے، ابو عامر حیدری نے ان کو علمی حیثیت سے عدیم المثال بتایا ہے، یحیٰ بن ابراہیم سلماسی فرماتے ہیں کہ ''وہ فضل و شرافت اور وفور علم میں بے نظیر تھے، میں نے علم و فن کی اشاعت کا ان سے زیادہ حریص شخص نہیں دیکھا۔''(۲)

فقہ: فقہ میں بھی امتیاز رکھتے تھے، اپنے والد اور مشہور فقیہ محمد بن ابو زید سے اس فن کی تحصیل کی تھی، ان سے انھوں نے الرسالہ و مختصر مدونہ کی روایت بھی کی ہے، ابو عامر حیدری کا بیان ہے کہ وہ فقہ و حدیث دونوں میں جامع تھے۔(۳)

سیر و تاریخ: حمیدی کی اخبار، سیر، تاریخ اور وقائع پر بھی گہری نظر تھی، اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں۔

ادب و عربیت: دینی علوم کی طرح ادبیات سے بھی شغف تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

در علم عربیت و ادب و حل تراکیب	علم و عربیت و ادب، قرآن کی ترکیبوں
قرآن و دریافت لطافت بلاغت	کے حل اور اس کی بلاغت و لطائف کی
آن دستگاہی کلی نصیب دارد۔(۴)	دریافت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

صاحب نفح الطیب کا بیان ہے کہ وہ علم و ادب و عربیت میں متبحر تھے، (ج ا ص ۳۷۵)

شعر و سخن: حمیدی نے موزوں طبیعت پائی تھی، اس لیے شعر و شاعری بھی کرتے تھے، ان

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵، ۲۸۶ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۹ و مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹ (۲) نفح الطیب ج ا ص ۳۷۵، تذکرہ ج ۴ ص ۱۸، و مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹ (۳) تذکرہ ج ۴ ص ۱۷ و ۱۸ و نفح الطیب ج ا ص ۳۷۵ (۴) بستان المحدثین ص ۸۲۔

کے اشعار وعظ و پند اور حکمت و موعظت پر مشتمل ہوتے تھے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لقاء الناس لیس یفید شیئا   سوی الھذیان من قیل وقال

فاقلل من لقاء الناس الا   لاخذ العلم او اصلاح حال

ترجمہ: لوگوں سے میل جول بے فائدہ ہے، اس سے بکواس اور لایعنی قیل وقال کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے علم کی تحصیل یا اپنی اصلاح کے علاوہ لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دو۔

کتاب اللّٰہ عزوجل قولی   وماصحت بہ الآثار دینی

وما اتفق الجمیع علیہ بدأ   وعودا فھو عن حق مبین

فدع ماصد عن ھذا وخذھا   تکن منھا علی عین الیقین (۱)

ترجمہ: اللہ کی کتاب اور صحیح روایت و آثار میرا مسلک و دین ہے اور جن چیزوں پر امت اول سے آخر تک متفق ہو وہ بھی بجا طور پر حق مبین ہے، اس لیے اگر تم بھی ان کو اختیار کر لو اور جو چیزیں ان میں مانع ہوں ان کو چھوڑ دو تو عین یقین پر فائز ہو جاؤ گے۔

ورع وتقویٰ: علم و فضل کی طرح تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، ان کے ورع وعفاف، عفت و تدین اور پاکبازی کا تمام ارباب سیر نے ذکر کیا ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ وہ نباہت و معرفت، اتقان، تدین اور ورع سے متصف تھے، ان کے معاصر اور دوست امیر ابن ماکولا فرماتے ہیں کہ مجھ کو پاکی، نزاہت، عفت اور پرہیزگاری میں حمیدی کا کوئی مثیل نظر نہیں آیا، اتباع سنت ان کا خاص شعار تھا، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، شرم و حیا کے پیکر تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز ابوبکر بن میمون نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، حمیدی نے غفلت کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سمجھے کہ غالباً مجھ کو اندر جانے

(۱) بستان المحدثین ص ۸۲ و اتحاف النبلاء ص ۳۸۳۔

کی اجازت ہے، چنانچہ وہ کمرے کے اندر داخل ہو گئے، اس وقت حمیدی کی ران کھلی تھی، وہ شرم سے پانی پانی ہو گئے اور دیر تک ان پر رقت طاری رہی، انھوں نے کہا جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے آج تک کسی نے میری ران کو برہنہ نہیں دیکھا تھا۔(۱)

دنیا سے بیزاری: ورع و تدین کی بنا پر وہ دنیا سے نہایت بے زار اور کنارہ کش رہتے اور دنیا اور اس کے زخارف کے تذکرہ سے کبھی ان کی زبان آلودہ نہ ہوتی اور نہ ان کی مجلسوں میں مال و متاع دنیا کا کوئی چرچا ہوتا تھا، ان کی زندگی نہایت سادہ اور صبر و قناعت کی تھی، صرف کفاف پر گذر بسر کرتے تھے، ابوبکر بن خاضیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو کبھی دنیا کا تذکرہ کرتے ہوئے نہیں پایا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کی مجلسوں اور گھر وغیرہ میں بارہا ان کا امتحان لینا چاہا لیکن ان کی زبان پر دنیا اور اس کی جاہ و حشمت کا کوئی ذکر نہیں آیا، ان کی شاعری بھی نہایت پر از حکمت اور دنیا کی مذمت پر مشتمل ہوتی تھی۔(۲)

فقہی مذہب و مسلک: وہ امام ابن حزم کے اخص تلامذہ میں تھے، اس لیے ان کا رجحان بھی اپنے استاذ کی طرح ظاہری مذہب کی طرف تھا، غالباً ان کے زمانہ میں اہلِ ظاہر کے خلاف یک گونہ شورش و ہیجان پایا جاتا تھا، اس لیے وہ اپنی ظاہریت کو مخفی رکھتے تھے، قاضی عیاض کا بیان ہے کہ اس کے باوجود ان کو فتنوں سے دوچار ہونا پڑا اور بعض علما نے ان کے ساتھ سختی اور شدت کا معاملہ کیا، اس سے تنگ آ کر بلادِ مشرق کی طرف چلے گئے۔(۳)

وفات: حمیدی نے منگل کی شب میں ۱۷ ذی الحجہ ۴۸۸ھ کو اس جہانِ فانی کو الوداع کہا اور بدھ کے روز باب ابرز میں شیخ ابو اسحق شیرازی کے مزار کے پاس دفن کیے گئے۔ مشہور شافعی فقیہ محمد بن احمد بن حسین نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

---

(۱) ابن خلکان ج ۳ ص ۲۸۵ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۸ (۲) تذکرہ ج ۴ ص ۱۸ و بستان المحدثین ص ۸۲

(۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹، ۲۰۔

مدفن: مشہور ہے کہ انھوں نے وفات سے پیشتر بغداد کے افسر اعلیٰ مظفر کو وصیت کی تھی کہ مجھ کو بشر حافی کے مزار کے پاس دفن کیا جائے لیکن اس نے اس وصیت کا خیال نہیں کیا اس لیے وہ پہلے شیخ ابواسحاق کے مقبرہ کے قریب دفن کیے گئے، مگر کچھ دنوں کے بعد مظفر نے خواب دیکھا کہ حمیدی اس بارے میں اس سے گلا و شکایت کر رہے ہیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ ماہ صفر ۴۹۱ھ میں اس نے ان کو سابق مدفن سے منتقل کر کے بشر حافی کے مقبرہ کے پاس دفن کرا دیا، کہا جاتا ہے کہ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود ان کا کفن تر و تازہ اور جسم صحیح و سالم تھا اور دور تک اس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، بعض مورخین نے اس واقعہ کو ان کی کرامت میں شمار کیا ہے۔(۱)

تصنیفات: حمیدی سے جو تصنیفات یادگار رہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱- کتاب الجمع بین الصحیحین: یہ حمیدی کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے، اس کو انھوں نے صحابہ کے ناموں پر ان کے فضل و تقدم کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، اس لیے اس میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور اس کے بعد خلفائے راشدین پھر عشرہ مبشرہ کی حدیثیں ہیں اور اس کے بعد دیگر صحابہ کے مرویات ان کے مراتب کے اعتبار سے درج ہیں، اس موضوع پر اور علما نے بھی کتابیں لکھی ہیں لیکن حمیدی کی تصنیف کو خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ بڑی مستند و معتبر خیال کی جاتی ہے، علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

واعتمدت فی النقل من	میں نے صحیحین کی حدیثیں (اپنی
الصحیحین علی ماجمعه	کتاب جامع الاصول میں) نقل کرنے
الحمیدی فی کتابه فانه	میں حمیدی کی کتاب پر اعتماد کیا ہے،
احسن فی ذکر طرقه	کیوں کہ انھوں نے روایات کے طرق
واستقصیٰ فی ایراد رواته	بیان کرنے میں بڑی خوبی سے کام لیا

(۱) ایضاً و بستان المحدثین ص۸۲ و نفح الطیب ج۱ ص۲۷۶۔

والیه المنتهی فی جمع هذین الکتابین۔	ہے اور رواۃ کا بھی نہایت استقصا سے ذکر کیا ہے، پس ان دونوں کتابوں کے بارے میں یہی کتاب اصل مرجع ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کی وجہ سے اس کی شرحیں اور تلخیصات بھی کی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- الا یضاح عن معانی الصحاح: یہ عون الدین ابوالمظفر یحییٰ بن محمد المعروف بابن ہبیرہ وزیر حنبلی (م ۵۶۰ھ) کی شرح ہے، اس میں حکم نبوی کی شرح ووضاحت کی گئی ہے، اور یہ چند جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی پہلی جلد کو لوگوں نے کتاب الافصاح کے نام سے علاحدہ اور مستقل کتاب قرار دیا ہے۔

۲- الحجة: ابوعلی حسن بن خطیر نعمانی الظہیر فارسی (م ۵۸۹ھ) کی شرح ہے، جو کتاب الافصاح کا مختصر ہے تاہم اس میں بعض اضافے بھی ہیں۔

۳- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے الجمع کی تلخیص کی ہے، الجمع کے قلمی نسخے شیخ الاسلام مدینہ، خدیویہ مصر اور خدا بخش خان پٹنہ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔(۱)

ایک اعتراض اور اس کا جواب: عراقی کا بیان ہے کہ حمیدی نے اس میں بعض ایسے الفاظ اور تتمے بڑھائے ہیں جو صحیحین میں موجود نہیں ہیں، اس بنا پر اصل واضافہ میں تمیز مشکل ہوگئی ہے لیکن بقائی نے اس کا جواب دیتے ہوئے خود حمیدی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ گو میں نے اس میں تتمے کے طور پر صحیحین کے ساتھ اعتنا کرنے والے بعض لوگوں مثلاً اسماعیلی وبرقانی وغیرہ کے بیانات الفاظِ حدیث کی تشریح وغیرہ کے ضمن میں نقل کیے ہیں مگر اصل واضافہ میں امتیاز کے لیے اس قسم کے الفاظ بھی لکھے ہیں۔

---

(۱) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۷ وفہرست خدیویہ مصر ج ۲ ص ۳۲۵ وفہرست کتب خانہ خدا بخش پٹنہ ج ۱ ص ۴۷

الیٰ ھھنا انتھت روایة البخاری او من ھنا زادہ البرقانی اوکذا زادہ فلان۔ (۱)	یہاں بخاری کی روایت تمام ہوگئی یا یہاں سے برقانی کا اضافہ شروع ہوتا ہے یا یہ فلاں شخص کا اضافہ ہے۔

۲۔ کتاب تاریخ اندلس: اس کا اصل نام جذوۃ المقتبس فی تاریخ علماء الاندلس یا جذوۃ المقتبس فی اخبار علماء الاندلس ہے، اس کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس کو اپنی یادداشت سے مرتب کیا ہے۔ (۲)

۳۔ کتاب الامانی الصادقہ، ۴۔ کتاب تسہیل السبیل الیٰ علم الترسیل، ۵۔ کتاب ماجاء من النصوص والاخبار فی حفظ الجار، ۶۔ کتاب ذم النمیمہ، ۷۔ کتاب الذہب المسبوک فی وعظ الملوک، ۸۔ کتاب الرسل، ۹۔ جمل تاریخ الاسلام یا تاریخ الاسلام، ۱۰۔ کتاب مخاطبات الاصدقاء فی المکاتبات واللقاء، ۱۱۔ کتاب من ادعی الامان من اہل الایمان۔ (۳)

☆☆☆

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۰۰ و ۴۰۱۔ (۲) ایضاً ج ۱ ص ۳۹۰ وبستان المحدثین ص ۸۲ (۳) ایضاً ونفح الطیب ج ۱ ص ۲۷۵۔

حافظ شیرویہ بن شہردار دیلمی

(م۵۰۹ھ)

نام ونسب: شیرویہ نام ابوشجاع کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ ابن فناخسرو۔

ولادت ووطن: ۴۴۵ھ میں ہمدان میں پیدا ہوئے۔

خاندان: وہ نسباً عجمی تھے اور ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی فیروز دیلمی سے ملتا ہے، حضرت فیروز دیلمی کو مدعیٔ نبوت اسود عنسی کے قاتل ہونے کا فخر حاصل ہے۔(۱)

شیوخ: شیرویہ کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالقاسم بن السری (یا البسری) احمد بن عیسیٰ بن عباد دینوری، سفیان بن حسین بن فنجویہ، ابومنصور عبدالباقی بن محمد (یا علی) العطار، عبدالحمید بن حسن قفاعی، ابوعمرو عبدالوہاب بن مندہ، ابوالفرج علی بن محمد حریری بجلی ابوالفضل محمد بن عثمان قومسانی (یا قوسانی) محمد بن عیسیٰ دینوری اور یوسف بن محمد بن یوسف مستملی وغیرہ۔(۲)

تلامذہ: چند تلامذہ کے نام ملاحظہ ہوں:

حافظ ابوموسیٰ مدائنی، حافظ ابوالعلا احمد بن حسن عطا، حافظ ابوالعلا احمد بن محمد بن

(۱) طبقات الشافعیہ ج۴ ص۲۳۰ وشذرات الذہب ج۴ ص۳۴ (۲) طبقات الشافعیہ ج۴ ص۲۳۰ وتذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۵۵و۵۶۔

فضل اسفرائنی، محمد بن قاسم ساوی۔

شیرویہ کے خاص تلامذہ میں ان کے نامور فرزند شہردار دیلمی بھی ہیں،(۱) ان کے مختصر حالات آگے درج ہیں۔

رحلت وسفر: ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمدان کے علاوہ انھوں نے اصفہان، بغداد اور قزوین کے اہل علم اور محدثین سے کسب فیض کیا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ان جگہوں کے علاوہ دوسرے اسلامی شہروں میں بھی سیر وسیاحت کی اور ابن صلاح نے ان کے متعلق واسع الرحلہ لکھا ہے۔(۲)

حدیث میں درجہ: وہ مشہور حفاظ اور صاحب تصنیف محدثین میں تھے، اہل سیر نے ان کو المحدث والحافظ لکھا ہے، ذہبی نے ان کے حسن معرفت کا بھی ذکر کیا ہے، تاہم ضبط واتقان میں زیادہ بلند پایہ نہ تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

اما دراتقان، معرفت وعلم او قصور یست در سقیم وصحیح احادیث تمیز نمی کند ولہذا دریں کتاب او موضوعات وواہیات تودہ تودہ مندرج۔(۳)

اتقان، معرفت اور علم میں کچھ قصور تھا، سقیم اور صحیح حدیثوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے، لہذا ان کی اس کتاب (فردوس الاخبار) میں موضوعات اور غیر مستند چیزیں درج ہیں۔

تاریخ وسیر: حدیث کی طرح سیر وتاریخ بھی ان کا موضوع تھا اور ان فنون پر ان کی اچھی نظر تھی اور مورخ ہمدان کہلاتے تھے۔

ذہانت: وہ غیر معمولی ذہین تھے، ذہبی نے ذکی القلب، ابن صلاح نے ذکی اور یحییٰ ابن مندہ نے کیس کہہ کر ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۵ و ۵۶ (۲) تذکرہ ج ۴ ص ۵۶ وبستان ص ۶۲ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۲۴ (۳) بستان المحدثین ص ۶۲۔

عقیدہ ومسلک: شیرویہ صحیح العقیدہ اور مذہب اہل سنت کے بڑے حامی اور فرق باطلہ سے متنفر تھے، ابن صلاح اور ابن مندہ نے ان کو مذہب سنت میں متصلب اور اعتزال سے دور بتایا ہے۔

فقہی مذہب: فقہ میں امام شافعی کے مذہب کے پیرو تھے، ابن شہبہ اور تاج الدین نے طبقات الشافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اخلاق واوصاف: حسنِ خلق سے بھی متصف تھے، ابن مندہ وابن صلاح نے ان کے خلیق، دلیر اور کم گو ہونے کا ذکر کیا ہے۔

شکل وشباہت: سیرت کی طرح عمدہ صورت بھی پائی تھی اور بڑے وجیہ وشکیل آدمی تھے، ابن مندہ وابن صلاح نے کہا ہے کہ وہ صورت وسیرت دونوں میں ممتاز تھے۔

وفات: رجب ۵۰۹ھ میں وفات ہوئی۔(۱)

اولاد: ان کے ایک صاحب زادہ ابومنصور شہردار کا ذکر ملتا ہے، یہ بھی صاحبِ فضل وکمال تھے، اس لیے ان کے مختصر حالات درج ہیں۔

شہردار نے اپنے والد کے علاوہ متعدد اساتذۂ فن سے علمِ حدیث کی تحصیل کی تھی، ان کو علمِ حدیث کی فہم ومعرفت کا بڑا ملکہ تھا، سمعانی نے ان کے فہم ومعرفت کی شہادت دی ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ ضبط واتقان اور فہم ومعرفتِ حدیث میں اپنے والد سے بہتر تھے، طلبِ علم میں یہ ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، ۵۰۵ھ میں ان کے ہمراہ اصفہان گئے اور ۵۳۷ھ میں تنہا بغداد تشریف لے گئے، زیادہ وقت درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کرتے، علم وادب سے اچھی واقفیت تھی، زہد واتقاء کے زیور سے آراستہ اور بڑے عبادت گذار تھے، مسجد ہی میں رہ کر تالیف وتصنیف اور درس وتدریس کا کام بھی انجام دیتے

(۱) یہ تفصیلات تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۶ طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ شذرات الذہب ج ۴ ص ۲۴ اور بستان المحدثین ص ۶۲ سے ماخوذ ہیں۔

تھے، اپنے والد شیرویہ کی کتاب فردوس الاخبار کو ازسرنو مرتب کیا اور جب اس کی تہذیب وتنقیح سے فارغ ہوئے تو ان کے لڑکے اور شیرویہ کے پوتے ابومسلم احمد اور دوسرے شاگردوں نے ان سے اس کی روایت کی، ۵۵۸ھ میں انتقال کیا۔(۱)

تصنیفات: حافظ شیرویہ کا خاص مشغلہ درس وتدریس اور تالیف وتصنیف تھا، ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱- کتاب الفردوس: یہ قضاعی کی کتاب الشہاب پر مستخرج ہے، اسی لیے اس کا نام فردوس الاخبار بماثور الخطاب المخرج علی کتاب الشہاب ہے، یہ دس ہزار چھوٹی حدیثوں پر مشتمل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے کتب حدیث کے چوتھے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی ترتیب مشارق اور جامع صغیر کی طرح حروف تہجی پر ہے، اس میں سندوں کا ذکر نہیں ہے لیکن رواۃ کا ذکر ہے، حوالہ اور مخرج کے لیے علامتیں اور رموز دیے گئے ہیں، سیوطی کی جامع صغیر میں بعینہ اس کا تتبع کیا گیا ہے، یہی کتاب مسند الفردوس کے نام سے مشہور ومتداول ہے، جس کو مصنف کے فرزند (محدث شہردار) نے چار جلدوں میں ازسرنو صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے اور ہر ہر حدیث کو سنداً بیان کیا ہے۔(۲)

حافظ ابن حجر نے تہدیس القوس فی مختصر مسند الفردوس کے: م سے اس کا مختصر کیا ہے،(۳) اور سیوطی کا بیان ہے کہ حافظ نے اس کے زوائد ایک جلد میں جمع کیے ہیں(۴) اس کے قلمی نسخے مدینہ، جرمنی، مصر، حیدرآباد اور رام پور کے کتب خانوں میں ہیں۔(۵)

---

(۱) شہردار کے حالات کے لیے طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ وبستان المحدثین ص ۶۲ ملاحظہ ہو، (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۶ و ۴۴۳ والرسالۃ المستطرفہ ص ۶۴ وبستان المحدثین ص ۶۲ (۳) ایضاً (۴) تدریب الراوی ص ۲۹۔ (۵) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۸، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۴ فہرست خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۱۹ و ۴۲۰ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۲- تاریخ ہمدان، شیخ محمد بن عبدالملک ہمدانی (م ۵۲۱ھ) نے اس کا ذیل لکھا ہے۔(۱)

۳- کتاب حکایات المنامات، ۴- ریاض الانس لعقلاء الانس فی معرفۃ احوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتاریخ الخلفاء: اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے علاوہ خلفائے راشدین اور خلفائے بنی امیہ وعباس کا تذکرہ بھی آ گیا ہے، یہ کتاب عباسی خلیفہ مستظہر باللہ ابوالعباس احمد بن عبداللہ المقتدی بامراللہ (۴۸۷ھ تا ۵۱۲ھ) کے تذکرہ پر تمام ہوئی ہے، اس کا قلمی نسخہ مصر کے کتب خانہ میں ہے۔(۲)

☆☆☆

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) وفہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ج ۱ص ۱۵۴ و ۱۵۵ وفہرست انگریزی رضالائبریری رام پور ج ۱ص ۴۶۴ تا ۴۶۶۔

(۱) کشف الظنون ج ۱ص ۲۳۵ (۲) تذکرۃ النوادر ص ۸۰ و ۸۱۔

امام ابو محمد حسین فراء بغوی

(متوفی ۵۱۹ھ)

نام ونسب: حسین نام، ابو محمد کنیت، محی السنۃ ورکن الدین لقب اور الفراء وابن الفراء عرفیت ہے، نسب نامہ یہ ہے: حسین بن مسعود بن محمد بن الفراء۔

فراء وابن الفراء کی عرفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرو (پوستین) سینا اور فروخت کرنا ان کا خاندانی پیشہ تھا۔(۱)

ولادت ووطن: امام بغوی ۴۳۶ھ یا اس سے کچھ پہلے بغ میں پیدا ہوئے، یہ ہرات اور مرو کے درمیان خراسان کا ایک مقام ہے، اس کا اصلی نام بغشور جو باغ کور کا معرب ہے بتایا جاتا ہے ''شور'' حذف ہوجانے سے بغ ہوگیا، بغوی کی نسبت اسی کی طرف ہے، ابوسمعانی (م ۵۶۲ھ) کو کئی بار یہاں جانے کا اتفاق ہوا، ان کے زمانے تک یہ آباد اور معمور تھا لیکن یاقوت حموی کا بیان ہے کہ ۶۱۶ھ میں یہ اجڑنا شروع ہوگیا تھا، اس شہر کو جن اکابر علمائے اسلام کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے ان میں فراء بغوی بھی ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔(۲)

اساتذہ: ان کے بعض مشہور شیوخ کے نام ملاحظہ ہوں:

احمد بن نصر توقانی، حسان بن محمد منیعی، قاضی حسین، ابوالفضل زیاد بن محمد حنفی،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴ وبستان المحدثین ص ۵۲ (۲) ایضاً وابن خلکان ج ۱ ص ۲۶۰ وکتاب الانساب ورق ۸۶ ومعجم البلدان ج ۲ ص ۲۴۵ و ۲۴۶۔

ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد داؤدی ابوعمر عبدالواحد بن احمد ملیحی، ابوالحسن علی بن یوسف جوینی، ابوالحسن محمد بن محمد شیرازی، ابوبکر محمد بن ہیثم ترابی اور ابوبکر یعقوب بن احمد صیرفی۔

قاضی حسین صاحب تعلیقہ فقہ میں بڑے صاحب کمال تھے، ان کا شمار اجل شوافع میں ہوتا ہے، بغوی ان کے خاص تلامذہ میں تھے اور فقہ کی تحصیل ان ہی سے کی تھی۔

تلامذہ: ابومنصور محمد بن اسعد عطاردی المعروف بابن حفدہ، ابوالفتوح محمد بن محمد طائی وغیرہ ان کے مشہور شاگرد ہیں، بغوی کے آخری شاگرد جن کو ان سے روایت کی اجازت حاصل تھی، ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد توقانی تھے، یہ چھٹی صدی ہجری تک طالقان میں بقید حیات رہے اور علامہ ذہبی کے شیخ فخر الدین علی مقدسی کو ان سے اجازت حاصل تھی۔(۱)

سماع حدیث کی ابتدا: بغوی کے سوانح نگاروں نے ان کے رحلت وسفر کی تصریح نہیں کی ہے لیکن اس عہد کے محدثین کی طرح انھوں نے بھی سماع حدیث اور تحصیل علم کے لیے اسلامی ممالک کا سفر ضرور کیا ہوگا، علامہ ابن سبکی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۴۶۰ھ کے بعد حدیث کے سماع کا آغاز کیا تھا۔(۲)

حدیث میں درجہ: ان کا درجہ حدیث میں مسلم ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ اس فن میں ان کا مقام نہایت بلند ہے، ابن خلکان نے محدث اور ذہبی نے الحافظ کہہ کر ان کے حدیث میں کمال وامتیاز کا ذکر کیا ہے، ابن ہبۃ اللہ بغوی کو فن حدیث میں امام اور صاحب روضات عدیم النظیر بتاتے ہیں، شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ وہ بے نظیر محدث اور معتبر ومعتمد شارحین حدیث میں تھے، شوافع میں احادیث کی شرح وتوجیہ کے لیے جو علما ممتاز سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہیں (۳) ان کا لقب محی السنۃ اس فن میں ان کی عظمت وکمال کا ثبوت ہے۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ص ۵۴ و ۵۵ وطبقات الشافعیہ (ابن سبکی) ج ۴ص ۲۱۴ و ۲۱۵ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۴ص ۲۱۴ (۳) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۴ص ۲۱۴ وابن خلکان ج ۱ص ۲۵۹ و ۲۶۰ وطبقات الشافعیہ لابن ہبۃ اللہ ص ۴۷ بستان المحدثین ص ۵۲ وعجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ص ۵۴

تفسیر: کلام رسول کی طرح کلام الٰہی سے بھی ان کو خاص شغف اور لگاؤ تھا، چنانچہ حدیث کی طرح قرآن مجید کی تشریح وتفسیر میں بھی وہ ممتاز مانے جاتے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان کو بے عدیل اور صاحب روضات نے عدیم النظیر مفسر کہا ہے اور ابن سبکی نے علم تفسیر میں عالی وبلند پایہ اور ابن ہبۃ اللہ نے امام بتایا ہے(۱)، حدیث کی طرح تفسیر میں بھی ان کی کتاب نہایت اہم خیال کی جاتی ہے، کلام اللہ کے سلسلہ میں وہ قرأت وتجوید کے فن کے ماہر بھی تھے، اپنی تفسیر میں انھوں نے قرأت کے متعلق مفید بحثیں کی ہیں۔

فقہ: وہ فقہ کے ماہر اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، اسی لیے علامہ ذہبی نے ان کو المجتہد کہا ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں۔

''ان کو فقہ میں ید طولا حاصل تھا اور اس میں ان کی معلومات کا دائرہ نقل وتحقیق ہر اعتبار سے وسیع تھا، ان کے اختیار کردہ مسائل پر جب بحث کی گئی تو وہ ان اقوال کے مقابلہ میں جن کو انھوں نے ترک کیا تھا، قوی اور مرجح تھے، ابن ہبۃ اللہ کا بیان ہے کہ وہ فقہ میں امام تھے، قاضی حسین صاحب تعلیقہ سے تلمذ ان کے بلند پایہ فقیہ ہونے کا ثبوت ہے۔''

بغوی مجتہدانہ اوصاف کے باوجود شافعی المذہب تھے اور ان کا شمار اکابر شوافع میں ہوتا ہے۔(۲)

جامعیت واعتراف کمالات: اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بغوی کی جامعیت، گوناگوں کمالات اور اسلام کے تین اہم اور بنیادی علوم یعنی تفسیر، حدیث اور فقہ میں امامت وعظمت شان پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، چنانچہ علامہ ابن سبکی وابن ہبۃ اللہ کا بیان ہے کہ وہ قرآن وسنت اور فقہ کے علوم کے جامع، امام اور یکتائے روزگار تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بغوی ان تینوں علوم کے فاضل تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ

(۱و۲) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۴ ص ۲۱۴ وابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۹ و ۲۶۰ وطبقات الشافعیہ لابن ہبۃ اللہ ص ۴۷ بستان المحدثین ص ۵۲ وعجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴۔

ان تینوں فنون میں جامع اور ہر ایک میں مرتبہ کمال پر فائز تھے، ان کی پوری زندگی انہی علوم کے پڑھنے پڑھانے اور ان سے متعلق کتابیں لکھنے میں بسر ہوئی، ابن اہدل کا بیان ہے کہ انھوں نے مختلف الفنون مفید تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ بغوی جلیل القدر امام تھے، وہ بغداد نہیں جا سکے ورنہ ان کا بڑا مبسوط تذکرہ لکھا جاتا، شیخ امام (صاحب شرح مہذب) ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی تحقیقات کی تعریف کرتے تھے، ذہبی نے ان کو امام، حافظ، مجتہد اور محی السنۃ اور ابن خلکان نے علوم کا سمندر بتایا ہے اور یافعی وابن عماد نے امام اور عالم خراسان لکھا ہے۔ (۱)

شغل: اوپر گذر چکا ہے کہ وہ تفسیر، حدیث اور فقہ تینوں علوم کے جامع تھے اور ان ہی مبارک علوم سے متعلق تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں عمر گذار دی (۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم وفن کی خدمت وتحقیق ہی ان کا خاص معمول تھا اور شب وروز وہ اسی میں مشغول ومنہمک رہتے تھے۔

زہد وعبادت: عملی اور دینی حیثیت سے بھی ممتاز اور بلند پایہ تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ قائم اللیل وصائم النہار علمائے ربانیین میں تھے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ بغوی علم وعمل کے جامع، متبع سلف اور دینی لحاظ سے عالی مقام تھے، دوسرے ارباب سیر وتذکرہ نے بھی ان کے زہد وورع، صلاح وتقویٰ اور نسک وعبادت کا ذکر کیا ہے۔ (۳)

سادگی وقناعت: ان کی زندگی تکلف وآرائش سے خالی اور نہایت سادہ تھی، قناعت اور سادگی کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ روکھا سوکھا کھاتے اور موٹا بھوٹا پہنتے تھے اور کفاف پر گذر بسر

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۱۴ و ۲۱۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۹۳، بستان المحدثین ص ۵۲ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴ ومرآۃ الجنان ج ۳ ص ۲۱۳ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۴۹ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۹ وبستان المحدثین ص ۵۲ (۳) تذکرہ ج ۴ ص ۵۴ طبقات ج ۴ ص ۲۱۴، والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۹۳ وبستان ص ۵۳۔

کرتے تھے، افطار میں صرف روٹی کا ایک خشک ٹکڑا ان کے لئے کافی ہوتا تھا، لوگوں نے اصرار سے کہا کہ خشک روٹی سے دماغ میں خشکی پیدا ہو جائے گی مگر اس پر بھی انھوں نے سالن نہیں استعمال کیا، البتہ روغن زیتون سے روٹی کھانے لگے، مال ودولت کی ذرہ برابر حرص وہوس نہ کرتے، ان کی بیوی کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کے ترکہ سے اپنا حصہ نہیں لیا۔(۱)

طہارت ونظافت: صفائی اور ستھرائی کا بڑا خیال رکھتے، طہارت اور وضو کے بغیر درس نہیں دیتے تھے۔(۲)

وفات: مروروز میں شوال ۵۱۶ھ میں وفات پائی اور اپنے استاذ قاضی حسین کے مقبرہ کے پاس طالقان میں دفن کیے گئے، ان کی قبر عرصہ تک زیارت گاہِ خلائق بنی ہوئی تھی، ایک روایت کے مطابق انھوں نے ۵۱۰ھ میں انتقال کیا۔(۳)

تصنیفات: امام بغوی نامور مصنف تھے،تفسیر، قرأت، حدیث اور فقہ جیسے اسلامی علوم میں ان سے مفید اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی نیک نیتی کی وجہ سے ان کی تصنیفات میں بڑی برکت ہوئی، ذیل میں تصنیفات کے نام اور بعض کا تعارف درج ہے۔

معالم التنزیل: یہ تفسیر کی مشہور ومتداول کتاب ہے، اس میں صحابہ وتابعین اور متقدمین علمائے تفسیر کے اقوال وآرا نقل کرنے کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، اس لیے اس کی حیثیت ماثوری تفسیروں کی ہے، مصنف نے مقدمہ میں کلام مجید کی اہمیت، اس کے نزول کا مقصد اور اس کی تفسیر وتاویل کی ضرورت اور ائمہ سلف کے تفسیری خدمات وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ گو قدیم اکابر مفسرین کے کارناموں پر اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے لیکن قدیم کی تجدید کے لیے ان میں کاوش وجد وجہد کا سلسلہ برابر جاری رکھنا چاہیے، اس لیے

(۱) تا (۳) ایضاً وابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۹، ۲۶۰۔

میں نے لوگوں کی فرمائش پر ایک متوسط درجہ کی کتاب مرتب کی ہے جو اطناب ممل اور اختصار مخل سے خالی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس فن سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے یہ مفید ثابت ہوگی۔"(۱)

اس میں اسباب نزول کی تعیین، ناسخ و منسوخ کی تصریح، فقہا کے احکامِ شرعی کے استنباطات کا ذکر اور اعراب و قرأت کے اختلاف اور نحوی و صرفی اشکالات کو حل کرنے پر خاص توجہ کی گئی ہے، ان مباحث کی توضیح کے لیے احادیث اور صحابہ و تابعین کے آثار اور مابعد کے ائمہ تفسیر کے اقوال سے مدد لی گئی ہے۔

خازن کا بیان ہے کہ علم تفسیر میں بغوی کی معالم التنزیل بڑی اہم اور بلند پایہ کتاب ہے، یہ صحیح اقوال کا مجموعہ، شکوک و تصحیف سے پاک، احادیث و آثار سے مزین اور عجیب واقعات پر مشتمل ہے۔(۲)

مقدمہ میں مشہور مفسر صحابہ و تابعین سے مصنف نے اپنے اسناد اور فضائلِ قرآن کی حدیثیں جمع کی ہیں، اس کی اہمیت کی بنا پر بعض علما نے اس کے خلاصے اور مختصرات لکھے ہیں۔

۱۔ مشہور مفسر علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی کی تفسیر لباب التنزیل جو تفسیر خازن کے نام سے معروف ہے، دراصل معالم ہی کا ملخص ہے، وہ خود لکھتے ہیں کہ "چوں کہ تفسیر بغوی نہایت عمدہ خصوصیات پر مشتمل تھی، اس لیے میں نے اس کا انتخاب کیا ہے اور دوسری تفسیروں کی مدد سے بعض اضافے کیے ہیں، نیز طلبۂ فن کے فائدہ کے لیے غریب حدیثوں کی شرح کر دی اور اس کی سندوں اور بعض زوائد کو حذف کر دیا۔(۳)

۲۔ دوسرا مختصر شیخ تاج الدین ابونصر عبدالوہاب بن محمد حسینی (م ۸۷۵ھ) کا ہے۔(۴)

معالم التنزیل ہندوستان اور مصر سے شائع ہو چکی ہے، مصر سے تفسیر خازن کے

---

(۱) مقدمہ معالم التنزیل (۲) مقدمہ تفسیر خازن ج۱ص۳ (۳) مقدمہ تفسیر خازن ج۱ص۳،۷ (۴) کشف الظنون ج۲ص۲۵۸۔

حاشیے پر ۱۳۲۲ و ۱۳۳۱ھ میں سات جلدوں میں چھپی ہے۔

۲- مصابیح السنۃ: یہ حدیث کی اہم اور مشہور کتاب ہے جو بڑی معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خطیب تبریزی کی مشہور ومتداول کتاب مشکوٰۃ المصابیح جو عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس کا تکملہ ہے، صاحب مشکوٰۃ کے درج ذیل بیان سے اس کی نوعیت اور اہمیت وغیرہ ثابت ہوتی ہے۔

محی السنۃ قامع البدعت امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی کی (اللہ ان کے درجات بلند کرے) کتاب المصابیح نہایت جامع کتاب ہے لیکن اس میں اختصار کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور سندیں حذف کر دی گئی ہیں، اس لیے بعض ناقدینِ فن نے اس میں کلام کیا ہے، حالاں کہ فی نفسہ اس کے نقلِ اسناد میں کوئی کلام نہیں ہے، مصنف علمائے ثقات میں ہیں تاہم اس حیثیت سے اس میں یک گونہ کمی تھی کیوں کہ نہ تو صحابہ کا اس میں ذکر ہے اور نہ حدیثوں کا جس سے اصل مخرج معلوم ہوتا ہے،......... کتب وابواب کے سرد وترتیب میں میں نے بغوی کا ٹھیک ٹھیک تتبع کیا ہے، البتہ ہر باب کو دو کے بجائے تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔(۱)

نام: یہ مصابیح السنۃ اور کتاب المصابیح کے نام سے مشہور ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام خود مصنف کا رکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ ان کے دیباچہ کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔(۲)

ان احادیث هذا الكتاب مصباح۔ اس کتاب کی حدیثیں چراغ ہیں۔

تقسیم وترتیب: یہ کتاب ابواب وفصول میں منقسم ہے، ہر باب کی حدیثیں دو فصلوں میں صحاح وحسان کے عنوان کے تحت شامل کی گئی ہیں، صحاح کے اندر بخاری ومسلم اور حسان کے اندر ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ کی حدیثیں درج ہیں، شاہ عبدالعزیز

(۱) مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح۔ (۲) مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح۔

صاحب” لکھتے ہیں کہ ”یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ کتاب نیت والی حدیث سے شروع ہوتی ہے اور نیت ہی ہر کام کا سرا ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ آخرت کے لفظ پر ہوا ہے، جو کتاب کے حسنِ خاتمہ کی خبر دیتا ہے۔(۱)

تعداد احادیث: مصابیح میں لگ بھگ ساڑھے چار ہزار حدیثیں ہیں، ان میں نصف سے کچھ کم صحاح (صحیحین کی) اور نصف سے کچھ زیادہ حسان (سنن کی) ہیں۔(۲)

خصوصیات: مصابیح کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں:

۱- ائمہ صحاح اور اکابر محدثین کی روایات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیثیں نہایت معتبر و مستند ہیں گو اصحابِ صحاح کے یہاں بھی بعض ضعیف و غریب اور منکر حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس لیے یہ بھی ان سے یکسر خالی نہیں ہے، تاہم فی الجملہ یہ صحیح اور مستند حدیثوں کا مجموعہ ہے اور بغوی نے غریب وضعیف روایتوں کی نشاندہی کر دی ہے، اس حیثیت سے کتبِ حدیث میں اس کا پایہ نہایت بلند ہو گیا ہے، صاحب روضات لکھتے ہیں، اکثر علما نے اس کی حدیثوں کو نقل کیا ہے اور یہ صحیح و عمدہ روایات پر مشتمل ہے کیوں کہ ان کو ثقہ و عادل راویوں نے عادل وضابط راویوں سے نقل کیا ہے۔(۳)

۲- مختلف کتب حدیث کی روایات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ بڑی جامع کتاب ہے اس لیے اس کا مطالعہ ایک حد تک حدیث کی طویل اور ضخیم کتابوں سے مستغنی کر دیتا ہے۔

۳- مختصر اور سندوں کے نقل نہ کرنے کی وجہ سے اس سے استفادہ بہت آسان ہے۔

۴- یہ ایمانیات، اعتقادیات اور اعمال واحکام ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ ہے، اس لیے ہر طرح کا ذوق رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۵- اس کی ترتیب عمدہ ہے، صاحب الانوار نے حمیدی، ابن اثیر، صغانی، قضاعی،

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۲ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳۲ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۲۔

نووی اور مدینی وغیرہ متعدد نامور مصنفین کی کتابوں کے مقابلہ میں اس کی ترتیب کو عمدہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ جو حدیث جہاں رکھی گئی ہے اس سے زیادہ موزوں جگہ اس کی اور نہیں کوئی ہوسکتی تھی۔(۱)

۶- مصنف نے چوں کہ احادیث کو صحاح وحسان میں تقسیم کیا ہے اور ضعیف وغریب کی نشاندہی کی ہے اس لیے عموماً اس سے ہر روایت کی صحت وقوت اور ضعف وغیرہ کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

بعض اعتراضات: ۱- صاحب مشکوٰۃ کا جو بیان اوپر گذرا ہے، اس میں مصابیح میں مکمل سندیں حذف کرنے کا ذکر ہے، اس میں شبہ نہیں کہ روایات میں اسناد کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مصنف مصابیح کو بھی اس کا پورا اندازہ تھا تاہم انھوں نے طوالت کے خوف اور اختصار کی بنا پر سندیں حذف کی ہیں، دوسرے اس میں ائمہ فن اور جہابذۂ محدثین کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، جن کی احتیاط میں کوئی شبہ نہیں اس لیے ان کے نقل پر اعتماد کر کے سندیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

نووی نے بغوی کی صحاح وحسان پر تقسیم کے متعلق لکھا ہے:

واما تقسيم البغوی الی	بغوی نے صحاح وحسان کی تقسیم کر کے
حسان وصحاح مريدا	جو صحاح سے صحیحین کی اور حسان سے
بالصحاح ما فی الصحيحين	سنن کی حدیثیں مراد لی ہیں وہ درست
وبالحسان ما فی السنن	نہیں ہے کیوں کہ سنن میں تو صحیح،
فليس بصواب لان فی	حسن، ضعیف اور منکر ہر طرح کی
السنن الصحيح والحسن	حدیثیں ہیں۔
والضعيف والمنكر.(۲)	

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۴ (۲) تقریب مع شرح تدریب الراوی ص ۵۴۔

نووی کے اعتراضات کا منشا یہ ہے کہ جب کتب سنن صرف حسن روایات ہی پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ ان میں دوسری قسم کی حدیثیں بھی ہیں تو ان کی تمام مرویات کو حسان سے موسوم کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ بغوی کی خاص اصطلاح ہے، اس لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، چنانچہ تاج تبریزی کا بیان ہے کہ ''بغوی پر ابن صلاح اور نووی کے اس اعتراض پر مجھے سخت تعجب ہے کیوں کہ اصطلاح کے بارے میں ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عراقی کے مذکورہ جواب کے با ے میں یہ لکھا ہے کہ ''بغوی کی مدافعت میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ہر حدیث کے آخر میں اس کے صحیح یا حسن اور غریب ہونے کو واضح کر دیتے ہیں تو یہ واقعہ کے خلاف ہے کیوں کہ انھوں نے سنن سے جن حدیثوں کی تخریج کی ہے ان میں صحیح وحسن کے درمیان امتیاز کرنے کے بجائے سکوت اختیار کیا ہے، البتہ انھوں نے زیادہ تر غریب وضعیف کی توضیح کر دی ہے، اس لیے سنن کے مرویات میں صحیح کو حسن سے خلط ملط کر دینے کا اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے، شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ ''ابن صلاح کا منشا یہ ہے کہ بغوی نے خاص اپنے لیے سنن کی حدیثوں کو حسان کہنے کی ایک اصطلاح وضع کی ہے تا کہ ہر حدیث کے خاتمہ پر ان کو یہ واضح نہ کرنا پڑے کہ اس کی اصحاب سنن نے تخریج کی ہے لیکن یہ ایک نئی اصطلاح ہے جو عرفی اصطلاح پر جاری نہیں ہوسکتی ہے۔(۱)

مصابیح کی اہمیت اور خصوصیات کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں اور کئی مختصرات لکھے گئے ہیں، ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱- قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی (م ۶۸۵ھ) کی شرح کا نام تحفۃ الابرار بتایا جاتا ہے۔

---

(۱) تقریب مع شرح تدریب الراوی ص ۵۴۔

۲- شہاب الدین فضل اللہ بن حسین توریشی حنفی کی شرح جوالمیسر کے نام سے موسوم ہے۔

۳- شمس الدین محمد بن مظفر خلخالی (م ۷۴۵ھ) کی شرح التنویر ہے۔

۴- علاء الدین علی بن محمد الشہیر بمصنفک (المتوفی ۸۷۵ھ) کی شرح۔

۵- محمد بن محمد واسطی بغدادی، مدرس مستنصریہ معروف بابن عاقولی (م ۷۹۷ھ) کی شرح۔

۶- شمس الدین محمد بن جزری (م ۸۳۳ھ) نے تین جلدوں میں تصحیح المصابیح کے نام سے شرح لکھی۔

۷- ظہیر الدین محمود بن عبدالصمد فاروقی کی شرح۔

۸- قرۃ بن یعقوب بن ادریس حنفی رومی قرمانی (م ۸۳۳ھ) کی شرح۔

۹- قطب الدین محمد ارنیقی (م ۸۴۴ھ) کی شرح۔

۱۰- علی بن عبداللہ بن احمد المعروف بزین العرب نے تین دفعہ میں تین شرحیں لکھیں، ان میں سے جو درمیان میں لکھی گئی وہ زیادہ مشہور ومتداول ہے۔

۱۲- مظہر الدین حسین بن محمود بن حسن زیدانی کی شرح کا نام المفاتیح فی شرح المصابیح ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں حدیث کے مصطلحات وانواع علوم پر بحث کی گئی ہے۔

۱۳- مصابیح کی شرحوں میں ازہار بھی ہے لیکن اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔

۱۴- شیخ عبدالمومن بن ابی بکر بن محمد زعفرانی کی شرح۔

۱۵- خلیل بن مقبل حلبی کی بسیط شرح۔

۱۶- شیخ ابوعبداللہ اسماعیل بن محمد بن اسماعیل المدعو بالاشرف الفقاعی۔

۱۷- شیخ صدر الدین ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم سلمی منادی شافعی کی شرح کا نام

المناہج والتفاتیح فی شرح احادیث المصابیح ہے، اس میں مصابیح کی حدیثوں کی تخریج کی ہے اور اگر کوئی حدیث کتبِ صحاح کی نہیں ہے تو موطا امام مالک اور مسند شافعی وغیرہ سے اس کی تخریج کی ہے۔

۱۸- قطب الدین محمد نکیدی ارنقی نے تلفیقات المصابیح کے نام سے شرح لکھی ہے، اس میں امام نووی کی شرح سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، شروع میں اصولِ حدیث پر ایک مقدمہ بھی ہے۔

۱۹- منہل الینابیع کے شارح کا نام معلوم نہیں۔

۲۰- غیاث الدین محمد بن محمود واسطی (م ۷۱۸ھ) کی شرح۔

۲۱- ابوذر احمد بن ابراہیم حلبی کی شرح جو ناتمام ہے۔

۲۲- محمد بن عبداللطیف المعروف بابن الملک کی شرح جو لطیف اور ممزوج ہے، (۱) ایک جلد میں ہے، اس کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۹ھ میں لکھی گئی۔

۲۴- عثمان بن محمد ہروی کی مختصر شرح: یہ بیضاوی کی شرح کے بعد لکھی گئی۔

شرحوں کے علاوہ تکملے اور مختصرات بھی لکھے گئے۔

۲۵- شیخ مجدالدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) نے التخاریج فی فوائد متعلقۃ باحادیث المصابیح لکھی۔

۲۶- شیخ ولی الدین ابوعبداللہ خطیب ۷۳۷ھ کی مشہور و متداول تصنیف مشکوٰۃ المصابیح، مصابیح کا تتمہ ہے۔

۲۷- مفتاح الفتوح: صاحب کشف الظنون نے مصنف کا نام نہیں لکھا ہے، مگر

---

(۱) ممزوج وہ شرح کہلاتی ہے جس میں متن اور شرح کی عبارتیں ملی جلی ہوتی ہیں اور امتیاز کے لیے "م" اور "ش" کے حروف لکھ دیے جاتے ہیں یا متن کے اوپر نشان کھینچ دیا جاتا ہے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۲)

یہ بتایا ہے کہ اس میں شرح السنۃ اور نہایہ وغیرہ سے بعض چیزوں کا اضافہ کیا ہے اور ۷۰۷ھ میں لکھی گئی۔

۲۸- شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردی متوفی ۵۶۳ھ نے مختصر لکھا ہے

۲۹- شیخ تقی الدین علی بن عبدالکافی سبکی (م۷۵۶ھ) نے ضیاء المصابیح کے نام سے خلاصہ لکھا۔(۱)

۳۰- شرح السنۃ: یہ بھی امام بغوی کی مشہور اور اہم تصنیفات میں ہے۔ اس میں مشکلات وغرائبِ حدیث اور فقہی مسائل وغیرہ کا مفصل ذکر ہے، مصنف خود مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''یہ اخبار وروایات کے گوناگوں علوم وفوائد پر مشتمل ہے، اس میں حدیثوں کی مشکلات کو حل اور غریب کی تفسیر کی گئی ہے، نیز ان سے مستنبط ہونے والے فقہی احکام اور ان کے سلسلہ میں علماء وفقہا کے اختلافات بیان کئے گئے ہیں، یہ شرح احکام کے سلسلہ میں مرجع اور ایسی اہم باتوں اور ضروری نکتوں پر مشتمل ہے، جن سے واقفیت نہایت ضروری ہے، میں نے اس میں وہی باتیں لکھی ہیں جن پر ماہرینِ فن ائمہ سلف کا اعتماد واعتبار ہے اور ان چیزوں کو چھوڑ دیا ہے جن کو ان بزرگوں نے چھوڑ دیا ہے۔''(۲)

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''امام نووی، محی السنۃ بغوی اور ابوسلیمان خطابی شرحِ حدیث کے سلسلہ میں تمام شوافع میں زیادہ قابل اعتماد ہیں، ان لوگوں کے قول محکم اور بحثیں پرمغز ہوتی ہیں، خصوصاً شرح السنۃ بغوی فقہ حدیث اور توجیہِ مشکلات میں نہایت

(۱) ان شرحوں کا ذکر کشف الظنون ج۲ص۴۴۴و۴۴۵ اور اتحاف النبلاء المتقین ص۱۵۱و۱۵۲ میں ہے

(۲) کشف الظنون ج۲ص۵۶۔

کافی وشافی ہے، گویا کہ مصابیح اور مشکوٰۃ کی شرح اسی سے ہو جاتی ہے۔"(۱)

مصابیح کی طرح اس کے ساتھ بھی اعتنا کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کے چند مختصرات کا ذکر کیا ہے:

۱-صفی الدین محمود بن ابوبکر ارموی قرافی کا مختصر، ۲-ابوالقاسم ہبۃ اللہ طبری اسکافی کا مختصر، ۳- ابوالقاسم عبداللہ بن حسن بن عبدالملک واسطی، شافعی نے لباب شرح السنۃ فی معرفۃ احکام الکتاب والسنۃ کے نام سے مختصر لکھا اور سندوں کو حذف کر دیا ہے۔

۴-شیخ علاء الدولہ احمد بن محمد بن احمد البنا مالکی نے الفلاح کے نام سے مختصر لکھا۔

۵- رضی الدین ابراہیم بن محمد طبری (م۷۲۲ھ) کا مختصر جوالجنۃ فی مختصر شرح السنۃ کے نام سے موسوم ہے۔(۲)

۶-بغوی نے خود اس شرح کی تجرید کی ہے، دونوں کے قلمی نسخے رضا لائبریری رام پور میں ہیں۔(۳)

۴-التہذیب فی الفقہ: اس میں امام شافعیؒ کے مذہب کے فقہی فروع وجزئیات کی تہذیب کی ہے۔

صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ اس میں دلائل نہیں بیان کیے گئے ہیں، غالباً اس میں اپنے شیخ قاضی حسین کے تعلیقہ میں کچھ کمی بیشی کر کے اس کی تلخیص کی ہے۔

حسین بن محمد مروزی ہروی شافعی نے لباب التہذیب کے نام سے اس کی تلخیص اور شہاب احمد بن محمد مروزی ہروی شافعی نے لباب التہذیب کے نام سے اس کی تلخیص اور شہاب احمد بن محمد بن منیر اسکندری (م۶۸۳ھ) نے مختصر کیا ہے،(۴) یہ دس جلدوں میں

(۱) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۷ (۲) کشف الظنون ج ۳ ص ۵۵و۵۶ (۳) فہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی ج ۱ ص ۴۶۶و۴۶۷ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۲۔

ہے، آٹھ جلدیں (تیسری اور چوتھی کو چھوڑ کر) کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہیں۔ (۱)

۵- الجمع بين الصحيحين۔

۶- تعلیقات فتاویٰ قاضی حسین: اس میں اپنے شیخ اور مشہور فقیہ کے فتاویٰ پر تعلیقات لکھی ہیں۔

۷- فتاویٰ بغوی: یہ خود ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

۸- ارشاد الانوار فی شمائل النبی المختار، ۹- ترجمۃ الاحکام فی الفروع، ۱۰- الکفایہ فی القراءۃ، ۱۱- الکفایۃ فی الفقہ، ۱۲- معجم الشیوخ، (۲) ۱۳- تجرید، مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس کو شرح السنہ کی تجرید بتایا ہے۔ (۳)

۱۴- شرح ترمذی: مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے مضمون ''حجاز کے کتب خانے'' میں اس کا ذکر کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ اس کے جز ثانی کا نسخہ مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ میں ہے۔ (۴)

☆☆☆

(۱) فہرست کتب خانہ ج ۳ ص ۲۱۲ (۲) فوائد جامعہ مع عجالہ نافعہ ص ۱۹۵ (۳) فہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور ج ۱ ص ۲۶۷ (۴) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۷۰۔

ابوالحسن رزین بن معاویہ عبدری سرقسطی

(م ۵۳۵ھ)

نام ونسب: رزین نام، ابوالحسن کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: رزین بن معاویہ بن عمار، (۱)

خاندان ووطن: قبیلۂ قریش کے مشہور بطن عبدالدار بن قصی سے ان کا خاندانی اور اندلس کے شہر سرقسطہ سے وطنی تعلق ہے، اس لیے عبدری اور سرقسطی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔ (۲)

اساتذہ: رزین نے ابومکتوم عیسیٰ بن ابی ذر ہروی سے صحیح بخاری اور حسین طری سے صحیح مسلم کی روایت کی ہے۔ (۳)

سفر ومجاورتِ مکہ: انھوں نے بلادِ مشرق کا سفر کیا اور عرصۂ دراز تک مکہ معظمہ میں قیام کیا، حرمین میں قیام کی وجہ سے امام الحرمین کہلاتے تھے، بعض تذکرہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ ان کی وفات بھی مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ (۴)

حدیث میں درجہ: گو سلفی نے ان کو نازل الاسناد کہا ہے، (۵) تاہم حدیث میں ان کا کارنامہ اور درجہ مسلم ہے۔

اعتراف کمالات: سلفی نے ان کو شیخ عالم اور ابن بشکوال نے عالم، فاضل اور عالم بالحدیث کہا ہے۔ (۶)

فقہی مسلک: بلادِ مغرب کے لوگوں کی طرح امام رزین بھی امام دارالہجرت کے مسلک

(۱) الدیباج المذہب ص ۱۱۸ (۲) انساب ورق ۳۸۱ واعلام ج ۱ ص ۳۲۱ (۳) شذرات الذہب ج ۴ ص ۱۰۶ (۴ و ۵) الدیباج ص ۱۱۸ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۱۰۶ (۶) الدیباج ص ۱۱۸۔

سے وابستہ تھے، صاحب دیباج کا بیان ہے کہ وہ مالکیہ کے امام تھے۔ (۱)

صلاح وتقویٰ: مورخین اور علمائے سیر نے ان کو صالح آدمی کہا ہے۔ (۲)

وفات: اکثر لوگوں نے ان کا سنہ وفات ۵۳۵ھ لکھا ہے لیکن بعض نے ۵۲۵ھ بتایا ہے، شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ امام رزین نے ۵۲۰ھ کے بعد انتقال کیا۔ (۳)

تصنیفات: امام رزین کی دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

۱- تجرید الصحاح الستہ یا کتاب الجمع بین الصحاح الستہ: یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں خیال کی جاتی ہے، اس کی اہمیت اس بنا پر زیادہ ہے کہ اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئیں وہ صرف صحیحین کی روایات کی جامع ہیں لیکن یہ حدیث کی ان چھ اہم کتابوں کی جامع ہے جو اپنے وثوق واعتبار کی وجہ سے امت میں متداول اور علما وفقہا کا ماخذ اور احکام وشرائع کا مرجع ہیں اور ان کے مصنفین بھی حفاظ ومحدثین کی پوری جماعت میں ممتاز ہیں، اس حیثیت سے اس کی نوعیت یک گونہ مختلف ہے، اس کتاب کے بعد اس نوعیت کی اور کتابیں بھی لکھی گئیں، ان میں امام ابن اثیر جزری کی کتاب زیادہ مشہور ہے لیکن اس میں دراصل اس کی ازسرنو ترتیب وتہذیب کی گئی ہے، فالفضل للمتقدم۔

چوں کہ چھٹی صدی اور اس کے بعد بھی صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کو محسوب کیا جاتا تھا، اس لیے امام رزین نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ساتھ موطا ہی کی روایتوں کو جمع کیا ہے۔ (۴)

۲- اخبار مکہ: اوپر گذر چکا ہے کہ امام رزین نے مدت دراز تک مکہ میں قیام کیا، اس لیے غالباً ان کو اس کتاب کو مرتب کرنے کا خیال ہوا ہوگا اور اس میں یہاں کے واقعات واخبار جمع کیے ہوں گے۔

---

(۱) الدیباج المذہب ص ۱۱۸ وروضات الجنات ص ۲۸۶ (۲) ایضاً (۳) ایضا ومقدمہ شرح مشکوۃ ص ۱۳، واتحاف النبلاء ص ۱۵۷۔ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۲۵ والرسالۃ المستطرفہ ص ۲۸۶۔

ابوبکر محمد بن عبداللہ بن العربی

(م ۵۴۳ھ)

نام ونسب: ابوبکر کنیت، ابن العربی لقب وعرفیت اور نام ونسب یہ ہے: محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن احمد۔(۱)

ولادت: مشہور روایت کے مطابق جمعرات ۲۲ رشعبان ۴۶۸ھ کو پیدا ہوئے، ابن خلکان نے ۴۶۹ھ کی بھی روایت کی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے ۴۴۸ھ سن پیدائش لکھا ہے لیکن یہ کتابت وطباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور پہلی روایت صحیح ہے کیوں کہ ابن بشکوال نے خودان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میں شعبان ۴۶۸ھ میں پیدا ہوا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ ۴۸۵ھ میں بلادِ مشرق کی سیاحت کے لیے گئے تو اس وقت مورخین کے بیان کے مطابق ان کی عمر سترہ سال تھی۔(۲)

خاندان: امام ابوبکر بن العربی کا خاندانی تعلق یمن کے قبیلہ معافر سے ہے، اسی لیے وہ معافری کہلاتے ہیں، ان کے والد ابومحمد عبداللہ کو علمی ودنیاوی وجاہت حاصل تھی اور وہ اشبیلیہ کے ممتاز علما ورؤسا میں تھے، فقہ وادب کے ماہر اور شعروسخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، دولت عبادیہ میں ان کو بڑا رسوخ حاصل تھا اور وہ بنوعباد کی جانب سے بعض اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، جب آل عباد کا زوال شروع ہوا تو یہ اپنے لڑکے ابوبکر کے ساتھ بلادِ مشرق کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے، واپسی میں مصر میں ۴۹۳ھ میں انتقال ہوگیا، ان

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۳۹۲ بستان المحدثین ص ۱۳۷ (۲) ایضاً والدیباج المذہب ص ۲۸۱۔

کی پیدائش ۴۳۵ھ میں ہوئی تھی۔(۱)

وطن: بلادِ مغرب میں اقلیم اندلس کے مشہور اور بڑے شہر اشبیلیہ کو ان کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ شہر آل عباد کا پایہ تخت اور ایک زمانہ میں قرطبہ کے بجائے یہی اندلس کا دارالسلطنت تھا، اس کی نسبت سے وہ اشبیلی اور اندلس اور بلادِ مغرب سے تعلق کی وجہ سے اندلسی اور مغربی کہلاتے ہیں۔(۲)

اساتذہ: اپنے والد ابو محمد اور ماموں ابوالقاسم حسن ہوزنی کے علاوہ انھوں نے بے شمار اساتذہ فن سے تحصیلِ علم اور روایت حدیث کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن خلعی، ابوالحسن بن مشرف، ابوالحسن محمد بن عبداللہ بن داؤد الفارسی، ابونصر مقدسی، ابوالفتح نصر بن ابراہیم قرشی، ابوسعید زنجانی، ابوسعید رہاوی، ابوالقاسم بن ابوالحسن القدسی، ابومحمد ہبۃ اللہ احمد اکفانی، فضل بن فرات دمشقی، ابوالحسن مبارک بن عبدالجبار صیرفی المعروف بابن الطیوری، ابوالحسن علی بن ایوب بزاز، ابوبکر بن طرفان ابوالفوارس طراد بن محمد زینبی، جعفر بن احمد سراج، ابوالحسن بن عبدالقادر، ابوالمعالی ثابت بن بندار مکی بن عبدالسلام رملی، ابوعبداللہ حسین طبری، ابوعبداللہ بن طلحہ نعالی، ابوعبداللہ سرقسطی، ابوعبداللہ کلاعی، ابوالحسن بن حداد خولانی، مہدی وراق۔

امام ابوحامد غزالی، ابوبکر شاشی، ابوبکر طرطوسی، اور ابوزکریا تبریزی وغیرہ کی صحبت میں زیادہ رہے اور ان سے فقہ و اصول اور ادب وغیرہ کی تحصیل کی۔(۳)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کی تعداد بھی زیادہ ہے، چند کے نام یہ ہیں:

''محمد بن یوسف بن سعادہ، حافظ ابوالقاسم سہیلی، شحنہ بن یحیٰی رعینی، عبدالخالق

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۲، بستان المحدثین ص ۱۳۷، الدیباج المذہب ص ۲۸۱ (۲) الدیباج المذہب ص ۲۸۱ و معجم البلدان ج ۱ ص ۲۵۴ واللباب ج ۱ ص ۴۹ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ والدیباج المذہب ص ۲۸۱ و ۲۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶۔

بن احمد یوسفی ابن صابر دمشقی، احمد بن خلف اشبیلی، حسن بن علی قرطبی، ابوبکر محمد بن عبداللہ بن الجد فہیری، محمد بن ابراہیم بن فخار، محمد بن علی کتانی، محمد بن جابر ثعلبی، عبدالمنعم بن یحییٰ بن خلوف غرناطی، علی بن احمد شریشی، ابوالحسن علی بن احمد سقوری اور احمد بن عمر خزرجی وغیرہ۔

قاضی ابوالفضل عیاض جیسے صاحب کمال اور ابن بشکوال کو بھی ان سے تلمذ کی نسبت حاصل ہے۔(۱)

رحلت وسفر: سترہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ بلاد مشرق کی سیاحت کے لیے روانہ ہوئے اور شام، بغداد وحجاز تشریف لے گئے، دوبارہ پھر بغداد ہوتے ہوئے مصر واسکندریہ پہنچے اور ان مقامات کے ارباب کمال اور ائمہ فن سے مستفید ہوئے، بلاد مشرق کی روانگی سے قبل وہ اپنے وطن میں فن قرأت وادب وغیرہ میں کمال حاصل کر چکے تھے۔(۲)

حدیث میں درجہ: ابن العربی اندلس کے محدثین اور نامور حفاظ میں تھے، ابن بشکوال نے لکھا ہے کہ وہ متبحر حافظِ حدیث اور اندلس کے ائمہ اور خاتمۃ المحدثین میں تھے، ان کی بدولت اندلس میں احادیث واسناد کے علم کو بڑا فروغ ہوا صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ انھوں نے حدیثیں قلم بند کیں اور وہ بڑے وسیع الروایت اور کثیر الخبر تھے، ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ ''وہ ثقات واثبات اور مشہور ائمہ میں تھے۔'' دوسرے مورخین واصحابِ سیر نے ان کے حفظ وضبط اور ذکاوت وذہانت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو متبحر عالم حدیث بتایا ہے۔(۳)

فقہ: حدیث سے پہلے وہ فقہ کی تحصیل کر چکے تھے اور اس میں ان کو بڑا درک تھا، اصولِ فقہ اور فنِ خلاف کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور ان فنون کا درس بھی دیتے تھے، ذہبی کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جن کے بارے مین کہا گیا ہے کہ وہ مرتبہٗ اجتہاد پر فائز تھے، تفقہ

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۴ص۹۰ والدیباج المذہب ص۲۸۱و۲۸۲ونفح الطیب ج۱ص۳۳۶ (۲) الدیباج المذہب ص۲۸۱ (۳) ایضاونفح الطیب ج۱ص۳۳۶وتذکرۃ الحفاظ ج۴ص۹۰۔

واجتہاد میں کمال کی بنا پر محکمۂ قضا ان کے سپرد کیا گیا تھا۔(۱)

تفسیر: علم تفسیر اور قرآنیات پر بھی اچھی نظر تھی اور اس میں ان سے بعض اہم کتابیں یادگار ہیں(۲)

ادب و بلاغت نحو وکلام اور علم تاریخ وغیرہ میں مہارت: خالص اسلامی علوم کے علاوہ اورنوعیت کے بھی متعدد علوم میں ان کو مہارت اور دسترس تھی، ادب و بلاغت میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور نحو وکلام اور فن تاریخ سے شغف تھا اور ان علوم میں ان سے بعض مفید کتابیں یادگار ہیں۔

شعروسخن: موزوں طبع اور شعر وسخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے، فی البدیہہ اشعار کہہ لیتے تھے، ایک دفعہ ایک خوش رو امیر زادہ کے ساتھ شکار کو گئے، راستے میں اس نے تفریحاً ابن العربی کی جانب نیزہ کر کے ہلانا شروع کیا تو انھوں نے فی الفور یہ قطعہ کہا:

یھز علی الرمح ظبی مھفھف لعوب بالباب البریۃ عابث

فلوکان رمحا واحدا الاتقیتہٗ ولکنہ رمح ثان فثالث

ترجمہ: مجھ پر ایک پھد کنے والے چھریرے بدن کا ہرن نیزہ کو حرکت دے رہا ہے، اگر ایک ہی نیزہ ہوتا تو میں اس سے بچتا لیکن یہاں تو دوسرا اور تیسرا نیزہ بھی تھا۔

شارحین کا اختلاف ہے کہ ثانی اور ثالث سے کیا مراد ہے؟ بعض نے اس سے قد وقامت اور نگاہ مراد لی ہے اور بعض لوگوں نے کچھ اور مراد لیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب" فرماتے ہیں کہ واحد سے نیزہ کی ایک بار کی تحریک اور ثانی وثالث سے اس کی تکرار مراد ہے۔(۳)

نفح الطیب، مطمح الانس اور مسرح التانس اور بستان المحدثین وغیرہ میں ان کے

(۱) ایضاً و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۴۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ (۲) ایضاً۔ (۳) بستان المحدثین ص ۱۲۷۔

اور بھی متعدد اشعار نقل کیے گئے ہیں جن سے ان کی قوتِ طبع اور شعر وسخن سے مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جامعیت اور اعتراف کمال: ان متنوع علوم اور گونا گوں فنون میں ان کے درک ومہارت سے ان کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے، اسی بنا پر اہل سیر نے ان کو جامع کمالات، متبحر عالم، علوم ومعارف میں متقدم، فنون اور انواعِ علوم میں بحث وکلام کرنے والا اور صحیح وثواب کے امتیاز میں ثاقب الذہن قرار دیا ہے، صاحب نفح الطیب فرماتے ہیں کہ وہ اصول وفروع میں امام تھے، ان کے تمام سوانح نگار ان کے فضل وکمال پر متفق ہیں، مورخین نے ان کو علم وفن میں یکتا، علامہ، حافظ متبحر، احد الاعلام، مسند وعالمِ اندلس لکھا ہے، ابن سعید نے ان کو امام، قاضی اور فخرِ مغرب کہا ہے، صاحبِ نفح الطیب لکھتے ہیں کہ وہ فضل وکمال سے متصف تھے، ابن بشکوال نے ان کی بڑی توصیف کی ہے، ابو یحییٰ یسع بن حزم نے ان کا تذکرہ غیر معمولی تعظیم وتوقیر کے ساتھ کیا ہے، حجازی کا بیان کہ انھوں نے شام وعراق وغیرہ کو اپنے فوائد اور امتیازی کمالات سے معمور کر دیا تھا، مورخین کا متفقہ بیان ہے کہ علمائے مغرب میں مشرق کی سیاحت کرنے والوں میں ان سے زیادہ علم سے مالا مال ہو کر آنے والا کوئی اور شخص نہ تھا۔ (۱)

درس وتدریس اور شہرت ومقبولیت: مشرق کی سیاحت سے اپنے وطن اشبیلیہ میں واپس آئے تو ان کی ذات طلبۂ علم وفن کا مرکز بن گئی تھی، لوگ دور دراز سے ان کے پاس سماع کے لیے آتے اور استفادہ کرتے، عہدۂ قضا سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ محض تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کا کام انجام دیتے تھے، درس وتدریس اور گونا گوں کمالات کی وجہ سے وہ نہایت مشہور ومقبول ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے امام کہلاتے تھے۔ (۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ و ۹۱، الدیباج ص ۲۸۱ و ۲۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۶ (۲) الدیباج المذہب ص ۲۸۲۔

فقہی مذہب: بلادِ مغرب کے علما و فضلا کی طرح وہ بھی امام دار الہجرت کے فقہی مذہب و مسلک سے وابستہ تھے۔

اخلاق و عادات: سیرت و شمائل اور اخلاق و عادات میں ممتاز تھے، ضبط و تحمل، نرمی و مروت، شرافتِ نفس، حسنِ عہد، خلوص و وفا اور دوستوں سے بہتر اور عمدہ سلوک کے لیے مشہور تھے، حسنِ اخلاق اور عمدہ خصائل و عادات کی وجہ سے وہ لوگوں میں نہایت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ (۱)

ظرافت: خوش طبع اور ظریف تھے، اس لیے مجلس میں تفنن اور مزاح کی باتیں بھی کرتے تھے۔ (۲)

ثروت و امارت: اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و فضل کی طرح دنیوی اعزاز و وجاہت اور مال و دولت سے بھی نوازا تھا، اور وہ نہایت فارغ البال تھے، طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی اس لیے داد و دہش بھی کرتے رہتے تھے اور خیر خیرات کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ اشبیلیہ کی فصیل انھوں نے اپنے خرچ سے بنوائی تھی، دولت و ثروت کی فراوانی اور جود و سخاوت کی عادت نے بھی ان کو لوگوں کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ (۳)

زہد و عبادت: زہد و تقویٰ اور ورع و تدین کے بھی جامع تھے، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ وہ عابد و زاہد تھے، (۴) حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

منصب قضا: تفقہ و اجتہاد میں کمال کی وجہ سے وہ اشبیلیہ کے قاضی مقرر کیے گئے، انھوں نے اس ذمہ داری کو اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ وہ عوام و خواص میں نہایت مقبول ہو گئے لیکن چوں کہ ان کے فیصلے بے لاگ ہوتے تھے اور وہ معاملات قضا میں شدت بھی برتتے تھے، اس لیے غالباً اس منصب سے معزول کر دیے گئے۔ (۵)

---

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۳ (۲) نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۷ (۳) ایضاً ص ۲۳ و تذکرہ ج ۴ ص ۹۱

(۴) البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۲۸ (۵) تذکرہ ج ۸ ص ۹۱ والدیباج ص ۲۸۳ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶۔

ابتلاو آزمائش: غالبًا وہ اپنے کمالات کی وجہ سے محسود ہوگئے تھے، اس لیے ان کو شدائد ومحن سے بھی دوچار ہونا پڑا اور بعض مورخین کا بیان ہے کہ موحدین نے ایک سال تک ان کو مراکش میں قید و بند میں رکھا تھا، ان کے ابتلا و آزمائش کی کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں:

۱- علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ بعض فقہائے اشبیلیہ ابن مرجیٰ وغیرہ اور ابن عربی کسی مجلس میں یکجا تھے، ایک حدیث کا ذکر آیا تو ابن مرجیٰ نے کہا کہ یہ اس کے محض ایک ہی طریق کو جو مالک عن الزہری سے مروی ہے، جانتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو بھی مستفید کیجئے، انھوں نے وعدہ کیا مگر وہ وفا نہ کرسکے، اسی لیے ایک شاعر نے کہا ہے:

یااهل حمص ومن بها اوصیکم ۔۔۔ بالبر والتقوىٰ وصية مشفق

فخذوا عن العربي اسمار الدجىٰ ۔۔۔ وخذوا الرواية عن امام متقي

ان الفتى حلوا الكلام مهذب ۔۔۔ ان لم يجد خبرا صحيحا يخلق (۱)

ترجمہ: اے اہل حمص! میں آپ لوگوں کو ایک مشفق کی طرح نیکی اور تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، ابن العربی سے رات کے قصے کہانیاں سنو اور صاحب زہد و اتقا امام سے احادیث و روایات نقل کرو، شیریں سخن نوجوان صحیح اور معتبر خبر و روایت نہ پانے کی صورت میں خود ہی روایتیں گڑھ لیتا ہے۔

۲- صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں:

"وہ بڑے مکرم و معظم تھے، منصب قضا پر فائز کیے گئے، اسی زمانہ میں اشبیلیہ کی فصیل کی مرمت و اصلاح کی ضرورت پیش آئی، عید قربان کا زمانہ تھا ابن العربی نے لوگوں سے جبراً قربانی کی کھالیں جمع کرائیں، اس کی وجہ سے عوام میں شورش اور ہیجان برپا ہوگیا اور انھوں نے ان کا گھر لوٹ لیا اور وہ قرطبہ چلے گئے۔"

---

(۱) تذکرہ حضرت ج ۲ ص ۱۹۲۔

۳- ایک اور وجہ قاضی عیاض سے یہ منقول ہے کہ کثرتِ حدیث واخبار اور غریب حکایات وروایات کی وجہ سے اکثر لوگوں نے ان پر نکتہ چینی کی ہے۔

مگر یہ وجہیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں، پہلی وجہ کی صحت میں علامہ ذہبی نے کلام کیا ہے، دوسری وجہ اس لیے غلط ہے کہ مورخین کا عام بیان یہ ہے کہ انھوں نے فصیل کی مرمت خود اپنی رقم سے کرائی تھی، آخری وجہ ممکن ہے صحیح ہو مگر اس میں قید ومحن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

مورخین کے متفقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شدائد ومحن کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے اس کی کوئی صحیح وجہ نہیں لکھی ہے، قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدمے اور فیصلوں میں غیر معمولی شدت برتنے کی وجہ سے بعض لوگ ان کے درپے آزار ہوئے ہوں گے، علاوہ ازیں امرا وسلاطین سے ان کے توسل کو بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا، چنانچہ ابوعبداللہ بن مجاہد اشبیلی تقریباً تین ماہ تک مسلسل ان کی خدمت میں رہے، اس کے بعد انھوں نے وہاں جانا موقوف کردیا، لوگوں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ ابن العربی درس دیتے ہیں اور اُن کے دروازے پر سلطان کے یہاں جانے کے لیے سواری کھڑی رہتی ہے،(۱) حافظ ذہبی نے بھی لکھا ہے کہ سلاطین سے وابستگی کی وجہ سے لوگ ان کے خلاف برافروختہ رہتے تھے اور وہ دوسرے علما ومحدثین کی طرح ان کے سامنے جرأت وبے باکی سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ نرمی اور مداہنت برتتے تھے۔(۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے تقرب اور معاملات قضا میں شدت اور غریب حکایات وروایات کے نقل نے ان کی مقبولیت کو کم اور بعض لوگوں میں محسود بنا دیا تھا، ان ہی باتوں کی وجہ سے ان کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

وفات: شاہ عبدالعزیز صاحب نے ۵۵۳ھ سن وفات لکھا ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، ۵۴۶ھ، ۵۴۵ھ اور ۵۴۴ھ کی روایتیں بھی کی گئی ہیں مگر صحیح قول یہ ہے کہ وہ

(۱) نفح الطیب ج۱ص۳۳۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۴ص۹۱۔

۵۴۳ھ میں فوت ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ مراکش سے اپنے وطن واپس آرہے تھے کہ فاس کے قریب ان کا انتقال ہوگیا، ان کی لاش فاس لائی گئی اور باب المحروق کے قریب دفن کئے گئے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ مقبرہ جیلانی میں دفن کئے گئے، ان کے ایک شاگرد ابوالحکم بن حجاج نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔(۱)

تصنیفات: ابن العربی کثیر التصانیف تھے، ان کی کتابیں مفید اور بلند پایہ ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں ذیل میں ان کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱- انوار الفجر: یہ فن تفسیر میں عمدہ کتاب ہے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے اسے بیس سال میں مرتب کیا تھا، اور یہ اسّی ہزار ورقوں پر مشتمل ہے، ابوعیان فارس بن علی بن یوسف کے کتب خانہ میں جو مراکش میں ہے اس کا ایک نسخہ بیس جلدوں میں تھا۔(۲)

۲- کتاب احکام القرآن: یہ فن تفسیر میں ایک اچھی کتاب ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے، ۱۹۱۳ء میں مطبع سعادۃ سے دو جزوں میں شائع ہوئی ہے۔(۳)

۳- کتاب الناسخ والمنسوخ، ۴- قانون التاویل: یہ دونوں بھی فن تفسیر کی کتابیں ہیں اور قرآنیات کے موضوع پر عمدہ خیال کی جاتی ہیں۔(۴)

۵- کتاب المشکلین: اس میں کتاب وسنت کے بعض مشکلات کا ذکر ہے۔(۵)

۶- کتاب شرح حدیث الافک، ۷- کتاب شرح حدیث ام زرع، ۸- کتاب شرح حدیث جابر فی الشفاعۃ: یہ سب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بعض حدیثوں کی شرح میں

(۱) ایضاً ص۹۲، وابن خلکان ج۲ ص۲۹۳ والدیباج المذہب ص۲۸۴ (۲) بستان المحدثین ص۱۳۸، الدیباج المذہب ص۲۸۳ ونفح الطیب ج۱ ص۳۳۹ (۳) معجم المطبوعات کالم ۱۷۵ (۴) کشف الظنون (۵) بستان المحدثین ص۱۳۸ ونفح الطیب ص۳۳۹۔

مستقل رسالے ہیں۔

۹- کتاب الکلام علی مشکل حدیث السحاب والحجاب۔

۱۰- کتاب السبا، ۱۱- کتاب السلسلات یا المسلسلات: یہ دونوں بھی فن حدیث سے متعلق رسائل معلوم ہوتے ہیں۔

۱۲- کتاب النیرین فی شرح الصحیحین: یہ صحیحین کی شرح ہے۔

۱۳- کتاب ترتیب المسالک: یہ مؤطا امام مالکؒ کی شرح ہے۔(۱)

۱۵- کتاب القبس: یہ بھی مؤطا کی شرح ہے، اس میں مصنف نے مؤطا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شرائع اسلام میں اول وآخر کتاب ہے، ایسی کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی، کیوں کہ امام مالکؒ نے اس کو فروغ کے اصول کے لیے تمہید بتایا ہے، اور اس میں انھوں نے فقہ کے ایسے اہم اور بڑے اصولوں پر متنبہ کیا ہے جن کی جانب مسائل وفروع میں رجوع کیا جاتا ہے، شرح ترمذی میں لکھتے ہیں کہ موطا ہی اولین اصل اور خلاصہ ہے اور صحیح بخاری اصل ثانی اور ان ہی دونوں کتابوں پر تمام کتب حدیث مسلم وترمذی وغیرہ کی بنیادیں رکھی گئی ہیں، امام خطابی نے اس کا انتخاب اور ابوالحسن فاسی نے ملخص ترتیب دیا تھا جو ملخص المؤطا کے نام سے موسوم ہے۔(۲)

۱۶- عارضۃ الاحوذی: یہ جامع ترمذی کی مشہور ومقبول شرح ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ علامہ سیوطیؒ کے زمانہ تک اس کے علاوہ ترمذی کی کوئی مکمل شرح متداول نہ تھی، وہ فرماتے ہیں کہ:

لانعلم انه شرحه احد كاملا	ہم کو ابوبکر بن العربی کی عارضۃ
الا القاضی ابوبکر بن	الاحوذی کے علاوہ ترمذی کی اور کسی

(۱) ان سب کتابوں کے لیے بھی مذکورہ بالا حوالہ ملاحظہ ہو (۲) کشف الظنون جلد۲ص۵۷۲، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۸۴، ۸۵۔

العربی فی کتابہ عارضۃ الاحوذی۔ کامل شرح کا علم نہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ رقم طراز ہیں:

''یہ ترمذی کی مشہور شرحوں میں ہے، حافظ ابن حجرؒ وغیرہ مشاہیر علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں اس سے استفادہ کیا ہے اور اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔''

ٹونک کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کا ایک جز ترمذی اور اس کے بعض شروح کے ساتھ ہند کے مطبع نظامی نے شائع کیا تھا اور مصر سے یہ مکمل شرح چھپ چکی ہے۔(۱)

۱۷-شرح غریب الرسالۃ، ۱۸-الانصاف فی مسائل الخلاف: یہ بیس جلدوں میں ہے۔

۱۹-تخلیص یا تخلیص التخلیص: صاحب کشف الظنون نے اس کا بھی علم الخلاف کے ضمن میں تذکرہ کیا ہے۔

۲۰-المحصول فی اصول الفقہ یا کتاب المحصول فی علم الاصول، نام سے موضوع ظاہر ہے۔

۲۱-کتاب المتکلمین، ۲۲-تبیین الصحیح فی تعیین الذبیح، ۲۳-تفصیل التفصیل بین التحمید والتہلیل، ۲۴-کتاب التوسط فی المعرفۃ لصحۃ الاعتقاد والرد علی من خالف السنۃ من ذوی البدع والالحاد، ۲۵-سراج المریدین، ۲۶-سراج المہتدین، ۲۷-عواصم وقواصم، ۲۸-نواہی ودواہی، ۲۹-کتاب ملجاء المتفقہین الی معرفۃ غوامض النحویین (۲) جیسا کہ نام

---

(۱) کشف الظنون ج۱ ص ۳۷۵ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۳ (۲) ان سب کتابوں کے لیے الدیباج ص ۲۸۲ ونفح الطیب ص ۳۴۰ وبستان المحدثین ص ۱۳۸ ملاحظہ ہو۔

سے ظاہر ہے، یہ فن نحو کی کتاب ہے۔

۳۰- کتاب الرحلۃ یا کتاب ترتیب الرحلۃ: اس کے بعض دلچسپ اور مفید اقتباسات صاحب فتح الطیب اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی نے نقل کئے ہیں، ان میں سے بعض کو دلچسپی کے خیال سے یہاں بھی درج کیا جاتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں ایک دن بغداد میں ابوالوفا کی مجلس میں حاضر تھا، قرآن کی تفسیر ہو رہی تھی، قاری نے یہ آیت تلاوت کی کہ (تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ) میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے آہستہ سے کہا کہ یہ آیت عالم آخرت میں رویت الٰہی کی صریح دلیل ہے، کیوں کہ اہل عرب (لقيت فلانا) رویت ہی کے موقع پر کہتے ہیں، ابوالوفا نے یہ سن لیا اور مذہب اعتزال کی تائید میں یہ آیت تلاوت کی:

(فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ .... يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ الخ) اور کہا کہ منافقین کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کو رویت نہ حاصل ہوگی، میں اس وقت پاسِ ادب اور مجلس عام کی وجہ سے کچھ عرض نہ کر سکا، حالانکہ کتاب المتکلمین میں اس آیت کے ضمن میں میں نے لکھا ہے کہ (يَلْقَوْنَهُ) کی ضمیر کا مرجع نفاق ہے، جس کی تقدیر جزاء نفاق ہے''

ایک اور موقع پر رقم طراز ہیں کہ:

> ''محدثین کا قول ہے کہ حدیث کی طلب و تحصیل کرنے والے شخص کے چہرے پر شادابی اور تازگی ہوتی ہے، کیوں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

نضر الله امرأ سمع مقالتی فوعاها فاداها کما سمعها۔

اللہ تعالیٰ اس آدمی کو تروتازہ کرے جس نے میری بات کو سن کر محفوظ کیا اور اس کو اسی طرح جس طرح سنا تھا دوسرے کو پہنچایا۔

حاملین علم کے لیے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے، اس لیے اللہ کے فضل وکرم سے یہ برکت ضرور حاصل ہوگی۔(۱)

مندرجہ ذیل کتابوں کا صرف نفح الطیب کے مصنف نے ذکر کیا ہے:

۳۱- کتاب الخلافیات: یہ غالباً وہی کتاب ہے جس کا ذکر نمبر ۱۸ میں ہوا ہے۔

۳۲- کتاب الامد الاقصیٰ باسماء اللہ الحسنی وصفاتہ العلا، ۳۳- کتاب العقد الاکبر للقلب الاصغر، ۳۴- کتاب اعیان الاعیان، ۳۵- رسالۃ الکافی فی ان لا دلیل علی النامی۔

۳۶- کتاب ستر العورۃ: صاحب کشف الظنون نے ابو عبداللہ احمد بن سلیمان زبیری (م ۳۱۷ھ) کی اسی نام کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔

۳۷- کتاب مراقی الزلف: صاحب کشف الظنون نے مراقی الزلفی کے نام سے امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔

☆☆☆

(۱) نفح الطیب ج ۱ ص ۳۴۰ تا ۳۴۳ و بستان المحدثین ص ۱۳۸ و ۱۳۹۔

قاضی عیاض

(المتوفی ۵۴۴ھ)

نام ونسب: عیاض نام، ابوالفضل کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض،(۱) بعض لوگوں نے عمرو کا نام عمرون لکھا ہے۔(۲)

ولادت وخاندان: یہ وسط شعبان ۴۴۶ھ میں پیدا ہوئے، بعض نے ۴۷۶ھ سنہ ولادت لکھا ہے، یمن کے مشہور قبیلہ حمیر سے خاندانی تعلق تھا، اس خاندان کے ایک شخص یحصب ابن مالک کی نسبت سے یحصبی کہلاتے ہیں۔(۳)

قاضی عیاض کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، اس میں ان سے پہلے اور ان کے بعد کئی اصحابِ علم وفن گذرے ہیں۔

وطن: قاضی صاحب کے اجداد بسطہ سے فاس منتقل ہو گئے تھے اور پھر سبتہ آئے یہیں ان کی ولادت ہوئی، یہ ساحل سمندر پر واقع مغرب کا ایک مشہور شہر ہے، اس کے تعلق سے وہ سبتی کہے جاتے ہیں۔(۴)

اساتذہ: مشہور استادوں کے نام یہ ہیں:

---

(۱) المعجم فی اصحاب القاضی ابوعلی الصدفی لابن ابار ص ۲۹۴ وابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶ (۲) الدیباج ص ۱۶۸ وبستان المحدثین ص ۱۳۱ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۷ و ۱۱۸ (۴) ایضاً والمعجم ص ۲۹۴ وکتاب الانساب ورق ۲۸۹ والدیباج ص ۱۶۸۔

قاضی ابوالولید بن رشد، قاضی ابوعبداللہ بن حمید بن ابومحمد بن عتاب عتابی محمد بن احمد بن الحاج ، ابوعلی بن حسین محمد صدفی ، عبداللہ بن محمد بطلیوسی ،عبداللہ بن محمد خشنی ، ابوعلی حسن بن محمد بن سکرہ ، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن بقی بن مخلد ، ابوالحسین ابن سراج بن عبدالملک ، ابومحمد بن عثمان ، ہشام بن احمد ، قاضی ابوبکر بن عربی ، ابوعلی حسن بن علی طریف ، ابوالقاسم خلف بن ابراہیم بن نحاس ، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ مسبل ، عبدالرحمٰن بن محمد بن عجوز ، ابوعبداللہ محمد بن عیسیٰ تمیمی ، ابوحامد محمد بن اسماعیل ،سفیان بن عاص فقیہ، قاضی ابوعبداللہ تمیمی ، ابوالولید ہشام بن احمد المعروف ابن العواد اور ابن مغیث وغیرہ۔

جن شیوخ سے ان کو شرف اجازت حاصل تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوعلی غسانی ، شیخ ابوبکر طرطوشی ، خلیص بن عبداللہ، ابوزید بن منتال، ابن السید ابوزید بن وراق ، ابوعبداللہ خولانی ، ابوالولید بن طریف ، ابوالاصبع بن عیسیٰ بن ابی البحر الشتر ینی ، ابونصر نہاوندی ، ابوطاہر احمد بن محمد سلفی اور ابوعبداللہ مازری وغیرہ۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ان کے اساتذہ اور اجازت دینے والے شیوخ کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔(۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا، چند مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوالقاسم خلف بن بشکوال ، ابوجعفر بن قصیر غرناطی ، عبداللہ بن احمد عصیری ابومحمد عیسیٰ بن الحجری ، محمد بن حسن الحائری ۔(۲)

طلب علم کیلئے رحلت وسفر: اپنے وطن کے علما و مشائخ سے استفادہ کرنے کے بعد ۵۰۷ھ میں اندلس تشریف لے گئے ، اور قرطبہ کے علمائے فن سے کسب فیض کیا، علم کی تحصیل کیلئے انھوں نے بلادِ مشرق کا بھی سفر کیا۔(۳)

---

(۱) المعجم ص ۲۹۵ و تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۹۹، ۱۰۰ و الدیباج ص ۱۶۹ (۲) تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۱ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۷ و تذکرہ جلد ۴ ص ۱۰۰ و الدیباج ص ۲۹ و بستان المحدثین ص ۱۳۱۔

حفظ وذکاوت: قاضی عیاض کے حفظ وضبط، فہم وتیقظ اور ذکاوت وذہانت کا علمائے سیر نے ذکر واعتراف کیا ہے، ان کی غیر معمولی فطانت کا یہ حال تھا کہ ۳۰ سال کی عمر میں ارباب فن سے مناظرہ اور ۳۵ سال کی عمر میں عہدۂ قضا پر متمکن ہو چکے تھے۔ (۱)

علم حدیث میں درجہ: ان کو علم حدیث سے بڑا شغف اور خاص اشتغال تھا، اور اس فن میں مکمل مہارت اور درک رکھتے تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ حدیث اور علوم حدیث میں یکتائے روزگار اور امامِ وقت تھے، اور حدیثوں کے ضبط وتحریر اور جمع وکتابت پر پوری توجہ مبذول کرتے تھے، اسلئے ان کے پاس روایات واحادیث کا وسیع ذخیرہ تھا۔ (۲)

تفسیر وفقہ: علوم قرآن اور فقہ وخلاف میں بھی ممتاز تھے، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ ''وہ تفسیر اور اس کے متعلقہ علوم وفنون کے عالم، مبصر، فقیہ اور احکام وشرائع کے بڑے واقف کار تھے۔'' (۳)

دیگر علوم: وہ خالص دینی علوم ہی میں ممتاز اور فائق نہ تھے، بلکہ نحو، لغت، کلامِ عرب اور انساب ووقائع کے بھی نامور عالم تھے، علامہ ابن خلکان نے بھی علوم حدیث کے علاوہ نحو، لغت، کلامِ عرب، انساب اور ایام ووقائع میں ان کو امام العصر قرار دیا ہے۔ (۴)

شعر وسخن: شعر وسخن کا عمدہ ذوق تھا، ان کے جو اشعار اربابِ سیر نے نقل کئے ہیں وہ فراق وجدائی کی بے قراری، حکیمانہ مضامین اور مناظر قدرت کی مصوری وغیرہ پر مشتمل ہیں، تذکرہ نگاروں نے ان کے اشعار کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔ (۵)

خطابت: صاحب دیباج لکھتے ہیں، وہ بلیغ خطیب تھے۔ (۶)

قضا: ان کے کمسنی ہی میں قضا جیسے اہم اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہونے کا ذکر اوپر

(۱) الدیباج ص ۱۶۹ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۶ و ۱۰۷ والدیباج ص ۱۶۸ و ۱۶۹ (۳) الدیباج ص ۱۶۸ (۴) ایضاً وابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ وبستان ص ۱۳۱ (۵) ایضاً وابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶ وتذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ وبستان ص ۱۳۱ (۶) الدیباج ص ۱۶۹۔

گذرا ہے، پہلے اپنے وطن سبتہ کے برسوں قاضی رہے، پھر غرناطہ میں اس عہدہ پر مامور کیے گئے، مگر جلد ہی وہاں سے سبکدوش ہو کر دوبارہ سبتہ کے قاضی ہوئے، اس عہدہ پر مدتوں متمکن رہنے کی وجہ سے قاضی ان کے نام کا جز ہو گیا تھا۔

وہ محکمۂ قضا کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے انجام دیتے تھے اور عدل وانصاف سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔ (۱)

جامعیت واعتراف کمالات: قاضی صاحب گوناگوں اوصاف وکمالات سے متصف، مختلف علوم وفنون کے جامع، امام وقت، علامۂ دہر اور عالم مغرب تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ''وہ اکابر ائمہ حفاظ ومحدثین اور افاضل فقہا وادبا میں تھے ان کی تصنیفات اور اشعار اس پر شاہد ہیں۔'' صاحب معجم لکھتے ہیں، قاضی عیاض کے علمی خدمات متنوع اور گوناگوں ہیں، فن حدیث میں ان کا انہماک غیر معمولی اور بے مثال تھا، وہ مختلف علوم اور معانی واصطلاحات کی فہم ومعرفت مین یکتا، نظم ونثر دونوں پر قادر اور فقہ، لغت، عربیت وادب کے ماہر تھے، درحقیقت ان کی ذات لائق فخر اور سرمایۂ کمال تھی اور وہ نہ صرف اندلس بلکہ مغرب کے علما اور رجال کے صدر الصدور تھے۔ (۲)

شہرت ومقبولیت: ان اوصاف وکمالات کی بدولت ان کی شہرت ومقبولیت میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا، صاحب دیباج فرماتے ہیں کہ ان کی شہرت عظیم تھی، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ خود اپنے شہر میں جو بلند مرتبہ، غیر معمولی عظمت اور عظیم الشان وقار ان کو حاصل ہوا وہ یہاں کے کسی اور شخص کو نہ ان سے پہلے حاصل ہوا تھا اور نہ ان کے بعد ہوا۔ (۳)

فقہی مذہب: مالکی مذہب کے اکابر میں شمار کیے جاتے تھے، اس کے اصول وفروع پر ان کی نظر وسیع تھی اور وہ اس مذہب کی جزئیات کے حافظ تھے۔ (۴)

---

(۱) الدیباج ص ۱۶۹ و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ و المعجم ص ۲۱۶ (۳) الدیباج ص ۱۷۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰ (۴) الدیباج ص ۱۶۹۔

اخلاق وعادات: انکسار، تواضع، نرم خوئی، خوش معاملگی، صبر وضبط، عفو وتحمل اور سخاوت وفیاضی وغیرہ عمدہ خصائل کے مالک تھے، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے اچھا سلوک اور خوب صدقہ وخیرات کرتے تھے۔ (۱)

خشیت وحق پسندی: خوف وخشیت الٰہی، عمل صالح میں مداومت اور حق کے معاملہ میں شدت پسندی کے لیے مشہور تھے، ذہبی کا بیان ہے کہ ان کے شہر میں ایسی عظیم الشان شہرت کا حامل کوئی نہ تھا، مگر اس چیز نے عجب وکبر کے بجائے ان کے عجز وانکسار اور خوف وخشیتِ الٰہی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، ان پر خوفِ الٰہی اس قدر غالب تھا کہ قضا کے معاملات میں کبھی ناانصافی نہیں کرتے اور نہ اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور حق پسندی سے دامن کش ہوتے۔ (۲)

اس طرح نہایت متقی، زاہد، عبادت گذار اور صحیح العقیدہ اور بدعات سے سخت متنفر رہتے۔ (۳)

جلاوطنی اور وفات: موحدین (۴) کی تحریک کا ظہور ہوا تو قاضی صاحب بھی اس میں شامل ہو گئے، ۵۴۳ھ کے انتشار اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں ان کو جلاوطن ہو کر مراکش جانا پڑا، یہیں ان کا جمعہ کے دن ؍جمادی الاخریٰ ۵۴۴ھ میں انتقال ہوا اور بابِ ایلان میں

(۱) الدیباج ص ۱۶۹ (۲) لدیباج ص ۱۱۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰ (۳) مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹

(۴) اس تحریک کے بانی محمد تومرت سوس میں پیدا ہوئے، یہ نہایت لائق وقابل اور عالم وفاضل شخص اور امام غزالیؒ کے تلامذہ میں تھے، ۵۱۵ھ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی دعوت کا آغاز کیا، جب ان کا حلقۂ اثر زیادہ ہوا تو انھوں نے مہدویت کا دعویٰ کر دیا، عبدالمومن کوجوان کا خاص معتقد ومرید تھا، ۵۲۰ھ میں اپنی وفات سے پہلے اپنا جانشین مقرر کر گئے، اسی نے اندلس اور بلادِ مغرب سے مرابطین کی حکومت کا خاتمہ کر کے ان کو اپنے زیرنگیں کر لیا، ۶۲۰ھ تک الموحدین کی حکومت ان علاقوں میں رہی۔

سپرد خاک کیے گئے۔(۱) بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کسی یہودی کے زہر دیدینے سے ان کی وفات ہوگئی تھی۔(۲)

اولاد واحفاظ: قاضی عیاض کے خاندان کی بدولت اندلس اور بلادِ مغرب میں مدتوں علم وفن کی قندیلیں فروزاں رہیں اور ان کی اولاد احفاد میں بڑے ممتاز اور بلند پایہ اصحابِ علم وکمال پیدا ہوئے، فرزند ابوعبداللہ دانیہ کے قاضی اور مشہور صاحب علم تھے اور پوتے عیاض بن محمد ممتاز ادیب وشاعر تھے۔(۳)

تصنیفات: قاضی عیاض صاحب کمال اور نامور مصنف بھی تھے اور ان کی تصنیفات کیت وکیفیت دونوں اعتبار سے اہم، بلند پایہ اور علم وفن کے ذخیرہ میں بیش قیمت خیال کی جاتی ہیں، اس لیے ان کو بڑی شہرت واعتبار حاصل ہوا اور وہ ہر زمانہ کے اہل علم میں مقبول ومتداول رہی ہیں، مورخین نے ان کو مفید، معلومات افزا اور تحریر وانداز بیان کے لحاظ سے انوکھی اور دلکش بتایا ہے، ابن الانباری لکھتے ہیں ان کی مفید کتابوں کو نقل کر کے لوگ ان سے خوب فیض یاب ہوئے اور وہ ہر طبقہ کے لوگوں میں نہایت مقبول ہوئیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی اہم تصنیفات کا چاردانگِ عالم میں شہرہ ہے، ان کی بدولت مصنف کا نام روشن ہوا اور ان کی دور دور شہرت ہوئی، ان کے وطن سبتہ میں ان کے زمانہ میں کسی شخص نے اتنی زیادہ کتابیں نہیں لکھی تھیں۔"(۴)

جن کتابوں کے ناموں کا علم ہوا ہے، ان کی فہرست اور بعض اہم کتابوں کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱-کتاب اجوبة القرطبيين، ۲-کتاب الاجوبة المجهرة على

---

(۱) الدیباج ص ۱۷۰، تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۱، ابن خلکان ج ۴ ص ۱۱۸، الرسالۃ المستطرفہ ص ۸۹

(۲) المعجم ص ۲۹۶ والدیباج ص ۱۷۱ و ۱۷۲ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۷ و ۱۱۸ والدیباج ص ۱۷۲

(۴) المعجم ص ۲۹۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰۔

الاسئلة المتخيره يا عن الاسئلة المحيرة، ۳-كتاب الاعلام بحدود قواعد الاسلام يا الاعلام فى حدود الاحكام، ۴-كتاب سر السراة فى ادب القضاة ، ۵- كتاب العقيده ۔ ۶-كتاب العيون الستة فى اخبار سبته، ۷-كتاب مسئلة الاهل المشروط بينهم التزاور، ۸-مطامح الافهام فى شرح الاحكام، ۹-معجم شيوخ ابى على الصدفى، ۱۰-المقاصد لحسان فيمايلزم الانسان، ۱۱-كتاب نظم البرهان على صحة، (ياحجة) جزم الاذان۔

۱۲-كتاب اجوبة عمانزل فى ايام قضائه من نوازل الاحكام: ایک سفر میں ہے(۱) اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ان کے عہدۂ قضا کے زمانہ میں پیش آنے والے حوادث و مسائل کے بارے میں استفسارات کے جوابات اور فیصلوں پر مشتمل ہے۔

۱۳-كتاب الالماع فى ضبط الرواية وتقييد السماع: یہ اصول حدیث میں ہے،(۲) اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبہ سندیہ میں اور دوسرا کتب خانہ ایا صوفیہ میں ہے۔ (تذکرۃ النوادر ص ۴۶)

۱۴-كتاب بغية الرائد لما تضمنه حديث ام زرع من الفوائد یا کتاب شرح حدیث ام زرع: یہ حدیث مذکور کی مبسوط شرح ہے۔ (۳)

۱۵-كتاب ترتيب المدارك وتقرير المسالك لمعرفة اعلام مذهب مالك یا كتاب ترتيب المدارك وتقريب المسالك فى ذكر فقهاء مذهب مالك: اس میں مذہب مالکی کے مشاہیر و اعلام کا ذکر ہے اور یہ بڑی عمدہ اور انوکھی کتاب ہے، اس سے پہلے ایسی عمدہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، (۴) اس کا ایک قلمی نسخہ دو جلدوں

---

(۱) الدیباج ص ۱۷۱ (۲) فہرست لباب المعارف پشاور ص ۶۱ و ۶۲ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱ و کشف الظنون ج ۲ ص ۵۵ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۲۷۶۔

میں کتب خانہ خدیویہ مصر میں اور دوسرا کتب خانہ ٹونک میں ہے۔ (تذکرۃ النوادر ص ۹۹)

۱۶- کتاب التنبیہات المستنبطہ علی الکتب المدونہ یا المستنبط فی شرح کلمات مشکلہ والفاظ مغلقہ مما اشتملت علیہ الکتب المدونہ والمختلط: مذہب مالکی کی مشہور کتاب مدونہ کے مشکل و مغلق الفاظ و کلمات کی شرح اور نادر و غریب فوائد کا خزانہ ہے،(۱) اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، یہ اصل نام کے بجائے تنبیہات ستہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، بعض لوگوں نے اس کی اشعار میں تعریف کی ہے۔

۱۷- جامع التواریخ : اس مبسوط اور جامع تاریخ میں اندلس اور بلاد مغرب کے ملوک اور سرزمین سبتہ کے واقعات اور اس کے علما کے حالات درج ہیں۔ (۲)

۱۸- کتاب الخطب: مصنف کے بلیغ خطبوں کا مجموعہ ہے۔ (۳)

۱۹- کتاب الغنیہ فی شیوخہ: اس میں اپنے شیوخ کا ذکر کیا ہے۔ (۴)

۲۰- کتاب غنیۃ الکاتب وبغیۃ الطالب فی الصدور والترسل (۵) یا غنیۃ الکاتب وبغیۃ الطالب فی صدور الرسائل (۶) یا علۃ الکاتب وبغیۃ الطالب۔ (۷)

۲۱- کتاب المعجم فی شیوخ ابن سکرہ: ابوعلی حسین بن محمد سرقسطی صدفی المعروف بابن سکرہ کے مشائخ کے ناموں کی تخریج کی ہے، شروع کے چند صفحے میں ابوعلی کا ترجمہ اور اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ انھوں نے ۱۶۰ شیوخ سے اخذ و استفادہ کیا تھا۔ (۸)

۲۲- اکمال المعلم فی شرح صحیح المسلم : یہ صحیح مسلم کی شرح اور ابوعبداللہ محمد بن علی مازری (م ۵۳۶ھ) کی مشہور شرح مسلم کتاب المعلم بفوائد کتاب مسلم کا تکملہ ہے۔ (۹)

---

(۱) ایضاً ج ۲ ص ۴۱۱ (۲) تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ (۳) الدیباج ص ۱۷۱ (۴) الدیباج ص ۱۷۱ و کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۱ و بستان المحدثین ص ۱۳۱ (۵) الدیباج ص ۱۷۱ (۶) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۰ (۷) بستان المحدثین ص ۱۳۱ (۸) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵ و اتحاف النبلاء ص ۱۵۶ (۹) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۷۴۔

صحیح مسلم کی مشہور و معتبر شرحوں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور متاخرین نے اس سے اپنی شرحوں میں بڑا استفادہ کیا ہے، ابوعبداللہ محمد بن خلفہ وشتانی (م ۶۲۷ھ) نے اپنی شرح اکمال اکمال المعلم میں مازری، عیاض، قرطبی اور نووی کی شرحوں کو بعض اضافوں اور تنبیہات کے ساتھ جمع کیا ہے، اسی طرح ابوالفرج عیسیٰ بن مسعود زواری (م ۷۴۴ھ) نے بھی اپنی شرح معلم، اکمال اور مفہم ومنہاج کی مدد سے مرتب کی ہے۔(۱) اس کی اہمیت مالک بن مرجل کے ان اشعار سے ظاہر ہے۔

من قرأ الاکمال کان کاملاً ۔۔۔ فی علمہ وزین الحافلا

وکتب العلم کنوز انہا ۔۔۔ تفید نفعا عاجلاً وآجلاً

ولیس من کتب عیاض عوض ۔۔۔ فانہ کان اماما فاضلا (۲)

ترجمہ: جس نے اکمال کو پڑھا وہ اپنے علم میں کامل ہوگیا اور اس نے محفلوں کو مزین کردیا اور علمی کتابیں درحقیقت خزانہ ہیں جو جلد یا بدیر ضرور ضرور فائدہ دے گا، مگر عیاض کی کتابوں کا بدل نہیں ہے کیوں کہ وہ امام فن اور فاضل یگانہ تھے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے۔(۳)

۲۳- مشارق الانوار: اس کا پورا نام مشارق الانوار علی صحاح الآثار ہے، یہ حدیث کی تین اہم اور طبقۂ اولیٰ کی کتابوں مؤطا امام مالک، صحیح بخاری وصحیح مسلم کی شرح ہے، اس میں ان کی حدیثوں کے مشکل اور غریب الفاظ کی تحقیق وتشریح، معانی ومطالب کی توضیح، راویوں کے ناموں کا ضبط اور ان کے اغلاط، اوہام اور تصحیفات وغیرہ پر تنبیہ کی گئی ہے۔(۴)

۲۴- کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ: یہ قاضی عیاض کی بڑی مفید، مقبول

(۱) کشف الظنون ج۱ ص ۳۷۴ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳۰ (۳) فہرست وکشف الظنون ج۲ ص ۴۳۵۔ (۴) الدیباج ص ۱۷۰

اور بے نظیر کتاب ہے، اس کی جدت وندرت، ہر طبقہ ومسلک کے لوگوں میں شہرت ومقبولیت اور انداز تحریر کی دلکشی ودلآویزی وغیرہ کا قاضی عیاض کے معاصرین، ارباب سیر اور علمائے فن نے اعتراف کیا ہے، صاحب دیباج لکھتے ہیں:

''مصنف کی انفرادیت، جدت اور سبقت وتقدم کا شرف ومزیت مسلم ہے، لوگوں نے اس کتاب کی نقل وروایت کر کے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے اور شرق وغرب ہر جگہ اس کا غلغلہ بلند ہے۔''(۱)

صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں:

''یہ نہایت بیش قیمت اور مفید کتاب ہے، اس سے پہلے ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔''(۲)

صاحب روضات کا بیان ہے:

''ہمارے اصحاب یعنی فرقہ امامیہ کے لوگوں نے بھی اس کے بکثرت اقتباسات نقل کیے ہیں، درحقیقت اس میں بے شمار فوائد، بلند تحقیقات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے وفات تک کے حالات وواقعات کے متعلق حدیثیں شامل ہیں، مصنف نے اس میں اکابر شیوخ سے روایتیں نقل کی ہیں۔''(۳)

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''غرض یہ بڑی اہم، عجیب اور نہایت مقبول کتابوں میں ہے، بعض شاعروں نے اس کی منظوم تعریفیں کی ہیں۔''(۴)

کتاب الشفا میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور آپ کے جلیل

---

(۱) الدیباج المذہب ص ۱۷۰ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۲ (۳) روضات الجنات ص ۵۱۶ (۴) بستان المحدثین ص ۳۰ واتحاف النبلاء ص ۱۰۰۔

القدر منصب ومقام کو قرآن مجید، حدیث نبوی اور ائمہ کے اقوال کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، مصنف کا بیان ہے کہ:

"تم نے مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت، آپ کے اوصاف ومحامد، آپ کی توقیر واحترام کا تذکرہ کرنے اور ان امور میں کمی اور کوتاہی کرنے والوں کے احکام بیان کرنے کے لیے مسلسل اصرار کیا ہے، یہ بڑا دقت طلب اور مشکل کام ہے اور اس میں لغزش کا بھی اندیشہ ہے لیکن چوں کہ اس سے ثواب اور اللہ کے فضل وانعام کی توقع ہے اور اس کو ترک کرنا کتمانِ علم کا موجب ہے، جس کے متعلق سخت وعیدیں آئی ہیں، اس لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔"(۱)

یہ چار حصوں میں ہے اور ہر حصہ کئی ابواب وفصول پر مشتمل ہے۔

پہلے حصہ میں آپؐ کی اس ثنا وتوصیف، عظمتِ شان، فضائل وکمالات میں جامعیت اور معجزات وکرامات وغیرہ کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔

دوسرے حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ لوگوں پر آپؐ کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں، جیسے آپ پر ایمان لانا، آپ کی مکمل اطاعت، آپ سے محبت وعقیدت رکھنا، آپ کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھنا اور آپ پر درود وسلام بھیجنا وغیرہ۔

تیسرے حصہ میں یہ بحث کی گئی ہے کہ کن بشری اوصاف وخصائل کی نسبت آپ کی جانب صحیح ومناسب ہے اور کیا اوصاف آپ کی شان وعظمت کے منافی ہیں غرض ان تمام باتوں کی اس میں تفصیل کی گئی ہے جو آپ کی شان میں روا اور جائز ہیں اور ان کی بھی جو ناروا اور ممنوع ہیں۔

چوتھا حصہ آپ کی تنقیص اور سب وشتم کرنے والوں کے احکام پر مشتمل ہے،

(۱) مقدمہ الشفاء۔

اس کے آخر میں اللہ تعالیٰ، ملائکہ، عام انبیاورسل اور رسول اللہ کے آل واصحاب کی شان میں گستاخی اور سب وشتم کرنے والوں کے احکام کا ذکر ہے۔

مصنف نے تیسرے حصے کو سب سے اہم مہتم بالشان اور اس کتاب کے لکھنے کی اصل غرض وغایت بتایا ہے جو شروع کے حصوں کا دیباچہ وتمہید اور آخر کے مباحث کا تکملہ ہے۔(۱)

قرآنی آیات کی تفسیر وتاویل کے ضمن میں اعراب وقرأت کے اختلافات اور مفسرین کے تفسیری اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

کتاب الشفا بڑی بابرکت کتاب سمجھی جاتی ہے، قاضی عیاض کے برادرزادہ کہتے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا کہ میرے چچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سونے کے ایک تخت پر فروکش ہیں، یہ منظر دیکھ کر مجھ پر ہیبت ودہشت طاری ہوگئی، انھوں نے میری پریشانی اور گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا کہ کتاب الشفاء کو مضبوطی سے اختیار کرو۔ یہ گویا اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ یہ بلند مرتبہ واعزاز اسی کتاب کی کرامت کا نتیجہ ہے۔“(۲)

مختصرات وشروح: اس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اس کی شرحیں، تعلیقات اور مختصرات وغیرہ لکھے گئے ہیں، ذیل میں ان کا اور ان کے مصنفین کا نام درج کیا جاتا ہے:

۱۔ المنهل الاصفیٰ فی شرح ما تمس الحاجة اليه من الفاظ الشفاء لابی عبداللہ محمد بن ابی شریف حسنی تلمسانی، یہ الشفا کی بہترین شرحوں میں ہے، ۹۱۷ھ میں اس کی تصنیف سے مصنف فارغ ہوئے۔

۲۔ الاصطفا لبيان معانی الشفا: للشیخ شمس الدین محمد بن محمد دلجی شافعی عثمانی، (م ۹۴۷ھ) یہ ۹۳۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۳۔ شیخ امام ابوالحسن علی بن محمد بن اقبرس شافعی متوفی ۸۶۲ھ نے شرح لکھی۔

---

(۱) مقدمہ کتاب الشفاء۔ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳۰۔

۴- عمر عرضی نے ۴ جلدوں میں شرح لکھی۔

۵- ابوذر احمد بن ابراہیم حلبی (م ۹۸۴ھ) کی شرح، یہ ناتمام ہے۔

۶- مناہل الصفانی تخریج احادیث الشفاء: اس میں حافظ جلال الدین سیوطی نے شفا کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔

۷- مزیل الخفا عن الفاظ الشفا: شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن محمد شمنی (م ۸۷۶ھ) نے اس میں شفا کے حواشی وتعلیقات لکھے ہیں، ۸۴۷ھ میں اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تھے۔

۸- برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی سبط ابن العجمی نے ایک جلد میں تعلیق لکھی اور ۷۹۷ھ میں مکمل کی۔

۹- المقتفی فی حل الفاظ الشفا: یہ سبط ابن العجمی کے ایک شاگرد محمد بن خلیل حنفی کی شرح ہے، اس میں انھوں نے اپنے استاد کے افادات مذکورہ بالا نام سے اور اس پر اضافے زبدۃ المقتفی فی تحریر الفاظ الشفا کے نام سے جمع کیے ہیں، اس کی تالیف ۸۱۰ھ میں ہوئی۔

۱۰- شہاب الدین احمد بن حسین بن رسلان رملی شافعی (م ۸۴۴ھ) نے ایک مفید تعلیق لکھی۔

۱۱- عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن ابراہیم بن جماعہ کنانی قدسی (م ۸۶۷ھ) نے شفا کے بعض الفاظ کی تشریح کی ہے۔

۱۲- شیخ ابوعبداللہ محمد بن حسن بن مخلوف راشدی کی شرح۔

۱۳- کمال الدین محمد بن ابی شریف قدسی (م ۸۱۷ھ) کی شرح۔

۱۴- ابوعبداللہ احمد بن محمد بن مرزوق تلمسانی مالکی (م ۸۱۷ھ) کی شرح۔

۱۵- شیخ عبداللہ قرشی یمانی کے حواشی۔

۱۶- الشفا المسمی بالوفا: ابن الاخضر کی تلخیص ہے۔

۱۷-القفا تجریر الشفا: قطب الدین محمد بن محمد بن خیضری (م۸۹۴ھ) کی تلخیص۔

۱۸-الاکتفا فی شرح الفاظ الشفا: امام ابوالمحاسن عبدالباقی یمانی کی شرح۔

۱۹-نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض: یہ مبسوط، ضخیم اور محققانہ شرح شہاب الدین احمد خفاجی (م۱۰۱۹ھ) نے لکھی ہے اور ۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۲۰-ملا علی قاری (م۱۰۱۶ھ) نے دو جلدوں میں شرح لکھی۔

۲۱-شیخ الاسلام مولی اسحاق بن شیخ الاسلام اسماعیل آفندی (م۱۱۴۷ھ) نے شفا کا ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔

۲۲-حرمین کے مفتش مولیٰ ابراہیم جعف نے بھی ترکی ترجمہ کیا ہے۔(۱)

۲۳-المدد الفیاض بنور الشفا: شیخ ہمام حسن عدوی خمراوی (م۱۲۷۶ھ) کی شرح(۲)

۲۴-بعض مصنفین نے اس کی ساٹھ مسند حدیثوں کو ایک علاحدہ جز میں جمع کیا ہے۔(۳)

ایک اعتراض: علامہ ذہبی نے الشفا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ موضوع اور واہی روایتوں اور حدیثوں سے پُر ہے، مصنف نے اس کی روایات میں زیادہ چھان بین اور نقد و تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔

شہاب الدین نے اس اعتراض کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس میں بعض ضعیف اور موضوع حدیثیں ہیں، حافظ سیوطی نے اپنی کتاب مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفا میں ان سب کی نشاندہی کر کے تنبیہ کی ہے۔(۴)

ذہبی کا بیان گو غلو پر مبنی ہے تاہم اس کی صداقت یک گونہ مسلم ہے، قاضی عیاض نے احادیث و اخبار کے نقد و تحقیق پر پورا دھیان نہیں دیا ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۳ و ۶۴ (۲) ہادی المسترشدین ص ۳۸۷ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۸۹

(۴) مقدمۂ الشفا۔

ابو السعادات مبارک بن اثیر جزری

(متوفی ۶۰۶ھ)

نام ونسب: مبارک نام، ابو السعادات کنیت، مجد الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے: مبارک بن محمد بن محمد بن عبد الکریم بن عبد الواحد۔(۱)

ان کے والد محمد اثیر کہلاتے تھے، اس لیے ان کی اور ان کے دو اور بھائیوں کی ابن اثیر کے نام سے شہرت ہوئی۔

ولادت ووطن: ربیع الاول یا ربیع الثانی ۵۴۴ھ میں جزیرۂ ابن عمر میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی، پھر اپنے بھائی اور دیگر خاندانی متعلقین کے ساتھ موصل تشریف لائے اور وہاں مستقل بود وباش اختیار کرلی، واقدی کا بیان ہے کہ اہل برقعید میں سے ایک شخص عمر بن عبد العزیز نے اس کو آباد کرایا تھا، اس لیے اس کو جزیرۂ ابن عمر کہا جاتا ہے، ابن خلکان لکھتے ہیں کہ مجھ کو ابن عمر کے بارے میں واقفیت نہیں ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جزیرہ امیر عراقین یوسف بن عمر ثقفی کی جانب منسوب ہے، بعد میں مجھ کو معلوم ہوا کہ اس کا تعلق برقعید کے عمر بن عبد العزیز سے ہے، بعض تاریخوں میں اس کو عمر نامی ایک شخص کے دو بیٹے اوس وکامل کا جزیرہ بتایا گیا ہے لیکن ان دونوں کے متعلق بھی مجھ کو کوئی تحقیق نہیں ہوسکی، ابن المتوفی اپنی تاریخ میں عز الدین ابن اثیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اوس وکامل کے جزیرہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ دونوں عمر بن ارس ثعلبی کے بیٹے تھے،(۲) یاقوت کا بیان ہے کہ اس

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وطبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۵۲۔ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۵ و ۲۰۶۔

کے اولین بانی حسن بن عمر بن خطاب تھے۔(۱)

خاندان: ابن اثیر کا خاندان علم و فضل کا گہوارہ تھا، ان کے والد ماجد کو علم و فن سے اشتغال تھا اور ان کے دو بھائی بھی ان ہی کی طرح علمی حیثیت سے ممتاز اور صاحبِ کمال تھے، ضیاء الدین بن اثیر صاحب المثل السائرہ نامور ادیب و انشا پرداز اور عزالدین صاحبِ ''تاریخ کامل'' بے نظیر مورخ تھے۔

نسبتیں: شیبانی، اربلی، موصلی اور جزری ان کی نسبتیں ہیں،(۲) ان میں اول الذکر خاندان کی جانب اور باقی شہروں کی جانب ہیں لیکن جزری سب نسبتوں سے زیادہ مشہور ہے، یہ جزیرۂ ابن عمر کی جانب نسبت ہے۔

اساتذہ: چند مشہور استادوں کے نام یہ ہیں:

ابو القاسم صاحب ابن الخل بغدادی، ابومحمد سعید بن مبارک بن ذہان، ابوالفضل عبداللہ بن احمد الخطیب الطوسی موصلی، عبدالمومن بن کلیب، عبدالوہاب بن سکینہ یحییٰ بن سعدون قرطبی۔(۳)

تلامذہ: ان کے فرزندوں کے علاوہ شہاب قوصی اور فخر الدین بن بخاری وغیرہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔(۴)

طلب علم کے لیے سفر: ان کے بغداد اور مختلف ولایات میں جانے اور وہاں کے علماو فضلا سے استفادہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔(۵)

حدیث میں بلند پائیگی: ابن اثیر نامور محدث اور فقہ و معرفت حدیث میں یکتا تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ انھوں نے بے شمار حدیثیں سنیں اور ان کی روایت کی حدیثوں کے نقد و تمیز کے ماہر اور رجال و علل کے واقف کار تھے، تذکرہ نگاروں نے اس فن اور اس کے متعلقہ

---

(۱) معجم البلدان ج ۳ ص ۱۰۳ (۲) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ و بغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵ (۳) و (۴) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ و طبقات ابن سبکی ج ۵ ص د [illegible] بغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵۔

علوم میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

قرآنی علوم: تفسیر اور قرآنی علوم کے بھی ماہر تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وقرأ القران واتقن علومه	قرآن مجید کا مطالعہ کیا اور اس کے علوم
وحرّرها.(۲)	میں مہارت بہم پہنچائی اور ان کو قلم بند کیا

فقہ: ان کے چھوٹے بھائی مورخ ابن اثیر نے ان کو فقہ کا عالم بتایا ہے اور دوسرے ارباب سیر نے بھی اس میں ان کے کمال و امتیاز کا ذکر کیا ہے۔(۳)

لغت، عربیت اور نحو: لغت، عربیت اور نحو وغیرہ میں بھی صاحب کمال تھے، مورخ ابن اثیر لکھتے ہیں:

وكان عالما في عدة علوم	وہ متعدد علوم جیسے فقہ، اصول، نحو،
منها الفقه والاصولان	حدیث اور لغت وغیرہ کے متبحر عالم
والنحو والحديث واللغة.	تھے۔

ابن عماد فرماتے ہیں، انھوں نے حدیث کا سماع اور فقہ و حدیث اور ادب کی تحصیل کی۔(۴)

ادب و انشا: ادب و انشا کے فن سے خاص مناسبت تھی اور ان کا شمار مشہور و ممتاز ادیبوں اور انشا پردازوں میں ہوتا ہے، ان کے بھائی مورخ ابن اثیر کا بیان ہے کہ وہ ماہر کاتب اور انشا پرداز تھے، ابن سبکی نے ان کو انشا پردازی میں بارع کہا ہے، ابن خلکان وغیرہ نے بھی انشا پردازی میں ان کی جودت کا ذکر کیا ہے، اس کمال کی بنا پر مدتوں امرا کے دربار میں کتابت و انشا کے فرائض ان کے متعلق رہے۔(۵)

---

(۱) الکامل ج ۱۲ ص ۱۳ والبدایہ ج ۳ ص ۵۴ (۲) البدایہ ج ۱۳ ص ۵۴ (۳) الکامل ص ۱۳ ج ۱۲ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ (۴) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ (۵) الکامل ج ۱۲ ص ۱۱۳ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۲۲۔

شعروسخن: موزوں طبع بھی تھے اور کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔

حساب وریاضی: حساب وریاضی جیسے خشک فن سے بھی ان کو اشتغال تھا اور اس میں کئی رسائل وتصنیفات ان سے یادگار ہیں، علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ فن حساب وانشا کے عالم تھے۔(۱)

جامعیت واعتراف کمالات: مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گوناگوں علوم وفنون کے جامع تھے، مورخ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ ان کو متعدد علوم سے واقفیت تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ وہ سارے علوم میں جامع اور مختلف فنون میں صاحب تصنیفات تھے، علمائے فن اور ارباب سیر نے ان کی جامعیت، فضل وکمال، عظمت وبلند پائیگی اور گوناگوں علوم میں مہارت وغیرہ کا اعتراف کیا ہے، ابوالبرکات بن مستوفی کا بیان ہے کہ وہ معتمد ترین علمائے مشاہیر ویگانۂ روزگار فضلا، نامور ارباب فن اور جلیل القدر اصحاب کمال میں تھے، ان کے انہی کمالات اور گوناگوں محاسن نے ان کی ذات کو مرجع خلائق اور شائقین علوم کا مرکز بنادیا تھا، ابن خلکان کا بیان ہے کہ گوشہ نشینی اور معذوری کے زمانہ میں ان کے گھر پر علماوفضلا کا ازدحام رہتا تھا۔(۲)

فقہی مذہب: شافعی المذہب تھے، علامہ ابن سبکی نے ان کا اپنی کتاب طبقات میں ذکر کیا ہے۔

تدین وتقویٰ: علمی کمالات کے ساتھ ہی وہ زہد واتقا سے بھی متصف تھے، حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، ان کے بھائی کا بیان ہے کہ وہ متدین اور جادۂ مستقیم پر گامزن تھے اور ان کا گھر صوفیہ کی سرائے اور عبادت گذاروں کے لیے وقف رہتا تھا۔(۳)

حسن خلق: اوصاف حمیدہ اور اخلاق فاضلہ کے پیکر تھے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی

---

(۱) الکامل ج ۱۲ص ۱۱۳ وابن خلکان ج ۲ص ۲۰۳ وشذرات الذہب ج ۲ص ۲۲ (۲) ایضاً۔(۳) الکامل ج ۱۲ص ۱۱۳۔

اورحسنِ سلوک سے پیش آتے تھے، ابن عماد لکھتے ہیں:

وکان ذابر واحسان (۱) وہ لوگوں کے ساتھ نیک اور عمدہ برتاؤ کرتے تھے۔

امراسے تعلقات اور شاہی درباروں سے توسل: ابن اثیر امرا وسلاطین کے دربار سے بھی متوسل رہے اور ان کو اپنے زمانہ کے موصل کے تمام امرا کے یہاں رسوخ حاصل تھا، پہلے وہ امیر مجاہد الدین قایماز (۲) کے دربار سے وابستہ اور اس کے منشی رہے، امیر کی وفات تک اس خدمت پر مامور رہنے کے بعد صاحب موصل عزالدین مسعود بن مودود نے ان کو دیوان رسائل کا محکمہ دیا، جب عزالدین کی وفات ہوئی اور اس کا لڑکا نورالدین ارسلان امیر ہوا تو وہ اس کے دربار سے متعلق ہو گئے، ارسلان ان کو بہت مانتا اور انعام واکرام سے نوازتا رہا، اس کے یہاں بھی وہ کتابت وانشا کے محکمہ پر فائز تھے لیکن جب معذور ہو گئے اور کام کرنے کے لائق اور چلنے پھرنے کی سکت نہ رہ گئی تو اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ (۳) ابن کثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نورالدین کی امارت کے شروع زمانہ ہی میں انھوں نے سبکدوشی حاصل کر لی تھی، چنانچہ پہلے اس نے اپنے غلام لولو سے کہلایا کہ وہ وزارت انشا کے محکمہ کا چارج لے لیں، انکار کرنے پر وہ خود گیا، مگر انھوں نے معذرت کی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اس کام کے لیے ایک گونہ سخت گیری اور شدت سے کام لینا پڑتا ہے، جو اب میرے لیے ممکن نہیں ہے، اس عذر کی بنا پر اس نے ان کو معاف کر دیا۔ (۴)

(۱) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲ (۲) قایماز گو امیر موصل سیف الدین غازی بن مودود کا نائب تھا، مگر عملاً وہی سلطان تھا، کیونکہ سیف الدین نے اس کی قابلیت ولیاقت، حسن خدمت اور عمدہ کارگذاری کی وجہ سے تمام معاملات اسی کو سپرد کر دیے تھے (دیکھو ابن خلکان ج ۳ ص ۱۷۷) (۳) ایضاً ص ۲۰۴۔
(۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۵۴۔

غالباً آخر عمر میں وہ امرا کی صحبت سے متنفر اور کنارہ کش ہو گئے تھے۔

سرائے کی تعمیر: موصل کے قریب ایک گاؤں میں انھوں نے ایک سرائے بنوائی، اس کا نام قصر حرب تھا، اس پر انھوں نے اپنی املاک اور جائداد کا بڑا حصہ وقف کر دیا۔(۱)

بیماری اور خانہ نشینی: آخر عمر میں ان کو ایک مزمن مرض نقرس (گھٹیا) لاحق ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے ہاتھ پاؤں مفلوج اور بیکار ہو گئے تھے، اور وہ چلنے پھرنے اور لکھنے پڑھنے سے بھی بالکل معذور ہو گئے تھے، بعض مورخین کا بیان ہے کہ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس سے ان کا نصف جسم شل ہو گیا، پھر گھٹیا کی بیماری ہوئی اور ہاتھ پاؤں حرکت اور جنبش کے لائق نہیں رہ گئے، اس زمانہ میں وہ مستقل خانہ نشین ہو گئے تھے، علماء اور طلبۂ فن ان سے استفادہ کے لیے یہیں تشریف لاتے تھے، اگر کہیں جانا ہوتا تو ڈولی میں بیٹھ کر جاتے۔

ان کے بھائی عزالدین کا بیان ہے کہ بیماری کے ایام میں بلاد مغرب سے ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ کا علاج کروں گا، اور دوا کی قیمت اس وقت لوں گا جب آپ کو مکمل فائدہ ہو جائے گا، ہم لوگ اس پر راضی ہو گئے، چنانچہ اس نے ایک تیل تیار کر کے علاج شروع کیا، جب قدرے افاقہ ہوا اور ہاتھ پاؤں میں کچھ لچک اور نرمی ہو گئی اور وہ پھیلنے لگے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''اسے کچھ معاوضہ دیکر واپس کر دو'' میں نے عرض کیا کہ جب علاج سے فائدہ ہو رہا ہے تو ایسا کیوں کیا جائے؟ انھوں نے کہا کہ ''اس بیماری کی وجہ سے مجھے بڑا آرام و سکون ملا ہے، امراء و رؤسا کے یہاں آمد و رفت سے نجات مل گئی ہے، اس سے پہلے ان لوگوں کے یہاں حاضری دینی پڑتی تھی اور خودداری اور عزت نفس کے خلاف کام کرنا پڑتا تھا، مگر اب میں اپنے گھر میں راحت سے بیٹھا ہوں اور نفس کی ذلت و رسوائی سے چھٹکارا مل گیا ہے، حکام و امرا کو ضرورت پڑتی ہے تو خود آ کر مجھ سے صلاح و مشورہ کر جاتے ہیں، میرے اس آرام و سکون کا سبب یہی بیماری ہے، اس لیے

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ و طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۵۴۔

میں اس کا ازالہ اور علاج کرانا پسند نہیں کرتا، اب عمر ہی کتنی باقی ہے جو کچھ رہ گئی ہے، اسے تو آزادی اور اطمینان کے ساتھ بسر کرنے دو، مجھے اپنی ذلت ومحکومی کا پورا پورا بدلہ اور فائدہ مل چکا ہے، ان کی اس تقریر کو سن کر مجھے قائل ہو جانا پڑا اور میں نے ان کے علاج کا ارادہ ترک کر کے اور معالج کو صلہ دے کر واپس کر دیا۔ (۱)

وفات: اسی معذوری اور خانہ نشینی کے زمانہ میں ۶۰۶ھ میں ذی الحجہ کی آخری تاریخ جمعرات کو موصل میں انتقال کیا اور اپنی رباط میں دفن کیے گئے۔ (۲)

تصنیفات: علامہ ابن اثیر نے متعدد کتب ورسائل تالیف کیے، ان کی تمام تصنیفات اسلوب بیان اور حسن تحریر کے لحاظ سے دلکش ہیں، بعض مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنی تمام کتابیں معذوری اور خانہ نشینی کے زمانہ میں تالیف کیں، اس زمانہ میں ان کو پوری یکسوئی حاصل تھی، اور طلبہ کا جم غفیر رہتا تھا، ان کو وہ املا کرا دیتے تھے، اور طلبہ کتابوں کی مراجعت اور حوالوں کے نقل واقتباس میں ان سے پورا تعاون کرتے تھے۔ (۳)

ابن اثیر کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

۱- کتاب الاذواد والذوات: اس کا نام کتاب البنین والبنات والآباء والامہات والاذواد والذوات اور المرصع وغیرہ بھی ہے، فن رجال کی کتاب ہے، اس میں ان ناموں کا ذکر اور تشریح ہے جن کی جانب اب، ابن اور ذو وغیرہ منسوب ہیں۔

یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں ویما سے مفصل فہرست کے ساتھ شائع ہوئی ہے، سیوطی نے اس کی تلخیص کی تھی۔ (۴)

۲- کتاب الانصاب فی الجمع بین الکشاف: یہ چار جلدوں میں کلام مجید کی ضخیم تفسیر ہے، اس میں ابو اسحٰق احمد بن ابراہیم ثعلبی (م ۴۳۰ھ) کی تفسیر الکشف والبیان اور

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ (۲) ایضاً وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۳ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۳ (۴) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۱۰۱ ومعجم المطبوعات کالم ۳۴

ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر (زمخشری (م ۵۲۸ھ) کی الکشاف عن حقائق التنزیل کا ماحصل جمع کر دیا ہے۔(۱)

۳- **کتاب الباہر فی الفروق فی النحو**: یا الفروق والابنیہ، فن نحو میں ہے۔

۴- **کتاب البدیع**: یہ بھی فن نحو میں ہے اور تہذیب فصول ابن الدہان یا شرح فصول ابن الدھان بھی اس کے نام ہیں، ابو محمد سعید بن مبارک نحوی نے ایک مختصر اور دوسری ضخیم اور مبسوط کتاب لکھی تھی، ابن اثیر نے ان کی تہذیب وتشریح کی ہے، یہ واقعی اسم بامسمی ہے اور اس کی ترتیب وتبویب نہایت عمدہ اور عجیب ہے،(۲) طاش کبریٰ زادہ نے البدیع اور تہذیب فصول الدہان کو دو کتابیں بتایا ہے۔(مفتاح السعادہ ج ۱ ص ۱۱۰)

۵- **تحفۃ الرسائل**: یہ غالباً فکاہات اور ادبی ظرائف وغیرہ سے متعلق رسائل ہیں جو مختلف النوع اجتماعی وتاریخی فوائد ومعلومات پر مشتمل ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ۳۵۲ صفحے کا ہے۔(۳)

۶- **دیوان رسائل**: غالباً یہ اور تحفۃ الرسائل ایک ہی رسالہ ہے۔

۷- **رسائل فی الحساب**: حساب وریاضی میں رسالوں کا مجموعہ ہے۔

۸- **کتاب الشافی فی شرح مسند الشافعی**: امام شافعی کی مسند کی حدیثوں کی شرح، ان کے معانی کی وضاحت، ان سے مستنبط ہونے والے احکام ومسائل اور لغوی تحقیق اور نحوی مباحث وغیرہ کا ذکر ہے اور تقریباً ایک سو کراسہ پر مشتمل ہے۔(۴)

۹- **شرح غریب الطوال**: صرف ابن سبکی نے اس کا نام لکھا ہے۔

۱۰- **کتاب صنعۃ الکتابۃ**: فن انشا میں ہے۔

۱۱- **کتاب المختار فی مناقب الاخیار**: یہ چار جلدوں میں ہے اور غالباً ابرار واخیار

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۵۹ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۹۳ (۳) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۰۱ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳۔

کے مناقب وحالات پر مشتمل ہوگی۔

۱۲- کتاب المصطفیٰ والمختار فی الادعیۃ والاذکار: اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادعیہ واذکار کا مجموعہ ہے ممکن ہے اس میں وہ دعائیں اور کلماتِ اذکار ذکر کیے گئے ہوں جو حدیثوں میں وارد ہیں۔

۱۳- النہایہ فی غریب الحدیث والاثر: یہ غریب الحدیث میں مشہور اور بلند پایہ کتاب ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ اس فن کی مشہور ومتداول اور عمدہ وجامع کتابوں میں النہایہ بھی ہے۔"(۱) طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ "اس موضوع پر ایسی عمدہ اور بےنظیر کتاب نہیں لکھی گئی۔"(۲) اس میں متقدمین کی کتابوں کا ماحصل جمع کر کے اس پر مفید اضافہ کیا گیا ہے، خصوصاً ہروی اور ابوموسیٰ مدینی اصفہانی کی کتابوں سے جو اس فن کی امہات کتب میں ہیں، یہ ماخوذ ومنقول ہے، ابن اثیر نے ان کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

النہایہ کو لغت کی کتابوں کے انداز پر حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے اور اس میں حدیثوں کے مشکل اور غریب الفاظ کو ذکر کر کے ان کے معانی بیان کیے گئے ہیں اور ہر لفظ کی تشریح سے پہلے حدیث کا وہ ٹکڑا بھی نقل کیا گیا ہے جس میں یہ لفظ آیا ہے، لغات کی تحقیق وتشریح کے لیے دوسری حدیثوں سے نظائر اور ائمہ لغت اور شارحین حدیث کے بیانات بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اس میں صرف صحاح کی حدیثوں ہی کے مشکل الفاظ کی تشریح نہیں کی گئی ہے بلکہ سنن، جوامع، مسانید اور مصنفات وغیرہ کی حدیثوں کے غریب الفاظ بھی درج ہیں، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں الفاظ حدیث کی معرفت کی ضرورت رسول اکرمﷺ کی فصاحت وبلاغت، فتوحات کے بعد اہل عرب کے دوسری قوموں سے اختلاط کے نتیجہ میں غیر زبانوں کے الفاظ کے عربی زبان میں داخل ہونے اور اس فن کی مشہور اور اہم کتابوں کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے۔(۳)

---

(۱) تدریب الراوی ص۱۹۳ (۲) مفتاح السعادۃ ج۱ ص۱۱۰ (۳) مقدمہ النہایہ ص۲ تا ۴۔

النہایہ ۱۲۶۹ھ میں طہران سے ایک ضخیم جلد میں چھپی تھی، ۱۳۰۸ھ میں قاہرہ سے چار جلدوں میں شائع ہوئی، اس ایڈیشن میں حاشیہ پر امام راغب اصفہانی کی مفردات اور ابو احمد عسکری کی تصنیفات المحدثین بھی شامل تھیں، ۱۳۱۱ھ میں مصر کے مطبع عثمانیہ نے اس کو چار جلدوں میں عبدالعزیز بن اسماعیل طہطاوی انصاری کی تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، اس کے حاشیہ پر علامہ سیوطی کی تلخیص الدر النثیر بھی چھپی ہے اور ۱۳۲۲ھ میں مطبع خیریہ نے اس کو چار جلدوں میں شائع کیا ہے،(۱) اس کی بعض تلخیصوں اور مختصر کے نام یہ ہیں:

۱- محمود بن ابوبکر ارموی (م ۷۲۳ھ) نے اس کا ذیل لکھا جو دراصل النہایہ کا تکملہ ہے۔

۲- جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اس کی تلخیص کی، اس کا نام الدر النثیر ہے، یہ النہایہ کے حاشیہ پر مطبع عثمانیہ سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، اس میں اصل کے حشو و زوائد اس طرح حذف کیے گئے ہیں کہ متن کی کوئی بات چھوٹنے نہیں پائی ہے، علاوہ ازیں ابن اثیر نے جن باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا، اس میں ان کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

۳- علامہ سیوطی نے النہایہ کا ذیل بھی لکھا تھا۔

۴- عیسیٰ بن محمد صفوی (م ۹۵۳ھ) نے مختصر لکھا تھا جو اصل کتاب کے نصف حجم کے برابر ہے۔

۵- شیخ علی بن حسام الدین الہندی المعروف بالمتقی نے مختصر لکھا۔(۲)

۱۴- **جامع الاصول فی احادیث الرسول:** یہ علامہ ابن اثیر کی سب سے مشہور و مقبول کتاب ہے، اس میں انھوں نے حدیث کی چھ امہاتِ کتب کی روایتوں کو جمع کیا ہے، اور یہ دس جزوں پر مشتمل ہے، ان سے پہلے رزین بن معاویہ نے بھی اسی نوعیت کی کتاب مرتب کی تھی اور اس کو بڑی شہرت و قبولیت بھی حاصل ہوئی تھی، ابن اثیر کی کتاب دراصل

(۱) معجم المطبوعات ج ۱ کالم ۳۵ و اکتفاء القنوع ص ۱۳۱ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۱۔

اس کا تکملہ ہے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں، اس میں صحاح ستہ کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، یہ اگرچہ رزین بن معاویہ کی کتاب کی طرح ہے، مگر اس میں بے شمار اضافے کئے گئے ہیں،(۱) خود ابن اثیر لکھتے ہیں

''امام رزین کی کتاب بڑی جامع اور نہایت مفید ہے، کیونکہ انھوں نے اس میں امہات کتب یعنی صحاح ستہ کی روایات کو جمع کیا ہے، اس لئے مجھ کو اس سے بڑا اشتغال ہو گیا، لیکن تتبع سے معلوم ہوا کہ اس میں بعض حدیثیں ایسے ابواب میں ذکر کی گئی ہیں جن کو دوسرے باب میں ذکر کرنا زیادہ بہتر تھا اور بعض حدیثوں کے نقل میں تکرار سے کام لیا گیا ہے اور بعض کو سرے سے نقل ہی نہیں کیا گیا ہے، علاوہ ازیں بعض ایسی حدیثیں بھی مجھ کو ملیں جو اصل مآخذ یعنی صحاح میں موجود نہیں ہیں، اس کی وجہ نسخوں کا فرق، حدیثوں کے طرق کا اختلاف اور مصنف کا اپنی کتاب کی ترتیب میں صحیح بخاری پر اعتماد ہے، ان ہی اسباب کی بنا پر مجھ کو رزین کی کتاب کی ترتیب وتہذیب اور اس میں صحاح کی ان روایتوں کا اضافہ کر دینے کا خیال ہوا جو اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔''(۲)

اس لحاظ سے اس کی نوعیت گویا خود ایک مستقل کتاب کی ہو گئی ہے اور گو رزین کو تقدم کا شرف ضرور حاصل ہے مگر ابن اثیر کی کتاب اس کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور مستند ہے، چنانچہ صاحب تیسیر الوصول لکھتے ہیں:

''میں قدیم وجدید ائمہ فن کی اکثر کتب حدیث سے واقف ہوں مگر مجھ کو جامع الاصول سے زیادہ جامع اور عمدہ کوئی کتاب نظر نہیں آئی، مصنف نے اس کو بڑی خوبی اور عمدہ ڈھنگ سے مرتب کیا ہے اور یہ گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے۔(۳)

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۵۹۔ (۳) مقدمہ تیسیر الاصول۔

جامع الاصول کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ یہ حدیث کی چھ مستند و معتبر کتابوں کی جامع ہے، یعنی مؤطا امام مالک (۱) صحیحین، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی وغیرہ کی روایات و احادیث کا یہ مجموعہ ہے، اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو اسلامیات کی اہم اور حدیث کی بنیادی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے، بعض علما کا خیال ہے کہ اس طرز پر ایسی عمدہ کتاب نہ پہلے لکھی گئی ہے اور نہ آئندہ لکھی جائے گی۔ (۲)

ابن اثیر نے محض صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی شرح بھی کی ہے اور ان کے فنی مسائل و مشکلات اور ان سے متعلقہ مباحث کی جانب بھی اعتنا کیا ہے اور حدیثوں سے مستنبط ہونے والے احکام بھی تحریر کیے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"ابن اثیر نے جامع الاصول میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کیا ہے اور غریب الفاظ کی شرح اور مشکلات کو ضبط بھی کیا ہے، اور روایان حدیث کے ناموں اور دوسرے متعلقاتِ فن کو بھی بیان کیا ہے، اس لحاظ سے یہ گویا صحاح ستہ کی شرح ہے جس طرح کہ مشارق الانوار طبقۂ اولیٰ کی تینوں کتابوں (مؤطا اور صحیحین) کی شرح ہے۔" (۳)

خود ابن اثیر فرماتے ہیں:

"رزین کی کتاب کی تہذیب و ترتیب ابواب اور اس پر اضافے کے علاوہ اس میں غریب الفاظ کی شرح اور اعراب و معانی کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔" (۴)

---

(۱) ابن اثیر نے سنن ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں والحق معہٗ یعنی صحیح قول ابن اثیر کا ہے، اس کے متعلق مفصل بحث اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن ماجہ کے تذکرہ میں گذر چکی ہے (۲) مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۱۰ (۳) عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۴ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۹۔

جامع الاصول مندرجہ ذیل تین حصوں میں ہے، ۱- مبادی، ۲- مقاصد، ۳- خاتمہ۔

پہلے حصہ میں چار فصلیں اور ایک مقدمہ ہے، مقدمہ میں علم حدیث کے اصول وقواعد اور اصطلاحات وغیرہ کا ذکر ہے اور فصلوں میں علم حدیث کی نشر واشاعت اور جمع وتدوین کتب حدیث کی تصنیف وتالیف کے اغراض ومقاصد، متاخرین کے متقدمین محدثین کی کتابوں کے خلاصے مرتب کرنے اور جامع الاصول کے مقصد تصنیف وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی تبویب وترتیب کے متعلق مصنف کا خود بیان ہے کہ:

''میں نے مسانید کے بجائے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے اور ابواب معانی کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں، پس جو حدیث کسی ایک ہی معنیٰ پر دلالت کرتی ہے اس کو میں نے اسی کے باب میں شامل کیا ہے لیکن اگر حدیث گوناگوں معانی پر مشتمل ہے تو اس کو میں نے آخر میں ایک مستقل کتاب کے اندر ذکر کیا ہے اور اس کا نام کتاب اللواحق رکھا ہے، میں نے جملہ کتب کو ابواب وفصول میں احادیث کے معانی کے اختلاف کے اعتبار سے تقسیم کردیا ہے اور چوں کہ کتب کی تعداد زیادہ ہے، اس لیے ان کو میں نے حروف پر مرتب کیا ہے، چنانچہ کتاب الایمان والاسلام اور کتاب الایلا کو الف کے بیان میں رکھا ہے، حرفوں کے آخر کے لحاظ سے ایک ایسی فصل قائم کی گئی ہے جس سے کتاب کے ابواب کے مواضع ومقامات پر استدلال کیا جاسکتا ہے، ہر اثر وحدیث کے راوی کا نام بھی کتاب کے حاشیہ پر حدیث کے مقابل میں اس کے شروع ہی میں دیدیا ہے، پھر ائمہ صحاح میں سے جس نے اس روایت کی تخریج کی ہے، اس کے نام کو ظاہر کرنے والی علامت بھی دیدی ہے، متن کے محتاج تشریح الفاظ وکلمات کو حاشیہ پر ذکر کرکے

ان کی تشریح کردی ہے، میں نے حدیثوں کی سندوں کو حذف کردیا ہے اور محض صحابی کے نام لکھنے پر اکتفا کیا ہے اور آثار کے سلسلہ میں اس شخص کا نام ذکر کیا ہے جس نے صحابی سے اس کی روایت کی ہے، ہر کتاب کے آخر میں ایک علاحدہ باب کے اندر تمام مذکورین کے ناموں کو حروفِ تہجی کے مطابق جمع کیا گیا ہے، رہا متن تو اس میں صرف حدیث یا اثر ہی کو درج کیا گیا ہے، تابعین اور ائمہ کے اقوال شاذ و نادر ہی نقل کیے گئے ہیں، البتہ امام رزین نے اپنی کتاب میں امام مالک کی فقہ کا ذکر کیا ہے۔(۱)

جامع الاصول کی اہمیت کی وجہ سے اس کے کئی مختصرات لکھے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱- ابوجعفر محمد مروزی استرآبادی نے ۶۸۲ھ میں جامع الاصول کو مختصر کیا تھا، اس وقت ان کی عمر ۶۹ سال تھی، اس کی ترتیب اصل کتاب ہی کے نہج کے مطابق ہے۔

۲- شرف الدین ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن عبدالرحیم بازری حموی شافعی (م ۷۳۸ھ) کا مختصر جو تجرید جامع الاصول کے نام سے موسوم ہے، مصنف نے اس میں غریب کی شرح، اعراب کی وضاحت اور تکرار وغیرہ کو حذف کردیا ہے، یہ ربع کتاب کے بقدر ہوگی اور حسنِ اختصار اور قابل استناد ہونے کی وجہ سے طلبۂ فن میں متداول ہے۔

۳- شیخ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی علائی دمشقی (م ۷۶۱ھ) کا مختصر جو تہذیب الاصول کے نام سے مشہور ہے۔

۴- شیخ عبدالرحمٰن بن علی الشہیر بابن الربیع الشیبانی (م ۹۴۴ھ) نے تیسیر الوصول الٰی جامع الاصول کے نام سے اس کا مختصر لکھا یہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت عمدہ ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ "یہ اصل کے ثلث کے بقدر ہے اور اختصار کے ساتھ

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۹۔

ساتھ حسنِ بیان اور لطفِ عبارت کو مدنظر رکھا گیا ہے، مصنف نے جن مباحث کو مفصل اور زیادہ شرح وبسط کے ساتھ لکھا تھا، ان کا میں نے خلاصہ بیان کردیا ہے۔'' اس کی تالیف سے ۹۱۶ھ میں فراغت ہوئی، یہ دو جلدوں میں ہے اور اس کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، کلکتہ سے ۱۲۵۲ھ میں چھپی تھی، لکھنو کے مطبع منشی نولکشور سے بھی یہ کئی دفعہ چھپی ہے اور ۱۸۹۶ء میں مطبع نولکشور کانپور نے اس کو شائع کیا تھا، نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

> ''غرض یہ مختصر تعریف وتوصیف سے مستغنی ہے، میرا ارادہ ہے کہ اس کی شرح فارسی زبان میں لکھوں تاکہ اس بہانہ سے پروانۂ نجات حاصل کروں اور اللہ کے ہاتھ میں توفیق ہے۔''(۱)

لیکن غالبًا نواب صاحب کو اس کی شرح لکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۵و۶) شیخ احمد بن رزق اللہ انصاری حنفی اور علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کے مختصر لکھے تھے۔

۷- شیخ مجد الدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی (م ۸۱۷ھ) نے اس کے زوائد مرتب کیے، اس کا نام تسہیل طریق الوصول الی الاحادیث الزائدہ علی جامع الاصول ہے، اس کو ناصر بن اشرف صاحب یمن کے لیے تالیف کیا تھا۔

۸- جامع الاصول کے غریب کے متعلق ایک کتاب محب الدین احمد بن عبداللہ طبری (م ۶۹۴ھ) نے لکھا تھا۔(۲)

---

(۱) اتحاف النبلاء ص ۴۷ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۶۰ والرسالۃ المستطرفہ ص ۱۴۳۔

امام ضیاء مقدسی

(م ۶۴۳ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور ضیاء الدین لقب تھا، نسب نامہ یہ ہے: محمد بن عبدالواحد بن احمد بن عبدالرحمٰن بن اسماعیل بن منصور۔(۱)

ولادت ووطن: ۵ جمادی الاخریٰ ۵۶۹ھ کو بیت المقدس میں پیدا ہوئے، اسی لیے مقدسی کہلاتے تھے، وہ سعدی اور صالحی کی نسبتوں سے بھی مشہور ہیں مگر اس کی تحقیق نہیں ہوسکی کہ یہ قبائل واشخاص کی جانب نسبتیں ہیں یا مقامات کی طرف۔(۲)

اساتذہ: شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابن الاخضر، ابن جوزی، ابن سکینہ، ابوجعفر صیدلانی، ابوالقاسم بوصیری، ابوالمجد البانیاسی، ابوالمظفر سمعانی، ابوالمعالی بن صابر، احمد بن موزینی، عبدالباقی بن عثمان، حافظ عبدالغنی، عبدالمعز بن محمد بزاز، عمر بن علی جوینی، فاطمہ بنت سعد الخیر، مبارک بن معطوس، موید طوسی، یحییٰ ثقفی۔

حافظ عبدالغنی کے خاص شاگردوں اور حافظ سلفی، شہدہ اور ابن بری وغیرہ نے ان کو روایت کی اجازت دی تھی۔(۳)

تلامذہ: ابن نجار، ابن نقطہ، شرف بن نابلسی، عمر بن حاجب اور فخر بخاری وغیرہ ان کے تلامذہ میں تھے۔(۴)

رحلت وسفر: بغداد، دمشق، مصر، ہمدان، اصبہان، مرو، حلب، حران، موصل اور مکہ معظمہ

(۱) شذرات الذہب ج۵ ص۲۲۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً وتذکرہ ج۴ ص۱۹۷ واتحاف النبلاء ص۳۶۷ و۳۶۸

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۱۹۷ وشذرات الذہب ج۵ ص۳۶۵۔

وغیرہ کا سفر کیا اور ان جگہوں کے علما واصحاب کمال سے استفادہ کیا، اصبہان دو دفعہ گئے اور وہاں کے علما سے فیضیاب ہوئے، بے شمار اہم کتابیں نقل کیں اور گوناگوں اصول وفوائد کی تحصیل کی۔(۱)

علم وفن سے اشتغال: ضیاء مقدسی کو علم وفن سے غیر معمولی اشتغال تھا، ابن نجار کا بیان ہے کہ میں نے علم کی طلب وتحصیل کا ان سے زیادہ شوقین کسی کو نہیں پایا، ابن رجب فرماتے ہیں کہ انھوں نے پانچ سو سے زیادہ شیوخ کی کتابیں نقل کیں، علم وفن سے غیر معمولی انہماک کی بنا پر انھوں نے کتب خانہ اور ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔(۲)

حفظ وضبط: ان کے حافظ وضابط اور ثقہ وثابت ہونے پر علمافن کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ "محدثین نے ان کے حافظہ کی تعریف کی ہے اور زکی برزالی نے ان کو ثقہ، ابن نجار نے متقن، ثابت، ثقہ، حجت، صدوق اور نبیل کہا ہے، ان کے شاگرد عمر بن حاجب کا بیان ہے کہ وہ حفظ وثقاہت میں یکتائے روزگار تھے۔(۳)

حدیث میں درجہ: ضیاء مقدسی کا پایہ حدیث میں اس قدر بلند تھا کہ محدث الشام اور شیخ السنۃ کہلاتے تھے، ابن عماد لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے صاحب کمال محدثین اور ائمہ فن میں تھے، متعدد مجموعے اور تخریجات ان سے یادگار ہیں، شریف ابو العباس حسینی فرماتے ہیں کہ وہ عرصہ دراز تک حدیث کے درس وتدریس کی مسند پر متمکن رہے، اور بے شمار حدیثیں روایت کیں، عمر بن حاجب کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ ابو عبداللہ شیخ وقت اور حدیث سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ انھوں نے روایت حدیث میں غیر معمولی طلب وتحری سے کام لیا، مزی کا بیان ہے کہ وہ حافظ عبدالغنی سے حدیث ورجال کے بڑے عالم تھے اور ان کے زمانہ میں ان کے مثل کوئی نہ تھا۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۷ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) تذکرہ ج ۴ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات ج ۵ ص ۲۲۴۔

جرح وتعدیل: حدیث میں مہارت اور بلند پائیگی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ جرح وتعدیل کے امام، فن رجال کے ماہر اور احادیث کے علل واسقام اور صحیح وغلط روایات میں نقد وامتیاز کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، ابن نجار کا بیان ہے کہ وہ حدیث وفن رجال کے عالم اور رواۃ کے حالات سے باخبر تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ضیاء جرح وتعدیل کے ممتاز عالم، رواۃ ورجال کے احوال کے واقف کار اور روایات واحادیث کے مبصر تھے۔" (۱)

فقہ وعلومِ قرآن: فقہ اور قرآنی علوم کا ذوق بھی تھا، اہل سیر نے ان کو فقیہ ومجتہد لکھا ہے، قرآنیات میں انھوں نے بعض کتابیں بھی لکھیں۔

فضل وکمال: ضیاء مقدسی علم وفضل میں نہایت ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ "وہ یگانۂ وقت اور ہم عصروں میں فائق وبرتر تھے، عمر بن حاجب ان کے بعض علمی کمالات بیان کر کے لکھتے ہیں کہ "میں ان جیسے بلند پایہ شخص کے کمالات بیان کرنے سے قاصر ہوں۔" شرف بن نابلسی کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ ضیاء کے مانند کوئی شخص صاحبِ فضل وکمال نہ تھا، صاحبِ شذرات کا بیان ہے کہ "وہ یکتائے روزگار تھے، ان کی شہرت محتاجِ بیان نہیں۔" (۲)

زہد وورع: زہد وورع، تدین وتقویٰ اور عبادت وریاضت میں بھی ممتاز تھے، محدثین اور علمائے رجال نے ان کے زہد واتقاء، تدین وانقطاع الی اللہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان علمائے ربانیین میں تھے جو ذکر وعبادت میں اکثر مشغول رہتے تھے، زکی برزالی کا بیان ہے کہ وہ متدین تھے، ابن حاجب فرماتے ہیں کہ وہ ورع وتقویٰ، زاہد، عابد، اکلِ حلال میں محتاط اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، میری آنکھوں نے عفت، نزاہت اور پاکبازی میں ان کے جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ (۳)

سیرت واخلاق: ان کی طبیعت میں بڑی سادگی اور بے تکلفی تھی اور وہ نہایت متواضع

(۱) تذکرہ ج ۴ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات ج ۵ ص ۲۲۴ (۲) شذرات ج ۵ ص ۲۲۴ (۳) ایضاً والبدایہ ج ۱۳ ص ۱۷۰۔

اور خلیق تھے، ابن نجار کا بیان ہے کہ وہ حسنِ سیرت میں ممتاز اور بے نظیر تھے۔(۱)

مدرسہ کا قیام: دمشق میں انھوں نے کوہ قاسیون کے دامن میں جامع مظفری کے دروازے پر ایک مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، ایک روایت کے مطابق اس مدرسہ کی بناء وتعمیر میں وہ خود کام کرتے اور اس کے لیے تورّعاً کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرتے، انھوں نے اپنے کتب خانہ کی کتابیں اس پر وقف کر دی تھیں۔ یہ مدرسہ حدیث کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا اور محتاج وضرورت مند طلبہ اور دور دراز سے آنے والے اس میں تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کے بعد بھی یہ قائم رہا اور بعض لوگوں نے اس کے لیے اپنی جائدادیں وقف کر دی تھیں۔(۲)

فقہی مسلک: حافظ ابن رجب نے طبقات حنابلہ میں ان کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنبلی المذہب تھے۔

وفات: ۷۴ سال کی عمر میں دوشنبہ ۱۸/ جمادی الاخریٰ ۶۴۳ھ کو انتقال کیا اور جبل قاسیون کے اندر دفن کیے گئے۔(۳)

تصنیفات: ضیاء مقدسی جلیل القدر مصنف تھے، انھوں نے متعدد مفید، عمدہ اور بلند پایہ کتابیں لکھیں، جو ان کے وسعتِ علم ونظر اور علومِ حدیث میں تبحر کی دلیل ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- کتاب الاحکام: تین جلدوں میں ہے مگر ناتمام ہے، ۲- الحکایات المستطرفہ: کئی جزوں میں ہے، ۳- الرواۃ عن البخاری ایک جز میں ہے، ۴- الطب والرقیات کئی جزوں میں ہے، ۵- افراد الصحیح ایک جز میں ہے، ۶- الموبقات کئی جزوں میں ہے، ۷- النہی عن سب الصحابہ، ۸- الہجرۃ الی الارض الحبشۃ ایک جز میں ہے، ۹- دلائل النبوۃ والالہیات

---

(۱) ایضاً والبدایہ ج ۱۳ ص ۱۷۰ (۲) ایضاً وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۸ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۶۔

تین جزوں پر مشتمل ہے، ۱۰- ذم المسکر ایک جز، ۱۱- سیر المقادسۃ چند جلدوں میں ہے، صاحبِ شذرات نے غالباً اسی کتاب کا نام سبب ہجرۃ المقادسۃ الیٰ دمشق وکرامات مشائخہم لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ تقریباً دس جزوں میں ہے، اس میں وہاں کے اکابر علما کے حالات وتراجم درج ہیں۔

۱۲- شفاء العلیل (ایک جز) ۱۲- صفۃ الجنۃ (تین جزوں میں، ۱۳- صفۃ النار (۲ جزوں میں)، ۱۴- غرائب الحدیث (۹ جزوں میں)، ۱۵- فضائل الاعمال (ایک جلد اور چار جزوں میں ہے، اس میں احادیث کی سندیں حذف کر کے ان کے لیے ائمہ کی کتابوں کا حوالہ دیدیا ہے) ۱۶- فضائل الشام (تین جزوں میں ہے)، ۱۷- فضائل القرآن، ابن عماد نے غالباً اسی کا نام فضائل القرأۃ لکھا ہے، ۱۸- قصہ موسیٰ (ایک جز)، ۱۹- کلام الاموات (ایک جز)، ۲۰- مناقب اصحاب الحدیث (۱) (۴ جزوں میں ہے)، ۲۱- المختارۃ فی الحدیث، اصل نام الاحادیث الجیاد المختارۃ مما لیس فی الصحیحین او احدھما ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب اور تقریباً نوے ۹۰ اجزاء پر مشتمل ہے، مگر مصنف اس کی تکمیل نہیں کر سکے تھے، یہ صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور صحیح مستدرک کی طرح کی کتاب اور ان صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے جو صحیحین میں درج نہیں ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں اس میں صحت کا التزام اور ان صحیح روایتوں کو نقل کیا گیا ہے، جن کی پہلے تصحیح نہیں کی گئی تھی، شاہ عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ائمہ صحاح کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی صحیح حدیثوں کے مجموعے مرتب کیے، ضیاء مقدسی کی المختارہ اسی نوعیت کی کتاب ہے، اس میں ان صحیح حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے، جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

اس کی ترتیب ابواب کے بجائے حروف معجم کے مطابق مسانید پر کی گئی ہے، گو ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم کی کتابوں کی جیسی شہرت المختارہ کو حاصل نہیں ہوئی مگر اس

(۱) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۵ بعض کتابوں کا اتحاف النبلاء اعلام اور کشف الظنون میں بھی ذکر ہے۔

کا نام ان کتابوں کے ساتھ ہی لیا جاتا ہے، بعض علماء کے نزدیک مستدرک سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "یہ عمدہ علوم اور حدیثی فوائد پر مشتمل ہے اور مستدرک حاکم سے بھی بڑھ کر ہے، ہمارے بعض مشائخ اس کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کاش یہ مکمل ہوگئی ہوتی۔"

حافظ ابن تیمیہ اور علامہ زرکشی سے منقول ہے کہ ضیاء مقدسی کی تصحیح حاکم کی تصحیح سے عمدہ واعلیٰ ہے، اور زرکشی نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کی تصحیح ترمذی وابن حبان کی تصحیح کے قریب قریب ہے۔

علامہ ابن عبدالہادی سے بھی اسی طرح کا بیان منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "المختارہ میں غلطیاں کم ہیں وہ حاکم کی مستدرک کی طرح نہیں ہے جس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن کا کذب وموضوع ہونا ظاہر ہے، اسی وجہ سے اس کا درجہ دوسری کتابوں سے کمتر ہے۔" صحت کے التزام کے باوجود بھی مختارہ میں ضعیف اور کم درجہ کی حدیثیں شامل ہوگئی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے، صاحب الرسالۃ المستطرفہ لکھتے ہیں:

> "اس کی اکثر روایتیں مسلّم ہیں، اور بہت کم حدیثوں پر تعقب کیا گیا ہے۔"

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ "المختارہ کی جو روایتیں صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کتاب میں نہیں ہیں اسی طرح صحیح ابوعوانہ میں جو صحیح مسلم پر مستخرج ہے، بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ہیں چونکہ ان زائد حدیثوں میں صحیح، حسن بلکہ ضعیف حدیثیں بھی شامل ہیں اس لیے ان زوائد کے بارے میں حکم لگانے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ المختارہ کا قلمی نسخہ ابن کثیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (۱)

(۱) کشف الظنون ج۲ ص ۳۹۸، البدایہ ج۱۳ ص ۱۷۰، الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۲ و۲۳ فتح المغیث ص ۱۴ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۹ و۱۶۶۔

امام نووی

(متوفی ۶۷۶ھ)

نام ونسب: یحییٰ نام، ابوزکریا کنیت اور لقب محی الدین تھا، ان کا نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن جمعہ بن حزام۔(۱)

ولادت ووطن: وہ محرم ۶۳۱ھ میں نوا میں پیدا ہوئے، یہ ملک شام میں حوران کا ایک گاؤں تھا،(۲) اسی کی نسبت سے وہ نواوی اور نووی مشہور ہیں اور حوران کے تعلق سے حورانی کہلاتے ہیں، حزامی ان کے جداعلیٰ حزام کی جانب نسبت ہے۔(۳)

اساتذہ: امام نووی نے جن اربابِ کمال سے مختلف علوم کی تحصیل کی تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابن مالک، ابواسحاق ابراہیم بن عیسیٰ مرادی، شیخ احمد مصری، تقی الدین بن ابی الیسر، جمال الدین بن صیرفی، رضی بن برہان، زین الدین خلف بن یوسف، زین الدین بن عبدالدائم، شمس الدین بن ابی عمر، شمس الدین عبدالرحمٰن بن نوح، عبدالعزیز بن محمد انصاری حموی، عبدالغنی علاء الدین، عزالدین بن خالد، عزالدین عمر بن سعد اربلی، عمادالدین عبدالکریم الخرستانی، شیخ کمال بن احمد، قاضی نفیسی۔(۴)

تلامذہ: ان سے سماع اور تخریج کرنے والے کچھ مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸ (۲) ایضاً وتذکرہ ج ۴ ص ۲۶۰ (۳) اتحاف النبلاء المتقین ص ۴۲۹

(۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱۔

ابن ابی الفتح، شیخ ابوالحجاج مزی، شہاب الدین احمد بن جعوان، خطیب صدر سلیمان جعفری، شمس الدین بن نقیب، شہاب الدین اربدی، علاء الدین بن عطار شیخ مبارک ناسک، جبریل کردی، قاضی محی الدین مزرعی۔(۱)

سیر وسیاحت: امام نووی پہلے (۶۴۹ھ) میں دمشق تشریف لے گئے اور رواحیہ میں قیام کر کے باقاعدہ علم وفن کی تحصیل شروع کی، دوسال بعد وہ اپنے والد کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور ڈیڑھ ماہ تک مدینہ کے فضلا سے استفادہ کرتے رہے، پھر وہ وہاں سے واپسی کے بعد اپنے وطن میں پورے انہماک کے ساتھ تعلیم میں مشغول ہو گئے، آخر میں بیت المقدس کی زیارت کی۔(۲)

حفظ وضبط: ائمہ فن اور تذکرہ نگاروں نے ان کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو متقن، حجت اور ثقہ وثابت لکھا ہے۔

حدیث میں بلند پائیگی: امام نووی کو علم حدیث اور اس کے متعلقات سے غیر معمولی شغف تھا اور وہ اکابر محدثین اور ممتاز شُراحِ حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے طبقات وتراجم نے ان کو حدیث میں ماہر فن اور امام وغیرہ بتایا ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ حدیث، فنونِ حدیث کے حافظ وتبحر عالم، رجال واسناد اور صحیح وسقیم حدیثوں کی پرکھ کے ماہر تھے، یافعی نے انھیں حدیث میں وسیع النظر اور کثیر المعرفت لکھا ہے، حدیث میں ان کی بلند پائیگی اور عظمت کی بنا پر ان کو حافظ ابوشامہ جیسے جلیل القدر محدث کا جانشین مقرر کیا گیا اور ان کی وفات کے بعد دارالحدیث دمشق کی تولیت وصدارت کے منصب پر فائز کیا گیا، اس ذمہ داری کو وہ عمر بھر انجام دیتے رہے۔(۳)

فقہ وافتاء: حدیث ہی کی طرح فقہ وافتاء میں بھی ممتاز تھے اور اس میں ان کے معلومات

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ص ۲۶۰ (۲) ایضاً (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ص ۲۶۲ ومرآۃ الجنان ج ۴ص ۱۸۴، ۱۸۲۔

وسیع اور نظر گہری تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے اکابر فقہا اور شوافع کے شیوخ میں تھے، یافعی کا بیان ہے کہ ان کو فقہ کی معرفت میں امتیاز حاصل تھا اور وہ معتمد اور لائق اعتبار مفتی تھے، ابن ناصر الدین نے ان کو فقیہ الامت کہا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''امام شافعی کے مذہب کی انھوں نے گوناگوں خدمات انجام دی ہیں، اس کی تحقیق وتصحیح، ضبط وتنقیح، تحریر وتدوین اور ترتیب وتہذیب میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے اور اس مذہب کے وہ چوٹی کے علما میں تھے، رافعی کے بعد اس مذہب میں ان سے زیادہ صاحب کمال اور ممتاز شخص کوئی نہیں گذرا۔''

امام نووی شافعی المذہب ہونے کے باوجود درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور بعض مسائل مین ان کے اقوال اپنے مذہب کے علما سے مختلف ہوتے تھے، جن مسائل میں انھوں نے رافعی سے اختلاف کیا ہے، ان میں سے اکثر میں ابن سبکی اور یافعی نے ان کو مصیب بتایا ہے۔(۱)

قرآنیات: بچپن ہی سے ان کو کتاب الٰہی سے خاص انس تھا اور انھوں نے اسے زبانی یاد کرلیا تھا، ہر وقت اس کی تلاوت کرتے اور دنیوی کاموں میں مشغولیت کے وقت بھی قرآن مجید زبانی پڑھا کرتے تھے، قرأت وتجوید اور علم تفسیر کی مشاہیر فضلا سے تحصیل کی تھی۔(۲)

لغت، عربیت اور نحو وصرف: گو امام نووی کی اصل توجہ حدیث وفقہ اور ان سے متعلقہ علوم کی جانب مرکوز رہی لیکن لغت وعربیت، نحو وصرف اور منطق وفلسفہ وغیرہ سے بھی اشتغال رکھتے تھے اور ان فنون کے ماہرین سے ان کی تحصیل کی تھی۔

جامعیت: اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جامع کمالات اور متعدد علوم پر دسترس رکھتے تھے، فخر

(۱) ایضاً وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۵ ص ۳۵۷ والبدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۳۵۷ البدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۱۔

حنبلی کا بیان ہے کہ وہ تمام علوم میں پختہ تھے، یافعی کا بیان ہے کہ فقہ وحدیث کے علاوہ دیگر فنون کے بھی وہ ماہر وواقف تھے۔(۱)

انہماک فی العلم: وہ شب وروز علم کی تحصیل اوردرس وتدریس، تصنیف وتالیف اور اشاعتِ علم وفن میں مشغول رہتے، ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتے، راستہ چلتے وقت بھی پڑھنے کا سلسلہ موقوف نہ کرتے، مدتوں اس حال میں گذرا کہ پہلو زمین پر رکھ کر اطمینان اور چین سے سونا نصیب نہ ہوا، بچپن میں بھی ان کو لکھنے پڑھنے کی دھن کے سوا اور کسی چیز سے کوئی رغبت نہ تھی، ان کے ہم سن لڑکے ان کو کھیلنے کے لیے مجبور کرتے تو وہ بھاگنے کی کوشش کرتے اور اگر مجبوراً ان کے ساتھ رہنا پڑتا تو قرآن مجید زبانی پڑھا کرتے، ایک دفعہ ان کے والد نے انھیں ایک دوکان پر کردیا مگر بیع وشرا کی مشغولیت کے باوجود ان کے علمی ذوق وشوق میں کمی نہ آئی، ان کے اسی شوق اوردلچسپی کی وجہ سے یاسین بن یوسف زرکشی نے بچپن ہی میں ان کے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی کہ آئندہ یہ بچہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم وزاہد ہوگا اور لوگوں کو اس سے بڑا فیض پہنچے گا، ان کے علمی انہماک کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ امام نووی روزانہ بارہ فنون کا سبق لیتے تھے، پہلا سبق حدیث کی شرح وتحقیق کا ہوتا اور بقیہ اسباق کی تفصیل یہ ہے:

دو سبق کتاب الوسیط کا، ایک سبق مہذب کا، ایک الجمع بین الصحیحین کا، چھٹا سبق صحیح مسلم کا، ساتواں ابن جنی کی کتاب اللمع کا، آٹھواں ابن السکیت کی اصلاح المنطق کا، نواں صرف کا، دسواں اصول فقہ کا، گیارھواں اسماء الرجال کا اور بارھواں اصول دین کا ہوتا تھا۔

اسباق اس شوق ومحبت سے پڑھاتے کہ کسی قسم کا کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا تھا۔

---

(۱) تذکرہ ج ۴ص ۲۶۴ ومرآۃ الجنان ج ۴ص ۱۸۴۔

اس سے ان کی غیر معمولی ذہانت وفطانت کا بھی پتہ چلتا ہے، ان کے کثرتِ اشتغال اور ذہانت وفطانت ہی کی وجہ سے ان کے کاموں میں بڑی برکت ہوئی اور ۴۵ سال کی مختصر عمر میں انھوں نے متنوع علمی کمالات اور گوناگوں اہم خدمات انجام دیئے، ساڑھے چار مہینہ کے اندر شافعی مذہب کی اہم اور جامع کتاب التنبیہ کو نہ صرف ختم کردیا بلکہ زبانی یاد بھی کرڈالا۔(۱)

درس وتدریس: انھوں نے مختلف مدارس میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیئے اور دارالحدیث اشرفیہ کے منصب صدارت پر بھی فائز رہے، اسی طرح مدرسہ اقبالیہ میں ابن خلکان کے جانشین مقرر کیے گئے اور ان کی وفات کے بعد درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔(۲)

زہد واتقاء: امام نووی بڑے متدین اور عابد وزاہد شخص تھے، برابر عبادت، ذکرِ الٰہی اور اوراد ووظائف میں مشغول رہتے تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجاہدہ وتزکیہ نفس، مراقبہ وتصفیۂ باطن تقویٰ، طہارت اور معمولی اور جزئی باتوں میں احتیاط کو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا اور اپنی خواہشاتِ نفس کو یکسر پامال کردیا تھا، یافعی کا بیان ہے کہ وہ عابد وزاہد، متورع، باعمل، شب بیدار، حامیِ دین اور ناصرِ سنت تھے، عبادت وطاعت، تلاوتِ قرآن اور تصنیف وتالیف میں ان کا تمام وقت بسر ہوتا، دنیا اور اس کے تعیشات سے بالکل دست کش رہتے اور تمام تر توجہ دین بنانے پر مرکوز رکھتے تھے، زہد وقناعت، اتباعِ سنت، اقتدائے سلف، نیکی وصلاح اور خیر خیرات کے کاموں میں لگے رہنا ان کی زندگی کا دستور تھا، ورع وتقویٰ میں بے مثال تھے، راتیں عبادت میں گذرتیں اور اس قدر روتے کہ داڑھی اور چہرہ تر بتر ہوجاتا ان کی طرح کسی شخص کو زہد وعبادت، حزم واحتیاط

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱ و ۲۳۰، مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۳ طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۵ و ۳۵۰ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۹۔

اور لوگوں سے حذر و اجتناب پر قابو نہیں ہوسکتا، فخر حنبلی کا بیان ہے کہ وہ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے، اکثر روزے رکھتے اور دوبار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اسی دینی جذبہ اور تورع کی وجہ سے انھوں نے اپنی زندگی اسلامی علوم خصوصاً حدیث وسنت کی خدمت واشاعت میں گذاری اور ان کی اصل دلچسپی کا مرکز فقہ وحدیث تھا، دوسرے علوم سے عدم رغبت ہی نہیں ایک گونہ انقباض ہوتا تھا جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھ کو طب پڑھنے کا خیال ہوا، اس لیے میں نے شیخ کی قانون خریدی مگر میرے دل پر ایسی ظلمت چھائی اور میرا حال ایسا ہوا کہ مجھ کو اس سے کسی قسم کا اشتغال ہی نہ ہوسکا، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب میرا طب کی جانب اعتنا ہے، یہ خیال آتے ہی میں نے کتاب قانون فروخت کر دی اور پھر میرا قلب منور ہوگیا۔ (۱)

سادگی وقناعت: زہد واتقاء کی بنا پر وہ نہایت صبر وقناعت کی زندگی گذارنے کے عادی ہوگئے تھے، کھانے، پینے رہنے سہنے، لباس اور پوشاک ہر چیز میں سادگی پسند کرتے تھے، تکلف، آرائش اور دنیاوی تعیشات سے ان کو سخت نفرت تھی، حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

''وہ بڑی عسرت ومشقت کی زندگی گذارتے اور بالکل موٹا جھوٹا کھاتے پہنتے تھے، ان کی پوشاک کورالٹھا اور چھوٹا سا شیخانیہ عمامہ تھا۔''

ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ نہایت قانع اور تھوڑے پر گذر اوقات کرنے والے تھے، اللہ کا دیا جو کچھ میسر آجاتا اسی پر راضی رہتے، معمولی لباس، موٹا جھوٹا کھانا اور مختصر ساز وسامان پر اکتفا کر لیتے تھے، قطب الدین یونینی فرماتے ہیں کہ تقلیل وقناعت اور عسرت وتنگی میں ان کی کوئی مثال نہ تھی۔

کم خوری کے اس قدر عادی تھے کہ اکثر روزے رکھتے اور شب وروز میں صرف ایک دفعہ عشا بعد کھانا کھاتے اور سحر کے وقت پانی پیتے، کبھی ان کے کھانے میں دو قسم کا سالن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱ و مرأۃ الجنان ج۴ ص ۱۸۱ تا ۱۸۶۔

نہیں ہوتا تھا، پھل اور میوہ جات اہلِ دمشق کی مرغوب غذا تھی، مگر بعض قباحتوں کی وجہ سے وہ تورعاً ان کا استعمال پسند نہیں کرتے تھے، دارالحدیث کے منصب صدارت پر فائز ہونے کے باوجود اس کے معاوضہ میں ایک حبہ بھی نہیں لیا بلکہ ان کے والد جو روٹی اور انجیر وغیرہ بھیج دیتے اسی پر قناعت کرتے تھے، فخر حنبلی کا بیان ہے کہ مرغوب اور لذیذ کھانا چھوڑ کر محض اپنے والد کی بھیجی ہوئی روٹی اور انجیر کھاتے تھے، کسی کا ایک درہم بھی قبول نہ کرتے، معمولی اور پیوند لگے کپڑے پہنتے اور پھل نہیں کھاتے تھے، کم خوری کے اس لیے عادی تھے کہ رات میں نیند نہ آئے اور اطمینان وسکون کے ساتھ خدا کی عبادت کر سکیں، علامہ ذہبی اپنے شیخ رشید ابن معلم سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے شیخ محی الدین کو حمام میں نہ جانے، موٹا جھوٹا کھانے اور پہننے اور سخت کوشی اور تنگی وترشی کی زندگی بسر کرنے پر ملامت کی اور کہا کہ اس سے آپ کو بیماری لاحق ہو جائے گی اور آپ علمی اشغال کے لائق نہ رہ سکیں گے تو وہ کہتے کہ اللہ کے فلاں بندے کا بھی تو مسلسل روزہ رکھنے کی وجہ سے جسم زرد ہو گیا تھا۔

نووی کا بیان ہے کہ میں جسم کی تروتازگی اور نیند کی زیادتی کے ڈر سے پھل، ترکاری، سبزی اور عمدہ کھانے سے پرہیز کرتا ہوں، ابن عطار نے فواکہ استعمال نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ دمشق کی آراضی کے بارے میں مجھ کو بعض شبہے ہیں، اس لیے ان کے استعمال میں تردد ہوتا ہے۔

چوں کہ ان کی زندگی بڑی سادہ تھی اور وہ کوئی اہتمام وتکلف پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کو دوسرے لوگوں کو اپنے یہاں کھانے کے لیے مدعو کرنے میں زحمت اور تکلف ہوتا تھا، چنانچہ ایک دفعہ شیخ برہان الدین اسکندرانی نے ان کے یہاں افطار کرنے کی خواہش کی تو انھوں نے ان سے بڑی صفائی اور بے تکلفی سے کہہ دیا کہ آپ اپنے یہاں سے کھانا لے کر آجایئے گا، ہم سب لوگ مل کر افطار کر لیں گے۔(۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ص ۲۶۱ تا ۲۶۴، مرآۃ الجنان ج ۴ص ۱۸۴ شذرات الذہب ج ۵ص ۳۵۶۔

ہدیے اور تحفے نہ قبول کرنا: ہدایا اور تحائف قبول نہ کرتے تھے، خصوصاً غیر متعلق لوگوں کے ہدیے لینے میں انھیں سخت پس وپیش ہوتا تھا، البتہ جن لوگوں سے واقفیت ہوتی تھی اور ان کے ہدایا کے بارے میں اطمینان ہوتا، ان کو لینے میں زیادہ پرہیز نہ کرتے، چنانچہ ایک دفعہ ایک فقیر نے ہدیہ کیا تو اس کو قبول کرلیا، احتیاط اور تورع کی بنا پر ہدیے کی طرح معاوضہ لینے سے بھی پرہیز تھا، مدرسہ کی ملازمت کے باوجود وہاں سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔(۱)

صبر واستقلال: صبر واستقلال میں بے مثال تھے، مصائب اور مشقتوں کو خندہ پیشانی سے انگیز کرتے اور زبان سے اُف نہ کرتے، جن چیزوں کو انھوں نے اپنا معمول بنالیا تھا ان پر ہمیشہ سختی سے قائم رہے اور ان میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیا، انھوں نے سخت تکلیفیں جھیلیں مگر ان کے شوق وانہماک اور علم کی طلب وجستجو میں کوئی کمی نہ آئی۔(۲)

اخلاق وعادات: سیرت وکردار کے لحاظ سے بھی بڑے ممتاز تھے، یافعی فرماتے ہیں کہ بخدا وہ بہترین اوصاف وخصائل اور پاکیزہ سیرت واخلاق سے متصف اور محاسن وکمالات میں عدیم النظیر تھے۔(۳)

تصوف: امام نوی بادۂ معرفت کے لذت شناس اور مشہور صوفی یٰسین بن یوسف زرکشی کے حلقہ بگوش اور عقیدمند تھے، سلوک کے آداب اور طریقت کے اشارات ان ہی سے سیکھتے تھے، صوفیہ ومشائخ سے بڑی محبت وعقیدت رکھتے تھے، پورے شوق سے ان کی صحبتوں میں حاضر ہوتے تھے، تصوف اور صوفیہ کے مخالفین پر برہمی کا اظہار کرتے تھے، کتاب الاذکار میں صوفیہ کی جماعت کے گوناگوں فضائل بیان کرکے دکھایا ہے کہ یہی اس امت کے منتخب اور عمدہ لوگ ہیں، نووی کی کرامت اور بزرگی کے بعض واقعات بھی منقول ہیں۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۲۶۲ (۲) ایضاً (۳) مرآۃ الجنان ج۴ ص۱۸۲و۱۸۵ (۴) ایضاً ص۱۸۵و۱۸۶۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: وہ فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ادائیگی سے کبھی غافل نہیں رہے، امراء وسلاطین کو بھی معروف کی تلقین کرتے اور منکر سے روکتے تھے، اس معاملہ میں بڑے جری اور بے باک تھے اور اس میں کسی مصلحت ومداہنت کے قائل نہ تھے، حق گوئی کی پاداش میں ان کو امرا کے غیظ وغضب کا نشانہ بھی بننا پڑا، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ گوناگوں مصروفیتوں اور علمی اشتغال کے باوجود اصلاحِ خلق اور امر بالمعروف کا فریضہ بھی انجام دیتے، بادشاہوں اور ظلم وجفا پرور لوگوں کے روبرو حق بات کہتے اور ان کے ملط کاموں پر سخت رد ونکیر فرماتے، انھوں نے سلاطین وامرا کو خطوط لکھ کر امورِ خیر کی تلقین اور معاصی سے بچنے کی دعوت دی۔'' ایک دفعہ ملک ظاہر کو ایک خط لکھا تو وہ سخت برہم ہوا اور گرفتار کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے تشدد سے ان کو بچالیا، بعد میں یہی ملک ظاہر ان کا معتقد ہوگیا اور بڑی تعظیم وتکریم کرنے لگا۔(۱)

متانت ووقار: بڑے سنجیدہ وباوقار تھے، بچپن ہی سے نہایت متین اور شائستہ تھے، کھیل کود اور لہوولعب سے کوئی رغبت نہ تھی، یاسین بن یوسف فرماتے ہیں کہ میرے دل میں نووی کی عظمت کا نقش اس وقت سے ثبت ہے جب وہ دس سال کے تھے، بچے ان کو کھیل کود کے لیے مجبور کرتے مگر یہ بھاگنے کی فکر میں رہتے، بحث ومبالغہ اور مناظرہ وغیرہ میں بھی متانت، اور وقار سے کام لیتے۔(۲)

اعترافِ فضل وکمال: امام نووی کی عظمت وکمال اور جامعیت کے بارے مین علمائے فن اور مورخین کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو امام، حافظ، یکتائے روزگار، قدوہ، شیخ الاسلام اور سرتاج اولیاء وغیرہ کہا ہے، ابن فرح فرماتے ہیں، ان میں تین خوبیاں تھیں، جن میں سے اگر ایک بھی کسی کے اندر ہوتو لوگ اس کے پاس سفر کرکے آئیں اور وہ مرجع خلائق بن

---

(۱) مرآۃ الجنان ج۴ ص۱۸۵ وتذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۲۶۳ وشذرات الذہب ج۵ ص۳۵۶

(۲) طبقات الشافعیہ ج۵ ص۱۶۶ وشذرات الذہب ج۵ ص۳۵۶ واتحاف النبلاء ص۴۴۰۔

جائے ، یعنی علم ، زہد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ، امام نووی میں یہ تینوں خصوصیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں ، شیخ قطب الدین یونینی کا بیان ہے ، وہ علم وورع ، ریاضت وعبادت کم خوری اور پر مشقت زندگی بسر کرنے میں بے مثال تھے ، شمس الدین ابن فخر حنبلی فرماتے ہیں ، وہ ماہر فن امام ، زبردست حافظِ حدیث اور گوناگوں علوم میں پختہ تھے ، انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور بڑے متقی وزاہد تھے ، مرغوبات ولذائذ سے بالکل دست کش ہو گئے اور معمولی پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے ، علامہ ابن سبکی نے شیخ ، علامہ ، شیخ الاسلام ، متاخرین کے استاذ ، اللہ کی حجت وبرہان ، طریقۂ اسلاف کے داعی اور سید وحصور کے شاندار القاب سے ان کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے کہ وہ مختلف علومِ فقہ ، متن حدیث ، اسماء الرجال اور لغت وصرف وغیرہ کے جامع تھے ، یافعی ان کے کمالات کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں ''شیخ الاسلام المحقق ، المدقق ، النجیب ، الحبر ، المفید ، گوناگوں فضائل ومحاسن کے جامع ، علوم میں متبحر ، حدیث ، فقہ اور لغت میں واسع المعرفت عالم وفاضل ، یگانہ ، ولی کبیر ، سید شہیر ، تمام معاصرین سے فائق وبرتر ، ہر سوان کے محاسن کا چرچا اور فضائل کی شہرت ہے ، ابن کثیر ان الفاظ میں ان کی ثنا خوانی کرتے ہیں ، شیخ محی الدین علامہ وقت ، مذہب شافعی کے شیخ اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر فقیہ اور زہد واتقاء میں بے مثال تھے ، ابن عماد اور ابن ہبۃ اللہ لکھتے ہیں '' وہ نامورانِ اسلام اور عظیم الشان لوگوں میں تھے ، انھوں نے کئی سال تک اس قدر ذوق وشوق اور ایسے غیر معمولی انہماک اور دلچسپی سے علم وفن کی تحصیل کی کہ اپنے تمام اہل زمانہ اور معاصرین سے آگے ہو گئے تھے ، طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں ، نووی اپنے زمانہ کے امام اور فاضل وعالم تھے ، حافظ سید مرتضیٰ زبیدی رقمطراز ہیں ، شیخ الاسلام استاذ المتأخرین بعد کے لوگوں پر اللہ کی حجت وبرہان ، اپنے زمانے کے قطب ، سید دوراں اور اللہ کی مخلوقات کے درمیان اس کار از تھے ۔(۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۵۹ ، ۲۶۳ ، ۲۶۴ ، طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ ، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فقہی مذہب اور انصاف پسندی: جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، وہ شافعی المذہب تھے، ان کا شمار اس مذہب کے اساطین اور اکابر میں ہوتا ہے، ان کے مزاج میں حق پسندی اور انصاف تھا، اس لیے ان کو اپنے مذہب کے علماء سے اختلاف کرنے اور دوسرے مذہب کے ائمہ کے اقوال نقل کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوتا تھا۔

عقیدہ ومسلک: وہ سلف صالحین اور اہلِ سنت والجماعت کے مذہب پر سختی سے عمل پیرا تھے، حدیث وسنت کی اتباع اور سلف کے مسلک کی ہم نوائی اور اس کی دعوت وتلقین ان کا اصلی طغرائے امتیاز تھا، ابن سبکی ویافعی کا بیان ہے کہ ''طریقۂ اسلاف کے داعی اور متقدمین اہلِ سنت والجماعت کے متبع تھے۔(۱)

خلوت پسندی: وہ طبعًا خلوت پسند تھے، زہد وتقشف اور دنیا بیزاری نے ان کو اور زیادہ عزلت گزیں بنا دیا تھا، جلوت سے نفرت تھی، اور ہجوم وازدحام قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، زندگی تجرد میں گذاری، اور شادی نہیں کی، اس لحاظ سے وہ اپنے ہم نام پیغمبر حضرت یحییٰ کے مثنیٰ تھے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں ''امام نووی سید وحصور تھے۔''(۲)

وفات: ۴۵ سال کی عمر میں چہار شنبہ ۲۴ رجب ۶۷۶ھ کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے وطن میں دفن کئے گئے، ان کی قبر ایک زمانہ میں زیارت گاہ تھی، متعدد شعرا نے ان کے مرثیے کہے ہیں۔(۳)

تصنیفات: امام نووی نے اگرچہ کم عمر پائی تھی، مگر اللہ نے ان کے علمی کاموں میں برکت دی، علاوہ ازیں وہ زندگی بھر علم وفن کی خدمت میں لگے رہے، اس لیے ان سے متعدد مفید،

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸، شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۴، ۳۵۵، طبقات الشافعیہ ابن ہبۃ اللہ ص ۸۷ وتاج العروس۔

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ ومرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۶۴ (۲) ایضاً (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۳ ومرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۶ ومفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۳۹۸۔

عمدہ اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:

''اہل بصیرت سے یہ مخفی نہیں کہ امام نووی اور ان کی تصنیفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور توجہ شامل رہی ہے۔''

یافعی کا بیان ہے کہ ''امام نووی پر خدا کی برکتیں ان کی کتابوں کے ذریعہ ظاہر ہوئیں، چنانچہ ان سب کو بڑا قبول حاصل ہوا اور ہر ملک میں ان کی شہرت ہوئی اور لوگ ان سے خوب متمتع اور فیض یاب ہوئے۔''

طاش کبریٰ زادہ کا بیان ہے کہ ''نووی سے بے شمار مشہور اور بیش قیمت کتابیں یادگار ہیں اور فن حدیث میں ان کی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔(۱)

امام نووی کی کتابوں کے ناموں کی فہرست اور بعض کا مختصر تعارف ملاحظہ ہو:

۱-التحقیق والترخیص فی الاکرام بالقیام لذوی الفضل والمزیۃ من اہل الاسلام

غالباً اسی کتاب کا نام الترخیص فی الاکرام بالقیام لذوی الفضل والمزیۃ من اہل الاسلام اور فضل القیام لاہل العلم والحدیث والزہاد والعباد والصلحاء والفقرا من اہل الاسلام بھی لکھا گیا ہے، یہ مصر میں چھپ گئی ہے۔(۲)

۲-بستان العارفین، ۳-تحفۃ الوالد وبغیۃ الرائد، ۴-خلاصۃ الاحکام فی مہمات السنن وقواعد الاسلام، ۵-روح المسائل فی الفروع: یہ دو متوسط جلدوں میں ہے، اس میں مسائل کی اصلوں اور دلائل کا ذکر ہے، (۳) ۶-غیث النفع فی القرآت السبع، ۷-مناقب الشافعی، ۸-عمل الیوم واللیلہ، اس میں اورادِ ماثورہ کا بیان ہے۔(۴)

۹-مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان: مختصر ہونے کے باوجود اس حیثیت سے اہم

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۷ ومرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۵ ومفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۳۹۸ (۲) معجم المطبوعات کالم ۱۸۷۷ (۳) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۷۸ (۴) فہرست کتب خانہ پشاور ص ۵۵۔

ہے کہ اس میں ابتدائے آفرینش سے واقعات درج کیے گئے ہیں۔(۱)

۱۰-عیون المسائل المہمہ : یہی مجموعہ فتاویٰ یا فتاوی النووی کے نام سے بھی مشہور ہے، اس میں امام نووی سے جو فقہی سوالات کیے گئے تھے، ان کا جواب مذکور ہے، شیخ علی بن ابراہیم عطار دمشقی (م ۷۲۴ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، امام نووی کی ترتیب میں فقہی ابواب کا لحاظ نہیں کیا گیا تھا، مصر اور حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ میں قلمی نسخے موجود ہیں۔(۲)

۱۱-المنثورات وعیون المسائل المہمات: صاحب کشف الظنون کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیون المسائل المہمہ کے بجائے ایک مستقل کتاب ہے۔(۳)

۱۲-طبقات الشافعیہ علامہ ابن صلاح کی کتاب طبقات الشافعیہ کا مختصر ہے مصنف نے اس میں کسی قدر اضافے بھی کیے ہیں۔(۴)

۱۳-الاصول والضوابط فی المذہب: ان اہم فقہی اصول وقواعد اور مفید مطالب ومقاصد پر مشتمل ہے، جو اس فن کے طلبہ کے لیے ضروری ہیں۔(۵)

۱۴-الارشاد فی علوم الحدیث: یہ اصول حدیث میں ہے اور علامہ ابن صلاح کی مشہور ومعتبر کتاب مختصر علوم الحدیث کا خلاصہ ہے، اس کی مندرجہ ذیل شرحیں لکھی گئیں۔

۱-شرح علامہ ابن ابی شریف المقدسی، ۲-شرح برہان جوہری، ۳-شرح ابو القاسم انصاری۔(۶)

۱۵-التقریب والتیسیر فی مصطلح الحدیث: یہ کتاب الارشاد کا مختصر ہے، اسی لیے اس کا نام تقریب الارشاد بھی ہے، اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

۱-حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی (م ۸۰۶ھ) کی شرح۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳-۴۱۲ (۲) ایضا ص ۴۵، وتذکرۃ النوادر ص ۴۲ و۴۳ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۵۴۲ (۴) ایضا ص ۹۲ و اعلام ج ۳ ص ۱۱۵۰ (۵) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۱۷ (۶) ایضا ص ۸۷۔

۲- برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی (م ۸۵۱ھ) کی شرح۔

۳- شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (م ۹۰۲ھ) کی شرح۔

۴- شیخ عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ) نے تدریب الراوی کے نام سے شرح لکھی، یہ بہت مشہور و متداول اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، سیوطی نے اس کے علاوہ التذنیب فی الزوائد علی التقریب بھی لکھی۔(۱)

۱۶- الاشارات الی بیان اسماء المبہمات: خطیب بغدادی کی کتاب کا خلاصہ ہے، نووی نے حدیثوں کے اسناد حذف کر کے اس میں بعض اضافے کیے ہیں اور اس کو صحابہ کے ناموں کے اعتبار سے حروف معجم پر مرتب کیا ہے، خطیب کی کتاب کے مقابلہ میں اس سے استفادہ سہل ہے، اس میں متنِ حدیث کے مبہم ناموں کا ذکر ہے۔(۲)

۱۷- الایضاح فی المناسک۔ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل اور ابن صلاح کی مبسوط کتاب المناسک کا خلاصہ ہے، تاہم اس میں مناسک کے جملہ ضروری مسائل و مقاصد کا ذکر آ گیا ہے، البتہ دلائل حذف کر دیئے گئے ہیں، رجب (۶۶۷ھ) میں وہ اس کی تالیف و تصنیف مکمل کر چکے تھے، نورالدین علی سمہودی نے اس کی شرح لکھی تھی، بعض اہل سیر نے مناسک میں نووی کی تین اور بعض نے چار کتابیں بتائی ہیں۔(۳)

۱۸- شرح البخاری: اس کو وہ صرف کتاب الایمان ہی تک لکھ سکے تھے، شرح صحیح مسلم میں اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "میں نے شرحِ بخاری مین گوناگوں معلومات جمع کیے ہیں، یہ مختصر ہونے کے باوجود مفید و متنوع علوم و فوائد پر مشتمل ہے۔(۴)

۱۹- کتاب التبیان: یہ دس ابواب میں ہے، اس کا نام التبیان فی آداب حملۃ القرآن بھی ہے، اس میں قرآن کی تلاوت کے فضائل، قرأت و تجوید کے آداب، قرآن

(۱) کشف الظنون ص ۳۱۸ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۴۷ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۰۴ و ج ۲ ص ۱۸۶
(۳) ایضاً ج ۲ ص ۱۸۶ (۴) مقدمہ شرح مسلم للنووی ص ۴۔

واہلِ قرآن کی عظمت وجلالت، معلم ومتعلمِ قرآن کے آداب اور قرآنی الفاظ کے ضبط وتحقیق وغیرہ کے گوناگوں مسائل ومباحث بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے مختصر البیان یا مختار البیان کے نام سے اس کا خلاصہ اور شیخ محمد بن محمد ابوسعید ایجی نے حدیقۃ البیان کے نام سے فارسی ترجمہ کیا تھا،(۱) احمد بن عبدالکریم اشمونی کی کتاب منار الہدی فی بیان الوقف والابتدا کے حاشیہ پر یہ کتاب ۱۳۰۷ھ میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۰- مقاصد النووی: توحید، عبادت اور تصوف پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، ۱۳۲۴ھ میں بیروت سے اور پھر مصر سے شائع ہوا ہے۔(۲)

۲۱- ریاض الصالحین: ترغیب وترہیب اور زہد وریاضتِ نفس سے متعلق صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ ہے،(۳) معتبر اور مفید ہونے کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت نصیب ہوئی اور یہ مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

۲۲و۲۳- التحریر فی شرح التنبیہ: یہ شیخ ابواسحاق ابراہیم بن محمد شیرازی، (م ۴۷۶ھ) کی کتاب التنبیہ کی شرح ہے، التنبیہ فروع وجزئیات پر مشتمل اور فقہِ شافعی کی پانچ مشہور ومتداول کتابوں میں ہے،(۴) اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، امام نووی نے دو شرحیں لکھی تھیں جو اہم ہیں، ایک میں مفتیٰ بہ اور متروک مسائل کی توضیح اور مصنف کے غلط بیانات کی تصحیح کی گئی ہے اور دوسری میں الفاظ ولغات کے ضبط وحل کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے، غالباً اسی لیے اس کو تصحیح التنبیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، امام نووی نے اس میں تنبیہ کی حدیثوں کے مفید نکات بھی بیان کیے ہیں، دوسری شرح ۱۳۲۹ھ میں مصر سے کتاب التنبیہ کے حاشیہ پر شائع ہو چکی ہے۔(۵)

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۲۴۶ (۲) معجم المطبوعات کالم ۱۸۷۸ (۳) ایضاً (۴) تنبیہ کے قلمی نسخے لیڈن اور آکسفورڈ میں موجود ہیں اور ۱۸۷۹ء میں لیڈن سے جوینبول کے اہتمام میں چھپ چکی ہے، اکتفاء القنوع ص ۱۵۵ (۵) ملاحظہ ہو مقدمہ شرح ص ۲۔

۲۴-شرح المہذب: یہ بھی امام ابواسحاق شیرازی کی مشہور اور عظیم الشان کتاب المہذب فی الفروع کی شرح ہے، المہذب کی اہمیت کی بنا پر اکثر فقہا نے اس کی جانب اعتنا کیا اور شرحیں لکھیں، امام نووی کی شرح گو نامکمل ہے تاہم احکام ومسائل میں یہ بڑی جامع اور پراز معلومات ہے، امام نووی نے شرح مسلم میں جابجا اس کا حوالہ دیا ہے، علامہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ مصنف نے اس میں غیر معمولی جدت واختراع اور نقد وتحقیق سے کام لیا ہے، غریب الفاظ کی تحقیق، فقہی وحدیثی معلومات اور گوناگوں دوسرے اہم امور ومسائل ایسے جمع کر دیئے ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتے، مجھے اس سے بہتر فقہی کتاب کا علم نہیں، امام نووی نے ایک علاحدہ جز میں اس کی حدیثوں کی تلخیص بھی کی تھی، یہ الخلاصہ فی الحدیث کے نام سے موسوم ہے۔(۱)

۲۵-اربعین: اس حدیث کے بموجب جس میں چالیس حدیثوں کے جمع کرنے کی فضیلت وارد ہے، اکثر محدثین نے چالیس حدیثوں کے مجموعے مرتب کرنے کی جانب اعتنا کیا ہے، گو یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہے تاہم فضائل وترغیبات میں توسع کی بنا پر اس نوعیت کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور اربعینیات بھی کتب حدیث کی ایک مشہور قسم ہے۔

مختلف علما نے مختلف اغراض ومقاصد کے تحت اربعینیات مرتب کئے ہیں، بعض نے توحید وصفات الٰہی کی چالیس حدیثوں کو جمع کیا، بعض نے اصول ومہماتِ دین کی روایتیں اکٹھا کیں، بعض نے جہاد کی اور بعض نے زہد ومواعظ اور بعض نے آداب واخلاق اور فضائلِ اعمال وغیرہ کے متعلق چالیس حدیثیں جمع کیں، امام نووی نے اپنی اربعین میں ان سب امور کا لحاظ رکھا ہے، اس لیے ان کا مجموعہ اربعین ان گوناگوں اغراض وامور کا جامع ہے، نووی کا خود بیان ہے:

علی جمیع ذالك وكل حديث	یہ چالیس حدیثیں ان سب امور کو شامل

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۵؛ البدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۹ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶۔

منها قاعدة عظيمة من قواعد الدين۔	ہیں اور ان میں سے ہر ہر حدیث دین کے کسی عظیم الشان قاعدہ پر مبنی ہے

امام نووی نے اپنی اربعین میں صحیح وثابت حدیثوں ہی کو جمع کرنے کا التزام کیا ہے، ان کی اکثر روایات صحیح بخاری وصحیح مسلم سے ماخوذ ہیں، اختصار کے خیال سے سندیں حذف کردی ہیں اور چالیس کے بجائے بیالیس حدیثوں پر مشتمل ہے۔

اربعین نووی کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں، ایک شرح خود انھوں نے بھی لکھی تھی، (۱) اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے، (۲) دوسری شرحوں اوران کے شارحین کے نام یہ ہیں:

۲- امام زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد المعروف بابن رجب بغدادی حنبلی متوفی ۹۵۰ھ نے ایک طویل شرح لکھی اس کا نام جامع العلوم والحکم ہے۔

۳- نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی طوفی حنبلی (م۷۱۰ھ) کی شرح۔

۴- تاج الدین عمر بن علی فاکہی (م۷۳۱ھ) کی شرح۔

۵- جمال الدین یوسف بن حسن بن محمود سرائی اشبیلی (م۶۹۹ھ) کی شرح۔

۶- ابوحفص عمر البلبیسی شافعی کی شرح فیض المعین کے نام سے موسوم ہے۔

۷- برہان الدین ابراہیم بن احمد خجندی (م۸۵۱ھ) کی شرح۔

۸- شہاب الدین احمد بن محمد ابی بکر الشیرازی الکازرونی کی ممزوج شرح کا نام ہادی المسترشدین ہے۔

۹- شیخ زین الدین سریحا بن محمد ملطی (م۷۸۸ھ) کی شرح نثر فوائد الاربعین النوویہ، چار جزوں میں ہے۔

۱۰- شیخ ولی الدین کی شرح کا نام الجواہر البہیہ ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۸۰ (۲) فہرست کتب عربیہ ج ۲ ص ۱۰۹۔

۱۱- حافظ مسعود بن منصور بن امیر سیف الدین عبداللہ علوی کی شرح کا نام الکافی ہے، یہ ممزوج شرح ہے۔

۱۲- معین بن صفی کی شرح مختصر ہے۔

۱۳- مصلح الدین محمد سعدی عبادی (م ۹۷۹ھ) نے وزیر علی پاشا کے لیے ایک شرح مرتب کی تھی۔

۱۴- شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی مکی (۹۷۳ھ) کی ممزوج شرح فتح المبین کے نام سے مشہور ہے اور قاہرہ سے ۱۳۰۷ھ میں چھپی ہے، اس پر حسن علی مدابغی کا حاشیہ ہے۔

۱۵- نورالدین محمد بن الایجی کی شرح سراج الدین الطالبین ومنہاج العابدین فارسی میں ہے۔

۱۶-۱۷- ملا علی قاری: (م ۱۰۴۴ھ) نے دو شرحیں لکھیں، ان میں ایک نہایت مبسوط، جامع اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کو سب میں بہتر اور عمدہ شرح بتایا ہے۔

۱۸- شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی (۸۰۴ھ) کی شرح۔

۱۹- شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۳ھ) نے اربعین نووی حدیثوں کی تخریج کی تھی۔(۱)

۲۰- ابراہیم بن مرعی بن عطیہ الشبر خیتی مالکی کی شرح الفتوحات الوہبیہ قاہرہ سے ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوئی۔(۲)

۲۱- علامہ عبدالہادی بن عبداللہ بن احمد کی شرح کا قلمی نسخہ رام پور میں ہے، یہ ۱۱۹۹ھ کا لکھا ہوا ہے، (۳) اربعین نووی بولاق سے ۱۲۹۴ھ میں چھپی ہے اور مصر سے بھی شائع ہوئی ہے، مصری ایڈیشن میں شیخ ہاشم شرقاوی کی شرح بھی ہے۔(۴)

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۸۰ و ۸۱ (۲) اکتفاء القنوع ص ۱۳۱ و ۱۳۲ (۳) فہرست عربیہ مجلد دوم ص ۱۷۴
(۴) معجم المطبوعات العربیہ جلد ۲ کالم ۱۸۷۷۔

۲۴- کتاب الاذکار: کتاب الاذکار المنتخب من کلام سید الابرار امام نووی کی مفید اور مشہور کتابوں میں ہے، یہ ایک جلد میں ساڑھے تین سو سے زیادہ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں حدیث کی کتابوں سے شب وروز کے اشغال واذکار اور دعائیں نقل کی گئی ہیں، ابتدا میں چند اہم اور ضروری فصلیں ہیں، ان میں اخلاص عمل اور حسن نیت کی اہمیت کا تذکرہ اور بطور تمہید اذکار کے عام اور مطلق فضائل بیان کئے گئے ہیں، پھر اصل کتاب اور خاتمہ پر استغنا کا بیان ہے، سب سے آخر میں تیس اہم حدیثیں درج ہیں۔

امام نووی نے احادیث وروایات سے اذکار وادعیہ نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان سے متعلق آیتیں اور متقدمین کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

اس موضوع پر پہلے جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان سے تکرار وطوالت وغیرہ کی بنا پر استفادہ آسان نہیں تھا، امام نووی نے تکرار وطوالت سے بچ کر اس کو عمدہ اور آسان پیرایہ میں اس جذبہ سے لکھا ہے کہ ان کے بقول:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

فَاذْكُرُوْنِىٓ اَذْكُرْكُمْ (بقرہ:۱۵۱) سو مجھ کو یاد کرو تو میں تم کو یاد کروں گا۔

نیز دوسری جگہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ. (ذاریات:۵۶) اور میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ بندہ کی سب سے عمدہ اور بہتر حالت وہی ہے جب وہ اللہ رب العالمین کو یاد کرتا اور ان اذکار واعمال میں مشغول رہتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہیں...... اس لیے میں نے یہ مختصر کتاب تالیف کی۔'' (۱)

اس میں اختصار وسہولت کے خیال سے عموماً سندیں حذف کر دی گئی ہیں اور

(۱) کتاب الاذکار ص ۲۔

حدیثوں کے حسن، ضعیف اور منکر ہونے کی نشاندہی کر دی گئی ہے اور کم علم و واقفیت رکھنے والوں کی رعایت سے غیر معروف صحابہ کے صحابی ہونے کی تصریح کر دی گئی ہے، نیز علم حدیث کے عمدہ مسائل، فقہی مباحث اور اہم اصول و آداب وغیرہ اس قدر واضح انداز میں لکھے گئے ہیں کہ عوام اور اہلِ علم وفقہ سب کے لیے ان کی معرفت آسان ہوگئی ہے۔

کتاب الاذکار کی زیادہ حدیثیں صحاح خمسہ (صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داوٗد، ترمذی ونسائی) سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اجزاء و مسانید وغیرہ میں موطاء امام مالک، مسند احمد بن حنبل، مسند ابی عوانہ، سنن ابن ماجہ، دارقطنی و بیہقی کی حدیثیں بھی کہیں کہیں نقل کی گئی ہیں اور صحاح کی ضعیف روایتیں بھی شاذ و نادر آگئی ہیں، مگر ضعیف کی تصریح کے ساتھ، اس لیے صحت، وثوق اور اعتبار وغیرہ کی حیثیت سے کتاب الاذکار کا پایہ بلند ہے۔

اس کی حسب ذیل شرحیں لکھی گئیں:

[۱] الفتوحات الربانیۃ علی الاذکار النوویہ۔ یہ شیخ محمد بن علی محمد بن علان مکی شافعی (م ۱۰۵۷ھ) کی شرح ہے۔

[۲،۳] اذکار الاذکار۔ شیخ جلال الدین سیوطی کی تلخیص اور دو کراسوں کے بقدر ہے، اس خلاصہ کی سیوطی نے شرح بھی لکھی تھی۔

[۴] تحفۃ الابرار بنکت الاذکار: یہ بھی سیوطی کی تالیف ہے۔

[۵] مختصر الاذکار: شیخ شہاب الدین احمد بن حسین رملی (م ۸۴۴ھ) کی تصنیف ہے۔

[۶] اتحاف الاخبار فی نکت الاذکار: یہ تعلیق شمس الدین محمد بن طولون دمشقی کی ہے۔

[۷] اذکار کے فارسی ترجمے بھی کیے گئے، ایک ترجمہ ۶۷۷ھ کا کیا ہوا ہے، اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔ (۱)

---

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲۔

۲۵-تہذیب الاسماء واللغات: اس میں ان اسماء واعلام کے الفاظ ولغات کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے، جو مندرجہ ذیل چھ کتابوں میں مذکور ہیں، ۱-مختصر مزنی، ۲-مہذب، ۳-تنبیہ، ۴-وسیط، ۵-وجیز، ٦-اور روضہ۔

مزید افادہ کے خیال سے مصنف نے بعض ایسے ناموں اور لفظوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جو ان کتابوں میں موجود نہیں ہیں، یہ کتاب دو قسموں میں ہے، پہلی میں اسماء اور دوسری میں لغات واماکن کا ذکر ہے، اس اعتبار سے پہلی قسم کی حیثیت ابتدائی اسلامی عہد کے مشاہیر واصحاب کمال کے سیر وتراجم کی اور دوسری قسم کی نوعیت لغوی قاموس کی ہے۔

دونوں قسموں کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے، مگر قسم اول میں تبرک کے خیال سے محمد نام کے لوگوں کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس قسم میں ذکور واناث کا علاحدہ علاحدہ ذکر ہے، اسی طرح جو لوگ کنیتوں یا انساب وقبائل کی نسبتوں سے مشہور ہیں، ان کا بھی ناموں سے الگ ذکر کیا گیا ہے۔

اسماء والفاظ کی حرکات وغیرہ کو ضبط کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

تہذیب الاسماء واللغات بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے اور اس میں مندرج تمام چیزیں معتبر ومستند کتابوں سے ماخوذ ہیں، گو مصنف نے مشہور باتوں اور عام اقوال کے حوالے تو نہیں دیے ہیں مگر غیر معروف اور غریب اقوال کے حوالے دیدیے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں تاریخ، طبقات، رجال، تراجم، انساب، مغازی، سیر، تفسیر، حدیث اصول وشروح حدیث، فقہ وکلام، لغت وادب اور صرف واشتقاق وغیرہ گوناگوں فنون کی کتابوں سے مدد لی ہے، ان میں سے اکثر کتابوں کا اس کے دیباچہ میں ذکر بھی ہے، اس لیے یہ عظیم فوائد ومطالب اور گوناگوں مسائل ومباحث کا مجموعہ ہے اور اس میں رجال وطبقات اور لغت کے علاوہ حدیث وتفسیر وغیرہ متعدد علوم بھی شامل ہو گئے ہیں۔

تہذیب الاسماء کی دونوں قسمیں مصر کے مطبع منیریہ نے دو، دو جزوں میں شائع کی ہیں اور اہل علم نے نووی کی بعض اور کتابوں کی طرح اس کی جانب بھی اعتنا کیا ہے، ملاحظہ ہو:

[۱،۲] شیخ کمال الدین محمد بن محمود حنفی (م ۷۸۶ھ) اور شیخ محی الدین عبدالقادر بن محمد قرشی حنفی (م ۷۷۵ھ) نے اس کو نئے ڈھنگ اور انداز پر مرتب کیا ہے۔

[۳،۴] شیخ عبدالرحمٰن بن محمد بسطامی نے الفوائد السنیہ کے نام سے تلخیص اور شیخ جلال الدین سیوطی نے اس کا مختصر لکھا۔(۱)

۲۶-الروضہ: یہ فقہی فروع وجزئیات پر مشتمل ہے، بعض مصنفین نے اس کا نام روضۃ الطالبین وعمدۃ المتقین فی الفروع لکھا ہے، اس میں رافعی کی وجیز کی شرح وتلخیص کی گئی ہے، یہ کتاب بڑی اہم اور شوافع میں نہایت مقبول ہے، اس کی جانب بڑا اعتنا کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کی دو درجن سے زیادہ شروح ومختصرات اور حواشی کا ذکر کیا ہے۔

۲۷-منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین: محرر، امام ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد رافعی قزوینی (م ۶۲۳ھ) کی فروع شافعیہ میں نہایت مشہور ومقبول اور بڑی معتبر ومستند کتاب خیال کی جاتی ہے، امام نووی کی یہ کتاب اس کا مختصر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''ہمارے ہم مسلک علما نے متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن محرر کا متن گوناگوں فوائد کا حامل اور تحقیق مذہب کے باب میں نہایت معتبر ومستند ہے مگر اس کا حجم اس قدر زیادہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تن آسان اور سہولت پسند لوگوں کے لیے اس سے استفادہ آسان نہیں تھا، اس لیے میں نے اس کا مختصر لکھا جو اصل کتاب کے نصف کے بقدر ہے، میں نے اس میں بعض مفید اور عمدہ مسائل ومباحث کا اضافہ بھی کیا ہے۔''(۲)

---

(۱) کشف الظنون ص ۵۱۰ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۶۷ (۲) کشف الظنون ج ۳ ص ۵۵۰ تا ۵۵۲۔

منہاج بڑی اہم کتاب ہے اور یہ شوافع میں مشہور و متداول بھی ہے، اس کی جانب بڑا اعتنا کیا گیا اور پچاس سے زیادہ شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔

۲۸-شرح صحیح مسلم: اس کا اصل نام المنہاج شرح صحیح مسلم ہے مگر یہ شرح صحیح مسلم کے نام سے مشہور اور علامہ نووی کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے، صحیح مسلم کی متعدد شرحیں لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی بھی شہرت و مقبولیت اور اعتبار و وثوق کے لحاظ سے اس کے ہم پایہ نہیں، شوافع میں جو علما و محدثین حدیث کی شرح و تحقیق میں بے نظیر خیال کیے جاتے ہیں، ان میں ایک علامہ نووی بھی ہیں، ان کی یہ شرح نہ مطول و مفصل ہے اور نہ بہت مختصر و مجمل، بلکہ متوسط ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں صحیحین خصوصاً صحیح مسلم کی اہمیت و خصوصیت، امام مسلم کی حدیث میں عظمت و بلند پائیگی، غیر معمولی احتیاط و کاوش اور دقتِ نظر وغیرہ کے علاوہ اصول روایت اور فن حدیث کے مباحث و مصطلحات تحریر کیے گئے ہیں، اس شرح کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- یہ متوسط اور جامع شرح ہے، اس لیے حشو و زوائد اور تکرار و اطناب سے خالی اور فنی نکات و متنوع مطالب و حقائق اور مختلف احکام و آداب، نیز حدیث سے مستنبط ہونے والے مفید مسائل و مباحث پر مشتمل ہے۔

۲- یہ تحریر و تصنیف کی خوبی و دلکشی سے بھی معمور ہے، عبارت میں سلاست و روانی اور پیرایۂ بیان میں دلآویزی ہے۔

۳- جو حدیثیں بظاہر مختلف و متضاد نظر آتی ہیں، ان میں جمع و تطبیق کی صورتیں بیان کی گئی ہیں اور سند و متن ہر ایک کے فرق و اختلاف کو دور کیا گیا ہے۔

۴- حدیثوں کے مصالح و حکم اور ان سے مستنبط احکام کے اسرار و علل بیان کیے گئے ہیں۔

۵- اسناد و رجال کی دقیق بحثیں، ان کے لطائف اور رواۃ کے متعلق گوناگوں

معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔

۶- ایک حدیث کی شرح اسی نوعیت کی دوسری حدیثوں سے کی گئی ہے اور کہیں کہیں قرآن مجید کی آیتوں سے بھی مدد لی ہے اور دکھایا ہے کہ حدیث فلاں آیت کے موافق ہے، جن حدیثوں میں قرآن مجید کی آیات مذکور ہیں، ان کی شرحیں وتفسیر بھی کی ہے اور اس سلسلہ میں مفسرین کے آرا بھی تحریر کیے ہیں، الفاظ حدیث کی وضاحت کے لیے قرآنی آیات سے استدلال بھی کیا گیا ہے۔

۷- مشکل الفاظ کے ضبط وتحقیق، دقیق فقروں اور جملوں کی وضاحت اور کلام کے اسالیب وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔

۸- متقدمین علما کے اقوال نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کا محققانہ جائزہ لے کر ان کی قوت وضعف اور صحت وسقم کی نشاندہی کی گئی ہے اور جو اقوال قوی ومرجح معلوم ہوئے ہیں ان کے وجوہِ ترجیح بھی تحریر کیے ہیں، امام نووی، ابن صلاح اور قاضی عیاض جیسے اکابر فن پر بھی جن کی کتابوں سے انھوں نے بڑا استفادہ کیا ہے، نقد وجرح کرتے ہیں اور محدثین وشارحین حدیث کے علاوہ فقہا اور دوسرے طبقہ وفن کے علما پر بھی انھوں نے نقد وتعقب کیا ہے، خود امام مسلم بھی ان کی گرفت سے نہیں بچ سکے ہیں، چنانچہ کہیں کہیں ان کے خیالات اور لغوی وفنی مسامحات کا بھی ذکر کیا ہے۔(۱)

(۱) اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اکابر علما اور امام مسلم وغیرہ کی عظمت کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کو ان حضرات کی جلالتِ قدر کا پورا اعتراف تھا اور انھوں نے امام مسلم کی مہارت وحذاقتِ فن، دقتِ نظر اور حدیث میں احتیاط وحیقظ کی جا بجا تحسین کی ہے، جمہور امت کی طرح وہ بھی امام بخاری کی عظمت اور ان کی صحیح کی تمام کتب حدیث میں برتری کے قائل ہیں، اس شرح میں انھوں نے جا بجا صحیح بخاری کے افضل وبرتر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے نزدیک بعض مغاربہ کا خیال صحیح نہیں ہے کہ صحیح مسلم حدیث کی سب سے بہتر اور صحیح کتاب ہے مگر اس کے باوجود وہ یہ کہتے ہیں کہ ۔ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

۹- حدیثوں کا مفہوم ایسے عمدہ اور دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ کوئی اشتباہ واشکال باقی نہیں رہ گیا ہے، امام نووی کی بحث کا طریقہ اور شرح کا انداز یہ ہے کہ پہلے وہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ع : ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مجموعی حیثیت سے نہ سہی لیکن بعض حیثیتوں سے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر ترجیح حاصل ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

صحیح مسلم کی بعض منفرد اور امتیازی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً سہل اور آسان ہونے کی وجہ سے استفادہ میں سہولت، امام مسلم ہر حدیث کو اس کے مناسب موقع ومحل اور موزوں جگہ پر بیان کرتے ہیں اور اس کے تمام مختار طرق، متعدد سندیں اور مختلف الفاظ وغیرہ بھی نقل کرتے ہیں، اس سے طالبینِ فن کے لیے اس کے تمام وجوہ پر نظر کرنا اور استفادہ سہل ہو گیا ہے، اس کے برخلاف امام بخاریؒ مختلف وجوہ وطرق کو جدا جدا ابواب میں بیان کرتے ہیں اور اکثر حدیثیں ایسے ابواب میں لاتے ہیں جن کی طرف ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا، گو اس سے ان کے پیش نظر ایک خاص غرض وحکمت ہوتی ہے، مگر طلبۂ حدیث کے لیے اس کے جملہ طرق کو جمع کرنا دشوار ہوتا ہے، اسی بنا پر متاخرین محدثین کی ایک جماعت کو غلط فہمی ہوئی، اور انھوں نے صحیح بخاری کی بعض حدیثوں کے بارہ میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اس میں نہیں ہیں، حالانکہ وہ موجود ہوتی ہیں'' (مقدمہ بر شرح مسلم ص ۱۴، ۱۵)

نیز لکھا ہے کہ کوئی شخص بھی علم الاسناد کی ان دقیق باتوں میں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے امام مسلم کا شریک وسہیم نہیں ہے.....ان کی کتاب میں صنعت اسناد کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو صحیح بخاری سے بھی ممتاز کر دیتی ہیں۔''

جس طرح امام مسلم کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اس طرح جہاں ان کو امام مسلم پر کیے جانے والے اعتراضات غلط اور بے وزن معلوم ہوئے ہیں، ان کی پرزور تردید کر کے امام مسلم کے نقطۂ نظر کی حمایت کی ہے، اس سے ان کے زور استدلال اور نقد ونظر کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

زیر بحث ابواب کی روایتوں کے مختلف وجوہ وطرق نقل کر کے ان کے اور متن کے فرق واختلاف کی تصریح، رجال وروایت پر گفتگو، مشکل اسماولغات کی ضبط وتحقیق، راویوں کے مختصر حالات اورفن حدیث میں ان کا درجہ ومرتبہ واضح کرتے ہیں اور حدیث کے اہم نکات اوراس سے مستنبط ہونے والے احکام وآداب وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں، جن امور ومسائل میں اہل فن اورائمہ فقہ وحدیث کا نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے، ان کے متعلق اختلافات ذکر کر کے دلائل وشواہد سے مختار ومرجح قول ومسلک کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فن حدیث کے علاوہ اس میں اصول وشروح میں حدیث، فقہ واحکام، تفسیر وتاریخ، کلام وعقائد، سیر وتراجم، رجال وانساب، لغت وادب، صرف ونحو، اعراب وامالی اور قرأت وتجوید کے مسائل ومباحث بھی تحریر کیے گئے ہیں اوران میں سے ہر ہرفن کی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، فنی مباحث سے قطع نظر دوسرے امور ومسائل پر بھی نووی کی بحثیں محققانہ اور پرمغز ہوتی ہیں، یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے اوراس کے بعض خلاصے بھی لکھے گئے ہیں۔

بعض اعتراضات: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کو شافعیت میں غلو تھا، اس لیے وہ مذہب شافعی کو شرح میں زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں اوراسی کو قوی اور مرجح بھی قرار دیتے ہیں، مگر نووی کے حامیوں نے اس الزام کو سراسر غلط قرار دیا ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

منزہ بود از تعصب شافعیت ومتصف بانصاف ونقل می کرد در کتب خود از اقوال ابوحنیفہؒ۔	شافعی مذہب کی عصبیت سے پاک اور انصاف پسند تھے اوراپنی کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کے اقوال ومسالک بھی بیان کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے فقہی مذہب کا ذکر زیادہ اہتمام سے کرتے ہیں اور

عموماً اسی کو مرجح بھی ثابت کرتے ہیں، ممکن ہے زمانہ کے عام اثر کی وجہ سے ان میں یک گونہ عصبیت بھی رہی ہوتا ہم ان میں رواداری اور حق پسندی بھی تھی، اس لیے وہ اپنے مرجح مسلک کے دلائل وشواہد بھی بیان کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہی کسی مسلک کے قوی اور ضعیف ہونے کے قائل رہے ہوں گے، وہ دوسرے اربابِ مذہب اور ائمہ فقہ کے مسالک نقل کرنے سے اغماض بھی نہیں برتتے، مشہور فقہائے صحابہ وتابعین اور ائمہ ثلاثہ کے علاوہ انھوں نے فقہائے امصار کے مذاہب بھی نقل کیے ہیں، بلکہ ان کی وسیع النظری اور رواداری نے فرقِ ضالہ، خوارج، معتزلہ اور روافض کے مذاہب واقوال نقل کرنے سے بھی ان کو باز نہیں رکھا ہے، اس لیے وہ ان کے اقوال ذکر کر کے ان کی تردید کرتے ہیں۔

امام ابو محمد عبد المومن دُمیاطی

(متوفی ۷۰۵ھ)

نام ونسب: عبدالمومن نام، ابو محمد کنیت، شرف الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے:

عبدالمومن بن خلف بن ابی الحسن بن شرف بن خضر بن موسیٰ۔(۱)

ولادت ووطن: ۶۱۳ھ کے اواخر میں تونہ میں پیدا ہوئے اور دمیاط میں نشو ونما پائی،(۲) مگر بعض لوگوں نے ان کا مولد بھی دمیاط ہی بتایا ہے،(۳) اس لیے وہ تونی اور دمیاطی دونوں کہلاتے ہیں، تونہ، دمیاط اور تینس کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے اور دمیاط ساحلِ سمندر کے کنارے مصر کا ایک بڑا مشہور اور سرسبز وشاداب شہر ہے، بعض لوگوں نے اس کا تلفظ دال مہملہ کے بجائے ذال معجمہ سے (ذمیاط) لکھا ہے، مگر یہ خود دمیاطی کی تصریح کے خلاف ہے اور علامہ سمعانی نے بھی اس کی تردید کی ہے۔(۴)

اساتذہ: دمیاطی کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابن قمیرہ، ابن مسلمہ، ابن مقیر، ابوالقاسم بن رواحہ، ابونصر بن علیق، ابراہیم بن خیر، زکی الدین عبدالعظیم منذری، صفیہ قرشی، ظافر بن شحم، عبدالخالق البسری، علم بن صابونی، علی بن زید انساری، علی بن مختار، عیسیٰ خیاطی، منصور بن دباغ، موہوب بن جوالیقی، یوسف بن خلیل، یوسف بن عبدالمعطی المحلی وغیرہ، حافظ زکی الدین منذری اور یوسف بن

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وشذرات الذہب ج ۶ ص ۱۲ (۲) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷ (۳) بستان المحدثین ص ۹۳ (۴) ایضاً وکتاب الانساب ورق ۲۳۰

خلیل سے ان کو زیادہ اور خاص تعلق تھا۔(۱)

تلامذہ: تلامذہ کی تعداد بھی بے شمار ہے، چند کے نام یہ ہیں:

ابوالحسین یونینی ابو حیان اندلسی، شیخ تقی الدین سبکی، صاحب کمال الدین بن عدیم، قاضی علم الدین اخنائی، علم الدین برزالی، فتح الدین ابوالفتح بن سید الناس یعمری، فخر الدین نویری قطب الدین عبدالکریم، شیخ محمد بن محمد ابیوردی، محی الدین نووی۔

دمیاطی کے تلامذہ کی فہرست میں ان کے معاصرین واقران اور بعض شیوخ بھی شامل ہیں، اور ان کے بعض تلامذہ جیسے شیخ ابیوردی اور ابن عدیم وغیرہ ان سے سن وسال میں کافی بڑے تھے، اور دمیاطی سے مدتوں پہلے ان کی وفات بھی ہوگئی تھی۔(۲)

طلب علم کے لیے سفر: دمیاط میں علم کی تحصیل کے بعد انہوں نے مصر، اسکندریہ، بغداد، حلب، حماۃ، ماردین حران، دمشق، عراق، حرمین، اور جزیرہ کا سفر کیا، عراق دوبار تشریف لے گئے، اور دمشق میں عرصۂ دراز تک قیام کیا۔

شوق علم: ان کو علم وفن سے انہماک وتعلق تھا اور اس کے لیے مشقت جھیل کر متعدد شہروں کا سفر کیا اور ابن خلیل اور صغانی کی بے شمار کتابیں لائے، انھوں نے علوم وفنون کی تحصیل کے بعد ان کی نشر واشاعت کا کام بھی بڑی دلچسپی اور شوق سے انجام دیا۔(۳)

حفظ وثقاہت: ان کے ضبط وثقاہت، حفظ واتقان اور عدالت ودیانت پر سب کا اتفاق ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''صدق ودیانت اور حفظ واتقان میں سرآمد روزگار تھے'' سیوطی کا بیان ہے کہ ''وہ حاذق، حافظ اور متقن تھے، ذہبی نے ان کو ''الحافظ الحجۃ'' ابن کثیر نے ''الحافظ الکبیر'' ابن حجر نے ''حافظ للحدیث'' اور یافعی وابن عماد نے ''حافظ الوقت'' کہا ہے، ابوالحجاج مزی فرماتے ہیں کہ ''میں نے حفظِ حدیث میں ان سے بلند پایہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷ (۲) ایضاً (۳) تذکرہ ج ۴ ص ۲۶۸، الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷ والبدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰۔

شخص نہیں دیکھا۔" ابوحیان جب ان کے واسطہ سے کوئی روایت بیان کرتے تو کہتے کہ "ہم سے حافظ مشرق ومغرب نے روایت کی ہے۔"(۱)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حدیث میں دمیاطی کی بلند پائیگی اور عظمت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ سیوطی نے مصر کے اکابر حفاظ وناقدینِ حدیث میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبی نے ان کو شیخ المحدثین لکھا ہے، حافظ ابن کثیر نے ان کے کمالات گناتے ہوئے ان کے علوے اسناد، کثرتِ روایت اور جودتِ درایت وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب صاحبِ فوات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "علامہ دمیاطی کثرتِ روایت اور حسنِ مذاکرہ وغیرہ میں ممتاز تھے۔" برزالی کا بیان ہے کہ "وہ بلند پایہ اصحابِ روایت ودرایت اور نامور حفاظ ومحدثین میں آخری شخص تھے۔" صاحبِ شذرات نے ان کو "بقیۃ نقاد الحدیث" بتایا ہے، حافظ ابن حجر حدیث میں ان کی امامتِ فن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس فن میں ان کے کمالِ پختگی، تبحر اور عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ حدیثوں کی طلب وجستجو اور جمع وتخریج کرنے کے بعد مسند درس پر متمکن ہوئے اور اپنے شیوخ واساتذہ کی زندگی ہی میں درس واملا کرانے لگے تھے اور ان کے رفقا ومعاصرین کی ایک بڑی تعداد نے ان سے حدیثیں لکھی اور روایت کی ہیں۔(۲)

فقہ: تفقہ واجتہاد میں ممتاز اور اکابر فقہائے شافعیہ میں شمار کیے جاتے تھے، تمام مورخین نے ان کے فقہی کمالات اور اجتہادشان کا ذکر کیا ہے، انہوں نے پہلے اپنے وطن میں اس فن کی تحصیل کی اور اس میں مہارت بہم پہنچانے کے بعد علم حدیث کی جانب اعتنا کیا، مزی کا بیان ہے کہ ان کا مطالعۂ فقہ اور فقہی معلومات وسیع تھے۔(۳)

---

(۱) البدایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۲) تذکرۃ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷ والبدایۃ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۳) ایضاً۔

قرأت: علومِ قرأت وتجوید میں بھی درک رکھتے تھے اور قراآتِ سبعہ کے ماہر تھے، ان کی تحصیل مشہور صاحب فن کمال ضریر سے کی تھی، صاحب فوات کا بیان ہے کہ وہ مقری سریع القرأۃ اور مجود بارع تھے۔(۱)

نحو، لغت وعربیت: ان کو نحو، لغت اور عربیت میں بھی عبور حاصل تھا، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ عربیت میں صاحبِ کمال وجید اور الفاظ ولغات کے وسیع النظر عالم تھے، صفدی کا بیان ہے کہ ''وہ لغوی، نحوی اور فصیح تھے۔''(۲)

انساب: نسب دانی میں بھی معروف وممتاز تھے، مورخین نے ان کو النسابہ اور رأس فی النسب لکھا ہے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ''علم انساب میں علامہ دمیاطی متقدمین پر فوقیت رکھتے تھے۔''(۳)

شعروسخن: نثر کی طرح اقلیم شعروسخن کے تاجدار بھی تھے، علم حدیث کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

علم الحدیث له فضل ومنقبة　　　نال العلاء به من کان معتنیا

علم حدیث کی بڑی فضیلت واہمیت ہے، اس کی جانب اعتنا کرنے والا بلندی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

ماحازه ناقص الاوکمله　　　او حازه عاطل الا به حلیا

ناقص اور زیورِ کمال سے عاری شخص بھی اس کی جمع وتدوین کر کے کامل اور مزین ہو جاتا ہے۔

کتاب وسنت کے علم کی برتری اور منطق وکلام کی مذمت میں فرماتے ہیں:

وماالعلم الافی کتاب وسنة　　　وما الجهل الافی کلام ومنطق

---

(۱) تذکرج ۴ص ۲۶۹ والدررالکامنہ ج ۲ص ۴۱۸ واتحاف النبلاص ۳۰۸ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۹ والدررالکامنہ ج ۲ص ۴۱۸ واتحاف النبلاص ۳۸۰ (۳) الدررالکامنہ وحسن المحاضرہ ج ۱ص ۱۵۰

علم صرف کتاب وسنت کے اندر ہے، اور کلام ومنطق تمام تر جہالت کا نام ہے۔

وما الخیر الا فی سکوت بحسبة وما الشر الا فی کلام ومنطق (۱)

بھلائی اس خاموشی میں ہے جو نیکی کے خیال سے اختیار کی جائے اور شر وفساد گفتگو اور گویائی میں ہے۔

جامعیت: غرض وہ علامۂ دہر اور مختلف علوم وفنون کے ماہر وجامع تھے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''وہ مختلف چیزوں میں یگانہ ویکتا اور بے مثل تھے'' اور صفدی کا بیان ہے کہ ''وہ کثیر الفنون تھے'' ابن عماد لکھتے ہیں کہ ''ان کے کمالات نہایت متنوع اور گوناگوں تھے۔'' (۲)

امامت ومرجعیت: ان گوناگوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت نے ان کی شخصیت کو بڑی پُرعظمت اور نہایت جلیل القدر بنادیا تھا، اس لیے وہ مقبول ومرجعِ انام ہوگئے تھے اور امام ومقتدا کہلاتے تھے، ابن عماد کہتے ہیں کہ وہ ائمہ اعلام میں تھے، مزی کا بیان ہے کہ عالی قدر اور بلند پایہ تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''دور دراز علاقوں سے علم وفن کے شائقین اور طلبہ ان کی خدمت میں جوق در جوق آکر ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔'' حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ طلبۂ فن کے محبوب اور ہر دلعزیز اور بڑی محترم، باوقار اور پُرجلال شخصیت کے مالک تھے۔'' (۳)

تدین وتقویٰ: علم وفضل کے ساتھ زہد واتقا اور تدین میں بھی ممتاز تھے، ان کی دیانت اور دینداری کا اہل سیر نے ذکر کیا ہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، اکثر روزہ رکھتے اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسی حالت میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی تھی۔ (۴)

(۱) الدرر الکامنہ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰ (۲) بستان المحدثین ص ۱۳ (۳) شذرات الذہب ج ۶ ص ۱۲ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰۔

اخلاق وعادات: وہ بڑے خلیق، متواضع اور ہنس مکھ تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کی خوش خلقی، شرافتِ نفس، حسن اخلاق اور تواضع کا ذکر کیا ہے، (۱) ان کی مقبولیت ومرجعیت میں ان کی شرافت خوش معاملگی اور پاکیزہ خوئی کا بھی دخل تھا۔

لطافت وظرافت: مزاج میں خشکی اور تقشف نہ تھا، اس لیے مزاح وتفنن کی باتیں بھی کرتے تھے، ان کی خوش طبعی اور ظرافت کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ کسی مجلس میں تشریف لے گئے، لوگ حدیثیں پڑھ رہے تھے، کسی مقام پر عبداللہ ابن سلام کا نام آیا تو قاری نے اس کو سلام کی تشدید کے ساتھ پڑھا، دمیاطی نے فوراً کہا: سلام علیکم، سلام، سلام'' اس طرح قاری کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو گیا۔ (۲)

آسائش وفراغت: اللہ تعالیٰ نے ان کو فارغ البالی اور کشادگی عطا کی تھی اور وہ بعض اہم عہدوں پر فائز تھے۔ (۳)

فقہی مسلک: پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ اکابر شوافع میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن ان کو اس مذہب میں غلو نہ تھا، بلکہ ان کے مزاج میں بڑی انصاف پسندی تھی، سنن شافعی کا وہ اکثر درس دیتے تھے، مگر ان کو اس کے متعلق یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ اس کے اکثر الفاظ صحیحین کی روایات کے مطابق نہیں ہیں، امام شافعیؒ کے مذہب ومسلک سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ دوسرے ائمہ کی عظمت واحترام کا پورا خیال رکھتے تھے، امام مالک کی مدح وتوصیف میں اس قدر رطب اللسان رہتے کہ بعض لوگ ان کو مالکی المذہب خیال کرتے تھے۔ (۴)

منطق وکلام سے نفرت وبیزاری: وہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان اور اہلسنت والجماعت کے مسلک کے ہمنوا تھے، اسی لئے منطق وکلام میں انہماک وتوغل کو سخت ناپسند

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰ واتحاف النبلاء ص ۳۰۸

(۲) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۳) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ وبستان المحدثین ص ۹۳ (۴) بستان المحدثین ص ۹۳۔

کرتے تھے، ان کے زمانہ میں عالم اسلام خصوصاً مصر میں یونانی علوم اور منطق وکلام کا طوطی بول رہا تھا اور کتاب وسنت کے بجائے انہی علوم کے مسائل ومباحث کی جانب لوگوں کی توجہ مرکوز ہوکر رہ گئی تھی، تاتاریوں کے حملہ اور سقوط بغداد کے بعد نصیر الدین طوسی اور ان کے تلامذہ نے منطق وفلسفہ کا غلغلہ اس قدر زور وشور سے بلند کیا کہ کتاب وسنت سے بُعد وبے گانگی بڑھنے لگی اور لوگ مذہب کے متعلق شک وتذبذب میں مبتلا ہونے لگے، عام محدثین وفقہا میں اس کے مقابلہ کی قوت نہ تھی، اس کی سرکوبی کے لیے اللہ نے اس صدی کے عظیم الشان عبقری، نامور مجتہد اور مجدد اعظم شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا انتخاب کیا، جنھوں نے یونانی حکمت وفلسفہ کی مدلل تردید وتنقید کو اپنا خاص موضوع بنایا اور ان کے پُر زور قلم نے اس فتنہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

جن گنے چنے محدثین نے یونانی افکار وعلوم کی آمیزش سے اسلامی علوم کو اور غیر اسلامی عناصر سے اسلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ان میں امام دمیاطی کا نام بھی ہے، ان کو منطق وکلام سے بڑی نفرت تھی، اس کا نمونہ ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے، اس کی مثال پہلے گذر چکی ہے، یہاں منطقیین اور فلاسفہ کے رد میں ان کی ایک تحریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

> ''منطقیوں پر علمائے حق نے اس لیے نکیر کی ہے کہ انھوں نے علومِ عقلیہ کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، وہ ان فضول عقلی علوم میں پڑ کر کتاب وسنت اور علومِ عقلیہ سے غافل اور بے پرواہوگئے ہیں، ان لوگوں کی منطق وفلسفہ سے اس قدر الفت ودلچسپی کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے واقفیت کے بغیر آدمی خوش اسلوبی سے گفتگو ہی نہیں کرسکتا، حالاں کہ یہ سراسر مضحکہ خیز بات ہے، کیا امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے اس فن کی تحصیل کی تھی؟ کیا امام ابوحنیفہؒ اور ایاس بن معاویہؒ کی ذہانت وطباعی اور عمرو بن عاصؓ کی سیاست

وفراست منطق ہی کی بدولت تھی، کیا سفیان ثوریؒ کے کمالات اس کے رہینِ منت تھے اور کیا قس وسحبان کی فصاحت وطلاقتِ لسانی اس میں مشق ومہارست ہی کا نتیجہ تھی؟ کیا کوئی کوئی شخص ان حضرات کو غبی اور بحث وگفتگو میں عاجز وقاصر تصور کرسکتا ہے؟ حالانکہ ان لوگوں کو اس فن میں کوئی دخل نہیں تھا، پھر اس لایعنی اور بے سود فن کے درپے ہوکر اس کے لیے غیر معمولی ریاضت ومشقت انگیز کرنا کس قدر حیرت انگیز ہے؟ یقیناً شیطان نے ان لوگوں کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کردیا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض اہل علم کو اس کے مطالعہ میں غلو وانہماک نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود کیا یہ اس کی کم مضرت ہے کہ انسان بے سود باتوں میں الجھ کر رہ جائے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مستغنی اور بے نیاز بنایا ہے۔''

عام منطقیوں کا خاص منتہائے نظر اور اہم مرکزِ توجہ یہی غیر مفید فن ہے اور اس کو ثابت شدہ حقائق ومسلمات کا آلہ وذریعہ بنائے ہوئے ہیں، اس لیے وہ اس میں سعی بلیغ سے کام لیتے ہیں اور اس کی تحصیل میں اپنی عمریں ضائع کرتے ہیں، کیا ان لوگوں کو ہادیٔ برحق کے اس ارشاد کی خبر نہیں کہ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو تختیوں پر توراۃ لکھ کر محفوظ کرتے دیکھا تو غضبناک ہوکر فرمایا کہ اگر حضرت موسیٰؑ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری اتباع سے مفر کی کوئی صورت نہ ہوتی، جب آپؐ نے حضرت موسیٰؑ کی سرتاپا نور کتاب میں حضرت عمرؓ کے توغل اور غیر معمولی انہماک کو پسند نہیں فرمایا تو آخر اس فن کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے جو متشککین اور گم کردہ راہ لوگوں کی وضع واختراع کا نتیجہ اور تمام تر کذب وافترا کا مجموعہ ہے، کس قدر افسوس اور تعجب ان منطقیوں پر ہے جو ضلالت وتاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔''(۱)

وفات: امام دمیاطی کا انتقال کبر سنی میں اچانک ہوا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز درس

(۱) بستان المحدثین ص ۹۴۔

دینے کے بعد ہی ان پر غشی طاری ہوئی، ان کے شاگردان کو گھر لائے، یہاں پتہ چلا کہ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے، ابن کثیرؒ کا بیان ہے کہ وہ اس دن روزے سے تھے، تاریخِ وفات ۱۰/ یا ۱۵/ ذی قعدہ ۷۰۵ھ بتائی جاتی ہے، دوسرے دن باب النصر کے مقبرہ میں دفن کیے گئے، جنازہ میں بڑا مجمع شریک تھا۔ (۱)

حلیہ: وہ نہایت شکیل وجمیل اور بڑے وجیہ تھے، اس لیے ان کو ابن الماجد کہا جاتا تھا، خوبصورتی کے اظہار کے موقع پر دمیاط میں یہی کہا جاتا تھا، چنانچہ اگر کسی دلہن کے غیر معمولی حسن وجمال کی تعریف کی جاتی تھی تو کہتے تھے، کانها ابن الماجد (گویا وہ ابن الماجد ہے) (۲)

تصنیفات: دمیاطی کثیر التصانیف تھے، حدیث، عوالی، فقہ اور لغت وغیرہ میں ان سے عمدہ اور بیش قیمت کتابیں یادگار ہیں، ان سب کو ان کے زمانہ میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل تھی مگر اب غالباً سب نایاب ہیں۔

۱-كتاب التسلى والاغتباط بثواب من تقدم من الافراط: یہ ایک کراسہ کے بقدر ہے، اس میں حدیثوں کے اسناد ومتون دونوں ذکر کیے گئے ہیں۔

۲-تساعیات مطلقه، ۳-كتاب ذكر ازواج النبى واولاده واسلافه، ۴-كتاب الذكر والتسبيح اعقاب الصلوٰة، ۵-العقد المثمن فيمن اسمه عبدالمومن (ایک جلد)

۶-كتاب فضل الخيل: محدثین کے طریقہ پر ایک جلد میں مرتب کی گئی ہے، مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں اس کا قلمی نسخہ ہے۔ (۳)

۷-كتاب فضل صوم ست من شوال: حافظ ابن کثیرؒ نے اس کو مفید،

---

(۱) بستان المحدثین ص ۹۴ وتذکرہ ج ۴ ص ۲۶۹ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰ (۲) بدر الطالع ج ۱ ص ۴۰۳۔ (۳) مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۸۔

جید اور بے نظیر کتاب بتایا ہے۔

۸- قبائل الخزرج والاوس (ایک جلد میں)

۹-کشف المغطی فی تبیین الصلوٰۃ الوسطیٰ یاکتاب الصلوٰۃ الوسطیٰ: ایک جلد میں عمدہ کتاب ہے۔

۱۰-المنجر الرابح فی ثواب العمل الصالح ،۱۱-مجالس بغدادیه ، ۱۲-مجالس دمشقیه۔

۱۳-مختصر السیرۃ النبویه :(یا سیرت مشہورہ) ایک جلد میں سیرت پر عمدہ کتاب ہے، اس کے بعد اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ ان میں سے اکثر کا ماخذ ہے، اہل تذکرہ کا بیان ہے کہ یہ جمیع علمائے سیرت کے لیے رہبر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۴- معجم :اس میں تیرہ سو سے زائد شیوخ کے ناموں کو چار جلدوں میں جمع کیا گیا ہے مگر صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ یہ ایک ہزار شیوخ کے ناموں پر مشتمل ہے۔

علامہ دمیاطی کی تصنیفات میں چند اربعیات بھی ہیں۔

۱۵-اربعین تساعیات الاسناد والابدال ،۱۶-اربعین حلبیه فی احکام النبویه ،۱۷-اربعین فی الجهاد ،۱۸-اربعین متباینة الاسناد ، ۱۹-اربعین موافقات عوالی۔

ان کی بعض تصنیفات سو حدیثوں پر مشتمل ہیں۔

۲۰-مأة تساعیه فی الموافقات وابدال العلیه۔(۱)

---

(۱) بستان المحدثین ص ۹۳ تا ۹۵۔

امام ولی الدین خطیب تبریزی

(متوفی بعد ۷۳۷ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اورولی الدین لقب تھا لیکن خطیب تبریزی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، باپ کا نام عبداللہ اوردادا کا محمد تھا۔

خاندان ووطن: آذربائیجان کے مشہور اور بڑے شہر تبریز کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس کی نسبت سے وہ تبریزی کہلاتے تھے اور خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ فاروق سے نسبی تعلق تھا، اس بنا پر عمری بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ: ان کے ایک ہی شیخ علامہ حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی کا نام معلوم ہوسکا، جن کے مشورہ اور ایماء سے خطیب نے مشکوٰۃ المصابیح مرتب کی تھی، جس کی خود طیبی نے ایک مبسوط شرح لکھی، حافظ ابن حجر طیبی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

امر بعض تلامذته باختصار المصابيح على طريقة نهجها له وسماه بالمشكوة وشرح وشرحا حافلا۔(۱)	طیبی نے اپنے ایک شاگرد کو امام بغوی کی مصابیح کو اسی نہج پر مختصر کرنے کا حکم دیا اور اس کا نام مشکوٰۃ رکھا اور اس کی ایک مبسوط شرح لکھی۔

تلامذہ: شاگردوں میں بھی صرف ایک ہی نام، امام الدین علی بن مبارک شاہ ساوجی کا ملتا ہے، حافظ مزی کے خاص شاگرد تھے اور مشکوٰۃ ان ہی کی روایت سے رائج اور مشہور

(۱) الدرر الکامنہ جلد۲ص ۶۹۔

ہولی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خلف رشید حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنی مشکوٰۃ کی سندیں بیان کرتے ہوئے ان کا نام تحریر کیا ہے۔(۱)

علم وفضل: ملاعلی قاری فرماتے ہیں ''وہ علم وفضل اور حقائق ودقائق کا بحرِ بیکراں تھے، ان کی کتابیں ان کے وسعتِ علم ونظر اور غیر معمولی فضل وکمال پر شاہد ہیں۔''(۲) بلاشبہ مشکوٰۃ تبریزی کے فضل وکمال، علمی تبحر اور حدیث میں عظمت وبرتری کا ثبوت ہے۔

زہدوورع: جن مصنفین نے خطیب تبریزی کا ذکر کیا ہے، وہ ان کے علم وفضل کی طرح صلاح وتقویٰ کے بھی معترف ہیں، ان کے استاذ علامہ طیبی نے ان کو ''بقیۃ الاولیاء قطب الصلحا'' اور ملاعلی قاری نے ''تقی نقی'' لکھا ہے۔(۳)

فقہی مسلک: مشکوٰۃ کی ترتیب وتبویب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے۔

وفات: خطیب تبریزی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، اس لیے ان کے سنہ ولادت کی طرح سنہ وفات کا بھی علم نہ ہوسکا مگر یہ مسلم ہے کہ ۷۳۷ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا تھا، کیوں کہ اسی سال وہ مشکوٰۃ کی ترتیب وتالیف سے فارغ ہوئے تھے۔

تصنیفات: ان سے دو کتابیں یادگار ہیں، ممکن ہے انھوں نے اور کتابیں بھی لکھی ہوں جو اَب ناپید ہیں۔

۱۔مشکوٰۃ المصابیح: یہ حدیث کی بڑی اہم اور مقبول کتابوں میں ہے اور صحاحِ ستہ اور دوسری مستند کتب حدیث کا مجموعہ ہونے کی بنا پر خود بھی بہت معتبر سمجھی جاتی ہے، اس کی ترتیب اور تالیف میں امام بغوی کی مشہور کتاب مصابیح السنہ پر اعتماد کیا گیا ہے اور یہ دراصل اس کا تکملہ اور ذیل ہے، تبریزی نے اپنے استاذ علامہ طیبی کے مشورہ وایما سے اس کو مرتب کیا تھا، علامہ طیبی فرماتے ہیں:

---

(۱) اتحاف النبیہ ص ۷۹ وعجالہ نافعہ ص ۲۳ (۲) مقدمہ مشکوٰۃ از ابوبکر شاویش (۳) مقدمہ مشکوٰۃ از ابوبکر شاویش۔

''مجھ میں اور میرے دینی بھائی محمد بن عبداللہ خطیب میں ایک مجموعۂ احادیث مرتب کرنے کے لیے مشورہ ہوا اور طے پایا کہ مصابیح کا تکملہ لکھا جائے اور اس کو از سرنو مرتب کیا جائے، چنانچہ انھوں نے میری خواہش کے مطابق پوری محنت و جانفشانی سے یہ مجموعہ مرتب کیا۔ (۱)

خود خطیب تبریزی کو بھی اعتراف ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے استاذ کی مدد اور مشورہ سے لکھی۔

گو مشکوٰۃ المصابیح مصابیح السنہ کا تکملہ ہے، تاہم اس میں کہیں کہیں حذف و اضافہ سے کام لیا گیا ہے، اس کی وجہ سے دونوں میں کسی قدر فرق بھی ہو گیا ہے اور مشکوٰۃ کی حدیثوں کی تعداد بھی مصابیح سے زیادہ ہو گئی ہے، مشکوٰۃ کے اضافے کی نوعیت حسب ذیل ہے:

۱- امام بغوی نے اختصار کے خیال سے سندیں حذف کر دی تھیں اور کتابوں کے حوالے بھی نہیں دیئے تھے، خطیب تبریزی نے حوالے بھی دیدیئے ہیں اور ان صحابہ کے نام بھی تحریر کیے ہیں، جن سے حدیثیں مروی ہیں، اس کی وجہ سے ہر حدیث کا ماخذ بھی معلوم ہو جاتا ہے اور اس کی صحت وقوت اور درجہ و مرتبہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی کی کتاب المصابیح اپنے موضوع پر بہت جامع کتاب ہے، اس میں مختلف و متفرق حدیثوں کو نہایت خوبی سے ضبط کیا گیا ہے، مگر اختصار کی بنا پر سندیں حذف کر دی گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے، حالانکہ بغوی جیسے مستند شخص کا نقل کرنا ہی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ (۲)

۲- امام بغوی نے ہر ہر باب میں دو ہی فصلیں قائم کی تھیں لیکن امام تبریزی نے

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۳ (۲) دیباچہ مشکوٰۃ۔

عموماً تین فصلیں قائم کی ہیں، پہلی فصل میں تو بغوی کی طرح صرف صحیحین کی روایتیں درج کی ہیں اور دوسری میں ان ائمہ کے علاوہ جن سے بغوی نے روایتیں نقل کی ہیں، بعض دوسرے ائمہ فن کی کتابوں کی حدیثیں بھی شامل کردی ہیں اور تیسری فصل میں جو بغوی کے یہاں نہیں ہے، مرفوع حدیثوں کے علاوہ ابواب کے مناسب آثارِ صحابہ وتابعین نقل کرکے راویوں کے نام اور کتابوں کے حوالے دے دیئے ہیں، جیسا کہ لکھتے ہیں:

> ''ترتیب وتبویب میں صاحب مصابیح کی پیروی کی گئی ہے، البتہ ہر باب کو عموماً تین فصلوں میں منقسم کیا گیا ہے، پہلی فصل میں شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں اور دوسری فصل میں ائمہ صحاح (ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی) کے علاوہ جن سے شیخ نے روایتیں نقل کی ہیں، امام مالک، شافعی، احمد، دارقطنی، بیہقی اور رزین بن معاویہ وغیرہ کے مرویات بھی شامل کیے گئے ہیں، تیسری فصل مین مقررہ شرطوں (۱) کے مطابق اس کے ابواب کے ہم معنی سلف وخلف سے منقول مناسب الحاقات درج ہیں۔'' (۲)

۳- صاحبِ مصابیح نے جن حدیثوں کی غرابت یا ضعف ونکارت کی جانب صرف اشارہ کیا ہے، صاحبِ مشکوٰۃ نے ان کی غرابت یا ضعف ونکارت کے وجوہ بھی بتادیئے ہیں اور جن کے بارے میں انھوں نے سکوت اختیار کیا ہے، ان کے سلسلہ میں صاحبِ مشکوٰۃ نے بھی سکوت سے کام لیا ہے، البتہ بعض جگہ کسی خاص مصلحت وضرورت کے تحت بعض وضاحتیں کی ہیں، جیسے ان روایتوں کے سلسلہ میں جن پر کوئی طعن کیا گیا ہے اور امام بغوی نے ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے تو ان کے سکوت کے باوجود امام تبریزی نے ان کی اصل حقیقت واضح کرکے یہ بتایا ہے کہ وہ حسن ہیں یا ضعیف؟

۴- جن حدیثوں کو صاحبِ مصابیح نے مکمل نہیں نقل کیا ہے، امام تبریزی نے کسی

(۱) مقررہ شرطوں سے صحابہ یا تابعین کے ناموں اور حوالوں کی تخریج مراد ہے۔ (۲) دیباچہ مشکوٰۃ۔

خاص مصلحت کے تحت ابواب کی مناسبت سے ان کو مکمل ذکر کیا ہے۔

حذف واختصار اس طور پر کیا گیا ہے۔

۱۱- مصابیح کی مکرر حدیثوں کو مشکوٰۃ میں تکرار کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۱۲- مفصل اور طویل روایتوں کی غیر ضروری طوالت وتفصیل کو حذف کر کے مختصر روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

۱۳- امام بغوی نے جن طویل حدیثوں کو کسی ایک ہی باب میں تحریر کیا ہے، امام تبریزی نے ان کے کچھ حصے تو اسی باب میں نقل کیے ہیں، مگر دوسرے حصوں کو ان کے مناسب دوسرے باب میں نقل کیا ہے۔

استدراک: مشکوٰۃ میں کہیں کہیں بغوی پر استدراک بھی کیا گیا ہے، جیسے مصابیح کی پہلی فصل میں بعض ایسی حدیثیں شیخین کی جانب منسوب کی گئی ہیں، جو درحقیقت ان کے بجائے دوسرے محدثین کی کتابوں میں مذکور ہیں، اسی طرح دوسری فصل کی بعض حدیثیں جو شیخین کے بجائے اور ائمہ حدیث کی جانب منسوب کی گئی ہیں، حالانکہ وہ شیخین کی کتابوں میں درج ہیں، امام تبریزی نے ان دونوں قسموں کی غلطیوں کی تصحیح کر دی ہے، اس کی وجہ سے مشکوٰۃ کی پہلی فصل میں بعض دوسرے ائمہ کی اور دوسری فصل میں شیخین کی حدیثیں بھی شامل ہو گئی ہیں لیکن تبریزی نے اس طرح کے مواقع پر تصریح ووضاحت کر دی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امام تبریزی نے امام بغوی ہی کی تحقیق پر اعتماد کر لینے کو کافی نہیں سمجھا ہے، بلکہ خود بھی مراجعت کر کے حدیثوں کے بارے میں چھان بین کی ہے، جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''اگر تم کو مشکوٰۃ کی پہلی اور دوسری فصلوں میں اصل کتاب (مصابیح) سے کوئی فرق واختلاف نظر آئے مثلاً پہلی فصل میں شیخین کے علاوہ اور ائمہ حدیث کی یا دوسری فصل میں شیخین کی روایتیں درج ملیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

میں نے خود بھی تحقیق وکاوش کی ہے اور حمیدی کی الجمع بین الصحیحین اور ابن اثیر کی جامع الاصول کا تتبع کرکے صحیحین کے متن پر اعتماد کیا ہے۔(۱)

ایک اور جگہ اپنی تلاش وتفحص کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''میں نے حدیثوں کی تلاش وجستجو اور تحقیق وتفتیش میں اپنے امکان بھر پوری جدوجہد کی ہے۔''(۲)

شروح وحواشی: مشکوۃ المصابیح کی اہمیت ومقبولیت کا یہ بھی ثبوت ہے کہ محدثین اور علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے اور اس کی متعدد شرحیں، تعلیقات اور حواشی لکھے گئے ہیں اور فارسی، اردو، انگریزی اور ترکی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں۔

شرحوں اور حواشی کے نام یہ ہیں:

۱-الاکمال فی اسماء الرجال: یہ رسالہ خود خطیب تبریزی کی تصنیف ہے، اس میں انھوں نے مشکوۃ کے رجال پر گفتگو کی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کو لکھ کر انھوں نے جب اپنے استاذ علامہ طیبی کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے مشکوۃ کی طرح اس کو بھی بہت پسند کیا تھا، اس کے قلمی نسخے کئی خانوں میں ہیں اور یہ چھپ بھی گیا ہے۔

۲-الکاشف عن حقائق السنن: یہ علامہ طیبی کی شرح ہے، خطیب تبریزی کی اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور مشکوۃ کی مقبولیت اور اہمیت اور کیا ہوسکتی ہے کہ خود ان کے استاذ نے شرح لکھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

''جب وہ مشکوۃ کی تالیف مکمل کر چکے تو میں اس کی شرح لکھنے کے لیے کمربستہ ہوا، اس میں مشکوۃ کے مشکل مباحث اور غریب الفاظ کو حل کیا گیا ہے اور نکات ولطائف مستنبط کیے گئے ہیں اور نحوی مشکلات اور معانی وبیان کے مسائل سے بھی بقدر ضرورت تعرض کیا گیا ہے، ان مباحث کی تحقیق کے لیے جن

(۱) دیباچہ مشکوۃ (۲) ایضاً۔

ائمہ فن کی کتابوں کا تتبع کیا گیا ہے، ان کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں، حوالے کے لیے مخصوص علامتیں اور نشان مقرر کیے گئے ہیں، جہاں حوالے نہیں دیئے گئے ہیں وہ میرے اپنے نتائج فکر ہیں جو لوگ اس کو انصاف کی نظر سے دیکھیں گے وہ اس کو نہایت مختصر، جامع اور محققانہ کتاب پائیں گے۔''(۱)

شروع میں حدیث کے اصول واصطلاحات اور اس کے اقسام وانواع، نیز جرح وتعدیل پر مفید بحث کی گئی ہے، یہ مشکوٰۃ کی اہم اور مفید شرح ہے جو شرح طیبی کے نام سے مشہور ہے غالباً ابھی تک چھپی نہیں۔

۳- حاشیہ سید شریف: علامہ سید شریف علی بن محمد بن علی جرجانی (م۸۱۶ھ) نے مشکوٰۃ پر ایک مفید حاشیہ قلمبند کیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ خدابخش خاں لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔(۲)

۴- هداية الرواة الى تخريج المصابيح والمشكوٰة: یہ حافظ ابن حجر (م۸۵۲ھ) کی تصنیف ہے، اس میں مصابیح ومشکوٰۃ دونوں کی حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے،(۳) اور یہ دراصل مناوی کی لباب الصدر کا خلاصہ ہے۔(۴)

۵- منهاج المشكوٰة: عبدالعزیز بن محمد بن عبدالعزیز ابہری (م۸۹۵ھ) نے امیر علی شیر کے لئے یہ شرح لکھی تھی۔(۵)

۶- فتح الاله فى شرح المشكوٰة: یہ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد بن محمد بن علی بن حجر ہیثمی شافعی (م۹۷۴ھ) کی شرح ہے۔(۶)

۷- مرقاة المفاتيح: یہ احادیث کے مشہور خادم اور نامور حنفی عالم شیخ نورالدین علی بن سلطان بن محمد ہروی المعروف ملا علی قاری (م۱۰۱۴ھ) جو چار جلدوں پر

(۱) کشف الظنون ج۲ ص۳۴۳ (۲) فہرست ج۱ ص۴۹ (۳) کشف الظنون ج۲ ص۶۴۷ (۴) ایضاً ص۳۵۰ (۵) کشف الظنون ج۱ ص۴۴۳ (۶) ایضاً۔

مشتمل ہے، اس میں پہلے کی تمام شرحوں اور حواشی کے مباحث کے علاوہ دوسرے مفید اور ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اس حیثیت سے اس کو بہت جامع اور اہم خیال کیا جاتا ہے۔(۱) ملا صاحب اس کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:

''چونکہ مشکوٰۃ المصابیح احادیث نبوی کی ایک جامع کتاب ہے، اس لیے مجھ کو اس کے مطالعہ کا شوق ہوا اور میں نے حرم کے شیوخ سے اس کو پڑھا مگر ان لوگوں کے پاس کوئی صحیح اور مستند نسخہ نہ تھا اور شارحین نے محض بعض لفظوں کو ضبط کیا تھا، اس لیے میں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ وتصحیح کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور پھر ایک لطیف شرح لکھی، اس میں الفاظ کو بھی ضبط کیا گیا ہے اور روایتوں کی فنی بحث وتحقیق کر کے ان کے معانی ومطالب کی تشریح بھی کی گئی ہے۔''(۲)

۸- انوار المشکوۃ: یہ ملا علی قاری کے بعد کے کسی فاضل کی تصنیف ہے، اس میں مشکوٰۃ کی تین فصلوں پر ایک اور فصل کا اضافہ کر کے چار فصلیں قائم کی گئی ہیں، چوتھی فصل میں ان سات ائمہ حمیدی، ابن اثیر، صغانی، قضاعی، اقلیشی، نووی، اور مدینی کی کتابوں سے ایسی روایتیں درج کی گئی ہیں جو مجتہدین فی المذہب کی مستدل بہا ہیں اور اس طرح یہ مشکوٰۃ اور مرقاۃ دونوں کی شرح ہے۔(۳)

۹- لمعات التنقیح: ہندوستان کے نامور محدث حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ (م۱۰۵۲ھ) نے مشکوٰۃ پر بڑا کام کیا ہے، یہ ان کی عظیم الشان تصنیف اور مشکوٰۃ کی اہم شرح ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''حرمین سے واپسی اور وہاں کے شیوخ سے روایتِ حدیث کی اجازت لینے کے بعد جب حدیث نبویؐ کی خدمت کی سعادت بندہ کو میسر آئی تو

(۱) کشف الظنون ج۲ص۴۴۳ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج۱ص۴۱۶ (۳) کشف الظنون ج۲ ص۴۴۴و۴۴۳۔

خواہش ہوئی کہ مشکوٰۃ المصابیح کی جس کی غیر معمولی شہرت ہے، شرح لکھی جائے اور اس میں علما نے اپنی کتابوں میں جو فوائد لکھے ہیں یا جو شیوخ وقت سے ہم نے سنے ہیں، یا جو ہمارے دل میں ہیں، ان کو طلبہ کے سامنے بیان کر دیا جائے، بعض مخلص دوستوں کی رائے ہوئی کہ فارسی مین شرح لکھنا زیادہ بہتر اور مفید ہوگا لیکن آغاز کرنے اور اس کے لیے معلومات جمع کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس کو فارسی میں تحریر کرنا مناسب نہیں تاہم دوستوں کی بات بھی ٹالی نہیں جا سکتی تھی، اس لیے عربی و فارسی دونوں میں ساتھ ساتھ شرح لکھنا شروع کیا، عربی کی شرح پہلے مکمل ہوگئی۔"

لمعات التنقیح دو جلدوں میں عربی شرح ہے، جو بڑی فکر و کاوش اور تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے اور گوناگوں علمی مباحث، لطیف تحقیقات اور مفید معلومات کا مجموعہ ہے، یہ متوسط اور عمدہ شرح ہے، اس میں نہ زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے اور نہ اختصار سے، لغوی ونحوی مشکلات اور فقہی مسائل کو بڑی خوبی سے حل کیا گیا ہے اور احادیث کی فقہ حنفی سے مطابقت دکھانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، ۱۰۲۵ھ میں اس کی تالیف مکمل ہوئی تھی، (۱) شروع میں ایک مفید و جامع مقدمہ میں شاہ صاحب نے اصول حدیث کے مباحث تحریر کیے ہیں، یہ مقدمہ مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ اور علاحدہ بھی طبع ہو کر بہت مقبول ہوا لیکن اصل شرح ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ (۲) قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۱۰- اشعة اللمعات : یہ حضرت محدث دہلوی ؒ کی فارسی شرح اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ متعدد بار چھپی، گو عربی شرح میں شاہ صاحب نے زیادہ کد و کاوش کی ہے، تاہم یہ بھی نہایت جامع اور بے نظیر ہے، ۱۰۳۷ھ میں اس کی ترتیب سے فارغ ہوئے تھے، پہلی جلد میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس

(۱) اتحاف النبلاء ص ۱۴۹ (۲) ایضاً۔

میں فن حدیث اور اس کے مصطلحات کے علاوہ متعدد اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ ہے جو اعظم پریس جونپور سے علاحدہ بھی چھپا تھا، شرح میں لغات و مطالب کو عمدہ طور پر حل کیا گیا ہے اور وہ مفید معلومات پر مشتمل ہے، فقہ حنفی کے مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں یہ بہت عمدہ شرح ہے۔

۱۱- **جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ:** شاہ صاحب نے اس کی دو جلدوں میں اپنی شرح مشکوٰۃ کا خلاصہ تحریر کیا ہے۔(۱)

۱۲- **اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ:** یہ اسماء الرجال پر حضرت شیخ کی مشہور تصنیف ہے، اس میں مشکوٰۃ کے تمام رواۃ کی فہرست اور خلفائے راشدین اور اہل بیت کے حالات ومناقب بیان کیے گئے ہیں، اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے، مگر ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔(۲)

۱۳- **مظاھر حق:** یہ اردو میں مشکوٰۃ کا ترجمہ اور اس کی مختصر شرح ہے، ترجمہ کی ابتدا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ نے کی تھی مگر پھر ان کے ایما اور مشورے سے مولانا قطب الدین خاں دہلوی (۱۲۸۹ھ) نے اس کو شرح کی شکل دی، اردو میں ہونے کی وجہ سے ایک زمانے میں اس سے عوام کو بڑا فیض پہنچا، مظاہر حق کی زبان وطرز بیان کی قدامت کی بنا پر دار العلوم دیوبند کے بعض فضلا نے اس کو موجودہ دور کی سہل اور سلیس زبان میں معارف مشکوٰۃ کے نام سے شائع کیا ہے، پہلی جلد کے جو ۱۹۶۰ء میں چھپی ہے، آغاز میں اصول حدیث کے مسائل ومباحث پر ایک مقدمہ بھی ہے۔

۱۴- **تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ:** یہ مشکوٰۃ پر مختصر مفید حاشیہ ہے، شارح مولانا ابوالوزیر سید احمد حسن دہلوی (م ۱۳۲۸ھ) علامہ میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے، اس کا صرف ابتدائی نصف حصہ ۱۳۳۵ھ میں دہلی کے

(۱) حیات شیخ عبد الحق دہلوی ص ۱۷۰ (۲) ایضاً ص ۱۷۱ اور ۱۷۲۔

مطبع انصاری سے شائع ہوا ہے۔

۱۵- التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح: یہ شرح مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے تحریر کی ہے، اس کی چار نامکمل جلدیں دمشق سے ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۶- مشکوٰۃ مع حاشیہ وتعلیق: ۱۳۸۰ھ میں ابوبکر شاویس نے مشکوٰۃ کا متن کئی نسخوں سے مقابلہ وتصحیح کر کے ناصر الدین البانی کے تحشیہ وتعلیقات کے ساتھ دمشق سے شائع کیا ہے، اس میں حدیثوں پر ہندسہ کے دو طرح کے نمبر دیئے گئے ہیں، ایک تو کتاب کی مسلسل حدیثوں کے لحاظ سے ہے اور دوسرے سے ابواب کی حدیثوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے، حواشی میں حدیث کے غریب اور مشکل الفاظ اور وضاحت طلب امور کی تشریح کے علاوہ صاحبِ مشکوٰۃ کی مسامحتوں کا بھی ذکر ہے، جیسے غلط حوالوں کی تصحیح کی گئی ہے اور جہاں سرے سے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے اور جہاں ایک ہی حوالہ تحریر کیا گیا ہے، وہاں مزید دوسرے حوالے بھی تحریر کیے گئے ہیں، بعض جگہ مشکوٰۃ میں دو حوالے دے کر الفاظ کو ان میں سے کسی ایک کا بتایا گیا ہے لیکن محشی نے اس کے بجائے دوسری کتاب کے الفاظ بتائے ہیں، بعض حدیثوں کو مشکوٰۃ میں مرفوع، متصل اور مسند بتایا گیا ہے لیکن حاشیہ میں ان کے موقوف، منقطع اور مرسل ہونے کا ذکر ہے، اسی طرح اس میں جن کو موقوف وغیرہ کہا گیا ہے، اس میں ان کے اس کے برعکس ہونے کی تصریح کی گئی ہے، اسی طرح مشکوٰۃ میں اگر امام ترمذیؒ کی روایتیں نقل کر کے ان کی تصحیح وتحسین یا تضعیف وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے تو اس میں اس کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، جن حدیثوں کو مصنف نے نامکمل نقل کیا ہے، محشی نے اس کو مکمل نقل کر دیا ہے اور جن حدیثوں کے بعض الفاظ اور جملے نقل ہونے سے رہ گئے ہیں یا ان میں کسی طرح کا تغیر ہو گیا ہے تو حاشیہ میں ان کو اصل کے مطابق ٹھیک نقل کیا گیا ہے، اسی طرح جن حدیثوں کی

سندیں ضعیف نقل ہوئی ہیں ان کے یا تو صحیح طرق بیان کیے گئے ہیں یا ان کی تقویت کے لیے شواہد و متابعات بھی ذکر کر دیئے گئے ہیں۔

یہ خوب صورت اور دیدہ زیب اڈیشن تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں کئی فہرستیں بھی دی گئی ہیں، شروع میں امام بغوی اور امام تبریزی کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں اور مصابیح و مشکوٰۃ پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۷- زجاجة المصابيح: یہ مولانا سید ابوالحسنات عبداللہ شاہ حیدر آبادی کی تصنیف ہے، اس کو مشکوٰۃ ہی کی طرز پر فقہی ابواب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے اور عموماً کتب و ابواب بھی اسی سے لیے گئے ہیں، البتہ مشکوٰۃ میں جہاں عنوانات میں شافعی مسلک کی رعایت کی گئی ہے، اس میں وہاں فقہ حنفی کی رعایت مدنظر رکھی گئی ہے اور ساتھ ہی حواشی میں حدیثوں کی مختصر تشریح بھی کی گئی ہے، اصل کتاب عربی میں لکھی گئی ہے، بعد میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔

۱۸- مرعاة المفاتيح: جمعیۃ اہل حدیث ہند کے ممتاز عالم و محدث مولانا ابوالحسن عبیداللہ رحمانی مبارک پوری بھی مشکوٰۃ کی ایک مبسوط شرح لکھ رہے ہیں، اس کی تین جلدیں اب تک شائع ہوئی ہیں، اس میں پہلے کی اکثر شرحوں کا خلاصہ آ گیا ہے، لائق شارح نے حدیثوں کی مفصل تشریح کر کے ان کے معانی و مطالب کی پوری وضاحت کی ہے، اس ضمن میں حدیث کے منکرین اور محدثین پر طعن و تشنیع کرنے والوں اور حدیثوں سے غلط نتائج مستنبط کرنے والوں کا جواب بھی دیا گیا ہے اور ان کے نقض و تضاد کو رفع بھی کیا گیا ہے، فقہی اختلافات نقل کرنے اور ائمہ فقہ و اجتہاد کے مذاہب و دلائل بیان کر کے مرجح و قوی مسلک کی تعیین کی گئی ہے، شارح نے عموماً محدثین کے مذہب کی تصویب کی ہے اور مرجوح اقوال پر بعض جگہ رد و کد بھی کی ہے، حدیثوں کی مشکلات لغوی و نحوی مسائل کو حل کرنے پر خاص دھیان دیا گیا ہے اور ان پر نقد و بحث کر کے ان کا درجہ و مرتبہ اور قوت

وضعف کی وضاحت بھی کی گئی ہے، رواۃ کے مختصر ترجمے اور بلاد واماکن کے متعلق ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، مشکوۃ کی پہلی اور تیسری فصل میں صحیحین کی جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں اگر ان کی تخریج دوسرے محدثین نے بھی کی ہے تو اس کا ذکر کردیا گیا ہے، اسی طرح دوسری فصل کی حدیثوں کے لیے جو حوالے دیئے گئے ہیں اگر ان کی تخریج ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی کی ہے تو اس کی تصریح کردی گئی ہے، جہاں مصنف نے حوالے تحریر نہیں کیے ہیں وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے، اگر مصنف سے الفاظ حدیث کے نقل کرنے میں کوئی مسامحت ہوئی ہے تو اس کی تصحیح کردی گئی ہے، یا اگر انھوں نے صحیحین کی جو حدیثیں پہلی فصل کے بجائے دوسری فصل میں اور دوسرے محدثین کی حدیثیں دوسری کے بجائے پہلی فصل میں بیان کی ہیں تو ان پر تنبیہ کی گئی ہے اور جن حدیثوں کو مصنف نے مختصر نقل کیا ہے، ان کو اس میں پوری نقل کردیا گیا ہے، مسلسل حدیثوں پر نمبر دیئے گئے ہیں اور ابواب کی حدیثوں پر علاحدہ بھی نمبر دیا گیا ہے، شروع میں کئی مفصل فہرستیں اور ایک مقدمہ ہے، اس میں اصول حدیث پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

☆☆☆

امام جمال الدین زیلعی

(متوفی ۷۶۲ھ)

نام ونسب: نام عبداللہ، کنیت ابومحمد اور لقب جمال الدین تھا، سلسلۂ نسب یوں ہے: عبداللہ ابن یوسف بن محمد بن ایوب بن موسیٰ۔(۱)

نام میں اختلاف ہے، بعض نے والد کا نام عبداللہ اور ان کا یوسف لکھا ہے۔(۲)

ولادت ووطن: زیلعی کے سنہ ولادت کا علم نہیں ہوسکا مگر ان کا وطن زیلع نام کا ایک گاؤں ہے جو بحر حبشہ کے ساحل پر ایک بندرگاہ ہے، اس کو دوسرے اکابرِ علم وفن کا وطن ہونے کا فخر بھی ہے۔(۳) امام فخر الدین زیلعی شارحِ کنز کا وطن بھی یہی سرزمین ہے، امام جمال الدین اسی کی نسبت سے زیلعی کہلاتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ: بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن عقیل، شہاب احمد بن محمد بن فتوح تجیبی، شہاب احمد بن محمد بن قیس انصاری، اسکندر ابن تاج الدین، محمد بن عثمان، تقی الدین بن عبدالرزاق لخمی، جمال الدین عبداللہ بن احمد بوری، ابومحمد فخر الدین عثمان بن علی شارح کنز، قاضی علاؤ الدین بن ترکمانی، جلال الدین ابوالفتوح علی بن عبدالوہاب جریری۔ شیخ محمد بن احمد بن عثمان۔(۴)

حفظ وضبط: علمائے فن نے زیلعی کے حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کا اعتراف کیا ہے، ہے، علامہ سیوطی نے مصر کے حفاظ حدیث اور نقادانِ فن میں ان کا تذکرہ کیا ہے، ارباب

(۱) لحظ الالحاظ ذیل طبقات الحفاظ ص ۱۲۸ (۲) الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۱، (۳) معجم البلدان الفوائد البہیہ ، ص ۹۵ (۴) لحظ الالحاظ ص ۱۶۹،

سیر وتذکرہ نے ان کو حافظ متقن اور احد حفاظ الحدیث وغیرہ لکھا ہے۔(۱)

حدیث میں درجہ: وہ حدیث میں بہت باکمال تھے، اس فن کی طلب وتحصیل اور کتب حدیث کی جمع وتالیف اور ہدایہ وکشاف کی حدیثوں کی تخریج سے ان کے علمی تبحر، وسعتِ نظر، حدیث میں کثرت اشتغال اور اس کے مباحث ومطالب پر دسترس اور متون وغیرہ سے مکمل واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ حدیثوں کے متون ومطالب کی طرح ان کے طرق واسناد پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے، اور فن جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کے ماہر تھے، اس پر ان کی تخریج شاہد ہے، مولانا عبدالحئ لکھنوی فرماتے ہیں، زیلعی کی تخریج سے فن حدیث اور اس کی جزئیات وفروع میں ان کی وسعتِ علم ونظر اور اسماء الرجال میں تبحر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔(۲)

فقہ: فقہ میں بھی نہایت بلند پایہ تھے، اہل تذکرہ نے ان کی فقہی بصیرت اور تفقہ کا اعتراف کیا ہے، ان کی تخریج سے بھی ان کے فقہی کمال اور علمی جلالت کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری سے منقول ہے، کہ ابن ہمام ہدایہ کی شرح الفتح القدیر میں حنفی مذہب کے جو دلائل تحریر کیے ہیں وہ زیادہ تر زیلعی کی تخریج سے ماخوذ ہیں۔(۳)

حدیث وفقہ دونوں میں امتیاز کی بناء پر اصحاب طبقات وتراجم نے ان کو امام لکھا ہے، سیوطی نے ان کو ''الامام الفاضل المحدث'' اور ابن فہد نے ''الفقیہ الامام'' کہا ہے، حافظ ابن حجر فقہی مسلک میں اختلاف کے باوجود ان کو امام کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔(۴)

علم وفن سے اشتغال: زیلعی اصلاً حدیث وفقہ میں زیادہ ممتاز تھے، مگر دوسرے علوم سے بھی ان کی دلچسپی کم نہ تھی، ان کے علمی اشتغال وانہاک کا ذکر تمام ارباب سیر نے کیا ہے۔(۵)

(۱) حسن المحاضرہ ج۱ص۱۵۱ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۱۳۸ (۲) الفوائد البہیہ ص۹۵ (۳) مقدمہ نصب الرایہ ص۸ (۴) ملاحظہ ہو ذیول تذکرۃ الحفاظ ص۱۲ وتلخیص نصب الرایہ ص۲ (۵) ذیل تذکرۃ الحفاظ ص۲۸ والدرر الکامنہ ج۲ص۳۱۰ والبدر الطالع ج۱ص۴۱۰۔

فقہی مذہب: وہ مسلکاً حنفی تھے، اوران کا شمار اجلۂ احناف میں ہوتا ہے، اسی بنا پر وہ حنفی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، لیکن جیسا کہ آگے معلوم ہوگا ان کو اس مذہب میں غلو نہ تھا۔

سیرت واخلاق: بڑے ستودہ سیرت اور پاک خو تھے، طبیعت میں نرمی، مروت اور شرافت تھی، اس لئے دوسرے مسلک کے لوگوں کے لئے بھی ان کے قلب میں نہ صرف گنجایش تھی بلکہ وہ ان سے میل جول بھی رکھتے تھے، تواضع اور خاکساری کا یہ حال تھا کہ اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں کے ساتھ مل کر حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرنے میں ان کو کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، سیرت واخلاق کی بلندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حنفی مذہب سے وابستہ ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں انصاف پسندی تھی، حدیثوں کی شرح وتوجیہ اور ان کے مباحث ومسائل کی تحقیق میں فقہی وجماعتی عصبیت کو راہ نہ دیتے تھے، حافظ ابن حجر کو بھی اعتراف ہے کہ ''امام زیلعی نہایت حق گو وانصاف پسند تھے، ہر باب میں اپنے مذہب کے مخالفین کے دلائل بھی نہایت فراخ دلی سے بیان کرتے ہیں اور ان کو جو کچھ معلوم ہوتا تھا، اس کو بلا ردو کد نقل کرتے تھے۔ (۱)

مقبولیت: اپنی اسی شرافت، حسنِ اخلاق، میانہ روی اور عدل پسندی کی وجہ سے ہر طبقہ ومسلک کے لوگوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔

عبادت وریاضت: علمی کمالات کی طرح عبادت وریاضت اور تقویٰ وتدین میں بھی ممتاز تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ مشائخ صوفیہ میں تھے اور عبادت وریاضت اور مجاہدات سے بڑا شغف رکھتے تھے، ان کا دل رذائل سے پاک صاف تھا۔

وفات: مورخین کا اتفاق ہے کہ محرم ۷۶۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، بعض نے تاریخ وفات ۱۱ محرم لکھی ہے، قاہرہ میں انتقال ہوا اور یہیں تجہیز وتکفین بھی ہوئی۔ (۲)

تصنیفات: اوپر گذر چکا ہے کہ زیلعی کو علم وفن سے بڑا اشتغال تھا اوران کا زیادہ وقت

---

(۱) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰ (۲) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰۔

کتابوں کے مطالعہ اور حدیثوں کی جمع وتخریج میں گذرتا تھا، اس لیے ان سے متعدد کتابیں یادگار رہی ہوں گی مگر افسوس کہ ان کے حالاتِ زندگی بہت کم معلوم ہو سکے اور ان کی چند ہی کتابوں کا پتہ چل سکا جو یہ ہیں:

۱۔مختصر معانی الآثار: یہ امام طحاوی کی مشہور اور بے نظیر کتاب معانی الآثار کا مختصر ہے، کوثری صاحب کا بیان ہے کہ ازہر کے کتب خانہ رواق اتراک اور آستانہ کے کتب خانہ کوبریلی میں اس کے نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔

۲۔تخریج احادیث الکشاف: اس میں علامہ زمخشری کی مشہور تفسیر کشاف کی حدیثوں اور آثار کی تخریج کی گئی ہے، مگر حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ''جن مرفوع حدیثوں کو زمخشری نے اشارۃً ذکر کیا تھا، ان کی تخریج نہیں کی گئی ہے اور موقوف آثار وروایات سے بھی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔''(۱) اس کمی کے باوجود اس کے استیعاب کا انھوں نے اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرفوع حدیثوں کی تخریج اور ان کے اسناد وطرق کی وضاحت میں خصوصیت سے بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور نہایت دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے، انھوں نے ''الکافی الشاف فی تحریر احادیث الکشاف'' کے نام سے ایک جلد میں اس کا خلاصہ لکھا تھا اور ایک جلد میں اس پر استدراک بھی لکھا تھا، آخر الذکر میں ان مرفوع حدیثوں کی جن کو صاحب کشاف نے اشارۃً ذکر کیا تھا اور ان موقوف آثار کی جن سے زیلعی نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا، تخریج کی گئی ہے، یہ پتہ نہیں کہ اصل وتلخیص چھپیں یا نہیں؟ لیکن کتب خانہ خدیویہ مصر میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں۔(۲)

۳۔نصب الرایہ فی تخریج احادیث الهدایہ: یہ زیلعی کی بڑی مفید اور سب میں اہم اور مشہور کتاب ہے، اگر انہوں نے کوئی اور کتاب نہ لکھی ہوتی تو تنہا یہی کتاب ان کے فضل وکمال اور شہرت ومقبولیت کے لئے کافی تھی، اس میں انہوں نے فقہ حنفی کی مشہور

(۱) الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰ وکشف الظنون ج ۲ ص ۳۱۴ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱۔

ومعرکۃ الآرا کتاب الھدایہ کی حدیثوں کی تخریج کی ہے اس کی بعض نمایاں اور اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- یہ ہدایہ کی سب سے اہم اور پہلی تخریج ہے، اس کی اس سے عمدہ اور بہتر کوئی تخریج نہیں لکھی گئی، پس اس کو ہدایہ کی تمام تخریجات میں مزیت اور اولیت کا شرف حاصل ہے، بعض لوگوں نے علاؤالدین ترکمانی کی بھی جو زیلعی سے پہلے گذرے ہیں، ایک تخریج ہدایہ کا ذکر کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، انھوں نے ہدایہ کی تخریج کے بجائے اس کی شرح اور خلاصہ لکھا تھا، البتہ ان کے ہم عصر حافظ عبدالقادر قرشی صاحبِ جواہر مضیہ کی تخریج کا ضرور ثبوت ملتا ہے، مگر یہ نہ تو متداول ہے اور نہ اس کا کوئی مکمل نسخہ ہی موجود ہے، علاوہ ازیں قرشی کا طبقہ زیلعی سے متاخر ہے، اس لیے ان کی تخریج بھی زیلعی کے بعد لکھی گئی ہوگی، اسی طرح حافظ ابن حجر کا زمانہ بھی زیلعی کے بعد کا ہے، ان کی کتاب درایہ دراصل نصب الرایہ کا ملخص ہے۔

۲- یہ تخریج لکھ کر مصنف نے جس طرح حنفی مذہب کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اسی طرح دوسرے فقہی مذاہب کی بھی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے، کیوں کہ انھوں نے صرف حنفی مسلک اور اس کے دلائل بیان کرنے ہی پر اس میں اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ دوسرے ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل، تخریجات وتفریعات بھی تفصیل ووضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں، اس اعتبار سے یہ محض حنفی مذہب ومسلک ہی کا عمدہ اور بیش قیمت ذخیرہ نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت دائرۃ المعارف اور انسائیکلو پیڈیا کی ہے جس میں تمام ائمہ مجتہدین وفقہائے امصار کے مسالک و دلائل کی مکمل تفصیل موجود ہے۔

مصنف نے جہاں اس میں حنفی ائمہ کی امہات کتب سے معلومات ومسائل نقل کیے ہیں وہیں شوافع میں بیہقی، نووی اور ابن دقیق العید، مالکیہ میں ابن عبدالبر اور حنابلہ میں ابن جوزی اور ابن عبدالہادی وغیرہ اساطینِ مذہب کی کتابوں کے مباحث ومندرجات کا

بھی منتخب حصہ شامل کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے احناف کی طرح دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس سے نقل واستفادہ کرتے رہے ہیں، زرکشی اور ابن حجر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

۳- اس میں فقہ وحدیث اور رجال کی اکثر کتابوں کے مباحث ومطالب درج ہیں، اس لیے اس کو دیکھنے کے بعد ان کتابوں کی احتیاج باقی نہیں رہتی، متعدد ایسی کتابوں کے مندرجات بھی جمع کیے گئے ہیں جو اَب دستبردِ حوادث سے معدوم ہوگئی ہیں، یا اگر ہیں تو اتنی کمیاب اور نادر الوجود ہیں کہ ان کا حصول ودسترس ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، جیسے صحیح ابوعوانہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن السکن اور معاجم، مسانید اور سنن کے دوسرے متعدد مجموعے، ابن عبدالبر کی کتاب الاستذکار والتمہید یا بیہقی، خطیب، ابن عدی ابوحاتم اور ابن جوزی وغیرہ کی علل ورجال کی ناپید کتابیں۔

۴- احکامی احادیث وروایات کے استقصا کے لحاظ سے یہ بے نظیر کتاب ہے، علاوہ ازیں حدیثوں سے مستنبط مسائل اور فقہی فوائد ومطالب پر مصنف نے بڑی عالمانہ گفتگو کی ہے اور بحث وتحقیق اور تلاش وجستجو کا حق ادا کر دیا ہے۔

۵- اس کی ایک اہم خصوصیت مصنف کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری ہے، ان کا اصل مقصد ہدایہ کی حدیثوں کی تخریج اور حنفیہ کے نقطۂ نظر کے دلائل وشواہد پیش کرنا ہے مگر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، انھوں نے دوسرے فقہی مذاہب اور ائمہ مجتہدین کے اقوال ودلائل بھی نہایت دیانتداری کے ساتھ بیان کیے ہیں، نہ کسی طرح کی عصبیت اور جانبداری سے کام لیا ہے اور نہ اپنے مذہب ومسلک کی بے جا حمایت اور تائید کی ہے۔

۶- صرف فقہی حیثیت ہی سے اس کی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ حدیثِ نبوی کی بھی نہایت مفید اور عظیم الشان خدمت ہے کیوں کہ یہ حدیث کے مباحث ومطالب، متون واسناد اور اصول حدیث کے بعض مسائل پر نادر تحقیقات' در پُر مغز معلومات کا بھی ایک خزانہ ہے، چنانچہ حدیثوں کی صحت وعدمِ صحت اور اسناد ورجال کی قوت وضعف کا اس سے مکمل

اندازہ ہو جاتا ہے کیوں کہ مصنف نے یہ تصریح کردی ہے کہ اس سند میں فلاں راوی مجروح یا متکلم فیہ ہے، اسی طرح اگر کسی حدیث کے ہم معنی دوسری حدیثیں بھی ہوتی ہیں تو وہ ان کو بھی مع سند و متن ذکر کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جرح و تعدیل کے موضوع پر ائمہ فن، جہابذۂ محدثین اور علمِ رجال و اسناد کے ماہرین کے اقوال کا یہ ایسا عظیم الشان ذخیرہ ہے جو اصول حدیث اور اسماء الرجال کی موجودہ مروج و متداول کتابوں میں بھی موجود نہیں ہے، اگر ان سب بحثوں کو اکٹھا کرلیا جائے تو یہ فنِ جرح و تعدیل کا ایک ضخیم مجموعہ بن جائے گا۔

۷- اس سے حدیثوں کے ماخذ و مرجع کا علم ہو جاتا ہے کیوں کہ زیلعی نے ہر ہر حدیث کے بارے میں یہ تحریر کردیا ہے کہ اس کو کس محدث نے اپنی کس کتاب میں نقل کیا ہے۔

ان خصوصیات سے نصب الرایہ کی عظمت واہمیت کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے، درحقیقت یہ فقہ و حدیث، اصولِ حدیث اور رجال کا ایسا مفید اور مستند ذخیرہ ہے جس کے مطالعہ سے کوئی محدث و فقیہ بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

حافظ ابن حجر نے الدرایہ فی تلخیص نصب الرایہ کے نام سے اس کا ایک مختصر لکھا تھا، جو ہندوستان میں دوبارہ چھپا ہے اور قاسم بن قطلو بغا حنفی نے ''منیۃ الالمعی فیما فات من تخریج احادیث الہدایہ للزیلعی'' کے نام سے ذیل تحریر کیا تھا۔

تخریج زیلعی کا پہلا اڈیشن ۱۳۰۱ھ میں مطبع علوی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور دوسرا ۱۳۵۷ھ (مطابق ۱۹۳۸ء) میں مجلس علمی ڈابھیل نے مصر سے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے، یہ محققانہ مقدمہ اور مفید حواشی پر مشتمل ہے۔

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَبَلَّغَهُ (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ سوم

اس میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادہ شیخ عبد الحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحب تصانیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات زندگی وسوانح اور ان کی علمی و دینی اور محدثانہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مقدمہ

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد الامین وعلی الہ واصحابہ اجمعین

قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کا اصلی دار و مدار ان احادیث نبوی پر ہے جو آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے صحیح اور مستند طریقہ پر ان تک پہنچی ہیں، قرآن مجید میں جو اصول وکلیات، بنیادی تعلیمات و ہدایات اور مجمل احکام بیان کیے گئے ہیں، رسول اکرم ﷺ نے اپنے اقوال واعمال کے ذریعہ ان کی تشریح وتفصیل کی ہے، اس لیے مسلمانوں کا اصل سرمایہ اور رأس المال یہی دونوں چیزیں ہیں، آپؐ نے فرمایا ہے کہ ''اگر میرے بعد تم لوگ ان دونوں چیزوں کو مضبوطی سے اختیار کرو گے تو ضلالت میں نہیں پڑو گے۔''

آنحضرت ﷺ کے ساتھیوں اور جاں نثاروں نے آپؐ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور آپؐ کی ایک ایک بات کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ آپؐ کی تعلیم وتلقین کے مطابق اسے دوسروں تک بھی پوری احتیاط اور ذمہ داری سے پہنچایا، اس طرح برابر چراغ سے چراغ جلتا رہا اور ہر دور میں احادیث سے مسلمانوں کا شغف وانہماک قائم رہا، جس کی بنا پر آپؐ کے اقوال واعمال اور سیرت وزندگی کا کوئی پہلو لوگوں سے مخفی و مستور نہیں رہا۔

ابتدا میں گو تحریر و کتابت کا زیادہ رواج نہیں تھا، کیوں کہ عربوں کا حافظہ قوی ہوتا تھا نیز قرآن مجید سے احادیث کے خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ تھا، تاہم احادیث کی جمع و تدوین کا سلسلہ آپؐ کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو گیا تھا اور بعض صحابہ کرامؓ کے پاس ایسے صحائف اور نوشتے موجود تھے جن میں حدیثیں قلم بند تھیں، صحابہؓ کے آخری دور میں احادیث کی نقل و اشاعت کا رواج عام طور پر ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی ایک جماعت صرف اسی کام کے لیے مخصوص ہو گئی تھی جس کو محدثین کہا جاتا ہے، ان لوگوں نے صرف احادیث کو نقل و جمع کرنے ہی کا کام انجام نہیں دیا بلکہ ان کا مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات کو پوری صحت کے ساتھ جمع کیا، حدیثوں اور ان کے راویوں کی مکمل تحقیق اور پوری چھان بین کی۔

احادیث کی باقاعدہ جمع و تدوین کا کام لگ بھگ پہلی صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوا، مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ دوسری قوموں کے یہاں جب کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلم بند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک نہیں معلوم ہوتا اور ان افواہوں میں وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں، لیکن اس معاملہ میں مسلمانوں نے جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول روایت کا تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا

پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سیکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کردیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے، ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوگیا جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول درایت کا تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں، اصول روایت ودرایت پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں، سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ اور خطبات مدراس میں بھی اس کی پوری تفصیل موجود ہے، یہاں صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ احادیث کی جمع وتدوین اور راویوں کی چھان بین میں محدثین نے کس قدر کدوکاوش اور محنت وجانفشانی کی ہے جس کی بدولت احادیث اور روایات کے صحیح و مستند مجموعے مرتب ہوئے۔

دار المصنفین نے مسلمانوں کے علوم وفنون کی تاریخ مدون کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں اس کے پیش نظر محدثین کرام کے حالات وکارناموں پر مبسوط کتاب لکھنا بھی تھا، یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کی دو جلدیں الحمد للہ اس سے پہلے چھپ کر مقبول ہوچکی ہیں، مگر ان دونوں جلدوں میں ہندوستان کے باہر کے محدثین کا ذکر تھا، غیر ہندوستانی محدثین کا سلسلہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ اہل علم کی جانب سے اس کا تقاضا ہونے لگا کہ پہلے ہندوستانی محدثین کا تذکرہ قلم بند کیا جائے، یہ اصرار وتقاضا بیجا نہیں تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کے بھروسے پر ہندوستان کے مشہور صاحب تصانیف محدثین پر کام شروع کردیا گیا اور خدا خدا کرکے اس کی ایک جلد مکمل ہوگئی۔

ہندوستان کے محدثین کے حالات کو ایک ہی جلد میں سمیٹنا ناممکن تھا، اندازہ ہے کہ کم از کم ابھی دو جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا، اس کتاب کو اس سلسلہ کی پہلی جلد سمجھنا

چاہیے، ناظرین اس پورے سلسلہ کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں جو یقیناً ان اوراق کے مرتب کے لیے بھی بڑی خوش قسمتی اور دینی ودنیاوی سعادت کی بات ہوگی۔

یہ جلد محدثین ہند کے لیے مخصوص ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کی اجمالی تاریخ یہاں بیان کردی جائے۔

مسلمانوں کی علمی تاریخ نہایت زریں اور درخشاں ہے، انہوں نے جس چپہ زمین پر قدم رکھا وہاں علم وہنر کا ایک تازہ جہاں آباد ہوگیا، ہندوستان بھی ان کے علم وفن کی برکتوں سے مالا مال ہے۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حملہ آور اور فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور اس سے ان کے تعلق کا آغاز محمود غزنوی کے حملہ یا محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے زمانہ سے ہوتا ہے لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے، دراصل ہندوستان سے عربوں اور مسلمانوں کا تعلق بہت قدیم ہے، عرب تاجروں اور سواحل ہند کے سوداگروں میں تجارتی تعلقات عرصہ سے چلے آرہے تھے، شمالی ہندوستان میں درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں اور افغانوں کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا آغاز ہے، لیکن جنوبی ہندوستان میں ملیبار اور کارومنڈل سے گجرات تک کے علاقہ میں عربوں کی آمد ورفت اور تجارت کا سلسلہ اسلام سے بہت پہلے شروع ہوگیا تھا اور وہ ان علاقوں میں آباد ہوگئے تھے جن کی اولاد آج تک وہاں موجود ہے، اسی طرح ہندوستان کی بعض قومیں اور جماعتیں بھی عرب کے بعض علاقوں میں مستقل طور سے آباد ہوگئی تھیں جن کے ناموں سے اہل عرب واقف تھے، خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ بھی ان کو جانتے تھے، احادیث وسیر کی کتابوں میں ان کے تذکرے بھی پائے جاتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے کہ مسلمان ہندوستان کو اپنا مفتوحہ ملک نہیں بلکہ اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں، کیوں کہ بعض ضعیف روایتوں میں اس کا ذکر ہے کہ حضرت آدمؑ جب آسمان کی جنت سے نکالے گئے تو وہ اسی زمین کی جنت میں جس کا نام

ہندوستان ہے، اتارے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ لنکا میں اترے تھے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''دجنا'' میں اترے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق یہ دراصل دکھن کا علاقہ ہے جہاں سے ملک عرب میں متعدد قسم کی خوشبوئیں اور مسالے بھیجے جاتے تھے اور پھر عربوں کے ذریعہ وہ تمام دنیا میں پھیلتے تھے۔

ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں کے آنے سے صدیوں پہلے جو اہل عرب اور مسلمان تاجر کی حیثیت سے سندھ اور ملیبار سے لے کر گجرات اور موجودہ مہاراشٹر تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے، وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم وفنون بھی لائے تھے اور یہاں کی مختلف آبادیاں اور مسجدیں بھی تعمیر ہو گئی تھیں جو اسلام کی ابتدائی درس گاہیں تھیں، ان میں بیٹھ کر ان کے علما ومحدثین قال اللّٰہ و قال الرسول کا آوازہ بلند کرتے تھے۔

۹۳ھ میں سندھ فتح ہوا جس کے بعد سے تیسری صدی ہجری کے شروع تک یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں رہا، لیکن سندھ پر مسلمانوں کی تاخت کا سلسلہ حضرت عمرؓ کے عہد ہی سے شروع ہو گیا تھا، اس لیے اسی زمانہ سے یہاں مسلمان بھی آنا شروع ہو گئے جن میں بعض صحابہ کرامؓ بھی تھے، انہوں نے اور ان کے بعد تبع تابعین نے بھی اس ملک میں اس عہد کے دستور اور طریقہ کے مطابق حدیث کی روایت کی ہوگی۔

عربوں کے حکومت کے قیام کے بعد سندھ، دیبل، منصورہ اور ملتان وغیرہ علم و فن کا مرکز اور اصحاب علم ودرس سے معمور تھے، لیکن اس زمانہ کی علمی ودینی سرگرمیوں اور اشخاص ورجال کا ذکر کم ملتا ہے، تاہم علم حدیث سے شغف رکھنے والے بعض علما ومحدثین کے نام یہاں تحریر کیے جاتے ہیں، ان میں سے بعض عرب سے ہندوسندھ میں آئے اور بعض اپنے وطن ہندوسندھ کو چھوڑ کر ملک عرب میں جا بسے تھے۔

ربیع بن صبیح سعدی بصری (م ۱۶۰ھ)، ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی (۱) (م ۱۷۰ھ)، اسرائیل بن موسیٰ بصری (دوسری صدی ہجری)، ابو خالد یزید بن عبداللہ بیسری سندھی (دوسری صدی ہجری)، عباس بن عبداللہ سندھی (دوسری صدی ہجری)، عبدالرحمٰن ابو امیہ سندھی (دوسری صدی ہجری)، ابراہیم بن محمد دیبلی مکی (اوائل تیسری صدی ہجری)، ابو محمد (۲) رجا بن سندھی اسفرائنی (۲۲۱ھ)، ابو محمد خلف بن سالم سندھی بغدادی (م ۲۳۱ھ)، ابوالحسن محمد بن عبداللہ سندھی بصری (تیسری صدی ہجری)، ابو محمد موسیٰ سندھی (تیسری صدی ہجری)، ابو جعفر سندھی (تیسری صدی ہجری)، ابو محمد عبداللہ المنصوری، ابوالعباس احمد بن محمد المنصوری (چوتھی صدی ہجری)، شعیب بن محمد دیبلی (۳۱۵ھ کے بعد)، ابو جعفر محمد بن ابراہیم دیبلی مکی (۳۲۲ھ)، ابوالعباس احمد بن عبداللہ دیبلی نیشاپوری (۳۴۳ھ)، ابوالفوارس احمد بن محمد صابونی سندی مصری (م ۳۴۹ھ)، ابوالقاسم منصور بن محمد (۳۸۶ھ)، ابو بکر محمد بن علی بامیانی (م ۳۹۰ھ)، علی بن موسیٰ دیبلی بغدادی (چوتھی صدی ہجری)، خلف بن محمد دیبلی بغدادی (چوتھی صدی ہجری) وغیرہ۔

عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد غزنوی اور غوری سلاطین برسر اقتدار آئے، اس دور میں اور اس کے بعد کئی صدی تک گجرات اور ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں معقولات کی گرم بازاری رہی اور دینی علوم تفسیر و حدیث سے لوگوں کا اشتغال بہت کم رہا، ایران، خراسان اور ماوراء النہر سے آنے والے اصحاب علم و درس کی ساری توجہ فقہ و خلاف، تصوف و کلام اور معقولات کی جانب مرکوز رہی اور فقہ میں بھی اصل زور فقہ حنفی کے فروغ و جزئیات ہی پر دیا جاتا تھا، علم دانائی و دانش مندی کی جانب رغبت بڑھ جانے کی وجہ سے حدیث کی امہات کتب کے بجائے امام صغانی کی مشارق الانوار

(۱) ابو معشر مشہور صاحب مغازی ہیں، ان کے خاندان میں متعدد علما و محدثین گزرے ہیں۔ (۲) اس خاندان میں بھی کئی اہل علم و فن پیدا ہوئے۔

داخل درس تھی، اگر کوئی امام بغوی کی مصابیح السنۃ اور مشکوٰۃ المصابیح بھی پڑھ لیتا تھا تو وہ محدث کامل سمجھا جاتا تھا، اس دردناک صورت حال کا ذکر نواب صدیق حسن خاں، مولانا حکیم سید عبدالحی رائے بریلوی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور استاذ العلما مولانا سید سلیمان ندوی سابق ناظم دارالمصنفین نے اپنے اپنے مضامین و کتب میں دکھ کے ساتھ کیا ہے۔

درۂ خیبر سے آنے والے مسلمانوں نے اپنا قدم شمالی ہند کی طرف بڑھایا، سلاطین غزنہ کا دارالسلطنت لاہور تھا، اس لیے اس عہد میں لاہور میں زیادہ اصحاب علم و فن جمع ہوئے، ذیل میں علم حدیث سے شغف رکھنے والے اس دور کے بعض علما کے نام پیش کیے جاتے ہیں:

ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن اشعثی لاہوری، سمرقندی (م ۴۲۹ھ)، شیخ اسماعیل لاہوری (۱) (م ۴۴۸ھ)، ابوالحسن علی بن عمر بن حکم لاہوری (م ۵۲۹ھ)، ابوالقاسم محمود بن خلف لاہوری اسفرائنی (م ۵۴۰ھ)، ابومحمد بختیار بن عبداللہ ہندی (م ۵۴۳ھ) ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی (م ۵۴۳ھ)، ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد بوقانی سندھی (م ۶۰۰ھ)، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۶ھ)۔

امام صغانی بھی اسی دور میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ان کی تصنیف مشارق الانوار کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی، لیکن ان کا فیوض ہندوستان سے باہر زیادہ جاری رہا، ان کے بعد گوسنا ٹا رہا تاہم کوئی کلیہ مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا، نویں صدی ہجری تک جو محدثین گزرے ہیں اور جن کو حدیث سے اشتغال رہا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ (۷۲۵ھ)، مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی (م ۷۴۷ھ)، عمر غزنوی (م ۷۷۳ھ)، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ)، امیر کبیر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ)، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا برہان الدین محمود دہلوی (۷۸۸ھ)، مولانا

(۱) یہ تفسیر و حدیث دونوں میں ممتاز اور مشہور واعظ تھے، جن کے ہاتھ پر بے شمار لوگ مسلمان ہوئے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جو حدیث و تفسیر کا علم لاہور میں لائے۔

کمال الدین زاہد دہلوی (شاگرد مولانا برہان الدین دہلوی) وغیرہ۔

یہ کساد بازاری نویں صدی ہجری تک قائم رہی، آٹھویں صدی کے اواخر میں دکن کی بہمنی سلطنت قائم ہوئی، اس نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی، گجرات کا علاقہ علم حدیث کے لیے کسی قدر شروع ہی سے زرخیز رہا ہے، نویں صدی کی ابتدا میں جب مظفر شاہ نے گجرات کی مستقل حکومت قائم کی تو علم حدیث کا تخم عرب سے ہندوستان کو منتقل ہونے لگا، اکبر کے دور میں گجرات، پھر ممالک محروسہ کا جزو بن گیا، اس کی وجہ سے اس کا فیض پورے ہندوستان میں پھیلنے لگا لیکن مرکزیت گجرات ہی کو حاصل رہی۔

غرض نویں صدی کے بعد ہندوستان میں نئے سرے سے علم حدیث کا آغاز ہوا، اس زمانہ میں حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی کے تلامذہ نے ہندوستان میں علم حدیث کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا، اس سلسلہ میں مولانا راجح بن داؤد گجراتی (۹۰۴ھ)، مولانا وجیہ الدین محمد مالکی (م ۹۲۹ھ)، جمال الدین محمد بن عمر حضرمی (م ۹۳۱ھ) اور مولانا علاء الدین احمد نہر والی (م ۹۴۹ھ) کے نام قابل ذکر ہیں، حافظ سخاوی کے ایک اور شاگرد شیخ رفیع الدین شیرازی (م ۹۵۴ھ) سے شمالی اور جنوبی ہند دونوں جگمگا اٹھے، وہ سکندر لودی کے زمانہ میں دہلی آئے اور آگرہ میں درس و تدریس کا بازار گرم کیا، انہی کے شاگرد شیخ ابوالفتح تھانیسری تھے، میر سید عبدالاول زید پوری جونپوری (م ۹۶۵ھ) نے سب سے پہلے صحیح بخاری کی شرح لکھی، جن کے شاگرد شیخ طیب محدث سندھی تھے، مولانا عبدالمالک عباسی گجراتی (۹۷۷ھ) کو صحیح بخاری زبانی یاد تھی، حافظ ابن حجر اور ابن حجر مکی کے تلامذہ نے بھی حدیث کے نور سے ہندوستان کی سرزمین کو منور کیا، اس عہد کے باکمال لوگوں کی ایک نامکمل فہرست یہاں دی جاتی ہے:

شیخ محمد بن محمد عبدالرحمٰن مالکی مصری (م ۹۱۹ھ)، رکن الدین مخدوم متو ٹھٹھوی (م ۹۴۹ھ)، شیخ احمد فیاض امیٹھوی (م ۹۸۱ھ)، ملا علی محدث سمرقندی (م ۹۸۱ھ)، شیخ بھکاری کاکوروی (م ۹۸۱ھ)، مولانا میر کلاں محدث اکبر آبادی (م ۹۸۳ھ)، شیخ عبدالمعطی

ابن حسن مکی (۹۸۹ھ) سید عبداللہ عیدروس (۹۹۰ھ)، شیخ سعید شافعی (م ۹۹۱ھ)، شیخ محمد بن احمد بن علی فاکہی (م ۹۹۲ھ)، شہاب الدین احمد بن بدرالدین مصری (م ۹۹۲ھ)، حاجی ابراہیم محدث اکبرآبادی، مولانا عبدالرحمٰن محدث سرہندی (استاذ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی)، شیخ بہلول بدخشی دہلوی، شیخ ابراہیم بن احمد بن حسن بغدادی، شیخ ضیاء الدین مدنی، شیخ حمید سندھی، شیخ عبداللہ بن سعداللہ سندھی، شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ سندھی (تینوں بھائی تھے، مؤخرالذکر دونوں شیخ علی متقی (م ۹۷۵ھ) کے تلمیذ تھے)، شیخ برخوردار سندھی، یہ بھی شیخ علی متقی کے شاگرد تھے، شیخ عبداللہ لاہوری اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا زمانہ بھی یہی ہے جن کا اور شیخ علی متقی کا تذکرہ اس جلد میں درج ہے، گیارہویں صدی کے اوائل میں جن لوگوں نے علم حدیث کی نشرواشاعت کی، ان کے نام یہ ہیں:

شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۰۰۳ھ) شیخ جوہرناتھ کشمیری (م ۱۰۲۶ھ)، حاجی محمد کشمیری، ملا محمد شگرف محدث کشمیری، شیخ عبدالنبی گنگوہی، شیخ عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری، قطب الدین عباسی نہروالی، شیخ احمد بن اسماعیل مندوی اور شیخ علیم الدین مندوی وغیرہ۔

خزاں کے بعد بہار آتی ہے، چنانچہ اکبر کے آخری دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی پیدا ہوئے اور انہوں نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھادیا، ان کی اور ان کے خاندان کی بدولت شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا ہوگیا جن کے اولیات اور کارناموں پر اس جلد میں مفصل بحث ملے گی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی کے معاصر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی بھی تھے جن کے اصلاحی وتجدیدی کارناموں کی گونج آج تک پورے ہندوستان میں سنائی دیتی ہے ان کا پایۂ علم حدیث میں بھی بہت بلند تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ ان کی تعلیم کی بنیاد اتباع سنت پر تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل کی طرف

لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہوگئی اوران کے بعد صوفی محدثوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوگیا۔

گیارہویں صدی کے خاتمہ کے بعد عبداللہ لاہوری محدث مکہ معظمہ میں، ابوالحسن سندھی (م ۱۱۳۹ھ) مدینہ منورہ میں مسند نشین تھے، اسی زمانہ میں جب کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا دریائے فیض جاری تھا، ہندوستان کی سرزمین پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی جامع کمالات ہستی نمودار ہوئی، انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی ازسرنو تجدید کا اہم کارنامہ انجام دیا، ان کا اوران کی اولاد کا فیض آج تک اس برصغیر ہی نہیں پوری دنیا میں جاری ہے، انشاء اللہ اس کی تفصیل آئندہ جلد میں بیان ہوگی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بدولت ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدا سے خالی نہیں رہا، اس لیے علم حدیث کی مرکزیت بھی کسی مخصوص علاقہ تک محدود نہیں رہی بلکہ ہر صوبہ اور ہر مقام اس کا مرکز ہوگیا، اس کی تفصیل بھی آئندہ جلدوں میں آئے گی، جن کی تکمیل کے لیے ناظرین سے مکرر دعا کی درخواست ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا ج اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

۲۵/اکتوبر ۱۹۹۰ء مطابق ۴/ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام حسن صغانی

(المتوفی ٦٥٠ھ/١٢٥٢ء)

نام ونسب: حسن نام، رضی الدین لقب، ابوالفضائل کنیت اور نسب نامہ یہ ہے:
حسن بن محمد بن حسن بن حیدر بن علی۔(١)

عبدالقادر قرشی (متوفی ٧٧٥ھ/١٣٧٣ء) نے علی کے بعد اسماعیل کے نام کا اضافہ کیا ہے۔(٢)

خاندان: امام صغانی عربی النسل تھے، ان کا تعلق قبیلۂ قریش کی اس شاخ سے تھا جس میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ پیدا ہوئے تھے، اسی لیے عمری وقرشی کی نسبت سے مشہور ہوئے، وہ عدوی بھی کہلاتے تھے، یہ حضرت عمرؓ کے دادا عدی بن کعب بن لوی کی طرف نسبت ہے۔(٣)

---

(١) بغیۃ الوعاۃ، ص ٢٢٧ والفوائد البہیہ، ص ٢٩۔ (٢) الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیہ، ج ١، ص ٢٠١۔
(٣) کتاب الانساب، ورق ٣٨٦۔

ولادت: عام مؤرخین کے بیان کے مطابق ان کی ولادت ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں ہوئی (۱) بعض نے ۱۰ر صفر (۲) اور بعض نے ۱۵ر صفر (۳) تاریخ لکھی ہے، عبدالقادر قرشی نے روز پیدائش پنجشنبہ لکھا ہے (۴) نزہۃ الخواطر میں سنہ پیدائش ۵۵۷ھ/۱۱۶۱ء درج ہے (نزہۃ الخواطر، ج۱، ص ۱۳۷) جو اغلب ہے کہ کتابت کی غلطی ہوگی۔

اس زمانہ کے ایک فاضل مولانا عبدالحلیم چشتی نے جمہور کے بیان پر اپنی بے اطمینانی ظاہر کی ہے اور ثبوت میں تاج العروس (للسید مرتضٰی زبیدی) کے حوالہ سے خود صغانی کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے جو ان کی تصنیف العباب الزاخر سے ماخوذ ہے:

سمعت والدی المرحوم بغزنة فی	میں نے ۵۸۰ھ (۵) میں غزنہ میں اپنے
شهور نیف وثمانین وخمس مائة	والد مرحوم سے سنا تھا، وہ فرماتے تھے کہ
یقول کنت اقرء کتاب الحماسة لابی	جس زمانہ میں اپنے استاد سے ابوتمام کا
تمام علی شیخی بغزنة ففسرلی	حماسہ پڑھتا تھا، مجھے یاد ہے (۶) کہ انہوں
هذا البیت :	نے اس شعر:
بیض مفارقنا تغلی مراجلنا ناسوا	"ہمارے سر کے بال مشک کے استعمال کی
باموالنا آثار ایدینا، واول لی فی قوله	وجہ سے سفید ہوگئے ہیں، ہماری دیگیں
بیض مفارقنا مائتی تاویل فاستغربت	(مہمانوں کے لیے) جوش کھا رہی ہیں،
ذلک حتی وجدت الکتاب الذی	ہمارے ہاتھوں کے زخموں کا علاج ہم اپنے

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ والفوائد البہیہ، ص ۲۹۔ (۲) الجواہر المضیہ، ص ۲۰۱ وتاج التراجم فی طبقات الحنفیہ، ص ۱۸۔ (۳) مآثر الکرام، ج۱، ص ۱۸۱ واتحاف النبلاء المتقین، ص ۲۴۳ وتذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔ (۴) تاج التراجم، ص ۱۸ والجواہر المضیہ، ص ۲۰۱۔ (۵) مولانا نے شہور نیف وثمانین وخمس مائۃ کا ترجمہ ۵۸۰ھ کیا ہے۔ (۶) مولانا نے اپنے خیالات کو درست ثابت کرنے کے لیے کہیں کہیں ترجمہ میں اصل کی رعایت نہیں کی ہے۔

یبین فیہ هذہ الوجوہ ببغداد فی حدود سنة اربعین و ستماة والحمدللہ علی نعمه

اموال سے کرتے ہیں، یعنی ہم سردار ہیں، دیت دیتے ہیں، ہم سے قصاص نہیں لیا جاتا" کا مطلب بتایا، پھر شاعر کے اس قول بیض مفارقنا کی دو سو تاویلیں بیان کیں، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کہیں اتنے سے جملہ کی دو سو تاویلیں کی جاسکتی ہیں تا آنکہ مجھے ۶۴۰ھ میں بغداد میں وہ کتاب مل گئی جس میں اس کے یہ وجوہ مذکور تھے۔

صغانی کے اس بیان کی وجہ سے مولانا کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ "یہ واقعہ سن شعور کا ہے، لہٰذا سنہ ولادت ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء ہرگز صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا" (۱) وہ مزید فرماتے ہیں کہ "صغانی نے اپنے قیام غزنہ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء کا ایک نہایت علمی واقعہ اپنے والد کی زبانی نقل کیا ہے، جمہور مؤرخین کے قول پر اس وقت صغانی کی عمر مشکل سے تین سال کی ہوتی ہے، تین برس کا جو اچھی طرح سے بول بھی نہیں سکتا، وہ عربی ادب کی بلند پایہ کتاب حماسہ کو کیا سمجھ سکتا ہے اور اس کے اشعار کو کیوں کر یاد رکھ سکتا ہے۔" (۲)

تعجب ہے کہ مولانا نے نیف ثمانین وخمس مأة کا ترجمہ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء کس طرح کیا ہے، ان کی بے اطمینانی اور جمہور کی رائے سے اختلاف میں خود ان کی مسامحت کو بڑا دخل ہے۔

ان کے نزدیک صغانی کا سنہ پیدائش ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء ہے، انہوں نے علامہ ذہبی کا یہی قول بتایا ہے جسے مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں ذہبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور تیرہویں صدی ہجری کے عالم و مؤرخ اسماعیل پاشا بن محمد امین البغدادی نے بھی ہدیۃ العارفین میں یہی سنہ پیدائش نقل کیا ہے، مولانا نے اس کی تائید میں بعض اور قرائن بھی پیش کیے ہیں

(۱) معارف، جلد ۸۳، عدد ۱، ص ۱۲۔ (۲) ایضاً۔

اور لکھا ہے کہ ان سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ جو سال ولادت سید مرتضٰی زبیدی نے نقل کیا ہے وہی صحیح ہے۔ (۱)

ان مختلف بیانات کی وجہ سے صغانی کے سنہ ولادت کی صحیح تعیین مشکل ہے، تاہم اس قدر مسلم ہے کہ وہ آخری غزنوی فرماں روا خسرو ملک (۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تا ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) کے دور حکومت میں پیدا ہوئے۔

مولد و وطن: ان کے آباء و اجداد صغان میں آباد تھے جو ماوراء النہر میں ترمذ کے قریب دریائے دخش (سرخ آب) کے مغربی اور دریائے جیحون کے جنوبی علاقہ میں واقع تھا، یہ ایک سرسبز و شاداب اور زرخیز مقام تھا (۲) صغان اور صغانیان، چغان اور چغانیان کا معرب ہے، اہل عجم اسے چغان و چغانیان ہی کہتے تھے، مگر اہل عرب عموماً جیم فارسی (چ) کو صاد سے بدل دیتے ہیں، اس لیے وہ صغان اور صغانیان کہتے تھے، صغانی اسی کی جانب نسبت ہے، بعض لوگ صاخان (چاغان) بھی کہتے ہیں اور صغانی کے بجائے صاغانی کی نسبت سے منسوب کرتے ہیں (۳) موجودہ جغرافیہ میں اس جگہ کو سرآسیا کہا جاتا ہے۔

صغانی کے بزرگ صغان سے ترک سکونت کر کے لاہور میں آباد ہوئے، مؤرخین نے اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ امام صغانی کے بزرگوں میں سے کون پہلے لاہور آیا، تاہم اس پر سب متفق ہیں کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے جو غزنویوں کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے ایک بڑا سیاسی، تمدنی اور علمی مرکز تھا، لیکن صغانی کی پیدائش کے زمانہ میں اس سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں، چنانچہ چند ہی سال بعد غوریوں نے غزنویوں کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور اس کا مرکز لاہور کے بجائے دہلی کو بنایا، اس لیے صغانی اپنے بچپن ہی میں غزنہ چلے آئے اور یہیں ان کی نشو و نما ہوئی۔

---

(۱) معارف، جلد ۸۳، عدد ۱، ص ۱۲-۱۳۔ (۲) معجم البلدان، ج ۵، ص ۳۶۱ و مآثر الکرام، ص ۱۸۱ و اتحاف النبلاء المتقین، ص ۲۴۳۔ (۳) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷، الفوائد البہیہ، ص ۳۰ و نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۳۷۔

صغانی کے مولد ووطن کے بارے میں مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کے متفقہ بیان کے برخلاف خواجہ نظام الدین اولیا نے ان کا وطن بدایوں بتایا ہے، فرماتے ہیں "او از بداوں افتاد" (۱) اس کی وجہ سے مولانا حکیم عبدالحیٔ صاحب نزہۃ الخواطر کو خیال ہوا کہ یہ صغانی دوسرے شخص ہیں، چنانچہ انہوں نے ان دونوں کا علاحدہ علاحدہ تذکرہ لکھا ہے۔

مولانا عبدالحلیم چشتی نے بجاطور پر مولانا کے اس خیال کی تردید کی ہے، ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ایک نام کے بیک وقت کئی صاحب کمال ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں، لیکن دو ہم عصر مصنف نے ایک ہی موضوع پر کئی کتابیں لکھیں اور نام بھی ایک ہی رکھیں ایسا نہیں ہوا ہے۔

۲۔ کتاب کی اندرونی شہادتوں سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ رضی الدین نام کی کوئی دوسری شخصیت بھی تھی۔

الف: امیر حسن سنجری حضرت نظام الدینؒ سے ناقل ہیں۔

بعد ازاں نسبت حدیث سخن در فضیلت مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار افتاد رحمۃ اللہ علیہ و آنچہ نوشتہ است کہ ایں کتاب حجت است میان من وخدائے۔ (۲)	اس کے بعد حدیث کی مناسبت سے مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار کی فضیلت اور ان کی اس تحریر کے متعلق گفتگو ہونے لگی یہ کہ یہ کتاب میرے اور خداتعالیٰ کے درمیان حجت ہے۔

صغانی نے مشارق الانوار کے مقدمہ میں لکھا ہے:

هذا الكتاب حجة بيني وبين الله	یہ کتاب صحت وثبوت، اتقان ومتانت میں

(۱) فوائد الفواد، ص ۱۰۳، مطبع اودھ لکھنؤ، ۱۸۸۵ء، وص ۱۷۹، مطبوعہ لاہور ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء۔ (۲) فوائد الفواد، ص ۱۰۳۔

تعالیٰ فی الصحة والرصانة والاتقان والمتانة (۱)	میرے اور خدا کے درمیان حجت ہے۔

ب: خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں:

اگر چہ حدیث براو مشکل شدے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام را در خواب دیدے وصحیح کردے۔(۲)	اگر انہیں کوئی حدیث مشکل معلوم ہوتی تھی تو رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھتے اور آپ سے اس کی صحت فرمالیتے۔

اس وصف میں بھی حسن صغانی لاہوری منفرد ہیں، مشارق الانوار میں مندرجہ ذیل حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

عن ابن عمر رضی اللّٰه عنهما ان الفتنة هٰهنا من حيث يطلع قرن الشيطان قال الصغانی مؤلف هذا الكتاب سمعته عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم قاله وهو يشير الی المشرق (۳)	حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا فتنہ وفساد ادھر ہے جہاں سے شیطان کا سینگ یعنی آفتاب نکلتا ہے، اس کو کتاب کا مؤلف صغانی کہتا ہے کہ میں نے خواب میں یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے سنی اور آپؐ پورب کی طرف اشارہ کررہے تھے۔

مولانا عبدالحلیم چشتی نے اس طرح کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں اور آخر میں سید مرتضیٰ زبیدی کی تاج العروس کے حوالہ سے مکہ معظمہ کے کنوئیں ادام کے متعلق یہ نقل کیا ہے:

ادام اسم بئر علی مرحلة من مكة حرسها اللّٰه تعالیٰ علی طريق السرين كما فی العباب قال الصاغانی رايت	ادام براہ سرین مکہ سے ایک منزل کی مسافت پر واقع ایک کنوئیں کا نام ہے جیسا کہ العباب میں مذکور ہے، صغانی کا بیان ہے

(۱) مشارق الانوار، مطبع رشادیہ استنبول ۱۳۲۶ھ ص۴۔ (۲) فوائد الفواد، ص ۱۰۳۔ (۳) مشارق الانوار ص ۲۱۔

النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقول ادام من مکۃ

میں نے رسالت مآب ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپؐ فرما رہے تھے ادام مکہ کے حدود میں داخل ہے۔

۳۔ حسن صغانی علم کے مقابلہ میں ہندوستان میں لقب سے زیادہ مشہور رہے ہیں، اس وجہ سے اس دور کی کتابوں میں حسن کے رضی الدین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، لہذا رضی الدین کو علم کی حیثیت دے کر بدایونی کہنا صحیح نہیں، چنانچہ سرور الصدور میں جو فوائد الفواد کے دور کی تالیفات میں ہے، شیخ فرید الدین ناگوری نے حسن صغانی کا جہاں بھی ذکر کیا ہے ان کے لقب رضی الدین ہی سے یاد کیا ہے۔

۴۔ مشارق الانوار کی نسبت سے نے تو صغانی کو لقب تک سے مستغنی کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ شیخ کمال الدین نے مشارق الانوار کی جو سند خواجہ نظام الدین اولیا کو دی تھی اس میں لقب تک کا ذکر ضروری نہیں خیال کیا بلکہ صرف اتنا ہی لکھنا کافی سمجھا:

وھما یرویانہ عن مؤلفہ

اور مذکورہ بالا ہر دو شیخ اس کتاب (مشارق الانوار) کو اس کے مؤلف سے روایت کرتے ہیں۔

چشتی صاحب آخر میں تحریر فرماتے ہیں ''ہمارے خیال میں یہ دلائل اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ فوائد الفواد کے رضی الدین صغانی دراصل ابو الفضائل رضی الدین حسن صغانی ہی ہیں نہ کہ رضی الدین بدایونی۔'' (۱)

گو مولانا عبدالحیؒ نے رضی الدین بدایونی کو رضی الدین حسن لاہوری سے علاحدہ ایک شخصیت قرار دیا ہے، مگر انہوں نے رضی الدین حسن صغانی کو بدایونی تسلیم نہیں کیا ہے،

(۱) معارف، جلد ۸۳، نمبر ۱، ص ۲۰ تا ۲۷۔

مگر اس دور کے بعض فاضل مؤرخین اور اہل قلم نے قدیم محققین اور مستند مؤرخین کے اقوال کو نظر انداز کر کے محض خواجہ نظام الدینؒ کے ایک مختصر و مبہم جملہ کی بنیاد پر ان کا مولد و وطن لاہور کے بجائے بدایوں قرار دیا ہے، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

''وہ سلطان نظام الدین کی طرح بدایوں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔''(۱)

اس متن کی مزید وضاحت حاشیہ میں اس طرح کی ہے:

''امام صغانی کے حالات اور تصانیف کا مآثر الکرام میں ذکر موجود ہے اور اس میں انہیں غلطی سے لاہوری لکھ دیا ہے لیکن سب سے واضح اور معتبر حالات وہ ہیں جنھیں سلطان نظام کی زبانی صاحب فوائد الفواد نے نقل کیا ہے۔''(۲)

حالانکہ صغانی کے لاہوری لکھنے کی غلطی صرف غلام علی آزاد بلگرامی ہی نے نہیں کی ہے بلکہ ان کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے کی ہے، یہاں تک کہ خود صغانی نے بھی کی ہے جیسا کہ علامہ احمد آفندی نے ان کے حوالہ سے تحریر کیا ہے:

قرأت في نسخة من العباب انه ولد في لوهور احدى مدن الهند الكثيرة الخيرات ويقال ايضا لهاور (۳)	میں نے العباب کے نسخہ میں (خود مصنف کا یہ بیان) پڑھا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے جو ہندوستان (موجودہ پاکستان) کے شہروں میں سے ایک نہایت عمدہ اور آباد شہر ہے، اسے لہاور بھی کہتے ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی ہاشمی صاحب کی بات دہرائی ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار جن کا نام ہندوستان

(۱) تاریخ ہند کتاب دوم، ص ۲۶۲۔ (۲) ایضاً، ص ۲۶۳۔ (۳) الجاسوس علی القاموس مطبعۃ الجوائب قسطنطنیہ ۱۲۹۹ھ، ص ۳۴، بحوالہ معارف، ج ۸۳، نمبر ۱، ص ۱۹۔

کے علمائے حدیث میں سرفہرست آتا ہے، محمد غوری کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے تقریباً دس سال قبل بدایوں میں پیدا ہوئے تھے، وہیں انہوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور وہیں اپنا ابتدائی زمانہ گزارا، جب بدایوں کا یہ عظیم المرتبت فرزند بغداد پہنچا تو بڑے بڑے عالموں کی گردنیں اس کے آگے جھک گئیں۔"(۱)

اس سے زیادہ پرزور انداز میں انہوں نے دوسری جگہ لکھا ہے:

"مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار کے متعلق نظام الدین اولیا کا بیان ہے "او از بداؤں بود۔"(۲)

اس کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں:

"شیخ نظام الدین اولیا کا بیان ان وجوہات کی بنا پر ان سب لوگوں سے زیادہ قابل اعتبار ہے جنہوں نے ان کا وطن لاہور بتایا ہے:

۱۔ شیخ نظام الدین خود بدایوں کے تھے اور بدایوں کے متعلق اچھی معلومات رکھتے تھے۔

۲۔ ان کے استاد مولانا کمال الدین زاہد، مولانا برہان الدین بلخی تلمیذ شیخ رضی الدین حسن صغانی تھے، اس بنا پر استاذ الاستاذ کے متعلق ان کا بیان زیادہ معتبر ہے۔"(۳)

اس دور کے ایک اور فاضل مولوی ضیاء احمد بدایونی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

حضرت محبوب الٰہی کی شہادت اور امیر حسن کی روایت کے بعد علامہ کی وطنیت میں شک اور ان کے بدایونی ہونے میں تامل کرنا ایک ایسا وہم ہے جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔"(۴)

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت، ج ۱، شائع کردہ ادارہ ادبیات دلی، ص ۲۰۰۔ (۲) حیات عبدالحق، ص ۱۲۔

(۳) ایضاً۔ (۴) مباحث و مسائل (مجلس اشاعت ادب دہلی) ص ۲۶۰۔

مولانا عبدالحلیم چشتی نے صغانی پر جو مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا ہے، اس میں شبہ کی بھی مدلل تردید کی گئی ہے جس کو یہاں نقل کر دینا کافی ہوگا، وہ خواجہ صاحب کے بیان "اواز بداؤں بود" کے متعلق فرماتے ہیں:

۱۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں تصحیف ہوگئی ہے، فوائد الفواد کے اصل نسخہ میں غالباً "اواز لاہور بود" تھا، جس کو ناقل نے خط شکست میں ہونے کے باعث "اواز بداؤں بود" پڑھا اور چوں کہ خود نظام الدین اولیا کا وطن بھی بداؤں تھا، اس کو بداؤں سمجھنے میں کوئی تردد نہ ہوا، خط شکست میں لاہور کو بداؤں یا بدایوں سے ایک گونہ تجنیس خطی کی وجہ سے ان میں تصحیف ہو جانا چنداں مستبعد نہیں، کیوں کہ لا کی بد سے اور ہو کی او رسے اور ر کی ن سے مشابہت خط شکست میں ایسی قوی اور اتنی قریب تر ہے کہ اس تصحیف کے قبول کرنے میں انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی، جن لوگوں کی نظر سے مخطوطات کا ذخیرہ گزرا ہے وہ ہماری اس رائے کی تائید کریں گے، یہ ایسی قابل قبول توجیہ ہے کہ اس پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی شہادت بھی غلط قرار نہیں پاتی اور امیر حسن پر بھی خلط ملط اور سہو کا الزام عائد نہیں ہوتا، دراصل امیر حسن پر خلط ملط یا سہو ہونے کا الزام کسی طرح درست نہیں، کیوں کہ یہ کتاب بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک زمانہ تک صوفیا کا دستور العمل رہ چکی ہے۔

۲۔ خلیق صاحب کو حسن صغانی کو بدایونی قرار دینے کے متعلق جو یہ شبہے ہوئے کہ "شیخ نظام الدین اولیا خود بدایوں کے تھے اور بدایوں کے متعلق اچھے معلومات رکھتے تھے" اس سے ہمارے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ لاہور کو بداؤں سمجھنے میں کاتب کو بھی یہی شبہے ہوئے ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ بھی بدایوں کا ہو۔

۳۔ خواجہ نظام الدین اولیا بلاشبہ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے اور بارہ برس تک بدایوں میں رہے، مگر پھر بدایوں سے زیادہ وابستگی نہیں رہی، بدایوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا ان کے موضوع اور مسلک سے خارج تھا، نیز یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی

چاہیے کہ فوائد الفواد تذکرہ یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے، پھر خواجہ نظام الدین صغانی کے بد واسطہ شاگرد ہیں، شمس الدین ذہبی مشہور مؤرخ اور حافظ الحدیث دمیاطی کے شاگرد ہیں جو صغانی کی جملہ مرویات اور مصنفات کے نہایت ثقہ اور نامور راوی ہیں، خود شمس الدین ذہبی عالم اسلام کے فن رجال اور تاریخ کے نادرۂ روزگار ناقد اور وسیع النظر عالم تھے، ان کا بیان ہر لحاظ سے قابل ترجیح تھا اور ہے۔(۱)

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا بیان بھی اس ضمن میں نقل کرنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''شاید فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن سنجری نے سہواً حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات کو کچھ خلط ملط کر دیا ہو اور اگر خلط ملط نہیں ہوا اور اس کو صاحب مشارق الانوار ہی کا ذکر سمجھا جائے تو پھر ''او (یعنی صاحب مشارق) از بداؤں بود'' کے اجمالی بیان سے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بداؤں ہی ان کا مولد تھا۔(۲)
>
> غرض بداؤں کو صغانی کا مولد منشا ماننا صحیح نہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ولادت کی طرح ان کی نشو ونما بھی لاہور میں ہوئی (۳) یہ خیال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ ان کی ولادت ۵۵۵ھ میں ہوئی تھی، لیکن یہ ثابت نہیں ہے۔''

اس تفصیل سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ رضی الدین حسن صغانی اور رضی الدین بدایونی کو دو شخصیتیں قرار دینا درست نہیں۔

۲۔ رضی الدین حسن صغانی کا وطن لاہور کے بجائے بدایوں ماننا غلط ہے۔

(۱) ماہنامہ معارف، جلد ۸۳، نمبر ۱، صفحات ۳۰ تا ۳۸۔ (۲) بزم مملوکیہ، ص ۳۴۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔

۳۔ بدایوں کو صغانی کا منشا سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے۔

اساتذہ: پہلے انہوں نے اپنے والد ماجد محمد سے علم وفن کی تحصیل کی، جو اپنے دور کے متبحر عالم اور لغت وعربیت میں یکتا تھے، مؤرخین اور ارباب سیر کا خیال ہے کہ وہ اپنے والد ہی سے علوم کی تحصیل وتکمیل کر چکے تھے، پھر مزید شوق وجستجوئے علم کی خاطر مختلف جگہوں کے سفر پر روانہ ہوئے اور وہاں کے شیوخ سے احادیث کا سماع اور کسب فیض کیا جن کے نام یہ ہیں:

بغداد: ابو منصور سعید بن محمد رزاز۔

مکہ معظمہ: برہان الدین ابو الفتوح نصر بن ابی الفرج محمد بن علی حصری، ان کی ولادت بغداد میں ہوئی مگر مکہ معظمہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اسی لیے امام الحرم اور امام الحطیم کہلاتے تھے، ۶۱۹ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۴، ص ۷۵ او ۱۷۶)

عدن: قاضی ابو اسحاق ابراہیم بن احمد قرمطی (خطیب عدن)

ہندوستان: قاضی سعد الدین خلف بن محمد کروری حسنا بادی، جو سلطان شمس الدین التمش کے دور کے سب سے بڑے قاضی تھے۔(۱)

نظام محمد بن حسن مرغینانی، نظام الدین عمر بن علی، صاحب ہدایہ کے فرزند، فقہ وفتاوی میں مرجع اور شیخ الاسلام کہلاتے تھے، جواہر الفقہ، الفوادا اور کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔(۲)

تلامذہ: صغانی کے دامن فیض سے جو لوگ وابستہ رہے، ان کے نام یہ ہیں:

شرف الدین ابو محمد عبد المومن دمیاطی، (۳) نظام الدین محمود بن عمر ہروی، محی الدین ابو البقا صالح بن عبد اللہ بن جعفر بن علی بن صالح اسدی کوفی معروف بہ ابن صباغ، شیخ برہان الدین محمود بن ابی الخیر اسعد البلخی (شارح آثار النیرین فی اخبار السمسین) محمد بن احمد بطال (۴)

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۶۲۔ (۲) الفوائد البہیہ، ص ۶۰۔ (۳) تذکرۃ المحدثین جلد دوم میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا جا چکا ہے۔ (۴) صغانی کو ان سے استاذی اور شاگردی دونوں حاصل تھی۔

ابوالربیع سلیمان بن بطال، منصور بن حسن، احمد بن علی سرودی، ابومحمد سعد بن مسعود المنجوی، عزالدین ابن الوزیر علقمی۔

شیخ برہان الدین کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے ''امام صغانی کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود دہلوی تھے، وہ امام مرغینانی صاحب ہدایہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور مشارق الانوار کا درس دینا شروع کیا، ۶۸۷ھ میں وفات پائی اور دہلی میں حوض شمسی کے پورب میں دفن ہوئے، ان کے خاص شاگرد مولانا کمال الدین زاہد دہلوی تھے، انہوں نے مشارق الانوار کی سند پر مولانا برہان الدین محمود سے حاصل کی اور علم حدیث میں یگانۂ روزگار تھے اور دہلی میں اس کا درس دیتے تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے چاہا کہ ان کو اپنا امام مقرر کرے، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیا نے حدیث ان ہی سے پڑھی تھی اور مشارق الانوار کا درس بھی انہیں سے لیا اور اس کو زبانی یاد کیا۔ (مقالات سلیمان، ج ۲ ص ۳۹ و ۳۰، بحوالہ اخبار الاخیار، ص ۶۸)

جامعیت: امام حسن مختلف علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وفنون کثیرہ تحصیل نمودو استعداد عالی بہم رسانده (مآثر الکرام، ج ۱ ص ۱۸۱)

متعدد علوم وفنون کی تحصیل کی اوران میں عالی استعداد بہم پہنچائی۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی ان کی جامعیت کا ان لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں:

ذا مشاركة تامة في العلوم

علوم میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔

(الفوائد البہیہ، ص ۶۹)

لیکن حدیث، فقہ، لغت اور ادب میں زیادہ ممتاز اور صاحب کمالات تھے اور حدیث ولغت میں درجۂ امامت پر فائز تھے، آگے ان سب کی تفصیل قلم بند کی جائے گی۔

فقہ: فقہ میں درک و کمال حاصل تھا، صاحب ہدایہ کے فرزند عمر بن علی سے اس کی تحصیل کی تھی جو نہایت با کمال فقیہ تھے، اس فن میں شہرت و امتیاز کی وجہ سے سلطان قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کا قاضی مقرر کرنا چاہا تھا مگر ان کی طبیعت میں استغنا و بے نیازی تھی اور عہدہ منصب اور جاہ و حشمت سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی، اس لیے انہوں نے منصب قضا کی پیشکش ٹھکرا دی اور وہاں سے غزنہ چلے گئے (۱) فقہ میں ان کی مہارت اور وسعت نظر کا دمیاطی نے بھی اعتراف کیا ہے (۲) اور مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں ''فقیہ کامل بود'' (۳) یعنی فقہ میں صاحب کمال تھے، ابن عماد اور یافعی نے بھی ان کی فقہی بصیرت کا ذکر کیا ہے۔ (۴)

حدیث: حدیث سے خاص اشتغال تھا، ہندوستان کے علمائے حدیث میں سر فہرست ان کا نام آتا ہے، جب یہ بغداد پہنچے تو اس فن کے بڑے بڑے علما کی گردنیں ان کے آگے جھک گئیں، صغانی کی غیر معمولی شہرت و عظمت کا ایک سبب اس فن مین ان کی بالغ نظری اور امتیاز و کمال بھی ہے، مؤرخین اور تذکرہ نگار حدیث میں ان کی بلند پائیگی اور نقد و نظر کے معترف ہیں، دمیاطی کا بیان ہے کہ وہ فن حدیث کے امام تھے، حدیث کے متعلقہ علوم رجال، جرح و تعدیل اور توثیق و تضعیف میں بھی یکتا تھے، حدیث کے علاوہ ان فنون میں بھی ان کی تصنیفات یادگار ہیں، موضوعات حدیث پر انہوں نے دو رسالے تحریر کیے تھے، آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں ''درفقہ و حدیث و علوم دیگر پایہ عالی داشت'' (۵) مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا بیان ہے کہ وہ ابن جوزی اور صاحب سفر السعادہ کی طرح حدیث کے باب میں متشدد تھے (۶) اصحاب سیر نے ان کو محدث کے لقب سے موسوم کیا ہے (۷) مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں ''محدث عامل بود۔'' (۸)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۳۷۔ (۲) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۱۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔
(۴) شذرات الذہب، ج ۵، ص ۲۵۰۔ (۵) مآثر الکرام، ص ۱۸۱۔ (۶) الفوائد البہیہ، ص ۳۰۔ (۷) ایضاً الجواہر المضیہ، ص ۲۰۱، واتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔ (۸) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۸۔

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں ''لغت وحدیث میں امام قرار پائے۔''(۱)

خواجہ نظام الدین نے فوائد الفواد میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، اس سے بھی ان کی حدیث میں بلند پائیگی اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

''جب وہ بغداد سے دہلی پہنچے تو اس زمانہ میں دہلی مختلف فنون کے علمائے کبار اور منتخب لوگوں سے معمور تھی، لیکن حدیث میں کوئی شخص صغانی سے زیادہ ممتاز یا ان کے ہم پایہ نہ تھا، یہاں سے وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، اس سے فارغ ہو کر پھر بغداد تشریف لائے، اس وقت بغداد میں ایک عالم تھے جو بڑے بلند پایہ محدث تھے، انہیں لوگ ابن زہری کہتے تھے، ان کے لیے ایک منبر تیار کیا گیا تھا جس پر بیٹھ کر وہ حدیث کا درس دیتے تھے، جس میں لوگ درجہ بدرجہ شریک ہوتے تھے، یعنی لائق اور ذی استعداد لوگ آگے ان کے سامنے ہوتے، اس کے بعد ان لوگوں سے کمتر لوگوں کی صف ہوتی، اسی طرح اس کے بعد اور لوگوں کا حلقہ ہوتا۔

اسی طور پر وہ حدیث بیان کرتے اور لوگ اسے ضبط وتحریر میں لاتے، ایک روز مولانا رضی الدین بھی اس مجلس میں حاضر ہوئے اور بعید تر حلقہ میں نشست فرمائی، ابن زہری ایک حدیث بیان کر رہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ مؤذن جس طرح جو الفاظ کہے سننے والے کو بھی اسی طرح وہی الفاظ کہنے چاہیے، شیخ نے حدیث کی ابتدا (اذا سکب المؤذن) کے لفظ سے کی، سکوب کے اصل معنی اوپر سے پانی گرانا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب مؤذن کی آواز تمہارے کانوں میں پڑے تو تم لوگوں کو بھی اسی طرح کہنا چاہیے جیسے وہ کہہ رہا ہے، جب ابن زہری نے یہ حدیث بیان کی تو مولانا رضی الدین نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے آہستہ سے دوسرے لوگوں سے کہا کہ یہ اذا سکت المؤذن ہے، یعنی جب مؤذن اپنا لفظ کہہ کر

(۱) مقالات سلیمان، ج۲، ص۴۔

خاموش ہو جائے تو اس کی موافقت کرنی چاہیے، جس شخص سے انہوں نے یہ بات کہی تھی اس نے دوسرے سے کہا، دوسرے نے تیسرے سے کہا، شدہ شدہ یہ بات ابن زہری تک پہنچ گئی، انہوں نے کہا یہ بات کس نے کہی ہے، صغانی نے کہا میں نے کہی ہے، ابن زہری نے فرمایا کہ دونوں باتوں کا مفہوم نکلتا ہے، اس لیے کتاب سے مراجعت کرنی چاہیے، کتاب دیکھی گئی تو اس میں دونوں توجیہات ملیں مگر واذا سکت کو زیادہ صحیح بتایا تھا، یہ خبر جب خلیفۂ وقت کو ہوئی تو اس نے صغانی کو دربار میں طلب کیا اور ان کا بڑا اعزاز و اکرام کیا۔ (فوائد الفواد، ص ۱۰۳ تا ۱۰۵)

لغت وادب: لغت وادب میں وہ خصوصیت سے بہت ممتاز تھے، عالم اسلام میں امام لغت کی حیثیت سے زیادہ روشناس اور متعارف ہوئے، اپنے زمانہ میں لغت کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے، دمیاطی کا بیان ہے کہ وہ لغت میں امام تھے، سیوطی لکھتے ہیں کہ ''لغت کی معرفت ان پر تمام ہوگئی'' اس میں انہوں نے عظیم الشان کتابیں یادگار چھوڑیں، وہ لغت کا پرچم سربلند کیے ہوئے تھے اور اپنے شاگردوں کو مشہور امام لغت ابوعبید قاسم بن سلام کی غریب یاد کرنے کی تلقین فرماتے تھے اور جو شاگرد اسے یاد کر لیتا اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک ہزار دینار انعام دیا کرتے تھے۔(۱)

وہ عربی زبان کے مستند ادیب بھی تھے اور شعر بھی موزوں کر لیتے تھے، ان کی نثر و نظم مشکل الفاظ پر مشتمل ہونے کے باوجود سلیس اور تکلف و تصنع سے بری ہوتی تھی، درحقیقت ان کے نہاں خانہ میں الفاظ ولغات کا وسیع ذخیرہ تھا، جسے وہ روانی اور بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے، اس لیے ان کے قلم سے نکلنے والی تحریروں اور اشعار میں خوبی اور دلکشی ہوتی تھی، اس کا اندازہ مشارق الانوار کے دیباچہ سے بھی ہوتا ہے، علامہ سیوطی نے ان کی ایک مناجات کے چند ابیات نقل کیے ہیں جس کا قافیہ مرتجی ہے، اس میں نظم کے ہر شعر میں انہوں نے اس

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ وشذرات الذہب، ج ۵، ص ۲۵۰۔

لفظ کو جداگانہ معنوں میں استعمال کیا ہے، لغت وعربیت کی تحصیل اور محاورات عرب پر عبور حاصل کرنے کے لیے انھوں نے برسوں نجد میں قیام کیا۔

شعر و سخن: امام صغانی کو شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا، وہ خود بھی شعر موزوں کرتے تھے اور برجستہ اشعار بھی کہتے تھے، ان کے اشعار میں بڑی روانی اور آمد بھی ہوتی تھی اور وہ صنائع و بدائع اور شعری محاسن سے بھی پر ہوتے تھے، اوپر ان کی مناجات کا ذکر آ چکا ہے، جو یہ ہے:

يا ارحم الطفل الرضيع المزعج　　يا فاتح الباب المنيع المرتج

(اے طفل شیر خوار وزار پر رحم فرمانے والے! اے دشوار اور بند دروازہ کھولنے والے!)

ان كان غيری مبلسا مستيئسا　　فانا الفقير المستكين المرتجي

(اگر میرے سوا کوئی نادار، شکستہ دل اور مایوس ہو سکتا ہے تو میں بھی فقیر و مسکین اور خوف زدہ ہوں۔)

او كان غيری آمنا في سربد　　فان المتيح المستجير المرتجي

(اگر میرے سوا کوئی ایسا ہو جس کی پناہ اپنے سوا کہیں نہیں تو میں بھی ایسا ہی بے نصیب پناہ جو اور امیدوار ہوں۔)

استاء ت الراحات عني وانتاء ت　　يا من يقرب كل ناء مرتجي

(راحتیں مجھ سے دور ہو گئی ہیں، اے وہ ذات جو تمام دور اور مشکل (مقاصد) کو قریب کرتی ہے۔)

انت الذی فيه شفاء السقم لا　　قصب الذريني ولا دواء المرتجي (۱)

(خداوندا! تو ہی ان بیماروں کو شفا بخشتا ہے جن کا علاج نہ نیشکر کر سکتا ہے اور نہ کوئی دوسری مفید دوا۔)

انھوں نے ایک طویل قصیدہ میں اپنے ناموافق حالات اور زمانے کی ناسازگاری وغیرہ کا ذکر کیا ہے، یہ پورا قصیدہ صنعت تجنیس میں اور منفرد نوعیت کا ہے، اس کے چند اشعار

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ و ۲۲۸۔

ملاحظہ ہوں:

انسانی الدھر اعطانی واوطانی ۔۔۔ وحطنی ووھاد الخسف اوطانی

(زمانہ نے میرے وطن اور میری قیام گاہ کو میرے دل سے محو کر دیا ہے اور مجھے فقر و ندامت میں گرا کر دھنسا دیا۔)

وکنت افنیت عمری فی رفاھیۃ ۔۔۔ فغطنی ولذیذ العیش انسانی

(حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و فراغت میں گزاری تھی مگر پھر زمانہ نے مجھے اذیت میں ڈال دیا اور خوش حالی کی زندگی سے غافل کر دیا۔)

وکان دوحۃ عیشی غضۃ زمنا ۔۔۔ غضیرۃ ذات اغصان وافنان

(میرے عیش و عشرت کا درخت جو برگ و بار والا تھا مدتوں سرسبز و شاداب رہا۔)

حتی اذا ماجنی الدھر الملم فنا ۔۔۔ قدی و قدادیم العمر افنانی

(یہاں تک کہ جب مصائب پہنچانے والے زمانہ کی زیادتی شروع ہوئی تو میرا قد وقامت فنا ہو گیا اور عمر کے بندھن نے مجھے ہلاک کر دیا۔)

فقلت یا دھر سالمنی مسالمۃ ۔۔۔ فانی عمری ثم صاغانی

(میں نے زمانہ سے کہا میرے ساتھ صلح کر لے، کیوں کہ میں حضرت عمرؓ کی اولاد ہوں اور میرا وطن صغان ہے۔)

فانصاع ینقاد اذعانا وسالمنی ۔۔۔ ومد ضبعی وناغانی وصاغانی

(چنانچہ وہ میرا مطیع ہو گیا اور اس نے مجھ سے صلح کر لی اور میرے بازو پھیلا دیے اور مجھ سے قریب ہوا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے، مگر افسوس کہ ان کا کوئی مجموعہ یادگار نہیں اور کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا، صرف متفرق اشعار تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

فضل وکمال: صغانی اپنے دور کے بہت ممتاز علما میں تھے اور علم وفن اور ادب ولغت میں امامت کے درجہ پر فائز تھے (۱) آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں کہ ''عالم ربانی ودانائے غوامض معانی بود'' (۲) صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ ان کی تصنیفات بہت مشہور و مقبول ہوئیں اور ان کے علم وکمال کے سامنے علمائے زمانہ سرنگوں ہو گئے (۳) عراق وحجاز کے علما بھی ان کے علم وفضل کا لوہا مانتے تھے۔

ہندوستان میں صغانی کی اہمیت واولیت: ہندوستانی علما میں امام صغانی پہلے محدث ہیں جن کی بدولت ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت واشاعت کی داغ بیل پڑی اور انہوں نے اس فن میں باقاعدہ تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا، مولانا سید سلیمان ندوی کے مندرجہ ذیل بیان سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔

''شیخ اسماعیل کے بعد یہاں ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا گھپ چھایا رہتا ہے، بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی .... الغرض امام صاغانی غزنوی لاہوری تنہا محدث ہیں اور مشارق الانوار اس دیار کی تنہا خدمت حدیث ہے جو اس عرصہ دراز میں انجام کو پہنچی۔'' (۴)

گو امام صغانی کا قیام ہندوستان میں کم رہا، اس لیے باہر کی طرح ہندوستان میں ان کا فیض واثر بھی کم رہا، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی ...... چوں کہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب وعراق سے رہا، اس لیے ان کا اثر اس ملک کے علما پر بہت کم پڑا اور اگر پڑا بھی تو صرف اسی قدر کہ ان کو اپنے نصاب تعلیم کے لیے حدیث میں ایک

---

(۱) الجواہر المضیہ، ص ۲۰۱۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۳۸۔ (۴) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴ و ۵۔

اپنے ہم وطن کی کتاب مل گئی اور وہ بدستور اپنے علم دانش مندی وعلم دانائی میں مصروف رہے، منطق وفلسفہ اور علم کلام کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہ بھی عقلی طریق سے، یہی سبب ہے کہ اصول فقہ جیسا ضروری علم بھی معقولات اور کلامیات کا ایک ضمیمہ ہوکر رہ گیا۔(۱)

اس کے باوجود صغانی کی ہندوستان میں اولیت واہمیت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔

تدین: علم وفضل کی طرح زہد واتقا، دیانت وامانت اور خیر وصلاح کے بھی جامع تھے، حج بیت اللہ سے کئی بار مشرف ہوئے اور برسوں خانۂ کعبہ کے جوار میں قیام پذیر رہے (۲) اسی لیے اپنے کو ملتجی الی حرم اللہ کہتے تھے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں ''مولانا حسن صغانی لاہوری ایسے فرشتہ خصال بشر تھے کہ گویا ان کی طینت عناصر فلکی سے ممزوج، عالم تھے، ربانی اور صاحب کمالات تھے، نورانی۔ (معارف مئی ۴۷ء، ص ۳۷۹، بحوالہ المرجان)

متانت: بہت خاموش، متین، سنجیدہ اور باوقار شخص تھے، فضول اور بیکار باتیں نہیں کرتے تھے (۳) یاوہ گوئی سے سخت نفرت کرتے تھے، جو بات کہتے صحیح کہتے۔

اخلاق وعادات: طبیعت میں بڑی شرافت اور مزاج میں انکسار اور حلم تھا، ان کے اخلاق وعادات نہایت بلند تھے۔

رحلت وسفر: امام صغانی کی پیدائش لاہور اور نشو ونما غزنہ میں ہوئی تھی، مگر انہوں نے عراق وعرب کو اپنا اصلی وطن بنالیا تھا، اس لیے ان کا زیادہ تر قیام ہندوستان سے باہر ہی رہا، اوپر مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ بیان گزر چکا ہے۔

ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی۔(۴)

---

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴ و ۵۔ (۲) شذرات الذھب، ج ۵، ص ۲۵۰ وبغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷۔

(۳) نزہۃ الخواطر، جلد ا، ص ۱۳۸۔ (۴) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴۔

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

لیکن چوں کہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب و عراق سے رہا، اس لیے ان کا اثر اس ملک (ہندوستان) کے علما پر بہت کم پڑا۔(۱)

انہیں سفر و سیاحت کا بھی بڑا شوق تھا اور چونکہ ان میں علم وفن اور تحقیق وجستجو کا فطری داعیہ بھی تھا، اس لیے وہ اکثر سفر و سیاحت میں رہتے تھے۔

۲۸ برس کی عمر میں ۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء یا ۱۲۱۹ء) میں بغداد کی کشش ان کو وہاں لے گئی، گو اس زمانہ میں عباسیوں کے عروج و اقبال کا ستارہ ماند پڑ گیا تھا اور تاتاریوں کے سیلاب نے عالم اسلام کو تہ و بالا کر دیا تھا، مگر بغداد ان کی زد سے محفوظ تھا اور اس کی قدیم شان وشوکت باقی تھی، امام صغانی کئی برس تک یہاں مقیم رہ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، مکہ معظمہ بھی پہنچے اور حج و زیارت کعبہ سے مشرف ہونے کے علاوہ برسوں بیت اللہ کے جوار میں قیام کی سعادت حاصل کی، مؤرخین نے عدن و یمن جانے کی صراحت بھی کی ہے(۲) عرب و عراق کے قیام کے زمانہ میں ہندوستان آنے کا اتفاق بھی ہوا، ان کا خود بیان ہے کہ میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق و مغرب میں چالیس برس سے زیادہ سیر و سیاحت کرتا رہا، اس کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

سفارت اور دوسرے عہدے: امام صغانی مختلف عہدوں پر فائز رہے، سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک نے ان کو لاہور میں عہدۂ قضا پیش کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور غزنہ چلے گئے، ۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء میں بغداد میں احتساب کا محکمہ انہیں سپرد کیا گیا جس کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں، اس کے ساتھ ہی درس و تدریس کی خدمت پر بھی مامور رہے، خلیفہ ناصر لدین اللہ نے آپ سے حدیث پڑھی تھی اور آپ کو خلعت سے بھی

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۵۔ (۲) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۱، اتحاف النبلا، ص ۲۴۳، مآثر الکرام، جلد ۱، ص ۱۸۱۔

سرفراز کیا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، خلیفہ نے ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں آپ کو سفیر کی حیثیت سے ہندوستان بھیجا، یہ سلطان شمس الدین التمش کا دور تھا، ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء میں بغداد واپس آئے لیکن اسی سال شعبان میں دوبارہ عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے سفیر بنا کر انہیں ہندوستان بھیجا، وہاں ۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء میں پہنچے، اس وقت رضیہ بنت التمش فرمانروائے ہند تھی، اس دفعہ بھی ان کے درس سے تشنگان علوم سیراب ہوئے مگر اس باران کی طبیعت ہندوستان میں نہیں لگی اور وہ برابر واپسی کے لیے فکر مند رہے اور جلد ہی بغداد آگئے۔ (۱)

فوائد الفواد میں ان کے کول (علی گڑھ) جانے اور نائب مشرف (سررشتہ دار) ہونے کا ذکر ہے۔ (۲)

صغانی کے امراو سلاطین سے اچھے تعلقات تھے خصوصاً خلیفہ مستنصر باللہ اور اس کے علم وادب نواز وزیر ابن العلقمی سے ان کو بڑا تعلق تھا، یہ دونوں ان کا بڑا اعزاز کرتے اور خوب انعام واکرام سے بھی نوازتے تھے، تاکہ وہ دلجمعی اور جمعیت خاطر کے ساتھ تصنیف وتالیف کا کام انجام دیں، انہوں نے اپنی اکثر کتابیں ابن العلقمی ہی کے نام سے معنون کی تھیں۔ (۳)

وفات: ۷۳ برس کی عمر میں جمعہ کے روز ۱۹ شعبان ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء کو بغداد میں وفات ہوئی، ان کا مکان بغداد میں حریم الطاہری میں واقع تھا، پہلے وہیں دفن کیے گئے مگر پھر ان کی وصیت کے مطابق نعش مکہ معظمہ لائی گئی اور وہیں دفن کی گئی۔ (۴)

اولاد: مصنفین اور تذکرہ نگاروں نے صغانی کی اولاد کا تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن ان کے ایک صاحبزادے محمد کا نام اس حیثیت سے معلوم ہوا کہ مشارق الانوار کا جو قلمی نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں ہے اس کی محمد نے اپنے والد حسن کے سامنے قرأت کی تھی (۵) اشعار میں

---

(۱) الجواہر المضیۃ، جلد ۱، ص ۲۰۲ وشذرات الذھب، جلد ۵، ص ۲۵۰ ونزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۳۷-۱۳۸۔ (۲) فوائد الفواد، ص ۱۰۳۔ (۳) مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ، تشرین ۱۹۲۵ء، ج ۱۵، نمبر ۱۱، ص ۵۲۴۔ (۴) مآثر الکرام، جلد ۱، ص ۱۸۱ واتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔ (۵) قصر علم (فہرست کتب خانہ ٹونک) ص ۳۰۱۔

بھی کہیں کہیں انہوں نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی ہے، مثلاً ایک شعر میں انہیں یہ تلقین کرتے ہیں:

حاکوا اباکم واحکموا عقدۃ الادب ترقوا مراقی یھواھا ذو الرتب

ترجمہ: ''اخلاق و عادات میں اپنے والد کے مشابہ بنو اور ادب کی گرہ مضبوطی سے باندھ لو، (فنون ادب میں کمال حاصل کرو) تو تم لوگ بلندی کے ایسے زینوں پر چڑھ جاؤ گے جن پر پہنچنے کے لیے بڑے بڑے صاحبان قدر و منزلت کے خواہاں ہوتے ہیں۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے ان کے کئی لڑکے تھے۔

تصنیفات: امام صغانی ممتاز اور بلند پایہ محدث تھے، ان کی تصنیفات کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے عمدہ اور ان کے فضل و کمال کی شاہد ہیں، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وتصانیف غرا پرداخت (۱) شاندار اور عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم ان کی تصنیفات کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

دو رائے ایں تصانیف دیگر است کہ دلیل برکمال علم وے است۔ (۲) ان کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات بھی ہیں جو ان کے کمال علم کا ثبوت ہیں۔

یافعی کا بیان ہے کہ ''لغت میں بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑیں'' (۳) ان کی تصنیفات کی تعداد ۳۲ سے متجاوز تھی لیکن ان میں ایک ثلث کے بقدر بالکل نایاب، صغانی کی سب سے اہم اور عظیم الشان کتاب مشارق الانوار ہے جس کا آخر میں تذکرہ آئے گا، باقی کتابوں کے نام حروف تہجی کے مطابق درج ذیل ہیں اور بعض کا مختصر تعارف بھی کرایا جاتا ہے۔

۱۔ اسماء الاسد: اس موضوع پر مختلف اصحاب علم و ادب نے کتابیں لکھی ہیں، ان کی فہرست میں امام صغانی کا نام بھی شامل ہے۔ (۴)

۲۔ اسماء الذئب: یہ خود ایک مستقل رسالہ ہے (۵) مگر بعض مصنفین کے بیان سے

(۱) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱۔ (۲) اتحاف النبلاء، ص ۳۴۳۔ (۳) مرآۃ الجنان، ج ۴، ص ۱۲۱۔ (۴) کشف الظنون، ج ۱، ص ۹۷۔ (۵) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷۔

پتہ چلتا ہے کہ یہ اسماء الاسد ہی کا ایک جز ہے۔(۱)

۳۔ اسماء الفارہ: سیوطی نے اس کا نام اسماء الغادہ لکھا ہے (۲) ممکن ہے یہ تصحیف یا کتابت کی غلطی ہو۔

۴۔ بغیۃ الصدیان: بعض نے اس نام نقعۃ الصدیان لکھا ہے(۳) جو غالباً صحیح ہے۔

۵۔ التجرید وجمل الصغانی، ۶۔ تعزیر بیتی الحریری: مولوی سید حسن برنی نے اپنے مضمون میں دونوں کا ذکر کیا ہے، مؤخر الذکر کا بعض اور مصنفین نے بھی تذکرہ کیا ہے۔ (۴)

۷۔ دار السحابہ فی وفیات الصحابہ: اس میں تقریباً آٹھ سو صحابہؓ کے مقامات رحلت اور محل وفات کا ذکر ہے، اسی لیے اس کا نام دار السحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ بھی لکھا گیا ہے (ماہنامہ برہان اگست ۵۳ء، ص ۸۵) صحابۂ کرامؓ کے نام حروف تہجی کے مطابق درج ہیں، صحابہؓ کے حالات وتراجم میں علامہ ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) کی الاستیعاب کے علاوہ علامہ ابن اثیر جزری (م ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء) کی اسد الغابہ اور حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۸ء) کی الاصابہ نہایت مشہور ہیں، صغانی کی کتاب چاہے ان کتابوں کے ہم پایہ نہ ہو تاہم وہ ابن اثیر کے ہم عصر اور حافظ ابن حجر سے زماناً متقدم ہیں، اس لیے ان کی کتاب کی اہمیت مسلم ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جرجی زیدان نے اسے ۶۴ صفحے کا بتایا ہے (۵) مگر بعض لوگوں کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک مبسوط کتاب تھی جس میں صغانی نے اپنی ایک مختصر کتاب اور اس کے ذیل میں جس میں صحابۂ کرامؓ کے مقام وفات کو بیان کیا تھا، بترتیب حروف تہجی یکجا کر دیا تھا (۶) اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر، مکتبہ شیخ الاسلام اور برلن میں موجود ہیں۔

---

(۱) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۲، کشف الظنون، ج ۱، ص ۹۷ ونزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۴۱۔ (۲) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷۔ (۳) ایضاً ومفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸۔ (۴) معارف جولائی، ۲۹ء، ص ۱۲۔ (۵) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جلد ۳، ص ۴۹۔ (۶) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔

۸۔الدر الملتقط فی تبیین الغلط :اس کتاب میں صغانی نے ''الشہاب'' و''النجم'' کی موضوع حدیثوں کو بیان کیا تھا۔(۱)

۹۔شرح ابیات المفصل: علامہ سیوطی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے(۲) معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مشہور معتزلی مفسر علامہ جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ/ ۱۱۴۳ء) کی فن نحو کی مشہور کتاب المفصل میں وارد اشعار کی شرح کی ہے۔

۱۰۔شرح البخاری: یہ امام بخاریؒ کی صحیح کی مختصر شرح ہے جو ایک جلد میں تھی۔

۱۱۔شرح درالسحابہ: معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنی کتاب درالسحابہ کی شرح لکھی ہے، آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں اس کا ذکر کیا ہے۔(معارف، جنوری ۴۸ء، ص ۶۱)

۱۲۔شرح القلادۃ السمطیہ فی توشیح الدریدیہ: بعض مصنفین نے اس کا نام صرف توشیح الدریدیہ ہی لکھا ہے۔(۳)

۱۳۔الشمس المنیرۃ من الصحاح الماثورہ: فن حدیث میں ہے، آزاد بلگرامی نے اسے صحیح بخاری کی شرح بتایا ہے۔(۴)

۱۴۔کتاب الشوارد: لغت کی اہم کتاب ہے، تمام ارباب سیر وفہارس نے اس کا ذکر کیا ہے(۵) بعض لوگوں نے اس کا نام الشوارد فی اللغات (۶) اور بعض نے الشوارد فی اللغۃ لکھا ہے۔(معارف مئی ۴۷ء، ص ۳۸۰)

۱۵۔العباب الزاخر: یہ بھی لغت میں مہتم بالشان کتاب تھی، سید حسن برنی نے اس کا نام العباب الزاخر واللباب الفاخر لکھا ہے اور اس کو صغانی کی تصانیف لغت میں سب سے زیادہ

---

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ واعلام جلد ۱، ص ۲۳۹۔(۲) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔(۳) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ ومفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸۔(۴) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱۔(۵) الجواہر المضیہ، جلد ۱، ص ۲۰۲، بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷، کشف الظنون، جلد ۲، ص ۷۱، مفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸، الاعلام، ج ۱، ص ۲۳۹، مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱، الفوائد البہیہ، ص ۲۹، اتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔(۶) معارف جولائی ۲۹ء۔

ممتاز اور قیمتی کتاب بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''عربی لغت کے متعلق متقدمین ائمہ لغت نے بڑے بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیے جو فی الواقع حیرت انگیز ہیں، امام صغانی کی یہ کتاب ان مہتم بالشان کارناموں میں بھی امتیاز خاص رکھتی ہے، قاموس کے مصنف امام مجد الدین فیروز آبادی (۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء۔ ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء) نے جو عربی لغت کے بہت بڑے امام ہیں، عربی لغات میں ایک ضخیم کتاب ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی جو زیادہ تر امام صغانی کی العباب اور اندلس کے نابینا علامہ لغت امام ابن سید کی کتاب المحکم پر مبنی تھی، اس کتاب کا نام فیروز آبادی نے ''اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم والعباب'' رکھا اور اسی کا خلاصہ دو جلدوں میں ''قاموس'' میں کر دیا تھا، کتاب اللامع موجودہ کتاب قاموس سے ضخامت میں تیس گنا زیادہ تھی، فیروز آبادی نے امام صغانی اور ابن سیدہ کی کتاب المحکم کے متعلق قاموس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''فن لغت میں یہ دونوں کتابیں بہتر ہیں لیکن افسوس کہ فیروز آبادی کی اللامع اور امام صغانی کی العباب متقدمین کی بعض دیگر نفیس و بیش بہا تصانیف کی طرح ناپید ہیں، کاش آج العباب بھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتی تاکہ ہم دنیا کو بتا سکتے کہ ہندوستان کے اس علامہ متبحر نے عربی لغت میں کیسے نمایاں کارنامے سرانجام دیے تھے۔'' (معارف جولائی ۲۹ء، ص ۹)

تاج الدین ابن مکتوم احمد بن عبدالقادر حنفی (۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء) نے اسے اور ابن سیدہ کی محکم کو یکجا کر دیا تھا، یہ کتاب خلیفہ مستنصر کے امیر ابن العلقمی کی فرمائش پر مرتب کرنی شروع کی تھی اور اس میں اصحاب معجم کے ترجمے بھی لکھے تھے (۲) صحاح جوہری یا قاموس

(۱) معارف جولائی، ۲۹ء۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۰۵ و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۴۹۔

کے انداز پر اسے حروف معجم کے اواخر پر مرتب کیا گیا تھا مگر صغانی اسے مکمل نہیں کر سکے تھے، وہ بیس جلدیں لکھ چکے تھے اور حرف میم تک پہنچے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا، آخری لفظ جو اس میں درج ہے وہ ''کم'' تھا، کسی کا شعر ہے ؎

ان الصغانی الذی حاز العلوم والحکم

کان قصاری امرہ ان انتہی الی بکم (۱)

ترجمہ: بیشک امام صغانی علوم وحکم پر حاوی تھے، مگر ان کے کام کی انتہا لفظ کم (کتنا) پر ہوئی۔

العباب کے غیر مکمل رہ جانے کا اکثر لوگوں نے تذکرہ کیا ہے، مگر صاحب قاموس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مکمل ہو گئی تھی، ممکن ہے اس کے اجزا بعد میں تلف ہو گئے ہوں اور حاجی خلیفہ کی نظر سے نامکمل کتاب گزری ہو، صغانی نے اسے لغت کی مشہور کتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا اور اپنے اقوال کی تائید وصحت کے لیے قرآن وحدیث سے اس میں ثبوت وشواہد بھی پیش کیے تھے، العباب کا ایک قلمی نسخہ چھ جلدوں پر مشتمل مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے، یہ ۶۴۲ھ/۱۲۲۴ء کا لکھا ہوا ہے (۲) گویا مصنف کی زندگی ہی کا ہے، پاکستان کے ڈاکٹر پیر محمد حسن کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ (۳)

۱۶۔ فرائض الصغانی (۴): معلوم ہوتا ہے یہ رسالہ علم الفرائض میں تھا۔

۱۷۔ فعال ۱۸۔ فعلان ۱۹۔ فعول: یہ تینوں ایک ہی طرح کے رسالے ہیں، غالباً ان میں تینوں کے ہم وزن الفاظ لکھ کر ان کی تشریح کی ہوگی، اول الذکر کے متعلق حال کے بعض اہل قلم نے لکھا ہے کہ اس میں صغانی نے اس کے ہم وزن ۱۳۰ الفاظ جمع کیے تھے۔ (۵)

---

(۱) بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ وکشف الظنون، ج۲، ص ۱۰۵۔ (۲) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج۳، ص ۳۹۔ (۳) کتاب خانہ ہائی پاکستان، جلد یکم، ص ۶۷۔ (۴) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔ (۵) الجواہر المضیۃ، ص ۲۰۲، بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷ ومجلہ المجمع العلمی العربی دمشق، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۲۵ء۔

۲۰۔ کتاب الاثر ۲۱۔ کتاب اسماء الدین ۲۲۔ کتاب اسماء السعادۃ ۲۳۔ کتاب الاصفار: اول الذکر تینوں کا نام صاحب مفتاح (۱) السعادۃ نے اور آخر الذکر کا صاحب الجواہر المضیہ (۲) نے لکھا ہے، سید حسن برنی نے الاصفار کے بجائے الاصفاد لکھا ہے (۳)

۲۴۔ کتاب الاضداد: یہ ایک صغیر الحجم لیکن کثیر المنافع رسالہ ہے جو ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں عربی کے ۳۳۶ لغات اضداد کے معانی بیان کیے گئے ہیں، یعنی وہ الفاظ جمع کیے ہیں جن کو دو مختلف معنی آتے ہیں، جیسے الابض کا لفظ لکھ کر اس کے یہ معنی بتاتے ہیں السکون والحرکۃ، اسی طرح الارز کے معنی لکھا ہے القوۃ والضعف، صغانی کا خود بیان ہے کہ محمد بن المستنیر قطرب (م ۲۰۶ھ/۸۲۱ء) کے دور سے خلیفہ عباسی مستنصر کے زمانہ تک کے مختلف مصنفین جو لغات اضداد تحریر کیے تھے ان سب کو میں نے اس کتاب میں بہ ترتیب حروف ہجا نہایت جستجو کے بعد جمع کر دیا ہے، آسٹریا کے استاذ کلیۃ الشبروک ڈاکٹر ہفنر کی سعی سے ۱۹۱۳ء میں بیروت سے یہ رسالہ چھپ گیا ہے، اس کے ساتھ ابن السکیت کی کتاب الاضداد بھی چھپی ہے (۴) اس کا قلمی نسخہ برلن میں موجود ہے۔ (۵)

شیخ محمد ابن ابی بکر بن عبدالقادر رازی متوفی ۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء نے ۹ صفحے میں کتاب الاضداد کا مختصر تیار کیا تھا، اس کا قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے۔ (۶)

۲۵۔ کتاب الافتعال (۷): غالباً صرف واشتقاق یا لغت کی کتاب ہے۔

۲۶۔ کتاب الافعال (۸)۔

۲۷۔ کتاب الانفال: یہ کتاب حال میں ڈاکٹر احمد خاں نے ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد سے ایڈٹ کر کے شائع کی ہے مگر ہماری نظر سے نہیں گزری، ممکن ہے یہ

---

(۱) مفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸۔ (۲) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۲۔ (۳) معارف جولائی ۲۱ء، ص ۱۲۔
(۴) معجم المطبوعات، ج ۲، کالم ۱۲۰۹۔ (۵) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۵۰۔ (۶) کتب خانہ عربیہ رامپور، جلد اول، ص ۵۱۷۔ (۷) کشف الظنون، ج ۲، ص ۲۶۳۔ (۸) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۲۔

اور اول الذکر دونوں کتابیں ایک ہی ہوں۔

۲۸۔ کتاب التکملہ : اس کا پورا نام تکملہ والذیل والصلہ ہے، یہ لغت کی کتاب ہے، صغانی کا بیان ہے کہ غریب القرآن، غریب الحدیث، لغت، نحو، اخبار، ایام و اشعارِ عرب نیز حیوانات اور اسلحہ وغیرہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے تقریباً ایک ہزار کتابوں کی مدد سے میں نے اسے مرتب کیا ہے، یہ دراصل جوہری کی صحاح کا ذیل و تکملہ ہے، اس میں اس کی غلطیوں کی تصحیح کے علاوہ مافات کو بھی شامل کر لیا ہے، آخر میں کتاب کے مراجع و مصادر کی فہرست دی ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر کوپریلی اور مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔(۱)

۲۹۔ کتاب التراکیب۔(۲)

۳۰۔ کتاب درجات العلم والعلما۔(۳)

۳۱۔ کتاب زبدۃ المناسک(۴): سید حسن برنی نے مناسک الصغانی نام لکھا ہے۔(۵)

۳۲۔ کتاب الضعفا: فن رجال کی کتاب ہے، اس میں ضعیف و متروک راویوں کا تذکرہ ہے۔(۶)

۳۳۔ کتاب العروض۔(۷)

۳۴۔ کتاب عقلۃ العجلان۔(۸)

۳۵۔ کتاب یفعول: اس میں امام صغانی نے اس وزن کے تقریباً ۴۰ر الفاظ جمع

---

(۱) کشف الظنون، ج ۲، ص ۷۵، الاعلام، ج ۱، ص ۲۳۹، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۵۰، تذکرۃ النوادر، ص ۱۲۰۔ (۲) الجواہر المضیہ، ج ۱، ص ۲۰۲، بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷، مفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸، معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۲۔ (۳) اتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔ (۴) ایضاً۔ (۵) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔ (۶) ایضاً والجواہر، ج ۱، ص ۲۰۲ و کشف الظنون، ج ۲، ص ۸۴۔ (۷) ایضاً و بغیۃ الوعاۃ، ص ۲۲۷۔ (۸) اتحاف النبلا، ص ۲۴۳۔

کیے ہیں، اس کی ترتیب حروف معجم پر ہے، مصنف نے اس میں لفظوں کی تشریح بھی کی ہے اور عربی نظم ونثر میں ان کے استعمالات کی نشاندہی بھی کی ہے، خلدونیہ کے تاریخ اسلام اور تونس کے مدرسہ علیا کے عربی زبان وادب کے استاد حسن حسنی عبدالوہاب نے اسے تصحیح و مقابلہ کے بعد اپنے مفید محققانہ حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع کیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں مصنف کے حالات اور شاعری پر بحث وگفتگو کے علاوہ ان کی کتابوں کے نام لکھے ہیں اور ہر کتاب کے موضوع کی نشان دہی بھی کی ہے، انہوں نے آخر میں ایک استدراک بھی لکھا ہے، اس میں یفعول کے وزن پر مزید ۱۴/الفاظ نقل کر کے ان کی تشریح کی ہے، امام صغانی نے ان لفظوں کو چھوڑ دیا تھا، یہ کتاب مطبعۃ العرب تونس سے سے شائع ہوئی ہے۔(۱)

۳۶۔کشف الحجاب عن احادیث الشہاب: اس کا نام تخریج الاحادیث للقضاعی بھی ہے، اس میں ابوعبداللہ محمد بن سلامہ قضاعی (م ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء) کی کتاب شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والآداب کو از سر نو مدون کیا ہے اور مشارق الانوار کی طرح اسے بھی ابواب پر مرتب کیا ہے اور صحیح، ضعیف اور مرسل حدیثوں کی تصریح علامتوں سے کر دی ہے۔(۲)

۳۷۔مجمع البحرین: یہ لغت کی ضخیم کتاب ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں مصنف نے جوہری کی صحاح اور اپنی کتاب التکملہ والذیل والصلہ کو جو دراصل صحاح جوہری کا ذیل وتتمہ ہے، جمع کر دیا ہے اور آخر میں اپنے حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے، جوہری کی کتاب کے لیے ''ص'' کا، تکملہ کے لیے ''ت'' کا اور حواشی کے لیے ''ح'' کا رمز واشارہ دیا ہے(۳) ابن مالک نے اس کی شرح لکھی تھی۔(۴)

---

(۱) مجلۃ المجمع العربی دمشق، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ/اکتوبر ۱۹۲۵ء ومعجم المطبوعات، ج ۲، کالم ۱۲۰۹۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۲۷ ومعارف جولائی ۱۹۲۹ء، ص ۱۳۔ (۳) کشف الظنون، ج ۲، ص ۳۸۳ ومفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸ وتاریخ آداب اللغۃ العربیہ، ج ۳، ص ۵۰۔ (۴) معجم المطبوعات، ج ۱، کالم ۲۵۲۔

۳۸۔ مصباح الدجی من صحاح احادیث المصطفیٰ: یہ مصباح الدجی فی حدیث المصطفیٰ اور مصباح الدجی بھی کہلاتی ہے، حدیث کی مفید اور بلند پایہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے بلاسند حدیثیں جمع کی تھیں (۱) آزاد بلگرامی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری کی شرح ہے (۲) مصر کے کتب خانہ خدیویہ اور برلن میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ (۳)

۳۹۔ موضوعات امام حسن صغانی: امام صغانی نے موضوعات میں دو رسالے لکھے تھے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ صغانی کا شمار ابن جوزی وغیرہ جیسے متشدد محدثین میں ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے اپنے رسائل میں بہت سی غیر موضوع حدیثوں کو بھی موضوع قرار دے کر شامل کرلیا ہے، علامہ سخاوی کا بیان ہے کہ انہوں نے قضاعی کی الشہاب، اقلیشی کی النجم اور ابن ودعان کی اربعین وغیرہ کی حدیثیں نقل کی ہیں اور ان کے رسالے صحیح وحسن حدیثوں پر بھی مشتمل ہیں اور ان میں ضعیف روایتیں کم ہیں۔ (۴)

مولوی سید حسن برنی نے رسالة فی الاحادیث الموضوعات کے نام سے صغانی کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مکتبہ خدیویہ مصر میں اس نام کے دو رسالے موجود ہیں (۵) الموضوعات کا ایک مخطوطہ رام پور کے کتب خانہ میں ۱۴ صفحے کا ہے۔ (۶)

موضوعات میں امام صغانی کا ایک رسالہ ۱۲ صفحے کا شیخ محمد ابی المحاسن قاوقجی کی کتاب ''اللؤلؤ المرصوع فیما لا اصل له او باصله موضوع'' کے آخر میں شائع ہوگیا ہے (۷) حال میں موضوعات صغانی نجم عبدالرحمٰن خلف کی تحقیق وتحشیہ کے ساتھ قاہرہ کے دار النافع للطباعة والنشر سے ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء میں بھی شائع ہوئی ہے۔ (۸)

---

(۱) کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۴۴۷۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۸۱۔ (۳) تذکرۃ النوادر، ص ۵۲ ومعارف مئی ۴۷ء، ص ۳۸۰۔ (۴) الفوائد البہیہ، ص ۳۰۔ (۵) معارف جولائی ۲۹ء، ص ۱۳۔ (۶) فہرست کتب عربیہ، ج ۱، ص ۱۲۰۔ (۷) رجال السند والہند، طبع اول، ص ۱۰۳۔ (۸) مجلة الجامعة السلفیه بنارس، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۳۲۔

۴۰۔النوادر فی اللغۃ یا نوادر فی اللغۃ: صغانی کی کتاب الشوارد کا پہلے ذکر آ چکا ہے، ممکن ہے دونوں ایک ہی کتاب ہوں۔

۴۱۔مشارق الانوار: یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے، وہ حدیث سے زیادہ لغت میں ممتاز اور بلند پایہ خیال کیے جاتے ہیں اورانہوں نے فن لغت میں بیش قیمت اور بے نظیر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں مگران کی تمام تصنیفات میں ''مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ'' جیسی شہرت، قبول اور اعتبار کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔

اب تو اس کا چرچا کم ہوگیا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ کافی مروج تھی اور ہندوستان میں نویں صدی ہجری تک صرف یہی کتاب متداول تھی، اس کے سوا دوسری کتب حدیث یہاں تقریباً عنقا تھیں، درس وتدریس میں سارا زور معقولات کی کتابوں پر صرف کیا جاتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کی زبانی یہ صورت حال سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

> ''نویں صدی ہجری تک صرف مشارق الانوار کا نسخہ ہندوستان میں نظر آتا ہے.....محمد تغلق جس کے براہ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان اور خلعت اور علم بھی ملا تھا اور عباسی خلیفہ سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے۔

الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی

الملا ہوری المتوفی ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء کے نسخے اور مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں علما کے درس میں تھیں۔"(۱)

اس لیے ہندوستان میں مدت دراز تک حدیث کی جو کتاب سب سے زیادہ مقبول ومتداول اور نصاب درس میں داخل اور عام طور پر پڑھی اور پڑھائی جاتی رہی، وہ یہی مشارق الانوار ہے، مولوی سید حسن برنی کا خیال ہے:

"امام صغانی ایک بلند پایہ مصنف تھے، ان کی تصانیف میں مشارق الانوار جس کا متن اور اردو ترجمہ شائع ہو چکے ہیں بہت زیادہ مشہور ومتداول ہے...... یہ مجموعۂ احادیث نہایت مقبول ہوا اور ہندوستان میں تو عرصہ دراز تک حدیث کی انتہائی تعلیم کا دارومدار ہی اس کتاب پر رہا۔"(۲)

ہندوستان کی طرح اس کی شہرت کی گونج دنیائے اسلام میں بھی سنائی دیتی تھی اور وہاں کے علماوفضلا بھی امام صغانی کے فضل وکمال کے معترف اور ان کی اس کتاب کی بلند پائیگی کے قائل تھے، مولانا سید سلیمان ندوی اس کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بغداد میں بیٹھ کر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے مشارق الانوار نام حدیث کی کتاب تصنیف کی.......... علمائے حدیث نے اس کتاب کی بڑی قدر کی اور بے شمار لوگوں نے شرحیں لکھیں اور خود یہ کتاب مدارس کے نصاب میں داخل ہوگئی۔"(۳)

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا، صغانی نے یہ کتاب بڑی کدوکاوش اور نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے لکھی تھی جس کا صلہ انہیں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور حسن

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۷۴ و ۷۵۔ (۲) معارف ماہ جولائی ۱۹۲۹ء، ص ۱۰۷۔ (۳) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۴ و ۵۔

قبول کی صورت میں دیا۔

صغانی اپنی عرق ریزی اور محنت شاقہ کا خود یہ حال بیان کرتے ہیں:

کفی باللہ الذی ھو.........عالما	اللہ کافی ہے، وہ ..... جانتا ہے کہ اس کی
بما عانیت فی تالیفه وترتیبه وقاسیت	ترتیب و تالیف اور تصنیف وتہذیب میں
فی تصنیفه وتھذیبه (۱)	میں نے کس قدر ریاضت کی ہے۔

شہرت، رواج اور قبول ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ صحیح اور مستند حدیثوں کا مجموعہ ہونے کی بنا پر بھی بڑی اہم اور معتبر کتاب خیال کی جاتی ہے، مولانا خرم علی بلہوری نے ترجمہ وتحشیہ کے لیے مشارق الانوار کا انتخاب اسی لیے کیا تھا، وہ رقم طراز ہیں:

"سوسب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے، کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی اور ضعیف بھی۔" (۲)

خود مصنف کو بھی یہ کتاب بہت پسند تھی اور وہ اسے صحت و وثوق کے لحاظ سے بڑی اہم اور مستند خیال کرتے تھے، فرماتے ہیں:

ھذا کتاب ارتضیه و استضیٔ بضیائه	یہ کتاب مجھے اس قدر پسند ہے کہ میں اس سے
والعمل بمقتضاہ (۳)	روشنی حاصل کرتا ہوں اور اس پر عمل کرتا ہوں۔

مشارق الانوار کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ھذا الکتاب حجة بینی و بین اللہ	یہ کتاب صحت و وثوق اور اعتنا و استناد میں
تعالیٰ فی الصحة والرصانة والاتقان	میرے اور اللہ کے درمیان حجت ہے اور یہ
والمتانة وھو انیسی مدة حیاتی فی	دنیا میں مدۃ العمر میری رفیق و انیس ہوگی
الدنیا وشفیع المشفع انشاء اللہ	اور انشاء اللہ عقبیٰ میں میرے لیے موجب

(۱) مقدمہ مشارق الانوار۔ (۲) تحفۃ الاخیار طبع نولکشور کانپور ۱۳۹۱ھ ص ۲۔ (۳) اتحاف النبلاء المتقین، ص ۱۴۷۔

فی القیامة (۱) شفاعت بنے گی۔

فن حدیث میں الفاظ کی بحث وتحقیق کی طرح معانی کی بحث وتحقیق بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے، جن محدثین نے اس باب میں احتیاط وکاوش سے کام لیا ہے اور احادیث کے متن کی طرح ان کے معنی ومفہوم کی تحقیق میں بھی زیادہ کدوکاوش کی ہے، ان میں امام صغانی بھی تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس حیثیت سے ان کی تالیف مشارق الانوار کو بڑی اہم کتاب بتایا ہے، فرماتے ہیں:

وامر ثانی یعنی احتیاط درفہم معانی احادیث پس مواد آں نیز از تحقیق امر اول معلوم شد زیرا کہ مشارق الانوار در توضیح معانی احادیث صحیحین وموطا کافی است۔ (۲)

رہا دوسرا معاملہ یعنی احادیث کے معانی کی فہم میں احتیاط تو اس کی حقیقت بھی پہلے معاملہ کی تحقیق سے واضح ہوگئی کیونکہ مشارق الانوار صحیحین اور موطا کی احادیث کے معانی کی توضیح کے لیے کافی ہے۔

یہ کتاب عباسی خلیفہ مستنصر باللہ (۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء-۶۴۰ھ/۱۲۴۳ء) کی فرمائش پر بغداد میں لکھی گئی تھی، مصنف کا بیان ہے:

الفته لخزانة (۳) المستنصر بن الظاهر بن المستضیء العباسی (۴)

میں نے اسے مستنصر بن ظاہر بن مستضی عباسی کے کتب خانہ میں مرتب کیا۔

اس میں ۲۲۴۶ حدیثیں جمع کی ہیں (۵) اور یہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے، اکثر ابواب کے ذیل میں فصول وانواع بھی شامل ہیں جن کی مختصر کیفیت اور مشمولات کا حال ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

پہلا باب: دو فصلوں کا مجموعہ ہے، فصل اول میں وہ حدیثیں درج ہیں جن کی ابتدا

(۱) مقدمہ مشارق الانوار۔ (۲) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ، ص ۱۶۔ (۳) لخزانہ تصحیف ہے، صحیح بخزانۃ ہوگا، یہ ترجمہ اسی لحاظ سے کیا گیا ہے۔ (۴) کشف الظنون، ج ۲، ص ۴۳۶ واتحاف النبلاء، ص ۱۴۷۔ (۵) ایضاً۔

مَنْ موصولہ یا شرطیہ سے ہوئی ہے اور فصل دوم کی حدیثوں کا آغاز مَنْ استفہامیہ سے ہوا ہے۔

دوسرا باب: دس فصلوں پر مرتب ہے، ان میں حرف اِنَّ اور اس سے ملحق ضمیروں سے شروع ہونے والی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اِنَّ ۲۔ اِنّی ۳۔ اَنَا ۴۔ اِنَّهٗ ۵۔ اِنَّهُمْ ۶۔ اِنَّها ۷۔ اِنَّک

۸۔ اِنَّکُمْ ۹۔ اِنَّکُنَّ ۱۰۔ اِنَّما

تیسرا باب: اس میں حرف لا سے شروع ہونے والی حدیثوں کا ذکر ہے۔

چوتھا باب: اس کی فصل اول میں اِذا سے اور فصل ثانی میں اِذ سے شروع ہونے والی حدیثیں نقل کی ہیں۔

پانچواں باب: دو فصلوں کا مجموعہ ہے، پہلی فصل پانچ انواع پر مشتمل ہے، ان میں جن کلمات سے شروع ہونے والی حدیثیں ذکر کی گئی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ما نافیہ ۲۔ ما استفہامیہ ۳۔ ما خبریہ ۴۔ ما شرطیہ ۵۔ ما بین

دوسری فصل میں چار انواع ہیں:

۱۔ اس میں وہ حدیثیں ہیں جو حرف ندا ''یا'' سے شروع ہوئی ہیں اور منادی وہ اشخاص ہیں جن کی کنیتوں یا ناموں کا ذکر ہے، جیسے یا ابا المنذر، یا ابا بکر اور یا ابن الخطاب، یا علی وغیرہ۔

۲۔ اس میں بھی حرف ندا ''یا'' مذکور ہے اور منادی جگہوں یا گروہوں یا قبائل کی طرف مضاف ہو کر آیا ہے، جیسے یا اهل الخندق، یا اهل المدینة، یا معشر الانصار، یا معشر المسلمین، یا معشر الشباب وغیرہ۔

۳۔ یہ نوع متفرق اجناس پر مشتمل ہے، یعنی اس میں بھی حرف ندا کا ذکر ہے اور منادی کہیں مفرد اور کہیں مضاف و مرکب ہے۔

۴۔ اس نوع میں منادی عورتوں کی کنیتوں یا ناموں کے لحاظ سے ہے، جیسے

یا ابنة ابی امیہ، یاام حارثة اور یا بریرة، یا عائشة وغیرہ۔

چھٹا باب: بارہ فصلوں پر مرتب ہوا ہے، ہر فصل میں جو حدیثیں درج ہیں ان کی ابتدا مندرجہ ذیل لفظوں سے ہوئی ہے:

۱۔ لیس ۲۔ نعم و بئس ۳۔بینا و بینه ۴۔ لعن اللّٰہ ۵۔ لو ۶۔ لولا
۷۔ ان شرطیہ ۸۔ لفظ خیر ۹۔ افعل کے وزن پر صیغہ تفضیل ۱۰۔ کل
۱۱۔ قد ۱۲۔ لقد

ساتواں باب: اس میں سترہ فصلیں ہیں جن کی ابتدا درج ذیل صورتوں میں ہوئی ہے۔

۱۔مبتدا معرف باللام جیسے الآن، الارواح، الاسلام وغیرہ ۲۔ایما ۳۔ایکم
۴۔ای ۵۔ أ (ہمزۂ استفہام) ۶۔الا ۷۔الم ۸۔ افلا ۹۔الیس نیز او ۱۰۔أما (مخففہ) ۱۱۔مثل (بفتح الثاء) ۱۲۔ ایاکم ۱۳۔ انا ۱۴۔اسم الفعل جیسے دونک، علیک وغیرہ ۱۵۔لک ۱۶۔ لم حازمة ۱۷۔أمّا (مشددہ)

آٹھواں باب: چھ فصلوں کا مجموعہ ہے، ہر فصل کے شروع کی حدیث اس طور پر ہے:

۱۔اعداد (گنتیاں) ۲۔''واو قسم'' جس کے بعد الذی آیا ہے (جیسے والذی نفس محمد بیدہ) ۳۔''حرف قسم'' جس کے بعد اللّٰہ مذکور ہے، مثلاً واللّٰہ ۴۔فعل مستقبل ۵۔مضارع معلوم ۶۔مضارع مجہول۔

نواں باب: ۵ فصلیں بہ تفصیل ذیل ہیں:

۱۔فعل ماضی معلوم ۲۔فعل ماضی مجہول ۳۔فعل ماضی صیغہ متکلم کے ساتھ
۴۔ ھل ۵۔فعل امر۔

دسواں باب: ۲ فصلیں اس طرح ہیں:

۱۔لام ابتدا ۲۔مختلف النوع۔ (اس کی حدیثیں مختلف لفظوں اور حرفوں سے شروع ہوئی ہیں جن کو کسی خاص قاعدہ میں منضبط نہیں کیا جاسکا)

گیارہواں باب: یہ باب احادیث قدسی کے لیے خاص ہے۔

بارہواں باب: ادعیہ پر مشتمل ہے۔

اس تفصیل سے کتاب کے مباحث و مندرجات کی نوعیت کے علاوہ اس کی قدر و قیمت اور اس کی ترتیب و تبویب میں امام صغانی کی جودت طبع اور دقت آفرینی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اہل نظر اور ارباب فن نے بھی اس کی ترتیب و تہذیب کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے، عزیز الدین عبداللطیف بن عبدالعزیز لکھتے ہیں:

رتب الشیخ ھذا الکتاب بترتیب انیق و انتخبه بتهذیب ذلیق (۱)	شیخ صغانی نے اسے نہایت خوبی سے مرتب کیا ہے اور اس کا بہت عمدہ انتخاب کیا ہے۔

صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ ورتبه بترتیب انیق صغانی نے اس کو بہت عمدہ طور پر مرتب کیا ہے (۲) نواب صدیق حسن خان تحریر فرماتے ہیں:

و ترتیب ایں کتاب بسیار خوب و انیق واقع شدہ (۳)	اس کتاب کی ترتیب بہت اچھے اور خوبصورت طریقہ پر کی گئی ہے۔

کتب حدیث میں اس کی نوعیت مشکوٰۃ اور مصابیح جیسی ہے، فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ مختلف کتابوں کی احادیث کا مجموعہ ہے اور اس کی ترتیب فقہی ابواب پر کی گئی ہے، مگر مشارق الانوار اصلاً صحیحین کی حدیثوں کا انتخاب یا انڈکس ہے اور اس کی ترتیب احادیث کے ابتدائی الفاظ پر ہے جس کی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہے۔

ترتیب سے امام صغانی کی خاص جودت طبع، دقت آفرینی اور ندرت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، جیسے اس میں احادیث قدسی، دعاؤں اور قسموں کے علاحدہ ابواب قائم کیے گئے ہیں اور اس ضمن میں والذی نفس محمد بیدہ یا والذی نفسی بیدہ کی الگ فصل قائم کی گئی ہے، اسی طرح اعداد کا علاحدہ تذکرہ کرنا بھی امام صغانی کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔

(۱) مبارق الازہار، ص ۱۹۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۴۳۶۔ (۳) اتحاف النبلا، ص ۱۴۷۔

صغانی کی یہ ندرت بھی قابل ذکر ہے کہ مشارق الانوار میں صرف قولی حدیثوں کو جمع کیا ہے۔

مشارق الانوار کی ترتیب کے متعلق ایک شبہ اور اس کا ازالہ: مشارق الانوار کی ترتیب حروف ہجا پر کی گئی ہے، اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ اس میں پہلے حرف الف کی حدیثیں لاتے، مگر اس کے برعکس اس میں پہلے حرف من سے شروع ہونے والی حدیثیں بیان کی گئی ہیں، اس کے بعد ان اور لا کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، ایسی صورت میں حروف تہجی کے مطابق ترتیب کا دعویٰ درست نہیں معلوم ہوتا، مولانا خرم علی اس اشکال کو ذکر کر کے اس کا یوں جواب دیتے ہیں:

''جن حدیثوں کے سرے پر حرف من ہے اول باب میں لایا اور ان کی حدیثوں کو دوسرے باب میں اور جن پر حرف لا ہے ان کو تیسرے باب میں اور باوجود اس کے پھر حروف تہجی کی رعایت ہے، خلاصہ یہ کہ اس میں ترتیب معنوی نہیں، ترتیب لفظی ہے...... لیکن جامع رحمہ اللہ نے باب اول میں من کو مقصود نہیں بلکہ من کے بعد وہ لفظ آئے گا جس کے شروع میں الف ہو، چنانچہ پہلی حدیث ہے:

ابوهريرة من آمن بالله ورسوله — ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا۔

اور دوسری حدیث یہ ہے:

زيد بن خالد الجهني من آوى ضاله فهو ضال مالم يعرفها (۱) — زید بن خالدؓ سے مروی ہے کہ جس نے کسی گم شدہ جانور کو پناہ دی تو جب تک اس کی تشہیر نہ کرے وہ اس کا ضامن رہے گا۔

پہلی حدیث میں من کے بعد لفظ آمن اور دوسری میں لفظ آوی کا اعتبار ہے،

(۱) تحفۃ الاخیار باب اول، ص ۶ و ۷۔

حروف تہجی کی رعایت کا التزام تمام کتاب میں اسی طرح ہے جیسا کہ حدیث ۱ و ۲ کے بعد ہے کہ الف ممدودہ کے بعد الف مقصورہ آیا ہے۔"

حوالے: مشارق الانوار میں حدیثوں کے حوالے بھی ہر حدیث کے ساتھ دیے گئے ہیں، جس کے لیے "خ"، "م" اور "ق" کی علامتیں اور رموز مقرر کیے گئے ہیں، "خ" سے "بخاری" کی جانب اور "م" سے "مسلم" کی طرف اشارہ ہے اور "ق" سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث "متفق علیہ" ہے، یعنی بخاری و مسلم دونوں نے اس کی تخریج کی ہے۔

اختصار: مشارق الانوار کی ایک اہم خوبی اختصار ہے، مصنف نے طوالت سے بچنے کے لیے سندیں حذف کر دی ہیں اور صرف اس صحابی کا نام دیا ہے جو اس حدیث کے اولین راوی ہیں، اس کے بعد اصل مضمون شروع کر دیا ہے اور غایت اختصار کی بنا پر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں کہا ہے، اس سلسلہ میں مولانا خرم علی کا بیان ملاحظہ ہو:

"مصنف نے اختصار کے واسطے احادیث کے اسناد یعنی راویوں کے نام کو حذف کیا، فقط صحابی کا نام جو اس حدیث کا اول راوی ہے مذکور کیا، اس طرح ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا، پھر صحابی کا نام لیا، پھر حدیث کو بیان کیا اور اختصار کے واسطے ہر حدیث پر قال رسول اللہ نہیں کہا۔"(۱)

مشارق الانوار کی بعض اور خصوصیات یہ ہیں:

۱: کہیں کہیں حدیثوں کے موقع و محل کی صراحت کر دینے سے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو گیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس موقع پر یا کس سے مخاطب ہو کر یہ بات فرمائی تھی، نیز اگر آپؐ نے کسی خاص شخص کے سوال کے جواب میں کوئی بات فرمائی تھی تو اس کا بھی وضاحت سے پتہ چل جاتا ہے، مثلاً ایک حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

---

(۱) تحفۃ الاخیار، باب اول، ص ۶ و ۷، بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۶۔

قاله منصرفه من تبوک	آپؐ نے تبوک سے واپسی کے وقت یہ
(مشارق الانوار،ص۴۲)	ارشاد فرمایا تھا۔

ایک حدیث یہ نقل کی ہے:

یا ام سلیم ان اللّٰه قد کفیٰ واحسن	اے ام سلیمؓ! اللہ ہمارے لیے (دشمنوں
....	کے شر سے) کافی ہے اور اس نے ہمارے ساتھ اچھا کیا۔

اس کی توضیح میں تحریر کرتے ہیں:

قاله یوم حنین	رسولؐ اللہ نے حنین کے روز یہ بات فرمائی
(شرح مبارق الازہار،ص ۳۶)	تھی۔

ام ہانیؓ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

قد آجرنا من آجرت و آمنا من آمنت	(اے ام ہانیؓ) جسے تو نے پناہ دی، امان دی،
	اسے ہم نے بھی پناہ اور امان دی۔

اس کی توضیح اس طرح کی ہے:

قاله لها یوم فتح مکه	آپؐ نے ام ہانی سے فتح مکہ کے روز یہ
(مبارق الازہار، ج ۲، ص ۱۸۳)	فرمایا تھا۔

گو پوری کتاب میں اس کا التزام نہیں کیا ہے، چنانچہ مولانا خرم علی بلہوری لکھتے ہیں:

"مصنف نے ہر جگہ قصہ حدیث کا نہیں بیان کیا کہ حضرت نے یہ حدیث کس وقت، کس تقریب سے فرمائی۔"(۱)

۲: اوپر گزر چکا ہے کہ مصنف نے اختصار کی وجہ سے سندیں حذف کر دی ہیں اور صرف صحابی کا نام دیا ہے، مگر اس کے باوجود اگر کسی حدیث کے متعلق اس کے کسی

(۱) تحفۃ الاخیار، بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۶۔

راوی نے کوئی تشریح ووضاحت کی ہے تو اسے نقل کر دیا ہے، جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں:

قال حماد (حماد نے یہ بات کہی)

اسی طرح روایت کے الفاظ میں اگر راوی نے شک وتردد کا اظہار کیا ہے تو اسے بھی ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ شک واشتباہ راوی کا ہے، جیسے قربانی کے گوشت کے متعلق آپؐ نے فرمایا:

کلوا واطعموا واحبسوا و ادخروا — قربانی کا گوشت خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور اسے روک یا جمع کر کے رکھ لو۔

اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ شک من الراوی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احبسوا (روک لو یا ادخروا (جمع کرلو) میں سے کون سا لفظ فرمایا تھا، راوی کو اس میں شک وشبہ ہو گیا ہے۔(۱)

۳: مصنف نے اس میں کہیں کہیں منامی حدیثیں نقل کی ہیں۔

۴: بعض حدیثیں دو صحابیوں کی سندوں سے ذکر کی ہیں۔

۵: احادیث کے سلسلہ میں مختلف قسم کی وضاحتیں کی ہیں، مثلاً .... کہیں کہیں ان کی مبہم باتوں کی توضیح کی ہے، بعض جگہ کی صراحت کی ہے کہ حدیث منسوخ ہو گئی ہے، اسی طرح روایت کے اختلاف الفاظ ومتون کی نشاندہی کی ہے، لفظوں کے اختلاف کی صورت میں بعض جگہ اپنی تصویب، توثیق اور ترجیح دلائل کے ساتھ لکھی ہے، نیز دو راویوں کے یہاں الفاظ کی روایت میں جو کمی بیشی یا حذف واضافہ پایا جاتا ہے اسے بھی بتا دیا ہے۔

۶: رواۃ واسناد کے سلسلہ میں بھی مختلف توضیحات کی گئی ہیں، مثلاً راویوں کے ناموں میں فرق واختلاف کی صراحت، ان میں غموض، خفا یا ابہام کی وضاحت، راوی سے حدیث کے بیان میں کوئی چیز ترک ہو گئی یا اس نے اپنی عدم یادداشت یا سوئے حفظ کا

(۱) مبارق الازہار، ج ۲، ص ۳۷۔

اعتراف کیا ہے تو اسے بھی نقل کیا ہے، اسی طرح سندوں کے ارسال و عدم واتصال کا بھی ذکر کیا ہے۔

۷: متفق علیہ حدیثوں میں جس محدث کے سیاق کا تتبع کیا ہے، اس کی صراحت کی ہے، اس سلسلہ میں دونوں کی روایتوں کے فرق واختلاف یا اضافہ وکمی کی نشاندہی بھی کی ہے، کسی روایت کو امام مسلم نے مسند اور امام بخاری نے معلق بیان کیا ہے تو اسے بھی بیان کر دیا ہے، اسی طرح قضاعی کے شیخین سے اختلاف کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

مشارق الانوار متعدد بار طبع ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں، ٹونک کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے فرزند محمد بن حسن نے ان کے سامنے اس کی قرأت کی تھی۔(۱)

مشارق الانوار کی شرحیں: مشارق الانوار کی شہرت ومقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کے بہ کثرت شروح وحواشی لکھے گئے، اس کی تلخیص کی گئی اور اس کے کئی مختصرات مرتب کیے گئے، مولوی سید احمد ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

''ان کی تالیف مشارق الانوار حدیث کی نہایت مشہور ومعتبر کتاب مانی جاتی ہے اور اس کی مقبولیت کا اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دسویں صدی ہجری تک (تقریباً ساڑھے تین سو برس میں) اس کتاب کی ۲۴، ۲۵ شرحیں اور حواشی ایسے لکھے جا چکے تھے جو بجائے خود مستقل اور بلند پایہ کتابیں ہیں۔''(۲)

مولوی امام ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی رقم طراز ہیں:

''صحاح ستہ کے بعد سب سے زیادہ اس کی شرحیں لکھی گئیں۔''(۳)

ہندوستان میں اس کتاب کے رواج وقبول کا اوپر ذکر آ چکا ہے، اس لیے ہندوستانی علمانے بھی اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا اور اس کی متعدد شرحیں، فوائد اور مختصرات بھی لکھے اور

(۱) قصر علم، ص ۳۰۱۔ (۲) تاریخ ہند، کتاب دوم، ص ۲۶۲۔ (۳) معارف دسمبر ۱۹۴۷ء، ص ۴۳۹۔

اس کے اردو ترجمے بھی کیے گئے، بلکہ حدیث کی یہی وہ کتاب ہے جس کا غالباً سب سے پہلے اردو ترجمہ ہوا اور جس کی حدیثوں کی سب سے پہلے اردو میں شرح وتوضیح کی گئی، ذیل میں شرحوں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے، ہندوستانی شرحوں کا ذکر آخر میں آئے گا۔

۱۔ تحفۃ الابرار: شارح کا نام شیخ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی الحنفی (م ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۴ء) ہے۔(۱)

۲۔ شوارق الاسرار العلمیہ: یہ صاحب قاموس شیخ مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء) کی شرح ہے جو چار جلدوں پر مشتمل تھی۔(۲)

۳۔ کشف الشارق: خیر الدین خضر بن عمر طوفی شارح کا نام ہے، وہ دولت عثمانیہ کے علما میں تھے، انہوں نے ۳ جلدوں میں مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی۔(۳)

۴۔ المطالع المصطفویہ: مشہور اور اہم شرح ہے جو شیخ امام سعید بن محمد بن مسعود گارزونی (م ۷۵۸ھ/۱۳۵۶ء) نے لکھی تھی، ان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انہوں نے مشارق الانوار کے ہر باب وفصل کے آخر میں اس باب وفصل کی احادیث کی تعداد بھی لکھی ہے اور آخر میں ان کی مجموعی میزان ۲۲۴۶ دی ہے(۴) مشارق کے موجودہ متداول نسخہ پر گارزونی ہی کے شمار کردہ اعداد ثبت ہیں۔(۵)

۵۔ مبارق الازہار: یہ مشارق الانوار کی بڑی مشہور ومتداول شرح ہے جو عز الدین عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک نے دو جلدوں میں لکھی تھی اور دولت عثمانیہ سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی ہے، دور حاضر کے مشہور ہندوستانی محدث مولانا حبیب الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

"عبد اللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہیں، مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل ہے، یہ شرح استنبول سے چھپ کر

---

(۱) کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۶۸۸۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً۔ (۵) معارف دسمبر ۱۹۴۷ء، ص ۴۳۹۔

شائع ہو چکی ہے، مصنف کی اس کے سوا تصنیفات میں شرح مجمع البحرین فقہ میں اور شرح منار اصول فقہ میں بھی بہت مستند اور علما میں متداول رہی ہے۔''(۱)

مبارق الازہار ان خوبیوں اور خصوصیات سے آراستہ ہے جو قدما کی شرحوں میں پائی جاتی ہیں، ابتدا میں شارح کا مقدمہ ہے پھر مقدمہ، مشارق کی شرح کرنے کے بعد دو جلدوں میں اس کے متن کی شرح کی ہے، ابن الملک کے پیش نظر مشارق الانوار کا جو نسخہ تھا اس میں جہاں کہیں انہیں تصحیف یا غلطی نظر آئی، اس کو انہوں نے درست کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

''میں نے التزام کیا ہے کہ شیخین میں اگر کوئی صاحب کسی حدیث میں منفرد ہیں تو اس کا ذکر کروں اور اگر دونوں متفق علیہ ہیں تو اسے لکھ دوں کیوں کہ مشارق الانوار کے متداول نسخے میں علامات کے لحاظ سے فرق واختلاف ہے اور ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ زیادہ صحیح کون ہے اور بعض جگہ مصنف کی علامتیں واقعہ کے مطابق نہیں ہیں تو ان پر بھی متنبہ کیا ہے، مثلاً مصنف نے حدیث کو صحیحین کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ ان میں سے صرف ایک ہی کتاب میں وہ درج ہے یا اس کی تخریج ان دونوں کے علاوہ کسی کتاب میں کی گئی ہے یا راوی کے نام میں صحیحین سے عدم مطابقت ہے(۲) گویا مبارق الازہار میں شرح کے ساتھ مشارق الانوار کی صحت وتخریج بھی کی گئی ہے، یعنی اگر حدیث بخاری میں ہے تو اس کا ماخذ کتاب وباب لکھ دیا اور مسلم میں ہے تو اس کی کتاب وباب کا ذکر کر دیا اور دونوں میں ہے تو ہر دو کا حوالہ کتاب وباب ضبط فرما دیا ہے'' مولوی ابو یحییٰ امام خان نوشہروی تحریر فرماتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ ابن الملک نے مشارق کی ایک ایک حدیث کا صحیحین سے مقابلہ کیا ہے اور جو حدیث مقابلہ کے بعد انہیں نہیں ملی، اس کے متعلق صراحت کر دی کہ وہ حدیث بخاری میں یا مسلم میں یا ان دونوں میں سے کسی میں نہیں ملی، ایسی حدیثیں جو صحیحین میں سے کسی میں نہیں ہیں ابن الملک کو بے شمار ملی ہیں نہیں کہا جا سکتا کہ مؤلف مشارق ہی کے

(۱) معارف جنوری ۵۴ء، ص ۶۱۔ (۲) مبارق الازہار بحوالہ کشف الظنون، ج ۲، ص ۴۳۷۔

پیش نظر صحیحین کے نسخوں میں کوئی کمی تھی یا انہوں نے بخاری ومسلم کے سوا کسی اور کتاب سے لیا، یا امام صغانی کے بعد کے محدثین نے مشارق میں ایسی احادیث کا اضافہ کر دیا جو صحیحین میں نہ تھیں، یا ناسخین نسخ کی بے پروائی سے ماخذ کا اندراج غلط ہوتا گیا اور یا ابن الملک صاحب مبارق ہی کے پیش نظر نسخوں میں تصحیف ہو چکی تھی جن پر اعتماد کر کے انہیں لم نجده (نہیں ملی) ولم نجده لکھنا پڑا" (۱) استنبول کا مجموعہ نسخہ الحاج الحافظ ابو مظہر احمد طاہر قنوجی مدرس جامع سلطان بایزید کی تصحیح وتحشیہ کے بعد چھپا ہے، فاضل مصحح نے شرح کے حواشی پر مشارق الانوار کی حدیثوں کے اصل مراجع یعنی صحیحین کے کتب وابواب کی صراحت کر دی ہے۔

مبارق الازہار کا مصنف: اوپر گزر چکا ہے کہ شارح کا نام عز الدین عبداللطیف ابن عبدالعزیز المعروف بہ ابن الملک ہے مگر قاضی سید نور الدین حسین صاحب نے معارف جولائی ۴۹ء میں اور ڈاکٹر سید باقر علی استاد شعبۂ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے معارف اکتوبر ۵۰ء میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے جو احمد آباد کے باشندے تھے، ان کے والد کا نام عبدالملک جنانی تھا اور ان کی وفات ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء میں ہوئی، ان کے صاحبزادے بھی عالم تھے اور ان کا نام خلیل محمد عباسی تھا۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے نزدیک یہ انکشاف معیار تحقیق پر پورا نہیں اترتا، مولانا نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مبارق الازہار عبدالملک بن عبدالعزیز بن امین المعروف بہ فرشتہ یا عبداللطیف بن عبدالملک کی تصنیف ہے، مولانا نے بہ تحقیق سنہ وفات ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء کو بھی غلط قرار دیا ہے اور استنبول کے نسخہ پر درج سنہ وفات ۷۹۷ھ/ ۱۳۹۵ء کو بھی صحیح تسلیم نہیں کیا ہے اور ابن العماد کے بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ ابن فرشتہ کی وفات تقریباً ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰ء میں ہوئی ہے، مولانا کے نزدیک مصنف کا ہندوستانی ہونا محقق نہیں ہے، انہوں نے علامہ شوکانی کی البدر الطالع کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مصنف ایک رومی عالم تھے

---

(۱) معارف دسمبر ۷۲ء ص ۴۴۱۔

جو سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو معارف جنوری ۱۹۵۴ء مضمون مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی بعنوان ''مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے'')

مبارق الازہار کی اہمیت کی وجہ سے اس کے بھی حواشی لکھے گئے ہیں:

۱۔ حاشیہ مبارق الازہار: اس کے محشی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔(۱)

۲۔ حاشیہ بر حاشیہ مذکور: ازمولانا ابراہیم بن احمد بن احمد المعید، اس کا نام صواب الافکار تھا۔(۲)

۳۔ ایک اور حاشیہ: ازمحمد بن الارنیقی الشہیر بوجی زادہ (م ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء)(۳)

۴۔ انوار البوارق فی ترتیب المشارق، ازمولی ابراہیم بن مصطفی، اس میں مبارق الازہار کی ترتیب (مع مشارق) مشکوۃ المصابیح کی طرح کردی ہے، مصنف لکھتے ہیں:

''میں نے بلاضرورت کہیں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کیا ہے البتہ اس میں کہیں کہیں مصابیح سے بھی کچھ چیزیں شامل کردی ہیں۔''(۴)

۶ و ۷ مشارق الانوار کی دو شرحیں مولی شمس الدین احمد بن سلیمان المعروف بہ ابن کمال پاشا (م ۹۴۰ھ/ ۱۵۳۳ء) نے لکھی تھی مگر انہیں زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔(۵)

۸۔ حدائق الازہار از وجیہ الدین عمر بن عبدالمحسن الارزنجانی: اس میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا، شرح السنۃ، نوادر الاصول، الفائق، النہایہ، مجمع الغرائب، مطالع الانوار، شرح البیضاوی، التحفہ لبدرالدین الاربلی۔(۶)

۹۔ شرح ازشمس الدین ابن صائغ محمد بن عبدالرحمٰن الزمردی، حنفی (۷)(م ۷۷۶ھ/ ۱۳۷۵ء) مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ:

''مصنف متبحر اور جامع العلوم والفنون تھے، مصر وشام میں حدیث کی تحصیل کی اور

(۱) کشف الظنون، ج ۲، ص ۴۳۷۔(۲) ایضاً۔(۳) ایضاً۔(۴) ایضاً۔(۵) ایضاً۔(۶) ایضاً۔(۷) ایضاً۔

اور اس میں بارع وفائق ہوئے، درس وافادہ کے علاوہ صاحب تصانیف بھی تھے، مشارق کی شرح لکھی۔"(۱)

۱۰۔ شرح از مولی محمد بن مصلح الدین قوجوی المعروف بشیخ زادہ محشی (م ۹۵۱ھ/ ۱۵۴۴ء)(۲)

۱۱۔ شرح از جلال الدین رسول بن احمد التبانی (م ۷۹۳ھ/ ۱۳۹۰ء) یہ نامکمل رہ گئی تھی۔(۳)

۱۲۔ شرح وحید الدین۔(۴)

۱۳۔ دقائق الآثار از محمد بن محمد اسدی قدسی (م ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) یہ مشارق الانوار کی تلخیص ہے۔(۵)

۱۴۔ ضیاء المشارق الجدید بالوضع علی المفارق از ضیاء الدین علی بن محمود کرمانی، یہ متعدد جلدوں میں تھی۔(۶)

۱۵۔ شرح از شمس الدین عطابی، ابن ملک کا بیان ہے کہ "طلبۂ فن کو اس شرح سے اغماض برتنا مناسب نہیں ہے، یہ گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے جو اکثر کتابوں سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہے۔(۷)

۱۶۔ حاشیہ از قاسم بن قطلو بغا حنفی (۸۷۶ھ/ ۱۴۷۱ء)۔(۸)

۱۷۔ مبارق الازہار از علی بن حسن، یہ ۹۳۶ھ/ ۱۵۲۹ء میں مرتب کی گئی، ابن الملک کی شرح اس سے پہلے لکھی گئی تھی، علی بن حسن نے پہلے مشارق الانوار کو مبوب کیا ہے، اس کے بعد ابن الملک کی شرح کو از سر نو مرتب کیا۔(۹)

۱۸ و ۱۹۔ علاء الدین یحییٰ بن عبداللطیف طاؤسی قزوینی نے دو شرحیں لکھی تھیں، ایک شرح صغیر اور دوسری کبیر تھی، شرح صغیر کی تالیف سے ۷۷۵ھ/ ۱۳۷۳ء میں بغداد میں

(۱) الفوائد البہیہ۔ (۲ تا ۷) کشف الظنون، ج ۱، ص ۴۳۷۔ (۸) ایضاً، ج ۲، ص ۴۳۷۔ (۹) ایضاً۔

مستنصریہ میں فارغ ہوئے، اس میں کہیں کہیں شرح کبیر کے حوالے دیے ہیں۔(۱)

۲۰۔ تحفۂ حسنا از عبدالباقی معروف بہ طورسون زادہ، مصنف جس زمانہ میں مشارق الانوار کا درس دیتے تھے اس وقت اکمل الدین اور ابن الملک کی شرحیں ان کے پیش نظر رہتیں اور ان سے بکثرت استفادہ کرتے، پھر وہ اسکندریہ کے قاضی مقرر کیے گئے تو انہوں نے مشارق کی سو حدیثوں کی تحفۂ حسنا کے نام سے شرح لکھی، بعد میں اس میں ۱۵/ اور حدیثوں کی شرحیں بھی شامل کردی تھیں۔(۲)

ہندوستانی شروح وتراجم: مشارق الانوار کی جو شرحیں ہندوستان میں لکھی گئیں، وہ یہ ہیں:

(۱/۲۱) شرح مشارق الانوار از مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی (م ۷۴۷ھ/ ۱۳۴۶ء)

مصنف خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے اجل خلفا میں تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شرح مشارق تالیف کی تھی۔(۳)

(۲/۲۲) شرح مشارق الانوار از مولانا مظفر بلخی بہاری (م ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۰ء) مولانا مظفر مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید و جانشین اور متبحر عالم تھے، حضرت مخدوم الملک انہیں امام کہا کرتے تھے، مکتوبات بست وہشت (۲۸) کے مکتوب دوازدہم (۱۲) سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا امام مظفر بلخی نے مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی۔(۴)

(۳/۲۳) مدارج الاخبار از خواجہ ارزانی محدث جونپوری (م ۹۸۱ھ/ ۱۵۷۳ء)

حضرت شیخ مخدوم ارزانی کے لڑکے اور مرید تھے، صاحب زہد وتقویٰ اور تمام علوم وفنون میں ماہر تھے، اپنے زمانہ کے مشہور علمائے محدثین میں سے تھے، احادیث مشارق کی بہ ترتیب حروف تہجی ہیں، حسب ترتیب مصابیح الانوار تالیف کرکے اس کا نام مدارج الاخبار رکھا، شارح

(۱و۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۴۴۷۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۹۷ و تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۶۔ (۴) معارف ج ۲۲، ص ۲۹۵ تا ۲۹۹۔

عہد شیر شاہی میں درجۂ وزارت میں پہنچے، سنہ وفات ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء ہے۔(۱)

مولانا حکیم حبیب الرحمٰن (ڈھاکہ) نے ان کا نام شیخ مبارک بن ارزانی الرجتکی البناری لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مدارج کا ایک ناقص قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں، صحاح ستہ سے مصابیح کی طرح برعایت ابواب فقہی لکھی ہے (۲) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے بھی بہ تحقیق ان کا نام مبارک اور والد کا نام شیخ ارزانی لکھا ہے۔(برہان فروری ۱۹۵۴ء)

مدارج الاخبار و معارج الآثار من مشارق الانوار کے نام سے ایک کتاب کتب خانہ ٹونک میں بھی موجود ہے جس میں مشارق کو فقہی تبویب پر مرتب کیا گیا ہے لیکن غالباً اس پر مصنف کا نام درج نہیں ہے یا فہرست نگاروں نے اس کا نام نہیں دیا (۳) خیال ہے کہ یہ مدارج ہی کی شرح ہوگی۔

مولانا اعظمی نے بھی مدارج کی ایک شرح معدن الاسرار کا ذکر کیا ہے اور اسے خود خواجہ مبارک کی شرح قرار دیا ہے۔(برہان فروری ۵۴ء)

(۴/۲۴) تبصرۃ الاخبار فی تخریج الآثار، اس کا تاریخی نام شوارق المشارق ہے، مصنف مولوی الٰہی بخش خاں بڑاکری بہاری (م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء) تھے، انہوں نے کتاب کے ناشر مولوی محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن علی خاں کی فرمائش پر مشارق کو فقہی ترتیب پر کیا تھا، مصنف صاحب کمالات اور جامع الفنون تھے، درس و تدریس سے مدۃ العمر وابستہ رہنے کے باوجود صاحب تصانیف کثیرہ تھے، علاوہ ازیں نہایت متدین تھے، اشاعت سنت و تردید بدعت ہمیشہ شعار رہا۔(۴)

(۵/۲۵) ملتقط مشارق الانوار، یہ علامہ عبدالمغنی کی تلخیص ہے جو ۹۰۳ھ/ ۱۴۹۷ء میں کی گئی تھی، اسی سنہ کا خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے،

(۱) تجلی نور، حصہ دوم، ص ۵۵ بحوالہ گنج رشیدی، ص ۵۵۔(۲) معارف فروری ۴۴ء، ص ۲۲۱۔(۳) معارف فروری ۴۸ء، ص ۱۳۹ وقصر علم، ص ۵۹۔(۴) معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۵۔

فہرست نگار کے بیان کے بموجب محمد جعدی نے اس کی تصحیح کی تھی، آخر میں قدرے آب رسیدہ ہے۔(۱)

(۶/۴۶) مشکوٰۃ الانوار لتسہیل مشارق الانوار، یہ شرح مولوی عبدالغفور غزنوی امرتسری (۱۳۵۴ھ/۱۹۲۵ء) نے اردو میں لکھی تھی اور مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی تھی، مصنف نے اس میں مشارق کو مشکوٰۃ کے نہج پر مرتب کیا تھا اور اسے کتابۃً بھی فہرست مدونہ کے مطابق بدل دیا تھا، اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ:

"......مناسب بلکہ واجب معلوم ہوا کہ اس کتاب کو ترتیب معنوی پر بنالیا جائے تاکہ سب مسلمان بھائی اس سے بآسانی تمام فائدہ اٹھاسکیں اور جس حکم کی احادیث مطلوب ہوں بآسانی نکال سکیں، چچا مولوی عبداللہ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء) سے مشورہ کیا تو پسند فرمایا، اللہ نے ذہن عالی اور فکر بلند دیا تھا، انہوں نے ترکیب یہ بتائی کہ اس کے ابواب موافق مشکوٰۃ کے ہونے چاہئیں اور ہر باب میں تین فصلیں ہوں، فصل اول میں بخاری اور مسلم دونوں کی حدیثیں ہوں اور دوسری فصل میں حدیث بخاری کی اور تیسری میں فقط مسلم کی حدیثیں ہوں اور جس باب میں تینوں میں سے کوئی فصل نہ ہو اس میں اس طرح رکھنا چاہیے کہ اس باب میں فلاں فصل نہیں، چنانچہ مشکوٰۃ والے کا بھی یہی قاعدہ ہے، غرض چچا کے ارشاد کے مطابق یہ کتاب بنائی تو گویا یہ کتاب ایک چھوٹی مشکوٰۃ بن گئی ہے بلکہ اس پر بھی فوقیت لے گئی، اس واسطے کہ یہ مختصر ہے اور اس کی تمام حدیثوں کی صحت پر اتفاق ہے، اس میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر قسم کی حدیثیں مذکور ہیں، صحیح بھی اور ضعیف بھی......۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں حسب دل خواہ کتاب تمام ہوئی۔" (۲)

(۷/۴۷) ترجمہ مشارق الانوار از مولانا محمد احسن نانوتوی، محمد عبدالباقی سہسوانی لکھتے ہیں:

"حافظ سید غلام جیلانی نے......مولانا محمد احسن نانوتوی مرحوم مترجم

---

(۱) فہرست کتب خانہ عربیہ رامپور، ج ۲، ص ۱۷۔ (۲) معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۹ و ۶۰۔

درمختار و مشارق الانوار سے دینیات کی تکمیل فرمائی۔"(۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے درمختار کی طرح مشارق الانوار کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا مگر یہ شاید طبع نہیں ہوسکا، اسی لیے کسی نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، جناب محمد ایوب قادری مرحوم نے مولانا کے حالات وسوانح میں ایک کتاب لکھی ہے لیکن انہوں نے بھی مولانا کے اس ترجمہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۸/۴۸) تحفۃ الاخیار، یہ مشارق الانوار کا اردو ترجمہ اور اس کی شرح ہے جو ایک دوسرے سے ممزوج ہیں لیکن شرح وفوائد کو ظاہر کرنے کے لیے "ف" کی علامت مقرر کردی ہے، یہ ترجمہ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں مکمل ہوا اور سنہ تالیف کے تین سال بعد مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، یہ ایڈیشن ایسا خوبصورت چھپا تھا کہ اس زمانہ میں اس کی قیمت پندرہ روپئے تھی، مترجم وشارح مولانا خرم علی بلہوری ہیں۔

اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ: اس ترجمہ کی خاص اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ ہے، مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں:

> "کتب حدیث کا سب سے پہلا اردو ترجمہ یہی تحفۃ الاخیار ہے، اس کے بعد نواب قطب الدین خان دہلوی نے مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ وشرح بنام مظاہر حق کیا (مظاہر حق اصلاً شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء کا تھا، نواب صاحب نے بادنی تغیر مہذب فرمایا اور اس کا اعتراف بھی کیا) مولانا خرم علی کی وفات کے بعد ۳ سال تک متواتر تین مرتبہ طبع ہوا، اس سے اس کی مقبولیت ظاہر ہوتی ہے۔"(۲)

مولوی عبدالحلیم چشتی بھی اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ اسی کو بتاتے ہیں:

---

(۱) حیوۃ العلما طبع نولکشور ۱۹۱۲ء، ص ۱۱۰ بحوالہ معارف جون ۱۹۵۷ء، ص ۴۴۴۔ (۲) معارف دسمبر ۱۹۴۷ء، ص ۴۴۷۔

"ہندوستان میں اس سے پہلے نہ اردو میں کوئی کتاب چھپی تھی اور نہ عوام میں حدیث کا کچھ چرچا تھا، موصوف نے سب سے پہلے مسلمانوں کو تعلیمات نبوی سے باخبر کرنے کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔"(۱)

اور چوں کہ ترجمہ کی اصل غرض یہ تھی کہ عام لوگوں کو اس سے فائدہ ہو، اس لیے زبان وطرز بیان اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت عام فہم اور آسان اختیار کی گئی تھی اور زیادہ دقیق اور پیچیدہ بحثوں سے صرف نظر کیا گیا تھا تاہم اکثر دینی حقائق ومطالب کو اس میں مؤثر پیرایہ اور دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا تھا، مترجم خود لکھتے ہیں:

"اصل غرض اس سے یہ ہے کہ اہل اسلام کو فائدہ عام ہو، یہاں تک کہ حرف شناس عوام بھی محروم نہ رہیں، اس واسطے نہایت مشکل مسائل نہیں لکھے ...... اس کتاب کے خطبے کا ترجمہ نہیں کیا، عوام کو اس سے کچھ فائدہ نہ تھا۔"(۲)

آگے لکھتے ہیں کہ:

"یہ کتاب اہل اسلام کے واسطے عجیب تحفہ ہے، کیونکہ یہ اکثر مطالب دینی کو شامل ہے، جس کے دریافت سے جاہل عالم بنے اور عالم تازہ لطف اٹھائے، حضرت مولانا عبدالقادر دہلویؒ کی ہندی تفسیر اور یہ کتاب طالب خدا کے واسطے کافی ہیں، دیندار کے حق میں یہ دونوں کتابیں گویا دو آنکھیں ہیں جن سے دو جہاں کا انجام نظر پڑے، یا دو پر ہیں جن سے عرش تک اڑ سکے۔"(۳)

مولانا خرم علی نے ابتدا میں حدیث کی اہمیت، ہندوستان میں اس سے بے اعتنائی اور اردو ترجمہ کے لیے اس کتاب کے انتخاب کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۴۔ (۲) ایضاً، ص ۴۴۶۔ (۳) ایضاً، ص ۴۴۶ و ۴۴۷۔

"علم حدیث اشرف العلوم ہے، اس واسطے کہ اشرف الناس کا کلام ہے، مثل مشہور ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام اور سب علوم دینی اس کے محتاج ہیں، علم تفسیر بدون حدیث کے معتبر نہیں اور علم عقائد اور علم فقہ وعلم سلوک اور علم تاریخ بدون اس کے کچھ پسند نہیں، لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں اس علم شریف کا چرچا نہیں، عوام کا تو کیا ذکر، اکثر علما کو خبر نہیں، اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عام فہم اردو زبان میں کیجیے، سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے، کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں جو غیر معتبر ہو بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی اور ضعیف بھی۔"(۱)

مقدمہ میں احادیث کے اقسام اور ان کی تعریف بیان کی ہے، اس کے بعد امام بخاری وامام مسلم کے حالات وکمالات کا تذکرہ ہے، پھر حسن صغانی کے حالات وتصنیفات کا ذکر ہے، پھر اپنے ترجمہ کی بابت کچھ ضروری باتیں لکھی ہیں، اصل کتاب کے آغاز سے پہلے حدیث کی اہمیت پر ایک بصیرت افروز نظم ہے، اس کے بعد کتاب کا مع متن ترجمہ ہے، اس کے بعد فوائد کے تحت حدیث کا پورا واقعہ اور اہم امور کی وضاحت ہے، فوائد اگرچہ مختصر ہیں لیکن بڑے کام کے ہیں۔(۲)

امام صغانی نے اختصار کی وجہ سے سندیں چھوڑ دی ہیں اور قال رسول اللہ کو بھی حذف کر دیا ہے، مگر ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ آنحضرتؐ نے یوں فرمایا، مصنف نے ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا ہے، مترجم نے بھی کتاب کا نام ہر حدیث میں پہلے دے دیا ہے، اختصار کی بنا پر مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ حدیث کس وقت سے تقریب سے فرمائی جس سے

(۱) معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۵۔ (۲) ایضاً۔

اس کا مطلب بخوبی نہیں معلوم ہوتا، اس واسطے مترجم نے فائدے میں اس کا پورا قصہ لکھ دیا ہے اور جہاں مطلب مجمل اور مشکل تھا اس کو مفصل کر دیا (۱) ترجمہ تحت اللفظ نہیں ہے، مترجم رقم طراز ہیں:

"حدیث کا ترجمہ تحت اللفظ نہیں کیا، اس واسطے کہ عرب کا محاورہ ہند کے محاورے سے اکثر مطابق نہیں ہوتا، بلکہ محاورہ مقدم رکھا ہے، مرادی مطلب جا بجا لکھا اور باوجود اس کے حتی المقدور تحت اللفظ ترجمے کی بھی رعایت کی ہے۔" (۲)

ترجمہ و فوائد کی زبان اس زمانہ کے لحاظ سے گو نہایت سادہ و عام فہم تھی، مگر اس زمانہ کے لحاظ سے اب اس میں قدامت آ گئی ہے، مترجم کا ماخذ حدیث اور شروح حدیث کی بے شمار کتابیں ہیں مگر انہوں نے علامہ گازرونی کی شرح مشارق اور علامہ ابن اثیر جزری کی جامع الاصول سے اس میں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔

مترجم و شارح نے اس میں مصنف کے اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"اکثر مشارق کی حدیثوں میں اس حدیث پر قاف کی علامت ہے یعنی بخاری و مسلم دونوں میں یہ حدیث بالاتفاق ہے، حالانکہ یہ صاف خطا ہے، اس واسطے کہ صاحب جامع الاصول اور شارح گازرونی نے لکھا ہے کہ حدیث صرف مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں اور اس عاجز نے بھی صحیح بخاری میں دیکھا، زید بن خالد سے اس میں اس مضمون کی حدیث نہیں پائی، معلوم ہوا کہ کاتب کی غلطی ہے۔" (۳)

---

(۱) تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) تحفۃ الاخیار نولکشور، ص ۱۲۸، جون ۵۷ء، ص ۴۵۰۔

مترجم وشارح نے اس میں شیعہ اور اہل بدعت کے شبہات بھی جا بجا دفع کیے ہیں اور چاروں ائمہ کے مذاہب بھی مناسب جگہوں پر لکھے ہیں، لیکن فقہی مذاہب تحریر کرنے میں بالکل بے تعصبی سے کام لیا ہے۔(۱)

ذیل میں شرح و ترجمہ کے دو نمونے پیش کیے جاتے ہیں تا کہ ان کی اہمیت و خصوصیت کا اچھی طرح اندازہ ہو سکے۔

خ ابوھریرۃ من آمن باللّٰہ ورسولہ واقام الصلوٰۃ وصام رمضان کان حقاً علی اللّٰہ ان یدخلہ الجنۃ ھاجر فی سبیل اللّٰہ او حبس فی ارضہ التی ولد فیھا (۲)

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے سچے دل سے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو مانا، نماز کو ٹھیک سے ادا کیا اور رمضان کا روزہ رکھا، کرم اور فضل کی راہ سے ضرور ہو گیا خدا پر اس کو بہشت میں لے جانا، خواہ اپنا وطن اس نے خدا کی راہ میں جہاد کے واسطے چھوڑا ہو یا اسی زمین میں ٹھہرا رہا ہو جس میں پیدا ہوا۔

اس حدیث پر یہ فائدہ تحریر کیا ہے:

''اس حدیث کی پوری روایت بخاری میں ہے کہ اصحاب نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو ہم لوگوں کو خوش خبری سنا دیویں کہ بہشت، جہاد اور ہجرت پر موقوف نہیں، حضرتؐ نے فرمایا بہشت میں ایک سو بلند درجے ہیں کہ خدا نے نمازیوں کے واسطے مقرر کیے ہیں، ہر ایک درجے میں اتنا فرق ہے کہ جتنا آسمان و زمین میں، سو جب تم خدا سے مانگو تو فردوس مانگا کرو کہ

---

(۱) تحفۃ الاخیار نولکشور، ص ۱۲۸، بحوالہ معارف ۵۷، ص ۴۵۰۔ (۲) تحفۃ الاخیار، ص ۷ بحوالہ معارف جنوری ۴۸، ص ۵۴۔

فردوس سب بہشتوں کے درمیان ہے اور سب سے اونچی اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے، اسی سے ..... بہشت کی سب نہریں نکلی ہیں، یعنی ہر چند جہاد پر بہشت موقوف نہیں، اصل نجات کے واسطے ایمان اور نماز روزہ کفایت کرتا ہے لیکن تم ہمت کو پست نہ کرو کہ صرف نجات پر قناعت کرو بلکہ ہمت کو بلند رکھو، جہاد کرو تاکہ فردوس پاؤ جس کے آگے سب بہشتیں پست ہیں۔

اس حدیث میں فرشتوں اور خدا کی کتابوں کا اور تقدیر و قیامت کا ایمان لانا بیان نہیں فرمایا اس واسطے کہ جب آدمی رسول کا ایمان لایا تو ان کا بھی ضرور ایمان لاوے گا کہ تمام قرآن و حدیث میں ان کا بیان موجود ہے اور نماز روزہ کے ساتھ زکوٰۃ و حج کا ذکر نہیں فرمایا، اس واسطے کہ زکوٰۃ و حج صرف مالدار پر فرض ہے، محتاج پر نہیں اور نماز روزہ سب پر فرض ہے مالدار ہو یا محتاج، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حکم عام بیان فرمانا منظور ہوا جو سب مسلمانوں کو شامل ہے، مصنف نے ایمان کی حدیث مقدم کی اس واسطے کہ ایمان سب نیکیوں اور عبادت کی جڑ ہے، بدون ایمان کے کوئی عبادت اور نیکی درست نہیں۔''(۱)

ایک اور حدیث کا ترجمہ اور شرح ملاحظہ ہو:

م سمرة بن جندب والمغيرة بن شعبة من حدث عني بحديث وهو يرى انه كذب فهو احد الكاذبين

مسلم میں روایت ہے سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ سے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جو میری طرف سے روایت کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹی حدیث ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔

(۱) تحفۃ الاخیار، ص ۷و۸ بحوالہ معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۴و۵۵۔

ف: ''دو جھوٹے یعنی مسیلمہ کذاب اور مختار یا اسود عنسی جنھوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا، یا یہ مطلب کہ ایک جھوٹا وہ جس ناپاک نے حضرتؐ پر جھوٹ باندھا، دوسرا جھوٹا یہ کہ اس جھوٹی حدیث کو روایت کرتا ہے، جان بوجھ کے اکثر لوگ جو علم حدیث سے ناواقف ہیں، واہی تباہی حدیثیں نقل کیا کرتے ہیں جن کی کچھ اصل نہیں، مسلمان کو لازم ہے کہ حدیث میں بہت احتیاط کیا کرے، ہر ایک کتاب کی حدیث کو سچا نہ جانے، جو حدیث کی معتبر کتابوں میں ہو اس کو مانے، جیسے کہ یہ کتاب مشارق الانوار ہے کہ سب علمائے اہل سنت اس کو بہت صحیح جانتے ہیں۔''(۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محشی و شارح نے حدیث مافی الباب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کس خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس پر فائدہ سونے پر سہاگہ، یہ فوائد دراصل علم حدیث کی بے نظیر شرح ہے، شارح ناقل نہیں، صاحب بصیرت ہے، جس طرح ترجمہ تحفۃ الاخیار میں شرح کو سمو دیا ہے، اسی طرح شرح میں احادیث متذکرہ فی الباب کے ساتھ ان ٹکڑوں کو جوڑ دیا ہے جو ایک دوسرے سے علاحدہ ہونے کی وجہ سے بکھرے پڑے تھے۔(۲)

مولانا خرم علی نے اپنے ترجمہ و فوائد کی مقبولیت کے لیے خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا کی تھی، ان کی ایک منظوم دعا بھی تحفۃ الاخیار میں شامل ہے جو اس کے حسن قبول کے لیے کہی گئی تھی، اس کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

یارب ان اوراق کو مقبول کر
ہند کو اس فیض سے کر بہرہ ور
خرم افسردہ کو پرورد کر
الفت دنیا سے اسے سرد کر

(۱) مشارق الانوار، ترتیب فقہی والا ایڈیشن نور محمد، اصح المطابع کراچی، ص ا، بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۸۔ (۲) معارف جنوری ۴۸ء، ص ۵۵۔

تیری ہی دھن روح کو ہر دم رہے
تیرے غم عشق میں خرم رہے
یارب اس عاجز کی دعا کر قبول
خاتمہ بالخیر بحق رسول(۱)

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا جو دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی، قبول فرمائی اور تحفۃ الاخیار کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کتاب کے اب تک بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں، ذیل میں بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ سب سے پہلا ایڈیشن سنہ تالیف ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء کے تین سال بعد ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں مطبع محمدی لکھنؤ سے محمد حسین کے اہتمام میں چھپا جو نہایت دیدہ زیب تھا اور جس کی قیمت اس زمانہ میں ۱۵ روپے تھی۔

۲۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۴۶ء میں عبدالملک بن محمد صادق نے مطبع محمدی بمبئی سے اسے شائع کیا، انہوں نے بمبئی سے اس کو تین مرتبہ طبع کرایا، جس کی صراحت خود انہوں نے تحفۃ الاخیار کے بمبئی ایڈیشن میں کی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطبع محمدی لکھنؤ کا نسخہ بھی ختم ہوا تو نواب ذوالفقار علی مرحوم نے جو مولانا خرم علی کے قدر شناسوں میں تھے اس کو چھپوا کر مفت تقسیم کرایا۔

۳۔ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں محمد مصطفیٰ خان (م ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) نے اپنے مطبع مصطفائی کانپور سے اسے چھاپا، اس کی قیمت سات روپے تھی۔

۴۔ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں مطبع مصطفائی کانپور سے دوبارہ دو جلدوں میں طبع ہوا۔

۵۔ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مشکوٰۃ المصابیح کے ترجمہ کے حاشیہ پر مطبع محمدی مدراس سے شائع ہوئی۔

(۱) تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۵۷ء، ص ۴۴۹۔

۶۔۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں ایک ایڈیشن مطبع مخدومی بمبئی سے شائع ہوا۔

۷۔۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء میں محمد عبدالرحمٰن خان نے اپنے مطبع نظامی کانپور سے یہ ترجمہ مع فہرست فوائد شائع کیا۔

۸۔۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں انہوں نے پھر اسے شائع کیا۔

۹۔۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں مطبع حیدری سے طبع ہوا۔

۱۰۔۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مطبع نظامی کانپور سے تیسری دفعہ شائع ہوا، ابتدا میں فہرست تبصرۃ الابصار بھی منسلک تھی۔

۱۱۔۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں یہ کتاب مطبع نولکشور کانپور سے چھپی۔

۱۲۔۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں محمد تیغ بہادر کے زیر اہتمام مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں شائع ہوئی۔

۱۳۔۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں مطبع نولکشور سے دوبارہ چھپی۔

۱۴۔۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں فخر المطابع لکھنؤ نے شائع کیا۔

۱۵۔۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی۔

۱۶۔حال میں نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔(۱)

مولانا حکیم سید عبدالحیٰ نے مشارق الانوار کی مندرجہ ذیل ہندوستانی شرحوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۸ و ۲۹۔شرح محمد بن یوسف حسینی دہلوی، یہ صوفیانہ طرز کی ایک شرح ہے جو عربی میں لکھی تھی، انہوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی تھی۔

۳۰۔منور بن عبدالمجید لاہوری نے بھی ایک شرح لکھی تھی۔

۳۱۔ایک فارسی شرح محی الدین احمد بن محمد حسینی کردی نے تحریر کی تھی۔

(الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۵۵)

---

(۱) ان ایڈیشنوں کا مولانا عبدالحلیم چشتی نے اپنے مضمون مولانا خرم علی شائع شدہ جون ۵۷ء میں کیا ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صفحات ۴۵۰ تا ۴۵۳۔

شیخ علی متقی

(متوفی ۹۷۵ھ/ ۱۵۶۷ء)

نام ونسب: علی نام اور علاء الدین لقب تھا، نسب نامہ یہ ہے: علی بن حسام الدین ابن عبدالملک ابن قاضی خاں۔(۱)

عبداللہ محمد بن عمر آصفی نے علاء الدین کے بجائے نور الدین لقب تحریر کیا ہے۔(۲)

ولادت ووطن: ان کے آباواجداد کا وطن شیراز ہند جونپور تھا، اسی لیے ارباب تذکرہ انہیں جونپوری الاصل لکھتے ہیں (۳) مگر ان کا خاندان ان کی ولادت سے قبل برہان پور منتقل ہوگیا تھا، یہیں ۸۸۸ھ میں ان کی ولادت ہوئی، بعض مؤرخین نے ان کی سنہ پیدائش ۸۸۵ھ لکھا ہے (۴) آخر میں وہ مکہ معظمہ چلے آئے اور بیت اللہ کے جوار میں قیام پذیر ہوئے۔(۵)

اساتذہ: شیخ کی ابتدائی تعلیم کا حال معلوم نہیں ہوسکا اور اس کا بھی پتہ نہیں چل سکا کہ برہان پور کے کن لوگوں کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا، مؤرخین نے جن استادوں کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

شیخ حسام الدین متقی ملتانی: یہ شیخ علی متقی کے مرشد بھی تھے جو بڑے عابد وزاہد شخص اور ممتاز عالم تھے، شیخ ان کی خدمت میں دو برس رہے اور ان سے ظاہری وباطنی علوم کی

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۱ والنور السافر، ص ۳۱۵۔ (۲) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۵۔ (۳) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۲۔ (۴) النور السافر، ص ۳۱۷۔ (۵) اخبار الاخیار، ص ۲۴۱۔

تحصیل کی، تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ شیخ حسام الدین سے انہوں نے تفسیر بیضاوی اور کتاب عین العلم کا درس لیا۔ (۱)

شیخ ابوالحسن بکری، شافعی: اپنے زمانہ کے مسلمہ ولی و عارف باللہ تھے، شیخ علی متقی نے مکہ معظمہ میں ان سے استفادہ کیا اور حدیث کا درس لیا، ان سے انہیں خلافت بھی ملی تھی۔ (۲)

شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی مکی: یہ اپنے دور میں مکہ کے مفتی، بلند پایہ فقیہ اور مشہور عالم تھے، ابتدا میں شیخ علی نے ان سے کسب فیض کیا مگر آخر میں یہ خود شیخ علی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے، اہل تذکرہ لکھتے ہیں:

''مولانا علی متقی نے ابتدا میں شیخ ابن حجر صاحب صواعق محرقہ سے درس لیا مگر آخر میں خود شیخ ابن حجر نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔'' (۳)

ابن حجر کو ان سے ارادت و بیعت کا تعلق بھی ہو گیا تھا، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

شیخ ابن حجر مکی مفتی حرم محترم صاحب صواعق محرقہ در ابتدا حال استاد شیخ بود آخر خود را تلمیذ می خواند و رسم ارادات بجا آورد و خرقۂ خلافت پوشید۔ (۴)	شیخ ابن حجر مکی مفتی حرم و صاحب صواعق محرقہ ابتدا میں شیخ کے استاد تھے مگر آخر میں وہ اپنے کو ان کا شاگرد کہنے لگے تھے نیز ارادت کی رسم بھی بجا لائے اور شیخ سے خرقۂ خلافت بھی پہنا۔

شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں:

و بارہا خود را نسبت بخدمت شیخ تلمیذ حقیقی	شیخ ابن حجر مکی نے بارہا اپنے کو شیخ علی متقی کا

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۱۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔ ـ عین العلم و زین الحلم تصوف کی مشہور کتاب ہے، یہ دراصل امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء علوم الدین کا مختصر ہے، مصنف محمد بن عثمان بن عمر بلخی تھے، بعض لوگوں نے مصنف کو ہندی الاصل بتایا ہے، ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) نے اس کی شرح لکھی تھی جو اصل کے ساتھ قسطنطنیہ سے چھپ گئی ہے۔

می خواند و در آخر مرید شد و خرقۂ خلافت پوشید۔(۱)	شاگرد کہا ہے اور آخر میں وہ ان کے مرید بھی ہو گئے تھے اور ان سے خرقہ خلافت بھی پہنا تھا۔

ان لوگوں کے علاوہ مکہ میں اس وقت جو اصحاب علم وکمال تھے، ان سے بھی استفادہ کیا، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

ودیگر علما و مشائخ عصر را کہ دراں دیار شریف بودند دریافت استفادہ نمود۔(۲)	ان کے علاوہ اس متبرک علاقہ میں جو علما و مشائخ تھے ان کا پتہ لگا کر ان سے استفادہ کیا۔

تلامذہ: شیخ علی متقی کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، تذکرہ نگاروں نے صرف چند لوگوں کے نام لکھے ہیں جو یہ ہیں:

شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی: ان کا نام استادوں کی فہرست میں گزر چکا ہے۔

شیخ عبدالوہاب متقی: یہ شیخ علی متقی کے خاص مسترشد وخلیفہ تھے جنہوں نے علم ظاہر و باطن دونوں کی ان سے تحصیل کی تھی، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

> "شیخ علی متقی کے خیر و برکت کی سب سے بڑی نشانی اور ان کے کمالات کی زبردست دلیل ان کے سچے خلیفہ اور حقیقی دوست شیخ کامل اور عارف باللہ عبدالوہاب بن ولی اللہ حنفی، متقی، قادری ہیں، اللہ انہیں سلامت رکھے، یہ دائرۂ استقامت کے مرکز اور آسمان ولایت کے قطب ہیں، اس زمانہ میں یمن سے شام تک کے فقرا و مشائخ کا اتفاق ہے کہ وہ ولایت کبریٰ کے درجہ پر فائز ہیں۔"(۳)

شاہ عبدالحق صاحب کو ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تھا اور انہوں نے ان کے حوالے سے اخبار الاخیار میں شیخ کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۲۔ (۲) ایضاً، ص۲۴۱۔ (۳) ایضاً، ص۲۴۳۔

محمد بن طاہر پٹنی: یہ مشہور محدث اور بحار الانوار جیسی عظیم الشان کتاب کے مصنف تھے، ان کا مستقل تذکرہ اس کتاب میں آگے آئے گا، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

"علم کی تحصیل کے لیے مکہ معظمہ گئے تو شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے،

ان کے مرید ہوئے اور ان سے خیر و برکت لے کر وطن واپس آئے۔"(۱)

شیخ چیلہ: آصفی نے تاریخ گجرات میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ شیخ علی متقی کے خاص شاگرد اور معتمد علیہ مرید تھے۔(۲)

عبدالصمد: آصفی نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ شیخ نے گجرات میں انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ (ظفر الوالہ، ج۱،ص ۳۱۸)

رحلت و سفر: شیخ اپنے وطن برہان پور سے علوم و فنون کی تحصیل اور تصوف و سلوک میں حصول کمال کے لیے پہلے ملتان گئے، پھر حرمین شریفین تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی، اس کے بعد وہ کئی بار ہندوستان میں گجرات کے علاقہ میں تشریف لائے اور لوگوں کو فیضیاب کیا۔

بعض تذکرہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ وہ ۹۵۳ھ میں حرمین کے لیے روانہ ہوئے تھے، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

آنجناب در ۹۵۳ھ شریفین خرامید و در مکہ معظمہ رحل اقامت افگند۔(۳)	شیخ علی متقی ۹۵۳ھ میں حرمین تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں مستقل قیام پذیر ہو گئے۔

مگر یہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ شیخ عبدالوہاب شعرانی صاحب طبقات نے ۹۴۷ھ میں مکہ معظمہ میں ان سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

نزيل مكة اجتمعت به فيها سنة سبع	شیخ علی متقی مکہ میں بود و باش اختیار کیے ہوئے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴ تذکرہ میاں محمد طاہر۔ (۲) ظفر الوالہ، ج۱، ص ۳۱۶۔ (۳) مآثر الکرام، ج۱، ص ۱۹۳۔

واربعین و تسع ماۃ (۱)	تھے، میں نے وہاں ان سے ۹۴۷ھ میں ملاقات کی تھی۔

یہ تو مسلم ہے کہ وہ مکہ معظمہ سے کئی بار گجرات تشریف لائے، شاہ عبدالحق صاحب دہلوی مکہ معظمہ میں ان کے قیام اور مشاغل کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

بعدازاں بدیار گجرات قدوم آوردند (۲)	اس کے بعد علاقہ گجرات میں تشریف لائے۔

پہلی دفعہ وہ سلطان بہادر کے زمانہ میں گجرات وارد ہوئے تھے، شاہ صاحب کا بیان ہے:

وسلطنت ایں دیار دراں زماں بدست تصرف سلطان بہادر بود۔ (۳)	اس زمانہ میں یہ علاقہ سلطان بہادر کے زیر تصرف تھا۔

اس کے بعد اس بادشاہ کا بھتیجا محمود شاہ دوم تخت نشین ہوا جس کے عہد میں شیخ علی متقی دوبار ہندوستان تشریف لائے (۴) سلطان بہادر جس کے زمانہ میں پہلی دفعہ گجرات آئے ۹۴۳ھ میں شہید کر دیا گیا تھا (۵) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۹۴۳ھ سے بھی پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے، ممکن ہے آزاد بلگرامی کے بیان میں کچھ تصحیف ہوگئی ہو۔

شاہ عبدالحق صاحب نے ان کے ملتان کے قیام کے زمانہ کا ایک معمول یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس کے گردونواح کے بعض ایسے شہروں میں چلے جاتے تھے جو نیک لوگوں کا مسکن ہوتا اور جو جگہ مناسب اور بہتر ہوتی اور جہاں آسانی سے عبادت کر سکتے تھے چند روز قیام فرماتے، سفر میں دو تھیلے ان کے ساتھ ہوتے تھے، ایک میں عام ضرورت کی چیزیں اور کھانے پینے کا سامان چاول، دال، تیل، گھی اور نمک نیز کھانا پکانے کے برتن ہوتے، لکڑیاں خود جنگل سے جا کر لاتے اور دو دن کا سامان تین دن تک اور تین دن کا چار دن تک

(۱) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶۔ (۵) ایضاً ص ۲۲۰۔

استعمال کرتے، کبھی مسجد میں نہ ٹھہرتے بلکہ کرایہ کے مکان میں رہتے، چقماق جلا کر آگ سلگاتے اور ایک لوٹا بھی ساتھ ہوتا جس میں ایک مشک پانی آتا تھا، اس سے کھانا پکاتے، وضو اور ضرورت کے وقت غسل فرماتے۔

معمول تھا کہ پاک پانی سے پہلے برتن دھوتے، پھر خود ہی کھانا پکاتے اور کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے، اگر کسی سے کام لینے کی ضرورت پڑ ہی جاتی تو پہلے اسے اجرت دے دیتے، تب کام کراتے۔

دوسرے تھیلے میں قرآن مجید اور بعض ضروری کتابیں رہتی تھیں، غرض اسی خوبی اور صفائی سے سفر کرتے تھے، اگر کوئی شخص صحبت میں رہنا چاہتا یا خدمت کرنا چاہتا تو اس سے معذرت کر دیتے۔ (اخبار الاخیار، ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

مجلس درس و افادہ: شیخ علی متقی دینی علوم کے فاضل و ماہر بھی تھے اور سلوک و تصوف میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ان کا بیشتر وقت علم کی اشاعت اور افادہ و فیضان میں بسر ہوتا تھا، ان کے خاص شاگرد و مسترشد شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

غالب اوقات ایشاں بنشر و افادہ علم (۱) ان کا زیادہ وقت علم کی نشر و اشاعت اور دوسروں کو علمی فائدہ پہنچانے میں صرف ہوتا۔

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ ''شیخ علی متقی کی علوم ظاہر و باطن کی نشر و اشاعت کا غلغلہ ملاءِ اعلیٰ تک پہنچا ہوا تھا۔'' (۲)

مکہ میں ان کی مجلس درس ظاہری و باطنی علوم کا سرچشمہ تھی، شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

و بآثار اضافت علوم دینی و افاضت معارف یقینی مستنیر و مستفید ساخت۔ (۳) انہوں نے دینی علوم اور یقین و معرفت سے (ایک عالم کو) منور اور فیضیاب کیا۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔

طالبین کا جم غفیر ان کے بحر علم ومعرفت سے سیراب ہونے کے لیے ہر وقت ان کی خدمت میں موجود رہتا تھا، شیخ عبدالوہاب شعرانی مکہ میں ان کی قیام گاہ پر طلبہ کی کثرت اور سالکین کے ہجوم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ مجھے اپنے گھر لوا گئے تو میں نے درویشوں اور طالبین کی ایک جماعت دیکھی جو ان کے گھر کے اردگرد صحن کے کناروں پر بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہتی تھی، ہر درویش کے لیے ایک ایک جھونپڑا تعمیر کیا گیا تھا، جس میں وہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتا تھا، کچھ لوگ تلاوت کرتے نظر آئے، بعض ذکر وفکر میں لگے ہوئے تھے، چند لوگ مراقبے میں تھے اور بعض حضرات علمی مطالعہ میں منہمک تھے، میں نے مکہ میں اس سے اچھا اور بہتر منظر نہیں دیکھا۔" (۱)

آصفی تاریخ گجرات میں لکھتا ہے:

> "گجراتی بادشاہ محمود شاہ ثانی نے مکہ میں اپنی رباط کے قریب شیخ علی متقی کی رہائش کے لیے ایک گھر تعمیر کرایا تھا جس کے سامنے ایک وسیع، کشادہ اور بڑا صحن تھا، اس کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے، بعد میں ان کے مریدین اور سندھ سے سلوک وطریقت کی تعلیم وتربیت کے لیے آنے والے قیام کرتے تھے۔" (۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حلقۂ درس اور دائرۂ فیض کتنا وسیع تھا اور ان کا گھر دینی علوم کی تحصیل کرنے والوں اور سلوک وتصوف کے طالبین کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ان کے درس کا انداز بہت باوقار تھا، وہ متانت اور سنجیدگی سے مجلس درس میں رونق افروز ہوتے تھے، ان کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ:

---

(۱) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۲) ظفر الوالہ، ص ۳۱۶۔

"اگر مجلس درس میں حاضرین میں باہم کوئی بحث چھڑ جاتی تب بھی
وہ خاموش رہتے اور بلاضرورت ایک فقرہ بھی زبان سے نہیں کہتے تھے،
ہاں جب ضرورت محسوس کرتے تو بقدر ضرورت کچھ ارشاد فرما دیتے۔"(۱)

درس میں کتب حقائق واسرار اور توحید وغیرہ کے مشکل مسائل کی توضیح وتفہیم میں وہی طریقہ وانداز اختیار کرتے جو بزرگوں کا تھا۔(۲)

علم حدیث سے شغف: شیخ علی متقی بلند پایہ محدث تھے اور اس حیثیت سے ان کو بڑی شہرت نصیب ہوئی، تذکرہ نگاروں نے انہیں المحدث لکھا ہے، انہوں نے اپنے زمانہ کے کبار محدثین سے اس فن کی تحصیل کی تھی اور خود ان کے درس حدیث سے بے شمار لوگوں کو فیض پہنچا، حدیث سے ان کا اشتغال مدۃ العمر قائم رہا، بڑھاپے میں آدمی کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ نقل وحرکت سے بھی معذور ہو جاتا ہے.....مگر وہ اس عمر میں بھی کتب حدیث کی مراجعت، مقابلہ، تصحیح، مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں شب وروز منہمک رہتے تھے، اس لیے فن حدیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی اور اس فن کے نکتوں اور باریکیوں سے انہیں مکمل واقفیت تھی، شاہ عبدالحق صاحب دہلوی نے احادیث سے ان کے اشتغال اور اس میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وہ سنن واحادیث نبویؐ کے تتبع میں آخر عمر تک مشغول رہے، ایام
پیری میں جب کہ بتقاضائے عمر جنبش کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا، وہ شب وروز
کتب احادیث کی تالیف، تصحیح اور مقابلہ کے کام میں منہمک رہتے تھے،
لوگ بیان کرتے ہیں کہ دقائق کے فہم ومعرفت اور معانی ونکات کے استنباط و
استخراج میں ایسے بلند درجے پر فائز تھے کہ ماہرین اور علمائے فن بھی حیرت و
تحسین ظاہر کیے بغیر نہیں رہتے تھے، شیخ ابن حجر مکی کو جو اپنے زمانہ میں مکہ کے

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) ایضاً۔

بڑے فقہا و علما میں شمار کیے جاتے تھے اور ابتدا میں شیخ علی متقی کے استاد بھی تھے، اگر کسی حدیث کے مفہوم میں تردد و تامل ہوتا تو شیخ کے یہاں کہلا بھیجتے کہ جمع الجوامع کی تبویب میں اس حدیث کو کس باب میں رکھا ہے تاکہ اس نشان دہی کے بعد قرینہ وقیاس سے انہیں حدیث کا مطلب اخذ کرنے میں آسانی ہو۔''(۱)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث نبویؐ کی خدمت کے لیے ان کی زندگی وقف تھی، اس کے درس و مطالعہ کتب حدیث کی تصحیح و مقابلہ نادر و نایاب کتابوں کی تلاش و جستجو اور ان کی اشاعت کے لیے سعی و کوشش کے علاوہ وہ اس فن میں تصنیف و تالیف کا کام بھی برابر انجام دیتے تھے، علم الحدیث میں ان کی تصنیفات کا ذکر آگے آرہا ہے۔

علم و فضل: وہ نہایت فاضل اور یکتائے روزگار تھے، اصول و فروع اور معقولات و منقولات میں دسترس رکھتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

''مکہ معظمہ کے عوام و خواص ان کے غیر معمولی فضل و کمال کے معترف تھے۔''(۲)

شاہ عبدالحق صاحب رقم طراز ہیں:

''ان کے دور کے تمام اکابر و مشائخ کو ان کے کمال فضل کا اعتراف تھا۔''(۳)

محی الدین عیدروسی لکھتے ہیں:

''علما میں جو ان سے ملتا اور جس سے یہ خود ملتے وہ ان کی مدح و تصنیف میں رطب اللسان رہتا تھا۔''(۴)

حقیقت یہ ہے کہ شیخ علی متقی اپنی علمی عظمت، فضل و کمال اور جامعیت کی بنا پر

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۴) النور السافر، ص ۳۱۷۔

''سرمایۂ نازش ہندوستان'' تھے۔(۱)

علما وزہاد سے تعلق اور اہل علم، مشائخ وطلبہ کی امداد وتکریم: وہ علما اور دینداروں سے بڑا تعلق رکھتے تھے، ان کی ملاقات کے لیے خود بھی تشریف لے جاتے اور انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دیتے، شیخ عبدالوہاب شعرانی مشہور صوفی اور صاحب علم تھے، ان کا بیان ہے کہ مکہ معظمہ میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کی ایک دوسرے کے یہاں آمد ورفت رہتی تھی۔

تردّدت الیه وتردّد الیّ (۲) میں ان کے گھر جاتا اور وہ میری قیام گاہ پر تشریف لاتے۔

ان کے ایک مسترشد خاص عبدالوہاب متقی کا بیان ہے:

''ایک دفعہ مکہ معظمہ میں شیخ کی زندگی میں بلاد مغرب کے دو شخص وارد ہوئے، یہ دونوں باپ بیٹے تھے اور بڑے عبادت گزار اور زاہد مرتاض تھے، شیخ نے جب ان کی تعریف سنی تو ان سے ملنے کا قصد وارادہ کیا مگر اس زمانہ میں ان پر ایسا ضعف طاری تھا کہ پیدل چلنے کی قوت نہ تھی، اس لیے فرمایا کہ اگر ہمارا کوئی دوست ہم کو اپنے کندھوں پر بیٹھا کر لے جائے تو ہم وہاں جاسکتے ہیں، یہ سن کر ایک مضبوط اور توانا آدمی اس کے لیے تیار ہو گیا چنانچہ اسی کے دوش پر سوار ہوکر ان دونوں حضرات کے پاس گئے اور مجھے بھی حکم دیا کہ ان کی کتاب حکم کبیر کا نسخہ لے کر ساتھ چلوں۔''(۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب علم وزہد سے ملنے کے لیے کس قدر بے چین اور مشتاق رہتے تھے، انہیں علما اور طلبہ کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کا بھی خیال رہتا تھا اور ان کی ہر قسم کی امداد واعانت بھی کرتے رہتے تھے، شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) النور السافر، ص ۳۱۹۔ (۲) الطبقات الکبریٰ، ج ۲۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۶۔

''علم کی نشر واشاعت اور اہل علم کی امداد واعانت کے لیے ان کی زندگی وقف تھی، وہ طلبہ کے لیے کتابیں مہیا کرتے اور ان کی نقل وکتابت کا بندوبست کرتے، اپنے ہاتھ سے روشنائی بناتے اور انہیں دیتے، ملک عرب میں جو مفید، نادر اور کمیاب کتاب دستیاب ہو جاتی، اس کی نقلیں کرا کے جسے مناسب خیال کرتے مرحمت فرماتے اور جن شہروں میں وہ کتاب موجود نہ ہوتی وہاں بھی اسے بھجواتے۔''(۱)

بیعت وارادت: وہ ابھی سات آٹھ برس ہی کے تھے کہ ان کے والد بزرگوار انہیں شاہ باجن چشتی کی خدمت میں لے گئے جو برہان پور ہی میں مقیم تھے اور شیخ علی متقی کو ان کا مرید کرا دیا، تھوڑے عرصہ بعد والد کا انتقال ہو گیا، اس وقت عمر کے تقاضے کی بنا پر طبیعت دنیوی لذتوں کی جانب کسی قدر مائل ہوئی مگر توفیق الٰہی نے یاوری کی اور دنیا کی حقارت اور ناپائیداری کا نقش دل میں ایسا جاگزیں ہوا کہ شیخ عبدالحکیم بن شاہ باجن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشائخ چشت کا خرقہ پہنا، اس کے بعد ملتان گئے اور شیخ حسام الدین ملتانی متقی کی صحبت اختیار کی اور ان کی برکت سے ورع وتقویٰ، سلوک ومعرفت اور طریقت کے درجات ومراتب طے کیے، دو برس بعد یہاں سے تقویٰ کا زادراہ لے کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور شیخ ابوالحسن بکری کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کی ولایت اور بزرگی پر اس زمانہ کے لوگ متفق تھے، ان سے اور ایک اور بزرگ شیخ محمد بن محمد سخاوی سے سلسلۂ عالیہ قادریہ وشاذلیہ میں بیعت ہوئے۔(۲)

شیخ علی نے خود اپنی بیعت وارادت کا حال اس طرح لکھا ہے:

''میرے والد نے مجھے بچپن ہی میں شیخ باجن رحمۃ اللہ کا مرید کرا دیا تھا، جن کا طریقہ سماع وصفا اور اہل ذوق ووجد کا تھا، مشائخ کے نزدیک اگر

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۱۔

کوئی شخص بچپن میں کسی کا مرید ہو جائے تو سن تمیز و رشد کو پہنچنے کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے تو اسی شیخ سے وابستہ رہے اور چاہے تو کسی اور شیخ کا انتخاب کرلے، میں نے اپنے والد کی موافقت کی مگر جب ان کا اور میرے شیخ کا انتقال ہو گیا تو میں نے ان کے صاحبزادے شیخ عبدالحکیم سے مشائخ چشت کا خرقہ پہنا، اس کے بعد مجھے ایسے مرشد اور شیخ کی تلاش ہوئی جو راہ حق و حقیقت کے اہم معاملات میں میری راہنمائی کرے، اس غرض سے میں نے ملتان کا سفر کیا اور شیخ عارف حسام الدین متقی کی خدمت و صحبت میں ایک مدت تک رہا، ان کا طریقہ ارباب تقویٰ کا تھا، اس کے بعد میں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوا اور عارف باللہ شیخ ابوالحسن بکری کی خدمت میں پہنچا جن سے سلاسل قادریہ، شاذلیہ اور مدینیہ کے خرقے پہنے، میں نے ان تینوں کے سلسلوں کے خرقے شیخ بن محمد سے بھی پہنے۔"(۱)

غرض شیخ علی متقی کو تصوف کے مختلف سلسلوں میں بیعت و اجازت حاصل تھی، پہلے تو وہ شیخ عبدالحکیم بن باجن سے چشتیہ سلسلہ میں بیعت ہوئے، پھر قادریہ، شاذلیہ، مدینیہ سلسلوں سے وابستہ ہوئے جن کے دو خرقے بزرگوں شیخ ابوالحسن بکری اور شیخ محمد بن محمد سخاوی سے پہنے۔(۲)

تصوف کے سلاسل میں قادریہ اور چشتیہ بہت مشہور ہیں، شاذلیہ سلسلہ کی نسبت قطب الوقت شیخ نورالدین ابوالحسن علی حسن شاذلی کی طرف ہے اور مدینیہ سلسلہ شیخ ابومدین شعیب مغربی پر منتہی ہوتا ہے(۳) اسی بنا پر وہ شاذلی، مدینی، چشتی اور قادری کی نسبتوں سے مشہور ہیں، متقی کی نسبت ان کے ملتانی شیخ اور عارف باللہ حضرت حسام الدین متقی کی جانب ہوگی، وہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲ و ۲۴۳ والنور السافر، ص ۳۱۸ و ۳۱۹۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۳۔ (۳) ایضاً، ص ۲۴۶۔

فلما وصلت الی الملتان صحبت الشیخ حسام الدین و کان طریقه طریق المتقین (۱)	میں جب ملتان پہنچا تو شیخ حسام الدین کی صحبت اختیار کی، ان کا طریقہ متقیوں کا تھا۔

صاحب ظفر الوالہ لکھتے ہیں کہ وہ متقی کے لقب سے مشہور تھے اور:

الالقاب تنزل من السماء (۲)	(ناموں کی طرح) لقب (بھی) آسمان (خدا کی طرف سے) اترتا ہے۔

تصوف وسلوک: شیخ کا اصلی طغرائے امتیاز تصوف وسلوک میں امتیاز وکمال ہے، ان کی زیادہ شہرت اسی حیثیت سے ہے، تصنیف وتالیف وغیرہ میں تو علمائے ظاہر بھی ممتاز اور صاحب کمال ہوتے ہیں لیکن کشف وکرامات، باطنی کمالات، عبادت وریاضت اور زہد واتقا میں وہ اپنی مثال آپ تھے، تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا اور تصوف میں ان کے درجۂ کمال کا اعتراف کیا ہے، عبدالوہاب شعرانی نے انہیں ''الشیخ الکامل'' لکھا ہے۔(۳)

صاحب النور السافر رقم طراز ہیں:

العالم الصالح الولی الشهیر العارف باللّٰه تعالیٰ (۴)	عالم صالح، مشہور ولی اور عارف باللہ تھے۔

صاحب ظفر الوالہ کا بیان ہے کہ:

وامامهم فی وقته العابد الزاهد المتصوف الافقه (۵)	وہ اپنے زمانہ کے امام، عابد وزاہد اور صوفی و فقیہ تھے۔

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''مکہ معظمہ کے عوام وخواص ان کی ولایت کے معترف تھے۔''(۶)

---

(۱) النور السافر ص ۳۱۵۔ (۲) ظفر الوالہ، ص ۳۱۵۔ (۳) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۴) النور السافر، ص ۳۱۵۔ (۵) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۵۔ (۶) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔

شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

جمیع مشائخ و اکابر آں وقت بکمال فضل و ولایت وے معترف و در رعایت تعظیم و تکریم وے متفق بودند والآن نیز خواص و عوام آں دیار چنانچہ مشائخ سلف را یاد کنند اورا نیز یاد می کنند۔(۱)	اس زمانہ کے تمام مشائخ اور اکابر علما ان کے فضل و ولایت میں کمال کے معترف اور ان کی تعظیم و تکریم کی رعایت اور اعتراف میں متفق تھے اور اب بھی مکہ معظمہ وغیرہ کے عوام و خواص انہیں اسی طرح یاد کرتے ہیں جس طرح بزرگانِ سلف کو یاد کرتے ہیں۔

ان کی ولایت اور سلوک و معرفت میں عظمت کے ان کے اساتذہ، شیوخ، معاصرین اور مرشدین بھی پوری طرح معترف تھے، شیخ ابن حجر مکی ان کے استاد ہونے کے باوجود ان کی ولایت کے ایسے معترف ہوئے کہ انہی سے بیعت و خلافت حاصل کی جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

شیخ حسام الدین متقی مشہور شیخ طریقت بھی تھے اور صاحب علم و کمال بھی، جن کی خدمت میں شیخ علی متقی دو برس تک رہ کر ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کرتے رہے، ان کی نسبت شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

> ''ان کے یہاں قیام کے زمانہ میں شیخ علی متقی جب خلوت میں رہتے تو شیخ حسام الدین اپنے سر پر کتابیں اٹھائے ہوئے ان کے کمرے کے دروازے تک آتے اور اندر داخل ہونے کے لیے اس طرح اجازت طلب کرتے ''حسام الدین آیا ہے، کیا فرماتے ہیں؟'' دو ایک بار اسی طرح فرماتے، اگر کمرے کا دروازہ کھلتا تو نشست فرماتے اور اس وقت تک تفسیر بیضاوی کا باہم مذاکرہ کرتے جب تک شیخ کے وقت میں گنجائش ہوتی،

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔

لیکن اگر دروازہ نہ کھلتا تو واپس تشریف لے جاتے۔''(۱)

یہ بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ زہد و اتقاان کی سرشت میں داخل تھا اور رشد و ہدایت اور صلاح و تقویٰ سے انہیں فطری دلچسپی تھی، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں''ان کے مزاج میں ورع و تقویٰ کا غلبہ تھا اور صلاح ان کی فطرت میں داخل تھا''(۲) اس لیے شروع ہی سے خیر و صلاح اور ورع و تقویٰ کے آثار ان میں نمایاں رہے ہوں گے، اس بنا پر ان کے مرشد بھی ان کا اس قدر خیال کرتے تھے اور احترام سے پیش آتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب متقی شیخ حاجی نظر بدخشی کے بارہ میں فرماتے ہیں:

''یہ مرد کامل علم و ریاضت کی تحصیل اور ماوراء النہر، شام اور مصر کے مشائخ کی دریافت و ملاقات کے بعد اصلاح و تربیت نفس کی تکمیل کے لیے حرمین شریفین پہنچے، میرے خیال میں یہ اکابر اولیاء اللہ میں تھے جو نہایت بلند درجات و مراتب پر فائز تھے اور ان سے آثار کمال بھی نمایاں تھے، ایسے بزرگ اور اس پایہ کے ولی اللہ بھی شیخ علی متقی سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور بڑی خصوصیت برتتے تھے۔''(۳)

یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ بلاد مغرب سے آئے ہوئے دو اشخاص سے ملنے کے لیے وہ معذوری کی وجہ سے اپنے ایک عقیدت مند کے کندھے پر سوار ہو کر گئے تھے، جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ اس پایہ کے مشہور بزرگ تشریف لائے ہیں تو اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے ہماری شہرت ہو جائے گی اور ملاقات کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ جائے گا، جس سے وقت برباد ہو گا اور عبادت و ریاضت میں خلل آئے گا، اس لیے شروع میں یہ دونوں حضرات شیخ سے زیادہ انشراح و انبساط کے ساتھ نہیں ملے اور کسی قدر بے توجہی بھی اختیار کی، شیخ نے

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۳۔ (۲) ایضاً، ص۲۴۱۔ (۳) ایضاً، ص۲۴۷۔

اسے محسوس کرلیا اور فرمایا کہ میں نے ایک کتاب جمع کی ہے جو مشائخ کے اقوال کا مجموعہ ہے پھر شیخ عبدالوہاب متقی کو اس کا کوئی حصہ پڑھنے کا حکم دیا، انہوں نے ابھی تھوڑا ہی سا پڑھا تھا کہ اس کی گرمی و تاثیر سے یہ دونوں حضرات بے اختیار ہو گئے اور فرحت و انبساط ظاہر کرنے لگے، اس کے بعد وہ دونوں حضرت شیخ علی متقی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کی خدمت میں برابر استفادہ کے لیے حاضر ہوتے اور بالآخر ان کے مرید بھی ہو گئے۔(۱)

قاضی عبداللہ سندھی اہل علم و تقویٰ اور اصحاب صلاح میں تھے، حوادث روزگار کی بنا پر وہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین سمیت سندھ کی سکونت ترک کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے، چندے گجرات میں بھی رہے اور شیخ سے بڑی محبت و مودت اور عقیدت مندی کا تعلق رکھتے تھے۔(۲)

غرض ان کے شیوخ، اساتذہ اور معاصرین اور وہ تمام لوگ جن سے وہ ملے یا جو ان سے ملے، سب ہی ان کے گرویدہ اور مداح تھے، محی الدین عیدروسی کا بیان ہے:

> ''عارفین اور علمائے ربانی میں سے جو بھی ان سے ملا یا جس سے وہ خود ملے وہ سب ان کی بے حد تعریف کرتے تھے، جیسے ہمارے شیخ تاج العارفین ابوالحسن بکری، امام الحرمین شہاب بن حجر شافعی، فقیہ مصر شمس الدین رملی انصاری اور ہمارے شیخ اور فصیح العصر شمس بکری وغیرہ ان کے مداح تھے اور ان لوگوں سے جو کچھ منقول ہے وہ شیخ علی متقی کی خدمت میں ان کی مدح اور غیر معمولی توصیف ہے۔''(۳)

عیدروسی ان کے اوصاف و محامد بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ لکھتے ہیں:

وبالجملة فما كان هذا الرجل الا من حسنات الدهر وخاتمة اهل الورع	خلاصہ یہ ہے کہ یہ شخص زمانہ کی خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ تھا، اس کی ذات پر ورع و تقویٰ

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۶۔ (۲) ایضاً، ص ۲۲۴۔ (۳) النور السافر، ص ۳۱۷۔

ومفاخر الهند وشهرته تغني عن ترجمته و تعظيمه في القلوب يغني عن مدحه (۱)	کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی شخصیت ہندوستان کے لیے سرمایۂ فخر و ناز تھی ، اس کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی جو عظمت و برتری پیوست ہے وہ اس کی مدح وتوصیف سے بالاتر ہے۔

وہ تصوف میں ممتاز ہونے کے باوجود اس کی بے اعتدالیوں سے پاک تھے، اسی لیے وحدۃ الوجود کے بارہ میں افراط وتفریط پر مبنی خیالات کی اصلاح کی اور شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت بھی کی۔ (رود کوثر، ص ۳۵۳، ۳۵۴)

اصلاح وتربیت کا طریقہ: طالبین اور مریدین کی تربیت وارشاد اور ان کی اصلاح و تزکیہ کے طریقہ سے بھی شیخ کے تصوف میں کمال کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے مرید خاص شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

> ''بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ طالبین کے نقائص اور اندرونی خرابیوں کو دور کرنے کے بجائے انہیں ان کے حال پر چھوڑے ہوئے ہیں، مگر باطنی طور پر وہ ان کی تربیت کے کام میں مشغول رہتے تھے اور پوری توجہ اور اہتمام سے اس طرح تربیت فرماتے تھے کہ انہیں اس کا کوئی پتہ بھی نہیں چلتا تھا، یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد بالکل نمایاں اور بدیہی طور پر یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اب ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں پہلے نہیں تھے، خود اس فقیر کے ساتھ بھی اس طرح کا معاملہ پیش آ چکا ہے، جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دو برس تک اسے سرے سے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہیں، اذکار و اوراد اور مجاہدات وغیرہ کسی چیز کی

(۱) النور السافر، ص ۳۱۹۔

تلقین نہیں فرمائی، البتہ جو وقت ان کی خدمت میں گزرتا اس میں زیادہ تر اپنی تصنیفات کی کتابت ونقل اور مقابلہ کا حکم دیتے، لطف یہ ہے کہ سالک ان کے کام میں لگا ہوتا اور وہ خود سالک کا کام کرتے رہتے تھے، اس طرح دو سال کے بعد ہمیں اس وقت اپنے اندر تبدیلی کا احساس ہوا جب ہم ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں پہلے نہیں پہنچے تھے۔

دراصل مریدین وطالبین کی اصلاح وتربیت کے معاملہ میں صوفیہ ومشائخ کے دو طریقے ہیں، بعض صوفیہ کرام سالکین کو ان کے پرانے طور د طریق سے ہٹا کر انہیں دوسرے کاموں کی تعلیم وتلقین کرتے ہیں، لیکن یہ طریقہ مشکل ہے، سلوک وتصوف کے ابتدائی مراحل میں خاص طور پر اس سے دشواری پیش آتی ہے، اس لیے دوسرے صوفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ مریدین کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود ان کے کام، ان کی اصلاح وتزکیہ اور ان کے عادات واطوار کو تبدیل کرنے میں لگ جاتے ہیں، یہاں تک کہ سالک کے کام میں ایسی جلا اور صفائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مقصود ومطلوب تک پہنچ جاتا ہے، یہ طریقہ سہل اور آسان ہے۔" (۱)

ورع وتقویٰ اور کثرت عبادت وریاضت: تصوف وسلوک میں ان کی عظمت اور بلند پائیگی اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ بڑے زاہد، متورع، متقی اور عبادت گزار شخص تھے، عبادت وریاضت اور مجاہدہ سے انہیں خاص شغف تھا، ورع وتقویٰ، طہارت وعفت ان کے مزاج میں داخل تھی، عبدالوہاب شعرانی نے انہیں صاحب ورع اور زاہد لکھا ہے (۲) محی الدین عیدروسی کا بیان ہے کہ "وہ عالم باعمل، اللہ کے مقبول اور صالح بندے اور ورع و تقویٰ میں نہایت عظیم المرتبت تھے، غیر معمولی عبادت وریاضت ان کا شعار تھی اور وہ برائیوں

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴ و ۲۴۵۔ (۲) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔

سے کنارہ کش رہتے تھے، علامہ فاکہی نے **القول النقی فی مناقب المتقی** کے نام سے ایک مستقل رسالہ میں ان کی سیرت حمیدہ اور ریاضت عظیمہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے ایسے مجاہدات شاقہ بیان کیے ہیں جو عقل کو مبہوت اور حیران کر دیتے ہیں، اس میں بھی انہوں نے یہ کیسی عمدہ بات لکھی ہے کہ "ہمارے شیخ کا نام علی اور لقب متقی واقعی اسم بامسمیٰ اور ان کے عظیم درجہ و مرتبہ کا آئینہ دار ہے۔"(۱)

شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

"تصنیف و تالیف اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں تو وہ علمائے ظاہر بھی جن کو خدا توفیق و برکت عطا کرتا ہے ممتاز ہوتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر ریاضات، مجاہدات، کرامات، محاسن اخلاق، محامد اوصاف، رزانت افعال، متانت احوال، ظاہر و باطن کے آداب کی رعایت اور ورع و تقویٰ کے سلسلہ میں ان کے بارے میں جو کچھ نقل و بیان کیا جاتا ہے وہی دراصل ان کے باطنی کمالات اور حقیقی احوال کی اصلی دلیل ہے۔"(۲)

آزاد بلگرامی نے بھی ان کی کثرت ریاضت و تقویٰ کا ذکر کیا ہے۔(۳)

وہ عبادت و ریاضت کی کثرت کی وجہ سے بڑھاپے میں بہت کمزور ہو گئے تھے، اس کی وجہ سے خواہش و حوصلہ کے مطابق اور پہلے کی طرح عبادت نہیں کر سکتے تھے جس کا انہیں بڑا قلق رہتا تھا، تاہم شاہ عبدالحق صاحب نے ان کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی سے اس زمانہ کی ریاضت و عبادت کا حال اور نفل نماز کی تعداد دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ:

"جوانی میں بکثرت نفل نماز پڑھتے تھے لیکن آخر عمر میں زیادہ تر ذکر خفی، تفکر اور دینی علوم پر کتابوں کی تصنیف و تالیف سے سروکار رکھتے تھے، علاوہ ازیں ضعف اور بول کا عارضہ بھی لاحق تھا جس کی وجہ سے پیشاب

---

(۱) النور السافر، ص ۳۱۵ و ۳۱۷۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۳) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۳۔

کے لیے رات میں دس یا بارہ مرتبہ اٹھنا پڑتا تھا اور جب پیشاب کے لیے
اٹھتے تو وضو کر کے ہر ہر دفعہ دو یا چار یا حسب توفیق اس سے زیادہ رکعتیں
نماز ادا کرتے تھے۔''(۱)

دنیا سے نفرت اور بے رغبتی: شیخ علی متقی کی نگاہ میں دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، انہوں نے اس کی طلب اور مال وزر کی تحصیل کو کبھی مقصود نہیں بنایا، ابتدا میں کسب معاش کی کچھ فکر دامن گیر رہی اور عمر کے اقتضا سے دنیاوی لذتوں سے بھی کسی قدر رغبت ہوئی، نو جوانی میں مانڈو میں ایک بادشاہ کے یہاں ملازمت کر کے بھی کچھ کمایا مگر بہت جلد خدا کی محبت کی کشش اور اس کی توجہ وعنایت سے دنیا کی نفرت وحقارت اور اس کی بے اعتباری اور ناپائیداری نظر میں رچ بس گئی (۲) چنانچہ دنیا کے مال ومتاع سے بے رغبتی کا یہ حال تھا کہ سلطان بہادر کوان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، مگر وہ ملنے سے پہلو تہی کرتے رہے، یہاں تک کہ قاضی عبداللہ سندھی کے کہنے سننے سے اس کے لیے تیار ہوئے، بادشاہ جب مل کر واپس گیا تو اس نے دوسرے روز ایک کروڑ تنکہ؎ بھیجا مگر شیخ نے یہ ساری رقم قاضی عبداللہ کو دے دی اور فرمایا کہ ''سلطان سے ملاقات اور اس رقم کے حصول کا ذریعہ آپ ہی تھے، اس لیے آپ ہی اس کے حق دار ہیں۔'' (۳)

اس سے بڑھ کر دنیا سے نفرت اور بیزاری کیا ہو سکتی ہے۔

تصوف کی چار خصوصیات: کہا جاتا ہے کہ تصوف کا دارومدار چار چیزوں پر ہے:

قلة الطعام، قلة الكلام، قلة المنام و	کم کھانا، کم بولنا، کم سونا اور لوگوں سے الگ
اعتزال الانام	تھلگ رہنا۔

حضرت سہل کا ارشاد ہے کہ ابدال کی چار خصلتیں ہیں:

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۱۔ (۳) ایضاً، ص ۲۴۴۔ ؎ یہ سکہ اس زمانہ میں گجرات میں رائج تھا۔

اخماص البطون والسھر والصمت	پیٹ کا خالی اور پچکا ہوا ہونا، جاگنا، خاموشی
والاعتزال عن الناس	اور لوگوں سے علاحدہ رہنا۔

ابدال کے یہ اوصاف بیان کیے جاتے ہیں:

ان اکلھم فاقة ونومھم غلبة وکلامھم ضرورة	فاقہ، نیند کا غلبہ اور ضرورۃً بات چیت۔

گو صوفیہ کے نزدیک غذا میں تقلیل اور کمی مستحسن ہے لیکن یہ مقصود نہیں ہے، دراصل غذا میں افراط اور کثرت سے ایسی آفتیں رونما ہوتی ہیں جو اصل مقصود میں خلل انداز ہوتی ہیں، تقلیل کا مقصد نفس کشی، قلب کی تقویت اور اس کی جلا اور صفائی ہے، بھوک سے قلب کی چربی پگھلتی اور خون کم ہوتا ہے جس سے قلب میں جلا، صفائی اور گداز پیدا ہوتا ہے اور وہ ذکر کا نور قبول کرتا ہے، نیز اس کے اندر شرعی معاملات اور غیبی واردات کے انوار کا فیضان ہوتا ہے، پھر قلب کے آئینہ سے ان انوار کا پرتو نفس کی زمین پر پڑتا ہے اور وہ نور خداوندی سے جگمگا اٹھتا ہے اور اس کی آلائشیں اور ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔(۱)

ذیل میں ان چاروں امور کے بارہ میں شیخ علی متقی کا حال بیان کیا جاتا ہے:

قلت طعام: شیخ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی غذا بہت کم ہوتی تھی، فاکہی کا بیان ہے کہ وہ اتنا کم کھاتے تھے کہ اس کا لوگوں کو مشکل سے یقین ہوگا اور اس قدر کم خوری کا کسی شخص کے بارہ میں خیال بھی نہیں کیا جا سکتا مگر شیخ اس قدر کم غذا کے اس لیے عادی ہو گئے تھے کہ طول ریاضت کی وجہ سے انہیں اس کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا اور اگر انہیں معمول سے کچھ بھی زیادہ غذا دی جاتی تھی تو وہ اسے ہضم نہیں کر سکتے تھے (۲) شعرانی کا بیان ہے کہ وہ نحیف البدن تھے اور بھوک کی ...... شدت کی وجہ سے ان کے جسم پر گوشت معلوم نہیں ہوتا تھا (۳) شیخ عبدالوہاب متقی سے منقول ہے کہ ان کا کھانا تو صرف اس لیے

(۱) النور السافر، ص ۳۱۶ و ۳۱۷۔ (۲) ایضاً، ص ۳۱۶۔ (۳) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔

ہوتا تھا کہ ان کا جسم بحال رہے اور وہ عبادت کر سکیں، ان کے لیے جو شوربا بنتا اس میں سے تھوڑا سا چکھ کر وہ دوسروں کو دے دیتے تھے۔(۱)

قلت کلام: وہ کم سخن بھی تھے (۲) فضول اور لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے اور بلا ضرورت کوئی بات چیت نہیں کرتے تھے، مجلس درس میں بھی عموماً خاموش رہتے، شعرانی کا بیان ہے کہ وہ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے۔(۳)

قلت منام: شیخ سوتے بھی کم تھے (۴) اور شب کا زیادہ وقت ذکر و فکر اور یاد الٰہی میں گزارتے تھے۔

خلوت پسندی اور عزلت گزینی: خلوت پسند تھے اس لیے لوگوں سے الگ تھلگ اور کنارہ کش رہتے تھے، محی الدین عیدروسی کا بیان ہے کہ:

موثر العزلة من الانام (۵) لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں:

> ''بڑے گوشہ نشین آدمی تھے، اپنے گھر سے صرف جمعہ کی نماز کے لیے حرم جاتے اور صفوں کے کنارے کھڑے ہوتے اور بہت جلد گھر واپس آجاتے۔''(۶)

شیخ جس زمانہ میں گجرات تشریف لے گئے تھے اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ جس طرف بھی نکلتے خلقت ان پر اس طرح ٹوٹی پڑتی تھی جس طرح شمع پر پروانے گرتے ہیں مگر خود ان کی عزلت پسندی کا حال یہ تھا کہ ہجوم سے کنارہ کش رہنے کے لیے اپنے کمرہ کا دروازہ بند رکھتے اور کسی کو اندر آنے کا موقع نہ دیتے بلکہ پوری خاموشی اور یکسوئی سے اپنے

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵۔ (۲) النور السافر، ص ۳۱۶۔ (۳) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۴) النور السافر، ص ۳۱۶۔ (۴) ایضاً۔ (۵) ایضاً (۶) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔

کاموں میں مشغول رہتے۔(۱)

خوارق وکرامات: شیخ کی مختلف کرامتیں بیان کی جاتی ہیں، ان کے حالات کے ضمن میں اس طرح کی باتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آئندہ بھی آئیں گی، یہاں چند واقعات تحریر کیے جاتے ہیں:

عبدالوہاب شعرانی کا بیان ہے کہ مکہ میں میری معذوری دیکھ کر انہوں نے چاندی کا ایک ٹکڑا مجھے دیا، اس کی وجہ سے حج میں اللہ نے مجھے ایسی وسعت اور برکت دی کہ میں بے دریغ پیسے خرچ کرتا تھا، مجھے خود بڑی حیرت تھی کہ یہ سب کہاں سے آرہا ہے۔(۲)

ان کے ایک شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

''ایک روز شیخ کے مخصوص خدام میں سے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ شیخ از سر نو جوان ہو گئے ہیں اور نہایت حسین اور دلکش دکھائی دے رہے ہیں، اس وقت ان پر عجیب عمدہ اور اچھی حالت طاری ہے، آپ کو طلب فرمایا ہے، فقیر حکم کی تعمیل اور اس حالت کا مشاہدہ کرنے کے شوق میں چلا، مگر جب پہنچا تو شیخ کی حالت تبدیل ہو چکی تھی، تاہم اب بھی سکر کے اثرات موجود اور باقی تھے، میرا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا اور مخصوص توجہ بھی فرمائی، فرمانے لگے کہ آج مجھ پر عجیب وغریب کیفیت طاری تھی، چوں کہ حاضرین کو مزید اطمینان ویقین درکار تھا اس لیے بعض خوارق کا ظہور بھی ہوا، تم کو اس حالت کے مشاہدہ کے لیے بلایا تھا مگر تم ارباب یقین میں ہو تمہیں خوارق کی ضرورت نہیں اس لیے حالت تبدیل ہوگئی اور میں اُس عالم سے اس عالم میں چلا آیا۔''(۳)

کہتے ہیں کہ سلطان محمود گجراتی کو پانی کے بارے میں بڑا وسوسہ اور شک لاحق

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔ (۲) الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۴۷۔

رہتا تھا جو کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا، شیخ نے ایک طشت منگوا کر اس میں اپنی ٹوپی دھوئی اور پانی پھینک دیا، اسی طرح انہوں نے تین بار کیا، چوتھی مرتبہ اسی طشت میں نیا اور پاک و صاف پانی رکھوا کر فرمایا، بابا محمود! یہ پانی از روئے شریعت پاک وصاف ہے، اس میں کسی قسم کا شک وشبہ کرنا وسوسہ ہے جو شیطانی کام ہے، تم اس پانی کو پیو اور کوئی وسوسہ اور شک دل میں نہ لاؤ، سلطان شیخ کے ارشاد کے موافق وہ تمام پانی پی گیا جس کے بعد اس کا شک ایسا زائل ہو گیا کہ پھر کبھی اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہی نہیں ہوا۔(۱)

وجد وحال: شیخ صاحب وجد وحال بھی تھے، اس کی ایک مثال اوپر نقل ہو چکی ہے، وفات سے پہلے بھی ان پر عجیب جذبہ وحال طاری ہوا جس کی کیفیت ان کے شاگرد عبدالوہاب متقی نے اس طرح بیان کی ہے ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے تمام حرکات وسکنات میں ایک تغیر وانقلاب رونما ہو گیا ہے، اسی عالم میں انتقال سے تقریباً تین چار ماہ پیشتر ماہ صفر ۹۷۵ھ کی ایک رات مجھ فقیر سے فرمایا کہ فلاں شاعر کا شعر پڑھو، میں اپنی فراست سے تاڑ گیا کہ وہ کون سا شعر پڑھنے کے لیے کہہ رہے ہیں، چنانچہ میں نے شعر پڑھا ؎

ہرگز نیامد در نظر نقشے زرویت خوبتر
شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری

یہ سن کر ان کی حالت عجیب ہوگئی اور زور زور سے فرمانے لگے کہ پڑھتے جاؤ، پڑھتے جاؤ، چنانچہ فقیر نے یہ شعر کئی بار پڑھا اور وہ محبت آمیز باتیں کہتے اور شور انگیز نالے کرتے رہے، اسی اثنا میں ملازم نے آکر کہا کھانا حاضر ہے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ کھانے کو کوٹ اور پیس کر اتنا باریک کرا دیتے تھے کہ اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے اس قدر رل جاتے تھے کہ ان کو پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا، چنانچہ جب ملازم نے کھانے کی خبر دی تو اس سے فرمایا کہ اسے پیس کر اتنا باریک کرو کہ اس کی تمام چیزیں اس میں گھل مل جائیں اور اس کا ہر ہر ذرہ باہم

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۸۔

اس طرح مل جائے کہ شناخت نہ ہو سکے اور اس کی دوئی اس طرح ختم ہو جائے جیسا کہ اس دھرے سے معلوم ہوتا ہے۔

من سہیلی پرم کی باتا
یوں مل رہے جیون دودھ نباتا

تمام رات یہی حالت رہی کہ آپ محبت انگیز کلمات فرماتے رہے اور ہم لوگ بھی ان کے ساتھ جاگتے رہے۔(۱)

شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''مجھ سے شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ شیخ زمانۂ قبل از مرگ میں اکثر بار ذکر بالجہر پوری قوت اور ذوق وشوق سے کرتے تھے، حالانکہ اس وقت ان میں حس وحرکت تک نہ باقی تھی اور وہ بالکل نحیف ہو گئے تھے، ذکر کے وقت ان کی حالت یہ ہو جاتی تھی کہ گویا کوئی مانع اور حائل ہے جسے وہ دفع کرتے جاتے ہیں، اسی حالت میں فرمایا کہ جنت معلیٰ میں قبر کی جگہ تیار کر لینی چاہیے تاکہ رحلت سے پہلے منزل متعین ہو جائے مگر پھر فرمایا کہ یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ہماری حیات مستعار کب تک باقی ہے؟ اور ہمیں کب موت آئے گی اور یہ مقبرہ عام مسلمانوں کا ہے، انتقال سے پہلے ہی قبر کی جگہ پر قبضہ کر کے لوگوں کے لیے تنگی پیدا کرنا مناسب نہیں ہے، وفات کے بعد لوگ جہاں چاہیں دفن کریں۔''(۲)

مہدویت سے تعلق وانقطاع: فرقہ مہدویت (۳) سے بھی شیخ کا تعلق بتایا جاتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ وہ صاحب حال بزرگ تھے، اس کیفیت کے طاری ہونے کے

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۹۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۹ و ۲۵۰۔ (۳) مہدویت یا فرقہ مہدوی سید محمد جونپوری، متوفی ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء کی طرف منسوب ہے۔

وقت وہ اس طرح کی باتیں بھی کہہ جاتے تھے، چنانچہ مرض الموت میں انہوں نے قطبیت کا دعویٰ کیا تھا (۱) اسی طرح وہ فرقہ مہدویہ سے بھی متاثر ہو گئے تھے، مگر ان کا یہ تاثر عارضی اور وقتی تھا۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:

وازغریب حالات ایشاں دعویٰ مہدویت ست کہ بجہت غلبہ وقت وسکر حال بوجود آمدہ و مدت بقائے آں پنج روز بود۔	ان کے عجیب حالات میں مہدویت کا دعویٰ بھی ہے جو غلبہ حال اور سکر کا نتیجہ تھا مگر اس کی مدت پانچ روز رہی۔
من نمی گویم انا الحق یار می گوید بگو چوں بگویم چوں مرادلدار می گوید بگو	میں خود انا الحق نہیں کہتا بلکہ یہ دوست کہلاتا ہے، میں اسی وقت یہ کہتا ہوں جب میرا محبوب مجھ سے یہ کہنے کے لیے کہتا ہے۔

مگر بعد میں وہ مہدویت کے مخالف ہو گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کے قلع قمع کرنے میں اپنی زندگی صرف کردی، ان کی تصنیف البرھان فی علامات المھدی آخر الزمان دراصل مہدویت کا رد تھی۔

ردمہدویت کے علاوہ شیخ نے اپنے زمانہ کی مختلف بے اعتدالیوں اور فتنوں کی بھی سرکوبی کی اور صوفیہ کے افراط وتفریط پر مبنی بعض نظریات وخیالات کی بھی اصلاح کی، اس کی تفصیل شیخ محمد اکرام نے تحریر کی ہے، ذیل میں اس کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

> ’’شروع شروع میں یہ (مہدویت) کی تحریک گجرات، خاندیش اور احمد نگر میں زوروں پر تھی اور بڑے قابل اور مخلص لوگ اس میں شامل تھے، لیکن شیخ علی متقی کی علمی مخالفت اور مخدوم الملک کی سیاسی کوششوں نے اسے شمالی ہند میں پھلنے پھولنے نہ دیا، گجرات سے یہ تحریک دکن میں منتقل ہوگئی۔‘‘ (۳)

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۸۔ (۲) اتحاف النبلاء، ص ۳۲۶۔ (۳) رودکوثر، ص ۲۸۔

شیخ صاحب آگے لکھتے ہیں:

"بلکہ شیخ علی متقی جنہوں نے بالآخر گجرات میں مہدویت اور دوسری غیر راسخ تحریکوں کے قلع قمع میں سب سے زیادہ گرم جوشی دکھائی، بعض روایات کے مطابق ایک زمانے میں مہدوی ہو گئے تھے لیکن جب مکہ معظمہ میں پہنچ کر انہوں نے زیادہ تحقیق کی تو ان خیالات کو ترک کیا اور ان کے خلاف ٹھوس، مدلل کتابیں لکھیں۔" (۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"شیخ علی متقی نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں، آپ کی زیادہ دلچسپی علم حدیث اور تصوف سے تھی، لیکن آپ نے معاصرانہ بے اعتدالیوں پر بھی بڑی توجہ دی، شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت کے علاوہ آپ نے مہدی جونپوری کے خیالات کی بڑی مخالفت کی اور نہ صرف اس مقصد کے لیے حکام وقت کی اعانت حاصل کی بلکہ مہدویت کی تردید میں دو مبسوط رسائل لکھے اور ظہور مہدی کے نشانوں کی تفصیلات اور علمائے مکہ کے فتاویٰ درج کر کے مہدی جونپوری کے دعاوی کی تردید کی، یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گجرات میں جو مہدویت کا مرکز بن گیا تھا یہ تحریک بالآخر ناکام ہوئی اور اسے اپنا مرکز دکن میں منتقل کرنا پڑا۔

آپ کے شاگردوں میں دوسرے اکابر علما کے علاوہ مشہور محدث محمد بن طاہر پٹنی تھے جنہوں نے اپنے استاد کی متابعت میں مخالفت بدعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور بالآخر اسی کوشش میں شہید ہوئے۔"

(رود کوثر، ص ۳۵۴)

(۱) رود کوثر، ص ۲۹۔

شیخ کے ممتاز مسترشد اور خلیفہ و جانشین شیخ عبدالوہاب متقی نے بھی ردمہدویت کے کام کو نہ صرف جاری و باقی رکھا بلکہ اسے وسعت بھی دی، ان کے متعلق شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبدالوہاب متقی شاید پہلے با اثر ہندوستانی عالم ہیں جنہوں نے وحدت الوجودیوں کی افراط و تفریط کے خلاف باقاعدہ آواز اٹھائی اور شیخ عبدالحق محدث اور شیخ محمد طاہر پٹنی جیسی ہستیوں پر اثر ڈالا۔''
>
> (رود کوثر، ص ۳۵۲)

شیخ محمد غوث گوالیاری کی تکفیر: اوپر ذکر آ چکا ہے کہ شیخ علی متقی نے شیخ محمد غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی سخت مخالفت کی تھی، ان کو شیخ کی بعض اور تصنیفات اوراد غوثیہ وغیرہ پر بھی اعتراض تھا، ان کی مخالفت میں وہ اس قدر سرگرم ہو گئے تھے کہ ان کی تکفیر اور قتل کا فتویٰ بھی دے دیا تھا، ملا عبدالقادر بدایونی نے ان واقعات کی تفصیل لکھی ہے، فرماتے ہیں:

> ''شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری سلسلہ کے مشہور صوفی تھے اور ان کی بدولت اس سلسلہ کو بڑی شہرت نصیب ہوئی، وہ شیخ فریدالدین عطار کی نسل سے تھے اور سلوک و باطن کی تکمیل شیخ ظہور حاجی حمید سے کی تھی، ان کے ایما سے کوہ چنار کے جنگلات میں تیرہ برس تک بڑی ریاضتیں کرتے اور درختوں کے پتے کھا کر یاد الٰہی کرتے رہے۔''(۱)

ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا لیکن شیر شاہ کا جب بول بالا ہوا تو وہ ان کے پیچھے پڑ گیا تھا، اس کی وجہ سے شیخ غوث گوالیار سے ہجرت کر کے گجرات تشریف لائے، یہاں شیخ علی متقی نے ان کے کفر و قتل کا فتویٰ دیا۔

سلطان محمود گجراتی نے اس دور کے ایک اور مشہور عالم و صوفی شیخ وجیہ الدین گجراتی سے جب اس مسئلہ میں استصواب کیا تو وہ تحقیق حال کے لیے شیخ محمد غوث کے پاس گئے اور

(۱) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۴ تا ۶۔

پہلی ہی ملاقات میں ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ فتوے کو چاک کر دیا، شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو انہوں نے شیخ وجیہ الدین سے کہا تم کیوں بدعت کے رواج پر راضی ہو گئے، شرع میں رخنہ ڈالتے ہو، انہوں نے کہا ''ہم ارباب قال ہیں اور شیخ اہل حال ہیں، ہمارا ذہن ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتا اور ظاہر شریعت میں کوئی اعتراض ان پر نہیں آتا'' غرض ان کے اثر سے تمام گجرات کے حکام شیخ محمد غوث کے معتقد ہو گئے اور شیخ نے اس بلا سے نجات پائی۔ (۱)

معراج نامہ جس پر شیخ علی متقی کو اس قدر شدید اعتراض تھا اس کی تفصیل ملا عبدالقادر بدایونی نے دوسری جگہ تحریر کی ہے:

> ''جب دوبارہ مغل حکومت قائم ہوئی اور شیخ گجرات سے اکبر آباد (آگرہ) کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت ہمایوں کی وفات ہو چکی تھی اور اکبر اس کا جانشین تھا، امور ملکی بیرم خان کے سپرد تھے اور عہد اکبری کا پہلا صدر شیخ گدائی شیخ کے خلاف تھا، اس نے بیرم خان سے کہا کہ رسالہ معراجیہ میں شیخ نے اپنی معراج کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ مجھے اللہ سے ہم نشینی اور ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے اور اس نے مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دی ہے، چنانچہ جب علما و مشائخ کے جلسہ میں اس پر بحث ہوئی اور شیخ پر اعتراضات کیے گئے تو بالآخر وہ آزردہ ہو کر گوالیار چلے گئے۔'' (۲)

مگر شیخ وجیہ الدین نے جیسا کہ اوپر گزرا اس میں شیخ علی متقی کی نہ صرف یہ کہ تائید نہیں کی بلکہ مسئلہ تکفیر پر ایک مستقل رسالہ بھی تحریر کیا جس میں ابتداءً فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے، پھر احادیث سے سنداً سب کو مشرح بیان کیا ہے، آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالت سکر میں جو کہہ جاتے ہیں وہ قابل مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ (۳)

(۱) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص۴۴۔ (۲) منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی، جلد دوم، ص۳۴ و ۳۵۔

(۳) معارف ج۳۱، ص۱۲۴، فروری ۳۳ء۔

اتباع سنت: ان کے کسی شاگرد نے مکہ معظمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپؐ سے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کس بات کا حکم دے رہے ہیں" ارشاد ہوا کہ "شیخ علی متقی کی اقتدا کرو، وہ جو کچھ کریں تم بھی وہی کرو" محی الدین عیدروسی یہ خواب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیخ علی متقی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں سے حصۂ وافر ملا تھا، اسی لیے آپؐ نے اس زمانہ کے اور لوگوں کے بجائے خاص طور پر ان کا نام لیا اور خواب دیکھنے والے کو ان کی اقتدا کا حکم دیا، اس خواب میں ان کی عظمت کے اور بھی کئی پہلو ہیں، ایک تو یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شیخ کے نام سے موسوم کیا ہے۔"(۱)

اس ضمن میں وہ خواب بھی نقل کرنے کے لائق ہے جسے شیخ کے بعض سوانح نگاروں نے ان کے مناقب میں بیان کیا ہے کہ "انہوں نے ۲۷ رمضان بروز جمعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی تھی، اس وقت انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس زمانہ میں سب سے افضل شخص کون ہے؟ ارشاد ہوا تم، پوچھا پھر کون افضل ہے، ارشاد ہوا ہندوستان میں محمد بن طاہر۔

کہا جاتا ہے کہ اسی شب میں شیخ کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی نے بھی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو یہی سوال کیا جس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

شیخک ثم محمد بن طاهر بالهند سب سے افضل تمہارے شیخ ہیں، پھر ہندوستان کے محمد بن طاہر۔

وہ جب شیخ متقی کے پاس یہ خواب بیان کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو شیخ نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فرمایا کہ جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے وہی میں نے بھی دیکھا ہے۔(۲)

(۱) النور السافر، ص ۳۱۸۔ (۲) ایضاً، ص ۳۱۵ و ۳۱۶۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر: اہل حق اور علمائے ربانی کی طرح وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل نہ رہتے ، قاضی عبداللہ سندھی نے جب سلطان بہادر گجراتی کی ملاقات کے لیے سفارش کرتے ہوئے ان سے کہا کہ ''اگر آپ اس سے بات کرنا پسند نہ کریں گے تو ہم لوگ اسے ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول رکھیں گے'' شیخ نے فرمایا ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کا لباس اور وضع قطع غیر اسلامی ہو اور مجھے اس کے اندر کھلا ہوا منکر دکھائی دے پھر بھی میں چپ رہوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے باز رہوں (۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کس قدر خیال تھا اور وہ کسی منکر اور غیر شرعی فعل وعمل کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو جو نصیحت مناسب سمجھی اسے کی ۔(۲)

سخاوت وفیاضی: طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی ،ان کی خانقاہ میں بڑی تعداد میں طالبین مستقل قیام پذیر رہتے ، شیخ ان کی کفالت فرماتے تھے اور طلبہ کے کھانے پینے کے علاوہ کتاب، کاغذ اور روشنائی تک وہی مہیا کرتے تھے، جو سائل بھی ان کے پاس آتا اس کی بروقت مدد فرماتے اور کسی کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے ،اوپر گزر چکا ہے کہ بہادر شاہ نے ایک کروڑ تنکہ بھیجا تھا مگر انہوں نے یہ پوری رقم قاضی عبداللہ سندھی کو دے دی ۔(۳)

داد ودہش میں نام ونمود اور ناموری کے لیے پر تکلف دعوتوں کا اہتمام پسند نہ تھا، جو کچھ کسی کو دیتے مخفی طریقہ سے دیتے ،آخر عمر میں بزرگوں کے عرس میں کھانا کھلانے کے بجائے اندازاً جو رقم اس پر خرچ ہوتی اسے زر نقد کی صورت میں فقرا میں تقسیم کردیتے تھے اور ہر فقیر کو جتنی رقم مناسب سمجھتے خاموشی سے اس طرح دیتے کہ کسی اور کو پتہ نہیں چلتا، فرماتے تھے کہ مجلس طعام کا اہتمام وآرائش اور لوگوں کا جمگھٹا موجب تکلیف اور باعث زحمت ہے ۔(۴)

معیشت میں سادگی اور قناعت: ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۴ ۔(۲) ایضاً ۔(۳) ایضاً ۔(۴) ایضاً، ص۲۴۶ ۔

اور ان کا دل مال وزر کی ہوس سے خالی تھا، جو کچھ جائز اور حلال طریقہ پر میسر ہوتا اسی پر قناعت کرتے، ابتدا میں اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کتابت کرتے تھے اور اسی سے گزر بسر کرتے تھے، عسرت کے باوجود بیوہ عورتوں کی مدد بھی کرتے اور کسی سائل کو محروم نہ کرتے، اگر کہیں سے فتوحات ملتے تو قرض ادا کرتے، کیوں کہ اس میں وسعت ہے، مگر فتوحات اپنی ذات پر خرچ نہ کرتے جن فتوحات کے بالکل حلال ہونے کا یقین ہوتا اسی میں سے اپنی ذات پر خرچ کرتے۔(۱)

بہادر شاہ اور محمود شاہ دونوں کو شیخ متقی سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کے اخراجات کے لیے بڑی بڑی رقمیں نذر کرتے، مگر شیخ سادہ زندگی کے عادی تھے اس لیے نہ یہ رقم اپنی ذات پر خرچ کرتے اور نہ پس انداز کرتے بلکہ فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیتے یا اہل علم، طلبہ اور سلوک ومعرفت کے طالبین کی ذات پر خرچ کرتے۔

سادگی کا یہ حال تھا کہ سفر میں دو تھیلے لے کر چلتے تھے ایک میں کھانے پینے کی چیزیں اور برتن ہوتے تھے، کھانے کی جنس کم سے کم مقدار میں خرچ کرتے، دو تین روز کی خوراک تین چار روز کام آتی، پانی کا استعمال بھی کم کرتے اور سارا کام بھی خود ہی کرتے تھے۔(۲)

رزق کے معاملہ میں توکل: سادگی کی بنا پر رزق کے معاملہ میں بڑے متوکل اور اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے، ان کے خیال میں سبب وواسطہ کے بغیر بھی روزی فراہم ہو جاتی ہے، فرماتے تھے کہ:

اللہ یرزق من حیث لا یحتسب — اللہ وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے بندے کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔

صحرا و بیابان میں اکثر اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ کنوئیں کے کنارے پیاسے ہرن آتے ہیں اور پانی کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کنوئیں کے اندر گہرائی میں

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۵ و ۲۴۶۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۷۔

ہوتا ہے، دفعۃً کنوئیں میں جوش آتا ہے اور پانی اُبلنے، اوپر بہنے لگتا ہے اور ہرن اور دوسرے جانور پانی پی کر خوب سیراب ہو جاتے ہیں اور کلیلیں کرنے لگتے ہیں، ہم نے بھی خود اس طرح پانی پیا ہے۔(۱)

حلال کمائی ضائع نہیں ہوتی: ان کے استاد اور شیخ طریقت شیخ حسام الدین رزق حلال کے معاملہ میں بہت محتاط تھے، اس بارے میں ذرا بھی شبہ ہوتا تو اس کے استعمال سے پرہیز کرتے، ان کی غایت احتیاط کے بعض واقعات مشہور ہیں (۲) شیخ علی متقی کا عمل بھی یہی رہا ہوگا اور وہ اکل حلال کا بڑا لحاظ کرتے رہے ہوں گے، ان کا عقیدہ تھا کہ حلال کمائی رائیگاں نہیں جاتی، چنانچہ ان کے مشہور شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ جو چیز کسب حلال سے حاصل ہوتی ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتی، یہ اگر گم بھی ہو جاتی ہے تو بالآخر مل جاتی ہے، اس کی تائید میں وہ اپنا یہ واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ بحری سفر میں طوفان آ گیا، ہم لوگ جس کشتی پر سوار تھے وہ ٹوٹ پھوٹ گئی، کئی روز تک ایک تختہ پر بیٹھے رہنے کے بعد جب ہم ساحل پر پہنچے تو ہمارے ساتھ جو کتابیں تھیں وہ بھیگ گئی تھیں، آگے ہم لوگوں کو پیدل چلنا تھا اس لیے کتابیں ڈھو کر لے جانے کی ہم میں طاقت نہ تھی، چنانچہ ایک صحرا میں انہیں دفن کر دیا گیا اور وہاں نشان بھی بنا دیا گیا، پھر مکہ کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں پیاس کی شدت سے دوچار ہوئے، صحرائے عرب میں پانی کا نام و نشان نہیں ہوتا، دوستوں نے کہا کہ پانی کے لیے دعا کرنی چاہیے، ممکن ہے اللہ پانی بھیج دے، میں نے کہا میں دعا کرتا ہوں آپ لوگ آمین کہیں، اللہ نے ہماری سن لی اور بارش ہوئی جس سے ہم لوگ سیراب بھی ہوئے اور اپنے مشکیزے بھی بھر لیے، کچھ روز کے بعد مکہ پہنچے، طواف و عمرہ کیا اور سعی بین الصفا والمروہ بھی کی، اتفاقاً ایک روز چند بدو گٹھری لیے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس چند کتابیں ہیں، آپ لوگ خریدنا چاہیں تو خرید لیں، انہوں نے جب

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۷۔ (۲) اخبار الاخیار، تذکرہ حسام الدین ملتانی، ص ۲۰۱۔

گٹھری کھولی تو اس میں ہماری وہی کتابیں تھیں جنہیں ہم نے صحرا میں دفن کیا تھا، ہم نے بدوؤں کو قیمت دے کر کتابیں لے لیں، ان کے اوراق خشک ہونے کے بعد ایک دوسرے سے ایسا چپک گئے تھے کہ انہیں پھر پانی میں تر کرنا پڑا تاکہ چپکے ہوئے اوراق کھل جائیں، مگر ان سب کے باوجود نہ کتابوں کا کوئی ورق محو ہوا اور نہ ان سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش آئی۔(۱)

اپنے کام خود کرنا: وہ اپنا کام خود ہی کرتے تھے، اوپر گزر چکا ہے کہ سفر میں دو تھیلے ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے جنہیں خود ہی لے کر چلتے تھے اور کھانا پکانے کے لیے خود ہی جنگل سے لکڑیاں بھی لایا کرتے تھے، اسی طرح کھانا بھی خود پکاتے اور خود ہی برتن بھی دھوتے، اپنے کام کے لیے دوسروں کو زحمت نہ دیتے تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کا عہد کیا تھا کہ دوسرے سے کوئی مدد نہ لیں گے اور جو کام خود کر سکتے تھے اس کے لیے کسی اور سے کچھ نہ کہتے اور اگر بالفرض ایسی کوئی ضرورت پیش آجاتی جس میں دوسروں کی مدد و احتیاج کی ضرورت ہوتی تو پہلے انہیں کچھ پیسے بطور اجرت دے دیتے تب ان سے کام لیتے اور خدمت کراتے۔(۲)

نوکروں سے اچھا برتاؤ: اپنے ملازمین اور خادموں سے بھی اچھا برتاؤ کرتے اور ان کی غلطی اور کج خلقی کو نظر انداز کر دیتے، شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں کہ کمال نام کا ان کا ایک نوکر تھا جو نہایت بے ہنگم اور کج خلق تھا، اس کے جو جی میں آتا کرتا اور انہیں جو چاہتا کہہ دیتا اور ان کی مرضی کی مطلق پروانہ کرتا، مگر اس کے باوجود اسے عزیز رکھتے، اس کے معاملہ میں ضبط و تحمل سے کام لیتے اور اس کی کج خلقی اور ایذا رسانی کو برداشت کرتے، ایک روز وہ ان کے لیے شوربا بنا کر لایا جس میں بہت نمک تھا مگر کوئی برہمی ظاہر کرنے کے بجائے اسے بلا کر یہ کہا میاں کمال! ذرا بیٹھو، پھر تھوڑا سا شوربا دے کر اس سے کہا اسے چکھو، دیکھو

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۷۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۴۔

کیسا پکا ہے، اس نے بڑی ڈھٹائی سے درشت لہجہ میں کہا ہاں کچھ نمک تو ضرور زیادہ ہے مگر یہ کتنا عمدہ پکا ہے، آپ اسے کھائیے کوئی حرج نہیں ہے، شیخ نے فرمایا بہت خوب! پھر پانی منگوا کر شوربا میں ڈالا اور تھوڑا سا کھالیا۔(۱)

پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت: شیخ کے حالات و واقعات زندگی بیان کیے گئے ہیں وہ ان کی عظمت، پاکیزہ شخصیت، بے داغ زندگی اور عمدہ سیرت کی دلیل ہیں، ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے محاسن و مناقب گوناگوں ہیں اور ان کی سیرت پاکیزہ اور واقعات زندگی نہایت محمود اور قابل ستائش ہیں۔(۲)

اپنی پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت و اخلاق کی بنا پر وہ مذہبی و دینی حیثیت سے بڑے ممتاز شخص سمجھے جاتے تھے، شیخ محمد اکرام تحریر فرماتے ہیں:

> ''شیخ علی متقی جن کا فیض شیخ عبدالحق کو شیخ عبدالوہاب کی وساطت سے پہنچا، خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں اور ایک خاص شان اور پایہ کے بزرگ تھے۔'' (رود کوثر، ص۳۵۴)

شیخ عبدالوہاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ اور ان کے استاد شیخ علی متقی ہماری مذہبی تاریخ میں بڑی باعزت جگہ کے مستحق ہیں۔'' (رود کوثر، ص۳۵۲)

غیر معمولی شہرت و مقبولیت: اپنے گوناگوں اوصاف و محامد، پاکیزہ زندگی، عمدہ سیرت، علمی کمالات اور تصوف و احسان میں بلند درجہ و مرتبہ کی وجہ سے شیخ علی متقی کو چہار دانگ عالم میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ ان کا آوازۂ شہرت ملاء اعلیٰ تک بلند تھا(۳) ان کے سیرت نگار فاکہی کا بیان ہے کہ مکہ معظمہ میں ان کی ایسی دھوم مچی ہوئی تھی کہ لوگ مشعر حرام اور صفا کی طرح ان کے قصد و ارادہ سے ان کے پاس

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۴۵۔ (۲) النور السافر، ص۳۱۵ و ۳۱۷۔ (۳) مآثر الکرام، ج۱، ص۱۹۳۔

آتے تھے اور ان پر پروانوں کی طرح نچھاور ہوتے تھے، یہاں تک کہ سلطان روم تک ان کا آوازۂ شہرت پہنچ گیا تھا۔(۱)

مکہ سے کہیں زیادہ وہ ہندوستان .... میں مشہور تھے، سلطان بہادر گجراتی کے زمانہ میں جب انہوں نے سرزمین ہند میں قدم رکھا تو جس طرف جاتے لوگ ان پر اسی طرح پلے پڑتے اور ٹوٹے پڑتے تھے جیسے شمع پر پروانے گرتے اور ٹوٹتے ہیں۔(۲)

امرا و سلاطین سے تعلقات: پہلے کئی بار ذکر آ چکا ہے کہ سلطان بہادر اور سلطان محمود شیخ علی متقی سے بڑا عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کی ہر قسم کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، جب مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں ان کی شہرت بڑھی تو رومی بادشاہ سلیمان ابن سلیم بن بایزید کو بھی اس کی خبر ہوئی جو اس وقت پوری دنیائے اسلام کا فرمانروا تھا، اس نے شیخ کے پاس خط لکھ کر دعا کی درخواست کی اور مدۃ العمران سے روابط و تعلقات قائم رکھے۔(۳)

جب شیخ پہلی دفعہ گجرات آئے تو اس وقت سلطان بہادر وہاں کا فرمانروا تھا، وہ شیخ کے اوصاف و کمالات سن چکا تھا اس لیے ان کا بہت گرویدہ تھا اور ملاقات و حاضری کے لیے بے قرار تھا، مگر وہ اس سے ملنے سے گریز کرتے رہے، اس لیے اس نے ان کے عقیدت مند قاضی عبداللہ سندھی کو درمیان میں ڈالا، ان کی سعی و سفارش کے بعد بادشاہ کی تمنائے ملاقات بر آئی (۴) اس کے بعد اس نے جو عزت افزائی اور قدردانی کی، اس کا حال پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔

سلطان محمود ثانی تو ان کا مرید ہی تھا، اس کے دور حکومت میں وہ دو بار گجرات تشریف لائے، اس نے مکہ معظمہ میں شیخ کے لیے مکان تعمیر کرایا تھا اور خانقاہ کے مصارف بھی وہی پورا کرتا تھا، اس نے اس پر ایک جائداد وقف کی تھی جس سے خانقاہ کے واردین و

(۱) النور السافر، ص ۳۱۷۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔ (۳) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶۔ (۴) اخبار الاخیار، ص ۲۴۴۔

صادرین کا خرچ چلتا تھا۔(۱)

سلطان محمود شیخ کا اس قدر عقیدت مند تھا کہ ان کے لیے خود وضو کا پانی لاتا اور ان کے ہاتھوں اور قدموں کو دھلاتا (۲) شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں کہ وہ برابر ان کی خدمت میں آیا کرتا لیکن غیر مسنون لباس میں ہوتا اس لیے شیخ اس کی جانب نہ نگاہ اٹھاتے اور نہ التفات ہی فرماتے، ایک روز وہ صلحا کے لباس میں آیا تو شیخ کو خوشی ہوئی اور انہوں نے اس کی طرف نگاہ التفات فرمائی، بادشاہ نے اپنی طرف میلان دیکھ کر گھر تشریف لے چلنے کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کرلیا، بادشاہ خود ڈولا اپنے کندھے پر رکھ کر انہیں گھر لایا اور اعزاز واکرام کیا۔(۳)

بعض عہدوں پر متمکن ہونا اور الزامات سے متہم ہونا: شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ ایک بار شیخ علی متقی کو خیال ہوا کہ عدل وانصاف کا بہت ثواب ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اسی نیت سے منصب عدالت پر فائز ہونا چاہا، اس سے یہ امتحان اور تجربہ بھی مقصود تھا کہ دنیا کی مشغولیت کے ساتھ باطن کی اصلاح وتربیت کا کام سکون اور رد جمعی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے یا نہیں؟ سلطان محمود گجراتی چوں کہ ان کا نہایت معتقد تھا اس لیے اسے جب اس ارادہ کی خبر ہوئی تو اس نے بہت غنیمت جانا اور اسے اپنے نظام سلطنت کی سعادت خیال کیا، چنانچہ شیخ کرسی عدالت پر رونق افروز ہو گئے مگر پاجی ملازمین نے اس کی وجہ سے ان پر رشوت کا الزام عائد کردیا اور بادشاہ کو بھی اس کی خبر کردی کہ شیخ دیانت وتقویٰ کے باوجود رشوت لیتے ہیں، عدل وانصاف کے بجائے افراط وتفریط سے کام لیتے ہیں مگر اس نے باور نہیں کیا تو مخالفین نے یہ کہنا شروع کیا کہ شیخ کے ساتھی رشوت لیتے ہیں اور وہ اس سے واقف ہونے کے باوجود کوئی دار وگیر نہیں کرتے، جب شیخ کو پتہ چلا کہ بادشاہ کو اس قسم کی خبریں پہنچی ہیں تو وہ کچھ روز تک تو اس معاملہ کو درست کرنے میں لگے رہے مگر جب

(۱) ظفر الوالہ، ج۱، ص۳۱۶۔ (۲) النور السافر، ص۱۴۷ وظفر الوالہ، ج۱۔ (۳) اخبار الاخیار، ص۲۴۷ و۲۴۸۔

مگر جب انہیں اندازہ ہوا کہ معاملہ سلجھ نہیں رہا ہے تو ایک روز عدالت کے چبوترے سے اپنا عصا لیے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، دوستوں کو سلام کیا اور دوڑتے ہوئے چل دیے اور فرمایا کہ یہ دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے، عاقبت بخیر ہونی چاہیے۔(۱)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

شیخ علی متقی جب دوسری مرتبہ گجرات تشریف لائے اور سلطان محمود سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت مسرور ہوا، چند روز بعد شیخ نے اس سے کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں، اس نے کہا ارشاد ہو، شیخ نے فرمایا مجھ پر کشف ہوا ہے کہ تمہارے امور و احکام کو میزان شریعت پر تولوں، جو اس کے موافق ہوں وہ باقی رہیں، سلطان اس کے لیے رضامند ہو گیا اور وزیروں کو حکم دیا کہ تمام معاملات میں شیخ کی جانب رجوع کریں، شیخ نے کئی دنوں کے غور و فکر کے بعد ان احکام و اعمال کو باقی رکھا جو شریعت کے مطابق تھے اور جو خلاف شریعت تھے انہیں موقوف کر دیا، اس کی وجہ سے تعطل اور ابتری پیدا ہو گئی اور نظام سلطنت بھی درہم برہم ہونے لگا۔(۲)

شیخ نے پرانے عمال و امرا کو نظر انداز کر کے ان کے معاملات سے واقفیت اور پیش آمدہ امور کی تحقیق اور چھان بین کا کام شیخ چیلہ کے سپرد کر دیا جو ان کے بہت قابل اعتماد مرید اور ان کی دانست میں نہایت عفیف، پاک دامن، زاہد و مرتاض شخص تھے مگر بالآخر صحبت کے اثر نے اپنا کام کیا اور وزیروں کی سازش رنگ لائی، چنانچہ ایک وزیر کے ایما سے ایک عورت نے شیخ چیلہ کی موجودگی میں ان کی بیوی کو رشوت میں زیور دیا جس کی خبر دینے

(۱) اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوۃ از شاہ عبدالحق، ج ۳، ص ۲۴۷۔ (۲) مورخ الفی نے شیخ کے طرز عمل اور اس کی وجہ سے کاروبار مملکت میں تعطل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کے اصول طریقہ کو ایسے زمانہ میں رائج کرنا چاہتے تھے جو شیخین کے زمانہ کی طرح نہ تھا، نیز جن لوگوں سے ان کا سابقہ تھا وہ بھی شیخین کے دور کے لوگوں کی طرح نہ تھے۔'' (ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶)

کے لیے وزیر بادشاہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا آ ئین و دستور معطل ہو چکا ہے اور معاملات بھی درہم برہم ہوتے جا رہے ہیں مگر رشوت جاری ہے، شیخ کی ذات بابرکت ضرور ہے مگر وہ نظم ونسق کے آدمی نہیں ہیں کہ نظام حکومت چلا سکیں، ایک عورت نے ان کے وکیل اور نائب کو رشوت دی ہے، سلطان ٹیک لگائے ہوئے تھا، یہ سنتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، پھر عورت سے واقعہ کے متعلق دریافت کیا، اس نے اقرار کیا مگر جب شیخ چیلہ سے پوچھا تو انہوں نے انکار کیا، بادشاہ نے انہیں اور عورت کو آمنے سامنے بلا کر دریافت کیا، عورت نے اس قدر وثوق سے بات کہی کہ سلطان کو پورا یقین ہو گیا، اس کے بعد اس نے سب معاملات سابق بدستور وزیر کے سپرد کر دیے۔

جب یہ سارا واقعہ شیخ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مکہ واپس جانے کا قصد کیا اور اسی وقت سریع روانہ ہو گئے، بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے واپسی کے لیے بار بار آدمی بھیجے مگر شیخ نے واپس آنے سے انکار کر دیا، جب امرائے کبار بھی بادشاہ کی طرف سے بلانے کے لیے پہنچے تو انہوں نے ان کے سامنے دنیا کے بارہ میں وارد حدیثیں اور بزرگوں کے اقوال بیان کرنا شروع کیا، یہ امرا وہاں موجود ہی تھے کہ خود بادشاہ بھی پہنچ گیا اور اس نے قیام کے لیے اصرار کیا اور کہا کہ اس سے ملک میں بھی برکت ہوگی اور وہ خود بھی برکت اندوز ہوگا، جواب میں ارشاد فرمایا کہ مکہ کو اللہ نے شرف بخشا ہے، دعا کی قبولیت کے لیے وہ زیادہ موزوں اور مناسب جگہ ہے، تمہارے لیے بھی یہاں کے مقابلہ میں وہاں کی دعا زیادہ سازگار اور نفع بخش ہوگی، یہ پرانا مقولہ ہے کہ:

ان الدین و الدینا ضرتان لا تجمعان   دین ودنیا سوکنیں ہیں جو یکجا نہیں رہ سکتیں۔

میں نے اسے ممکن خیال کر لیا تھا، اس لیے یہ تجربہ کرنا چاہا تھا اور اسی لیے مکہ سے یہاں آیا تھا لیکن تجربہ وامتحان نے ثابت کر دیا کہ یہ سوکنیں جمع نہیں ہوں گی، میرے آنے کا مقصد پورا ہو چکا ہے، اس لیے اب بیت اللہ کا قصد اور اس کے جوار میں عمر گزارنا ضروری ہو گیا ہے۔

یہاں میری نیابت کے لیے عبد الصمد موجود ہیں، اللہ نے انہیں رشد و ہدایت کی توفیق بھی بخشی ہے اور ان میں دعا کی اہلیت بھی ہے، تم لوگ ان سے دعا کرانا، میں تم کو انابت الی اللہ اور سارے معاملات میں اسی کی جانب رجوع ہونے کی وصیت کرتا ہوں، قانون شریعت کو نافذ کرنے اور ارباب شریعت کا اعزاز کرنے اور صلحا کی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔

اس کے بعد رخصت ہو کر اور الوداعی سلام کر کے کھوکہ کے بندرگاہ گئے اور وہاں سے مکہ چلے آئے۔(۱)

غیرت و خودداری اور عدم مداہنت: سلاطین و امرا سے ربط و تعلق کے باوجود شیخ نہ ان کی بیجا رعایت اور نامناسب لحاظ کرتے تھے اور نہ ان کی وجہ سے دین و شریعت کے معاملہ میں کوئی مداہنت کرتے تھے بلکہ ان کے غیر شرعی اعمال، منکرات اور غیر مسنون لباس پر نکیر اور ناگواری بھی ظاہر کرتے تھے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

شیخ میں بڑی غیرت و خودداری اور حد درجہ استغنا و بے نیازی تھی، اس لیے امرا کے ہاں جانے سے گریز کرتے مگر وہ خود حصول برکت کے لیے ان کی خدمت میں آتے، ایک دفعہ گجرات کے ایک وزیر نے انہیں برکت کے لیے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی، فرمایا کہ ہمیں اس سے معاف رکھو، ہم یہیں سے تمہارے لیے برکت کی دعا کریں گے، مگر جب زیادہ اصرار ہوا تو ارشاد ہوا کہ تین شرطیں منظور ہوں تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔

۱۔ میں جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا، مخصوص اور نمایاں جگہ بیٹھنے کی فرمائش نہ کی جائے۔

۲۔ کسی خاص چیز کو کھانے کے لیے مجبور نہ کیا جائے، ہمیں جو پسند ہوگا وہی کھائیں گے۔

---

(۱) ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۳۱۶ تا ۳۱۹۔

۳۔ جب میرا جی چاہے گا اٹھ کر چلا آؤں گا، مزید رکنے کے لیے

اصرار نہ کیا جائے۔

اس نے یہ تینوں شرطیں منظور کرلیں تو فرمایا کہ انشاء اللہ کل آؤں گا، چنانچہ دوسرے روز اکیلے تھیلے میں اپنے یہاں کے نانپارے لے کر اس کے گھر تشریف لے گئے اور دروازے کے قریب بیٹھ گئے، اس نے شاہی اہتمام کیا تھا اور پر تکلف فرش بچھائے تھے، اس لیے وسط میں نمایاں جگہ بیٹھنے کے لیے اصرار کیا، فرمایا میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ جہاں چاہوں گا بیٹھوں، وزیر چپ ہوگیا، اس نے انواع واقسام کے کھانے پکوائے تھے مگر شیخ نے انہیں تناول فرمانے کے بجائے اپنے تھیلے سے نان پارے نکالے اور انہی کو کھانا شروع کیا، اس نے پھر اصرار کیا کہ فلاں کھانا چکھ لیں، فرمایا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جو چاہوں گا وہی کھاؤں گا، کسی چیز کے کھانے کے لیے مجھے مجبور نہ کیا جائے گا، اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت ہوکر چلے آئے اور کہا کہ یہ بھی پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ جب چاہوں گا چلا آؤں گا۔(۱)

وفات: ۲ جمادی الاولی ۹۷۵ھ کو منگل کے دن طلوع سحر کے وقت مکہ معظمہ میں وفات پائی، اس وقت عمر تقریباً ۹۰ برس کی تھی اور معلاۃ میں ایک پہاڑ کے دامن میں حضرت فضیل بن عیاضؒ کی قبر کے بالمقابل دفن ہوئے، دونوں قبروں کے درمیان ایک عام شاہراہ تھی اور یہ جگہ ناظر الجیش کہلاتی تھی۔(۲)

وفات اور مرض الموت کے زمانہ کے متعدد خوارق بیان کیے جاتے ہیں، یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''مکہ میں مردے کو کسی ولی یا صالح بزرگ کی قبر میں دفن کرنے کا دستور تھا، چنانچہ امام عبداللہ یافعی حضرت فضیل بن عیاض کی قبر میں مدفون ہیں، شیخ کی وفات کے بعد یا چودہ برس بعد ان کے بھتیجے کے لڑکے شیخ احمد کا

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۶۔ (۲) النور السافر، ص ۳۱۵۔

انتقال ہوا تو انہیں شیخ کی قبر میں دفن کیے جانے کی تجویز کی گئی، اس غرض سے ان کی قبر کھودی گئی تو جسم مبارک کفن میں اپنی اصلی خشک حالت میں جوں کا توں موجود تھا، حالانکہ مکہ کی زمین کی خصوصیت یہ ہے کہ تین یا چار مہینے میں مردہ خاک ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔"(۱)

تصنیفات: شیخ علی متقی کا بیشتر وقت درس و تدریس اور لوگوں کی اصلاح و تربیت میں بسر ہوتا تھا، اس کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی انہوں نے مدۃ العمر سروکار رکھا، حدیث اور تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی، ان کی اکثر کتابوں کا تعلق انہی فنون سے ہے، شاہ عبدالحق صاحب تصنیف و تالیف میں ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی تصنیفات دیکھ کر عقل حیران اور ششدر رہ جاتی ہے اور اس بات پر یقین محکم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی خاص برکت اور توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا...... ان کی بعض کتابیں سالکان طریقت اور طالبان آخرت کے لیے بیش قیمت سرمایہ اور ان کے حال کے لیے معین و مددگار ہیں۔"(۲)

شیخ کی تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز بتائی جاتی ہے مگر اب اکثر ناپید اور معدوم ہیں، جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ذیل میں ان کے بارہ میں دستیاب معلومات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ **البرھان فی علامات المھدی آخر الزمان:** اس میں حضرت مہدی موعود کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، علامہ سیوطی نے اس موضوع پر ایک کتاب "العرف الوردی فی اخبار المھدی" لکھی تھی جو امام ابونعیم کی کتاب الاربعین کا خلاصہ ہے، شیخ علی متقی کی یہ تصنیف سیوطی کی کتاب کی تلخیص اور اس کی از سر نو تہذیب و تدوین ہے جس میں کچھ نیا مواد بھی بڑھایا ہے اور اضافہ میں سیوطی کی جمع الجوامع اور عقد الدرر فی اخبار المھدی المنتظر سے امام مہدی کے بارہ میں روایتیں نقل کی ہیں جن کا رمز "ج" اور "ع" مقرر کیا ہے۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۵۰۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۲۔

شیخ علی متقی نے یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی تھی جب ہندوستان میں محمد جونپوری نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اس کی وجہ سے عرب و ہند میں یہ مسئلہ معرکۃ الآرا بنا ہوا تھا، شیخ مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''محمد جونپوری یقیناً مہدی نہیں ہیں، وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور ولی ہو سکتے ہیں، بعض اوقات ولی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، معصوم صرف پیغمبر ہوتے ہیں۔''

یہ کتاب مندرجہ ذیل تیرہ فصلوں میں منقسم ہے:

۱۔معجزات حضرت مہدی ۲۔ان کا سلسلۂ نسب ۳۔شکل وصورت ۴۔کن حالات میں حضرت مہدی کا ظہور ہوگا ۵۔علامات ۶۔کس طرح ان کی اطاعت و بیعت کی جائے گی ۷۔ان کے انصار ۸۔فتوحات ۹۔حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات ۱۰۔مدت قیام ۱۱۔موت ۱۲۔ان لوگوں کا ذکر جنہوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ۱۳۔علمائے مکہ ومدینہ کا فتویٰ۔

علامہ سیوطی کی کتاب ترتیب ابواب وغیرہ سے معرا تھی، شیخ علی نے اس کو ابواب وتراجم پر مرتب کیا ہے، اس نئی تہذیب وتدوین کے بعد کتاب نے دوسرا جامہ پہن لیا ہے۔(۱)

ریاست رام پور کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جو کرم خوردہ تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اسے ۹۲۴ھ میں مرتب کیا تھا۔(۲)

۲۔**تبیین الطرق الی اللہ تعالیٰ:** مصنف کے بیان کے مطابق یہ ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے (۳) شاہ عبدالحق صاحب محدث فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کے وقت انہیں غیب سے الہام ہوتا تھا (۴) حافظ محمود خاں شیرانی کے کتب خانہ میں اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔(۵)

---

(۱) معارف دسمبر ۴۷ء، ص ۴۲۸۔(۲) فہرست کتب عربیہ ریاست رام پور، جلد دوم، ص ۱۳۹۔(۳) النور السافر، ص ۳۱۹۔(۴) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔(۵) مخطوطات شیرانی، ص ۲۰۶۔

۳۔جوامع الکلم فی المواعظ والحکم: یہ سلف صالحین کے پندونصائح اور مواعظ وحکم پر مشتمل ایک مفید رسالہ ہے، اس میں درج حکم ومواعظ کی تعداد تین ساڑھے تین ہزار بتائی جاتی ہے، اس کے قلمی نسخے مندرجہ ذیل کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

بانکی پور پٹنہ میں اس کے تین نسخے ہیں، رام پور کے کتب خانہ میں دو قلمی نسخے ہیں جس میں ایک مصنف کے قریب العہد ۹۸۷ھ کا اور دوسرا ۱۲۶۱ھ کا ہے، اول الذکر ۳۵۶ صفحے کا اور مؤخر الذکر ۳۸۰ صفحے کا ہے (۱) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سبحان اللہ اورنٹیل لائبریری میں ۱۷۵ اوراق کا ایک نسخہ ہے جو ۱۰۳۹ھ کا لکھا ہوا ہے (۲) حیدرآباد اور پشاور کے کتب خانوں میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں (۳) اس کی ابتدا مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے:

الحمد للہ الذی نور قلوب العارفین فاقتبسوا من لوامع کلامہ (۴)

۴۔غایۃ الکمال فی بیان افضل الاعمال: مصنف کے بیان کے مطابق یہ ان کی آخری تصنیف ہے، انہوں نے اس کی اور اپنی پہلی تصنیف تبیین الطرق کے متعلق خاص طور پر یہ تلقین وتاکید کی ہے کہ ''جن طالبین کو دونوں میں سے کوئی ایک رسالہ میسر آجائے تو انہیں دوسرے کو بھی حاصل کر کے ان کا ساتھ ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے (۵) اس سے اور کتاب کے نام سے رسالہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔مجموعہ حکم کبیر: یہ تصوف کی اہم اور معرکۃ الآرا کتاب ہے جس پر شیخ علی متقی کو خود فخر تھا، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ بڑی مفید اور نافع کتاب ہے جس میں تصوف کے بارہ میں اس فن کی کتابوں میں جس قدر مواد ومسائل موجود تھے ان کا خلاصہ تحریر کر دیا گیا ہے، خود شیخ اپنے دوستوں سے فرماتے تھے کہ تصوف کا جو مشکل

---

(۱) فہرست کتب عربیہ ریاست رام پور، جلد دوم، ص ۳۳۴۔ (۲) فہرست نسخ قلمی، ص ۱۱۵۔ (۳) محبوب الالباب، ص ۴۷ و فہرست لباب المعارف العلمیہ، ص ۱۸۲۔ (۴) محبوب الالباب، ص ۱۴۸۔ (۵) النور السافر، ص ۳۱۹۔

مسئلہ بھی تمہارے سامنے آئے اس کا اس میں جواب ڈھونڈ لو اور تم لوگوں سے جو مشکل مسائل دریافت کیے جائیں ان کا جواب بھی اس میں دیکھ لو (۱)

اس سے کتاب کی اہمیت، قدر و قیمت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۶۔ مختصر النهاية في اللغة: علامہ ابن اثیر جزری نے حدیث کے مشکل الفاظ و لغات کی تحقیق میں "النهاية في غريب الحديث" کے نام سے بڑی مفید، اہم اور عمدہ کتاب لکھی تھی، بعض اصحاب علم نے اس کے مختصرات تحریر کیے تھے، شیخ علی متقی نے بھی اس کا مختصر لکھا تھا۔ (۲)

۷۔ الوسيلة الفاخرة في سلطنة الدنيا والآخرة: اس میں سلاطین اور والیان ملک کے واسطے نصائح اور آداب مملکت بہت خوبی سے تحریر کیے گئے ہیں، رسالہ مختصر مگر مفید ہے، رام پور کے کتب خانہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، ابتدا کی عبارت ملاحظہ ہو:

"الحمدلله رب العالمين.....اما بعد هذه رسالة في نصائح الملوك" (۳)

مولانا حکیم سید عبدالحی رائے بریلوی نے ان کی مندرجہ ذیل تین کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے (۴) ان میں اول الذکر فارسی میں ہے۔

۸۔ البرهان الجلي في معرفة الولي:

۹۔ النهج الاتم في ترتيب الحكم:

۱۰۔ رسالة في ابطال دعوى السيد محمد بن يوسف الجونپوري:

"الثقافة الاسلاميه في الهند" میں مولانا نے ردمہدویت کے ضمن میں شیخ علی متقی کی بھی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، غالباً یہ وہی رسالہ ہے اور اسی میں مہدویت کی تردید کی ہوگی۔

ان کی چند اور کتابوں کے نام بھی بروکلمن وغیرہ نے تحریر کیے ہیں۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۲) کشف الظنون، ج ۲، ص ۲۶۔ (۳) فہرست کتب عربیہ، جلد اول، ص ۳۷۷ وجلد دوم، ص ۴۴۰۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۴۴۔

۱۱۔ شئون المنزلات (تفسیر) ۱۲۔ الفصول شرح جامع الاصول (حدیث) اس کا قلمی نسخہ بانکی پور میں ہے (برہان فروری ۵۴ء، ص ۸۴) ۱۳۔ شمائل النبیؐ (حدیث) اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ میں ہے (برہان فروری ۵۴ء، ص ۸۴) ۱۴۔ العنوان فی سلوک النسوان (تصوف) ۱۵۔ المواہب العلمیہ فی الجمع بین الحکم القرانیہ والحدیثیہ (تصوف) ۱۶۔ تبویب الحکم العطائیہ (تصوف) ۱۷۔ زاد الطالبین (تصوف) ۱۸۔ اسرار العارفین (تصوف) ۱۹۔ نعم معیار القیاس لمعرفۃ مراتب الناس ۲۰۔ فتح الجواد (تصوف) ۲۱۔ نظم الدرر (تصوف) ۲۲۔ ہدایۃ ربی عند فقد المربی (تصوف) ۲۳۔ خلاصۃ الحقائق فی الحکم الدقائق (تصوف) ۲۴۔ عمدۃ الوسائل۔

فن حدیث میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں متداول ہیں، یہ سب دراصل علامہ سیوطی کی کتابوں کی ترتیب وتہذیب ہیں۔

۲۵۔ کنز العمال: علامہ سیوطی نے احادیث نبویؐ کے استیعاب کی غرض سے جمع الجوامع کے نام سے ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا جو صحاح ستہ اور مسانید عشرہ پر مشتمل ہے، یہی مجموعہ جامع کبیر کے نام سے بھی مشہور اور دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں حدیث کے اصل الفاظ نقل کیے ہیں اور اس کے ماخذ اور راوی کے نام کی نشاندہی کی ہے، اسے لغوی ترتیب کے موافق حروف معجم پر مرتب کیا تھا اور ایک باب میں ایک سے لے کر دس یا اس سے بھی زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں، دوسرے حصہ میں یا تو محض فعلی حدیثیں درج کی ہیں یا قولی اور فعلی دونوں طرح کی حدیثیں درج کی ہیں، یہ حصہ صحابہ کے مسانید پر مرتب کیا گیا ہے اور پہلے اس میں عشرہ مبشرہ کی حدیثیں ذکر کی ہیں، پھر باقی صحابہ کرام کی حدیثیں ناموں اور کنیتوں وغیرہ کے لحاظ سے دی ہیں اور آخر میں مرسل حدیثیں نقل کی ہیں۔

علامہ سیوطی نے جامع صغیر میں اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ میں نے اس میں تمام

حدیثیں جمع کی ہیں لیکن اہل علم نے ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ تمام احادیث کا استقصا و استیعاب سخت مشکل ہے، خود جامع صغیر میں ایسی حدیثیں ہیں جو اس میں نہیں آسکی ہیں، اسی لیے بعض لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ مصنف اپنے ارادہ کے مطابق اسے مکمل نہ کر سکے ہوں اور ان کی وفات ہوگئی ہو، تاہم یہ واقعہ کہ انہوں نے یہ مجموعہ بڑی محنت شاقہ سے تیار کیا ہے اور اس کے لیے انہوں نے بے شمار کتب احادیث کا مطالعہ کیا تھا۔

شیخ علی متقی کی عظیم الشان کتاب ''کنز العمال'' دراصل علامہ سیوطی کی ''جمع الجوامع'' (جامع کبیر) کی ترتیب و تنقیح اور ماخذ سے نیز جامع صغیر سے ماخذ ہے، ان کا بیان ہے کہ میں نے متعدد ائمہ فن کی کتابیں دیکھیں لیکن ان میں سے کسی کی کتاب کو بھی سیوطی کی جمع الجوامع سے بہتر اور جامع نہیں پایا، انہوں نے صحاح ستہ اور دوسری کتابوں کی حدیثیں بہت عمدہ طریقہ پر جمع کی ہیں اور اس میں گوناگوں فوائد کا اضافہ بھی کیا ہے، مگر اس کے باوجود وہ کچھ بڑے اور اہم فوائد سے خالی رہ گئی تھی، جیسے:

۱۔ اگر کسی شخص کو کسی حدیث کی تلاش ہو اور وہ اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو لیکن قولی حدیث کا سرا معلوم نہ ہو اور فعلی حدیث کے راوی کا علم نہ ہو تو اس وقت تک اس کے لیے اس کی تلاش بہت دشوار اور مشکل ہے۔

۲۔ اگر کسی شخص کو بیوع یا نماز یا زکوٰۃ وغیرہ ابواب کی تمام حدیثوں کا احاطہ مقصود ہو اور وہ ان سے مطلع ہونا چاہے تو ایسا اس کے لیے اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ پوری کتاب کا ایک ایک ورق الٹے، ظاہر ہے یہ کس قدر دشوار، مشکل اور وقت طلب امر ہے۔

۳۔ ابواب، تراجم اور فصول وغیرہ کی حیثیت احادیث کی شرح جیسی ہوتی ہے، کیوں کہ بعض حدیثیں مجمل اور بعض مفصل ہوتی ہیں، بعض میں حدیث کا قصہ مذکور ہوتا ہے اور بعض میں اس کا ذکر نہیں ہوتا، چنانچہ جب

میں نے علامہ سیوطی کی کتاب جمع وتبویب کی تو مفصل سے مجمل کی توضیح
ہوگئی اور جن حدیثوں میں قصہ وسبب کا ذکر تھا انہوں نے ان حدیثوں کی
تبیین ووضاحت کردی جن میں قصہ مذکور نہیں تھا۔

ان ہی امور کو مدنظر رکھ کر میں نے جمع الجوامع کو مرتب ومبوب کیا تا کہ ان فوائد کو بھی ان میں قلم بند کردوں جن سے وہ خالی رہ گئی تھی، میں نے اپنے مجموعہ کا نام کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال رکھا ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ایک بہتر اور کارآمد مجموعہ ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ یہ لوگوں میں بہت مشہور ومقبول بھی ہوا۔ (۱)

شیخ علی متقی نے کنز العمال کو فقہی ابواب پر جامع الاصول (ابن کثیر) کے انداز و اسلوب پر اس قدر خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے کہ یہ احادیث نبوی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) بن گئی ہے، ان کی ترتیب وتنقیح کی وجہ سے سیوطی کی کتاب کے مقابلہ میں اس کا فائدہ بھی دو چند ہوگیا ہے اور اس سے استفادہ بھی آسان ہوگیا ہے، اسی بنا پر شیخ ابوالحسن بکری فرماتے تھے کہ:

للسیوطی منة علی العالمین وللمتقی منة علیه (۲)	سیوطی نے (جامع کبیر مرتب کر کے) دنیا والوں پر احسان کیا تھا اور شیخ علی نے کنز العمال ترتیب دے کر خود سیوطی پر احسان کیا۔

شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ:

”کتاب دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نے اتنا عظیم الشان کام
کیسے حیرت انگیز طریقہ پر انجام دیا ہے۔“ (۳)

ترتیب وتبویب میں جامعیت وافادیت کو مدنظر رکھنے کے باوجود انہوں نے بڑی احتیاط اور دیانت داری سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ علامہ سیوطی کی کتاب کے خطبہ اور

(۱) منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد جلد اول، ص ۳ تا ۵۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۳) ایضاً۔

دیباچہ کو بھی انہوں نے بعینہ باقی و برقرار رکھا ہے اور اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی اور بیشی نہیں کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''جو یہ کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اسے گویا مرتب ومبوب جمع الجوامع حاصل ہوگئی، اس کے علاوہ اسے اس میں بہ کثرت ایسی حدیثیں بھی ملیں گی جو جمع الجوامع میں نہیں ہیں، کیوں کہ مصنف نے خود جامع صغیر اور اس کے ذیل میں ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جو اس میں درج نہیں ہیں، اب میں وہ دیباچہ نقل کرتا ہوں جو مصنف نے جامع صغیر، اس کے تکملہ اور جامع کبیر کے شروع میں لکھے تھے تاکہ میں نہ کسی چیز کو ترک کروں اور نہ کسی میں ردوبدل کروں۔''(۱)

فن حدیث میں شیخ علی متقی کی جن تصنیفات کا ذکر آگے آرہا ہے، دراصل کنز العمال ان سب کا مجموعہ ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ:

''پھر میں نے اپنی دونوں کتابوں ''غاية العمال في سنن الاقوال'' اور ''مستدرك الاقوال بسنن الافعال'' کو ایک مجموعہ میں اکٹھا کردیا مثلاً کتاب الایمان کو پہلے ''غاية العمال'' سے لکھا جو اسے مستدرک الاقوال سے بھی لکھا اور یہی روش کتاب کے آخر تک قائم اور باقی رکھی ہے اور اس نئے مجموعہ کا نام میں نے ''كنز العمال في سنن الاقوال والافعال'' رکھا ہے۔''(۲)

وہ کنز العمال کی تحریر وتسوید سے ۹۵۷ھ میں فارغ ہوئے اور یہ بڑی تقطیع کی آٹھ جلدوں میں حیدر آباد کے دائرۃ المعارف النظامیہ سے ۱۳۱۲ھ تا ۱۳۱۵ھ میں مولانا وحید الزماں نواب وقار نواز جنگ کی تصحیح کے بعد پہلی دفعہ شائع ہوئی تھی اور اب دوبارہ بھی

(۱) کشف الظنون۔ (۲) منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد جلد اول، ص ۵۔

وہیں سے چھوٹی تقطیع میں اس کے اجزا شائع ہو رہے ہیں، اس ایڈیشن کی ۱۳ تا ۱۸ جلدیں دار المصنفین کے کتب خانہ میں آ گئی ہیں۔

۲۶۔ منتخب کنز العمال: شیخ علی متقی نے خود اپنی کتاب کنز العمال کا ایک خلاصہ مرتب کیا تھا جس کا انہوں نے ''منتخب کنز العمال'' نام رکھا، یہ منتخب بھی حدیث کا ایک مفید، عمدہ اور پاکیزہ مجموعہ ہے، گو اس میں زوائد اور مکررات حذف کر دیے گئے ہیں (۱) تاہم اس میں بھی ہر باب کی حدیثیں آ گئی ہیں۔ (۲)

انہوں نے منتخب کنز العمال مرتب کرنے کی یہ وجہ تحریر کی ہے:

''کنز العمال کی ترتیب کے وقت مجھے اندازہ ہوا کہ سیوطی کی جامع کبیر کی حدیثیں حروف و مسانید پر مرتب کیے جانے کی وجہ سے بہ کثرت مکرر ہو گئی ہیں اور قولی و فعلی حدیثوں کے اضافے ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط بھی ہو گئے ہیں، اس کی وجہ سے حدیث کے طالب علموں کو مکررات اور اضافوں کا پتہ نہیں چلتا، گو بسط و فضل کے جویا لوگوں کے لیے یہ زبانی اور تکرار فائدہ سے خالی نہیں ہے، تاہم عام لوگوں کی کم ہمتی وغیرہ کی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ ان کو اس طرح حذف کر دوں کہ کوئی اہم بنیادی اور معنی خیز بات ترک نہ ہونے پائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کے بعد جب میں نے انتخاب و تلخیص کا کام شروع کیا تو تقریباً پندرہ ہزار حدیثیں حذف ہو گئیں جو اصل کتاب کا ایک تہائی حصہ تھیں۔

حذف و اختصار میں یہ امر مدنظر رہا ہے کہ جس قولی حدیث کو مصنف نے کسی سبب یا مراجعت وغیرہ کے خیال سے فعلی حدیثوں میں ذکر کیا ہے تو میں نے اس کو قسم اقوال کے بجائے صرف قسم افعال میں نقل کیا ہے لیکن

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔ (۲) محبوب الالباب، ص ۲۰۱۔

ایسا اسی وقت کیا ہے جب حدیث کا معنی ومفہوم اسی سبب یا مراجعت وغیرہ
پر موقوف رہا ہو اور اگر معنی اس پر موقوف نہیں تھا تو میں نے اسے قسم الافعال
میں اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے لفظ و معنی قسم اقوال میں مذکور ہو چکے
ہیں اور اگر دو حدیثیں معنی ومفہوم کے لحاظ سے مجھے برابر اور یکساں ملی ہیں
تو میں نے ان میں سے صرف مختصر کو لے لیا ہے اور اگر وہ اختصار میں بھی
یکساں ہیں تو میں نے ان میں سے زیادہ صحیح حدیث کو نقل کرنا پسند کیا ہے۔
بعض جگہ مکرر اور معنی حدیثیں اس لیے نقل کی گئی ہیں کہ اس باب میں
حدیثوں کی تعداد کم تھی یا لوگوں کو ان حدیثوں کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔
اس طرز انتخاب کی وجہ سے یہ مجموعہ اصل کتاب یعنی کنز العمال سے
فائق اور بہتر ہو گیا ہے کیوں کہ اس میں تکرار باقی نہیں رہی اور قولی و فعلی
حدیثیں ساتھ ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔"(۱)

صاحب کشف الظنون کو بھی منتخب کی اس خوبی کا اعتراف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "شیخ علی متقی نے کنز العمال کو جو انتخاب کیا تھا وہ خود ایک جامع، بہتر اور کارآمد چیز ہے۔"(۲)

منتخب کنز العمال مسند احمد بن حنبل کے حواشی پر مطبع میمنہ مصر سے شائع ہو گیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں چار جلدوں میں موجود ہے۔"(۳)

۲۷۔ **منهج العمال فی سنن الاقوال**: علامہ سیوطی نے جامع کبیر کی طرح جامع صغیر کے نام سے بھی احادیث کا ایک مجموعہ ایک جلد میں مرتب کیا تھا جو دراصل جامع کبیر کا ملخص تھا اور پھر خود ہی اس کا اضافہ وتکملہ بھی ایک جلد میں لکھا، جس کے متعلق وہ یہ تصریح کرتے ہیں کہ:

"میں نے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں کلمات اور

---

(۱) منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد بن حنبل، جلد اول صفحات ۶ و ۷۔ (۲) کشف الظنون، ج ۱، ص ۳۹۹۔
(۳) فہرست کتب عربیہ، ج ۱، ص ۱۱۸۔

پندو حکمت پر مشتمل باتیں جمع کی ہیں اور ان کی تخریج میں غیر معمولی کدو کاوش کی ہے مگر اختصار کی وجہ سے چھلکے چھوڑ کر صرف مغز ہی لیا ہے اور اس کو وضعی اور جعلی حدیثوں سے بھی محفوظ رکھا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب اس نوع کی دوسری کتابوں سے بہت بڑھ گئی ہے اور یہ گوناگوں فنی وحدیثی فوائد پر مشتمل ہے، اسے میں نے طلبہ کی آسانی کے خیال سے حدیث کے ابتدائی الفاظ کے لحاظ سے حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور اس کا نام الجامع الصغیر اس لیے رکھا ہے کہ یہ جمع الجوامع (جامع کبیر) کا مقتضب ہے۔''(۱)

شیخ علی متقی نے منہج العمال میں جامع صغیر اور اس کے زوائد کو ابواب وفصول پر اچھے طرز پر مرتب کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''جامع صغیر اور اس کا ضمیمہ وتکملہ چوں کہ قولی حدیثوں کا عمدہ، کار آمد اور جامع ذخیرہ ہے، اس لیے مجھے اس کی حدیثوں کو ابواب وفصول پر مرتب کرنے کا خیال ہوا، اس کی ترتیب بھی حروف تہجی کے مطابق جامع الاصول کے اسلوب پر کی ہے اور کنز العمال کی طرح اس میں بھی مکمل احتیاط ودیانت ملحوظ رکھی ہے، چنانچہ اصل اور ضمیمہ دونوں کے دیباچے اور رموز بعینہ اسی طرح ذکر کیے ہیں جس طرح سیوطی نے املا کرائے ہیں، غرض حتی الامکان اس کی پوری کوشش کی ہے کہ دونوں کی کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔''(۲)

اہل نظر نے شیخ علی متقی کے اس کارنامے کی بھی بڑی تحسین کی ہے، ان کا خیال ہے کہ ''یہ کتاب اتباع سنت کے لیے نہایت عمدہ راہنما ہے۔''(۳)

منہج العمال کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ۹۰۶ صفحے کا رام پور کی رضا لائبریری

---

(۱) منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد، ج ۱، ص ۴ و ۵ و کشف الظنون، ج ۱، ص ۳۷۶ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی، ص ۱۳۷۔ (۲) اتحاف النبلاء ص ۱۶۲۔ (۳) لباب المعارف العلمیہ پشاور، ص ۶۵۔

میں موجود ہے جو ابتدا سے باب النذر تک ہے اور حدیثوں کی تعداد ۱۵۷۵۸ ہے۔ (۱)

اس کے بعض حواشی بھی لکھے گئے ہیں، رام پور کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی حاشیہ موجود ہے جو ۳۸۸ صفحہ کا ہے مگر اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں، یہ نسخہ کسی قدر کرم خوردہ ہے، اس میں قولہ سرخی سے اور باقی تمام کتاب سیاہی سے لکھی ہوئی ہے، منہج کی عبارت قولہ کے بعد کے نقل کی گئی ہے، محشی نے حمد و نعت کے بعد مشکل مقامات کو حل اور مجمل اقوال کی تشریح کی ہے، رام پور کی فہرست کتب عربیہ میں اس کے آغاز و اختتام کی عبارتیں بھی درج کی ہیں۔ (۲)

مولانا نجیب بن قاسم چندراوتی احمد آبادی نے بھی اس کا حاشیہ لکھا تھا جس کی اس کے مقدمہ میں صراحت کی ہے کہ ''میں ۲۹ رمضان المبارک ۹۵۶ھ کو احمد آباد میں اس کی تحریر و کتابت سے فارغ ہوا'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حواشی مصنف کی زندگی میں لکھے گئے تھے، کچھ بعید نہیں کہ وہ مصنف کے شاگرد بھی ہوں۔

منہج العمال کا قلمی نسخہ جس پر یہ حواشی ہیں جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں ہے، یہ نسخہ محشی کے بھانجے قاضی عبداللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا سنہ کتابت ۹۸۶ھ ہے۔ (۳)

۲۸۔ الاکمال: اس میں جوامع الجوامع (جامع کبیر) کی بقیہ قولی حدیثوں کو مبوب کیا ہے، اسی لیے اس کا نام الاکمال لمنہج العمال بھی ہے۔ (۴)

۲۹۔ غایة العمال فی سنن الاقوال: یہ منہج العمال اور الاکمال دونوں کا مجموعہ ہے۔ (۵)

۳۰۔ مستدرک الاقوال بسنن الافعال: اس میں جامع کبیر کی فعلی حدیثوں (قسم الافعال) کی ترتیب و تبویب کی گئی ہے۔ (۶)

---

(۱) فہرست کتب عربیہ رام پور، ج۱، ص۱۱۹۔ (۲) ایضاً، ج۲، ص۱۹۷۔ (۳) رسالہ برہان فروری ۱۹۵۴ء مضمون ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ (۴) منتخب کنز العمال بر حاشیہ احمد، ج۱، ص۴ و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر، ج۱، ص۴۳۳۔ (۵) کشف الظنون، ج۱، ص۳۹۹۔ (۶) ایضاً۔

شیخ محمد بن طاہر

(متوفی ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء)

نام: محمد نام اور جمال الدین یا مجد الدین لقب تھا (۱) تذکروں میں ان کا نام محمد بن طاہر اور محمد طاہر دو طرح سے لکھا ہے، حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ جو شیخ محمد بن طاہر کے ہم عصر ہیں اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کا نام محمد طاہر لکھا ہے لیکن ان کے دوسرے معاصر علامہ محمد غوثی شطاری، آزاد بلگرامی اور کئی دوسرے ارباب تذکرہ نے محمد بن طاہر لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ صرف طاہر کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھا ہے، اس سے اس قدر تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ ان کا نام طاہر نہیں تھا، اب جہاں تک محمد طاہر کے مرکب نام کا سوال ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ واقعۃً مرکب نام ہے کیوں کہ ناموں کے ساتھ تبرکاً محمد لکھنے کا جو رواج اب ہو گیا ہے وہ پہلے یا کم از کم دسویں صدی ہجری تک نہیں تھا، پہلے محمد اور احمد وغیرہ خود مستقل نام ہوتے تھے، اس بنا پر شیخ کا اصلی نام محمد ہی ہے اور طاہر ان کے باپ کا نام ہے، اس مسئلہ پر مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے اچھی طرح بحث کی ہے، ذیل میں اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

۱۔ عرب قوم میں مرکب نام کا دستور نہیں تھا اور ہوتا بھی تھا تو عبدالوہاب، عبداللہ اور عبدالرشید کے طرز کا اور اب تک بوہروں میں اس کا رواج نہیں ہے، البتہ ہندوستانی مسلمان

(۱) النور السافر، ص ۳۶۱ و شذرات الذہب، ج ۸، ص ۴۱۰ و الرسالۃ المستطرفہ، ص ۱۴۴۔

اپنے ناموں کے ساتھ محمد کا لفظ برکت کے خیال سے لگا دیتے ہیں، بخلاف اس کے بوہروں میں اگر کسی کے نام کے ساتھ محمد اضافہ کر دیا جائے تو اصل نام تو اس کے باپ کا سمجھا جائے گا اور محمد جو تبرکا لگایا گیا ہے خود اسی کا نام سمجھا جائے گا، یعنی جیسے محمد طاہر کہنے پر محمد ان کا اور طاہر ان کے باپ کا نام متصور ہوگا، اس لیے جن تذکرہ نگاروں نے ان کا نام محمد طاہر لکھا ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ محمد طاہر ان کا مرکب نام ہے بلکہ محمد ان کا اور طاہر ان کے والد کا نام ہوا۔

۲۔ تاریخ فرشتہ میں محمد بختیار خلجی کا نام موجود ہے جس نے بہار و بنگال کو فتح کیا تھا، حالانکہ اس کا صحیح نام محمد بن بختیار ہے، ٹھیک اسی طرح فاتح سندھ محمد بن قاسم کا صحیح نام محمد بن قاسم ہے مگر عموماً اسے محمد قاسم ہی لکھا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن کو حذف کر کے باپ بیٹوں کا نام لکھنے کا رواج غیر عربوں میں موجود ہے، چنانچہ گجرات میں آج بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ باپ اور بیٹوں کے نام بغیر ابن کے ہوتے ہیں جیسے احمد اسماعیل بوتا والا، عبداللہ احمد ننھا میاں ولی اللہ وغیرہ۔ (۱)

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شیخ نے خود اپنی کتابوں میں اپنا نام محمد بن طاہر ہی لکھا ہے۔ (۲)

ان وجوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا اصل نام محمد تھا اور طاہر ان کے والد بزرگوار کا نام تھا، پس جن لوگوں نے محمد طاہر لکھا ہے اس کی حیثیت محمد قاسم اور محمد بختیار جیسے ناموں کی ہے۔

نسب وقومیت: عام تذکرہ نگاروں نے ان کا نسب صرف دادا تک لکھا ہے، یعنی محمد بن طاہر بن علی، مگر تاریخ گجرات کے مشہور عالم مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے ان کا حسب ذیل شجرۂ نسب تحریر کیا ہے جو خود شیخ کے ایک خاندانی بزرگ سے ان کو دستیاب ہوا تھا:

''محمد بن طاہر بن علی بن الیاس بن ابوالنصر داؤد بن ابوعیسیٰ عبدالملک بن

(۱) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی، ص ۱۱ و ۱۲۔ (۲) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص ۳ و دیباچہ قانون الموضوعات، ص ۲۳۰۔

ابوالفتح یونس شامی مؤلف جامع القصص ابن عمر شامی صاحب البدایہ والنہایہ
بن عبداللہ بن ابوالعطا حسین مفتی بن ابوالحامد احمد غریب بن ابوقاسم محمد بن
ابوالصلاح محمد بن ابوالفیض عبداللہ بن ابوالرضا عبدالرحمٰن بن ابوالبقا قاسم
البر (؟) محمد عباس بن ابوالنصر محمد طیفور شامی بن ابوالمجد خلف بن ابوالمجد
احمد بن ابوالوجود شعیب بن ابوطلحہ بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق
صاحب رسول اللہ۔(۱)

اس شجرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نسباً صدیقی تھے اور ان کے آباؤ اجداد کا تعلق عرب سے تھا، اس کے ثبوت میں چند اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں جو ان کے پوتے اور ممتاز عالم وفقیہ شیخ عبدالقادر بن شیخ ابوبکر (متوفی ۱۱۳۸ھ) کے استاذ شیخ عبداللہ طرفہ انصاری نے کہے تھے، وہ فرماتے ہیں:

قد کان جد ابیک بل ضریحه
من اوحد العلماء و الفضلاء
اعنی محمد بن طاهر من منجی
الصديق حقه بغير مراء (۲)

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پردادا کی قبر کو خدا سیراب کرے، وہ یکتائے روزگار علما وفضلا میں تھے، یعنی محمد بن طاہر بلا شک وشبہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی نسل سے تھے۔

لیکن انہیں عام طور پر ہندنژاد اور بوہرہ قوم کا فرد خیال کیا جاتا ہے، ان کے معاصر شاہ عبدالحق دہلویؒ کا یہی خیال ہے، علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''جمہور کا اتفاق ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کا تعلق بوہرہ قوم سے تھا،

(۱) مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی،ص۱۰،۱۱۔(۲) اتحاف النبلا،ص۳۹۸۔

شیخ عبدالحق دہلویؒ نے بھی اخبار الاخیار میں اسی کی تصریح کی ہے۔''(۱)

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صدیقی کیوں کہلاتے ہیں؟ اس کے جواب میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ نسبت عقیدہ کے اعتبار سے ہے، کیوں کہ فرقہ شیعہ اپنے کو حیدری کہتا تھا، اس کے مقابلہ میں یہ اپنے کو صدیقی کہتے تھے۔ (۲)

نواب صدیق حسن خاں صاحب نے جمہور کے خیال کو مرجح بتایا ہے اور اس کی خاص وجہ یہ بتائی ہے کہ نسب ماں کی طرف سے نہیں چلتا بلکہ باپ کی جانب سے چلتا ہے، مگر وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ طرح کے اشعار سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن طاہر ماں یا باپ کسی ایک جانب سے صدیقی ضرور تھے، تاہم ان کے نزدیک صحیح ترین بات یہی ہے کہ وہ بوہرہ تھے، حالات الحرمین میں درج ہے کہ شیخ محمد طاہر بوہروں میں سے تھے۔ (۳)

شیخ محمد بن طاہر نے خود اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں اپنے کو ہندی نژاد قرار دیا ہے:

فقد قال اضعف عباد القوی الولی	قوی اللہ کے بندوں میں سب سے ضعیف
محمد بن طاهر بن علی الفتنی الهندی	محمد بن طاہر عرض کرتا ہے جو سکونت اور نسب
مسکنًا و نسبًا (۴)	کے لحاظ سے پٹنی اور ہندی ہے۔

قانون الموضوعات کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

فیقول افقر عباد اللّٰه الغنی محمد بن	غنی اللہ کے بندوں میں زیادہ محتاج محمد بن
طاهر بن علی الهندی الفتنی (۵)	طاہر بن علی ہندی پٹنی عرض کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ خود اپنے کو ہندی الاصل اور بوہرہ قوم کا فرد سمجھتے تھے، آزاد بلگرامی اور بعض دوسرے اہل علم نے ان کو نومسلم ہندوستانی بتایا ہے۔

---

(۱) مآثر الکرام، ج۱، ص۱۹۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) اتحاف النبلاء ص ۳۹۸، ۳۹۹۔ (۴) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص۳۔ (۵) ایضاً، ص۲۳۰۔

وكان رحمه الله من البوهرة المتوطنين بگجرات الذين اسلم اسلافهم على يدا الشيخ على الحيدرى المدفون بكنبايت ومضى لاسلامهم نحو سبع مائة سنة (۱)	شیخ محمد بن طاہرؒ ان بوہروں کی نسل سے تھے جو گجرات میں آباد تھے اور جن کے اسلاف شیخ علی حیدری کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے، شیخ حیدری کھمبایت میں دفن ہیں اور بوہرے تقریباً سات سو برس سے مسلمان ہیں۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے شیخ کی نسل وقومیت کے بارہ میں دو مختلف رائیں سامنے آتی ہیں، پہلی رائے کے مطابق وہ عربی النسل اور صدیقی النسب تھے اور دوسری رائے یہ ہے کہ وہ نومسلم ہندی الاصل اور گجرات کے بوہروں کی قوم سے تعلق رکھتے تھے، ان کا عربی النسل ہونا ثابت نہیں۔

گو یہ رائیں بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقۃً ان میں تضاد نہیں، شیخ کا بوہرہ ہونا ان کے صدیقی النسل اور عربی الاصل ہونے میں مانع نہیں ہے کیوں کہ بوہروں میں خالص ہندوستانی اور نومسلم بھی تھے اور بعض عرب کے بجائے دوسرے ملکوں سے آ کر ان میں شامل ہو گئے تھے اور بعض بوہرے خالص عربی بھی تھے، مولانا ابوظفر ندوی مرحوم گجرات کی تاریخ کے ماہر اور مشہور مسلم عالم ہیں، انہوں نے بوہرہ قوم کی اصلیت پر طویل بحث کر کے آخر میں لکھا ہے:

> ''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بوہرہ قوم ایک ایسی جماعت ہے جو مختلف نسلوں اور قوموں کا مجموعہ ہے، اس میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، خالص عرب بھی ہیں اور خالص ہندی بھی، ایرانی بھی ہیں اور عراقی بھی، قدیم الاسلام بھی ہیں اور جدید الاسلام (نومسلم) بھی، تاجر بھی ہیں اور غیر تاجر بھی، غرض یہ بوہرہ مختلف قوموں اور نسلوں کا مجموعہ ہے۔'' (۲)

(۱) بحوالہ مقدمہ بحار الانوار از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ص ب۔ (۲) مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۲۷۔

اس توجیہ کے بعد شیخ کو بوہرہ قوم کا فرد ہونے کے باوجود صدیقی اور عربی بھی کہا جاسکتا ہے۔

گجرات میں بوہرہ قوم کی بڑی آبادی تھی، ان لوگوں کا ذریعہ معاش تجارت اور صنعت وحرفت تھا، اس لیے انہیں بوہرہ کہتے ہیں جو ہندی لفظ بیوپار سے بنا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ بوہرہ عربی لفظ ہو، قاموس میں ہے:

بهراء قبيله وبهرة بالفم بنواحي المدينة بالیمامة — بہراء ایک قبیلہ کا نام ہے اور بہرہ مدینہ اور یمامہ کے نواح میں رہتے ہیں۔

صراح میں ہے کہ بہرا قبیلہ قضاعہ کی ایک شاخ کا نام ہے، مشہور مؤرخ مسعودی ۳۰۳ھ میں بھروچ اور کھمبایت کی سیاحت کے لیے آیا تھا، اس کا بیان ہے کہ چیمور (متصل بمبئی) میں علاوہ بغداد اور بصرہ کے دس ہزار بیاسرہ مسلمان ہیں اور قاموس میں بیاسرہ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ "بیاسرہ سندھ میں ایک قوم ہے جن کو ناخدا کرایہ پر دشمنوں سے لڑنے کے لیے رکھتے تھے اس کا واحد بیسرہ ہے۔"

ابتدا میں جو تاجر جہازوں پر ان لوگوں کو نوکر رکھ کر ہندوستان لاتے تھے ممکن ہے انہی کو بیاسرہ کہنے لگے ہوں اور پھر یہ لفظ صرف ان لوگوں کے لیے مستعمل ہونے لگا ہو جو عرب سے آکر یہاں مقیم ہوجاتے ہوں اور رفتہ رفتہ ان کی اولاد (ہند میں پیدا ہونے والی) کے لیے مخصوص ہوگیا ہو۔

غرض بوہرہ کے معنی عام تاجر کے لیے جائیں یا اس سے مراد عرب سے آنے والے تاجر ہوں یا ان کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے ہو، ہر صورت میں بلا تفریق مذہب ونسل یہ لفظ زیادہ تر مسلمان تاجروں کے لیے استعمال ہوا اور عرب تاجر (مسلمان) کا ہندوستان میں پہلی صدی ہجری سے آنا مسلم ہے۔(۱)

---

(۱) مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۱۷ تا ۱۹۔

بوہرہ قوم کے دو مشہور فرقے تھے، چھوٹی جماعت کو شیعہ اور بڑی کو سنی کہتے تھے، شیعہ بوہرے اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، یہ فرقہ اسماعیل بن امام جعفر صادق کو امام مانتا ہے اور دوسرے ائمہ کا منکر ہے، یہ لوگ تقیہ کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو انتہائی حد تک پوشیدہ رکھتے ہیں، شیخ محمد بن طاہر کا تعلق بڑی جماعت یعنی اہل سنت والجماعت سے تھا۔(۱)

ولادت ووطن: مشہور قول کے مطابق شیخ محمد بن طاہر ۹۱۳ھ میں پٹن میں پیدا ہوئے (۲) مگر شیخ کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے لکھا ہے کہ ۹۱۴ھ میں پیدا ہوئے (۳) پٹن کی نسبت وہ فتنی (پٹنی) کہلاتے ہیں، یہ گجرات کا قدیم دارالخلافت تھا جو نہر والہ بھی کہلاتا تھا، مؤرخ مکہ صاحب الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام قطب الدین محمد بن احمد النہروالی (متوفی ۹۹۰ھ) اسی کی جانب منسوب ہیں (۴) یہ قدیم آبادی جو احمد آباد سے پہلے گجرات کے بادشاہوں اور راجاؤں کا پایۂ تخت تھا، اس کی پرانی آبادی جو شہر پناہ کے اندر تھی ویران ہوگئی، قلعہ بھدر کا دروازہ اور برج بطور آثار کے باقی رہ گئے ہیں، جدید آبادی احمد آباد سے تقریباً نوے میل پر مغرب اور شمال کے درمیان ہے۔(۵)

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ پٹن کے بانی بن راج چوڑا کے ایک ساتھی انہل نامی شخص کے انتخاب پر یہ زمین پسند کی گئی تھی اور اسی کے نام پر انہل واڑا مشہور ہوئی جسے عربی مصنفین نے اپنے لہجہ کے مطابق نہروالہ کر دیا، مگر آخری عہد میں لوگ اسے صرف پٹن کہتے تھے کیوں کہ ہندو راجدھانی یا بڑے شہر کو پٹن کہتے تھے، جیسے پاک پٹن، سومناتھ پٹن وغیرہ، پنجاب میں پاک پٹن موجود ہے اس لیے اس کو لوگ گجرات پٹن کہتے تھے۔(۶)

شیخ کا زمانہ: شیخ کی ولادت سے سو برس قبل ہی پٹن سے تغلق خاندان کی حکمرانی کا

---

(۱) اتحاف النبلاء، ص ۳۹۹۔ (۲) النور السافر، ص ۳۶۱۔ (۳) رسالہ مناقب، اردو ترجمہ، ص ۸۹۔ (۴) الرسالۃ المستطرفہ، ص ۱۲۴ ومقدمہ بحار الانوار مولانا اعظمی۔ (۵) تاریخ احمدی، ص ۲۳۲۔ (۶) مقدمہ تذکرۂ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۴۱ بحوالہ مرأۃ احمدی، ج ۱، ص ۲۶، کلکتہ۔

خاتمہ ہو چکا تھا اور پٹن کی سلطنت آزاد ہو چکی تھی، شیخ کی ولادت کے وقت پٹن کا حکمراں محمود اعظم عرف بیگرہ تھا(۱)، ۹۱۸ھ میں اس کی وفات ہوگئی، اس کے بعد متعدد فرمانروا یکے بعد دیگرے تخت حکومت پر متمکن ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہِ دہلی نے گجرات فتح کر کے اسے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا، اس طرح پٹن کی آزاد سلطنت ختم ہوگئی اور گجرات بھی ہندوستان کا ایک صوبہ بن گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ کا دور بڑا پرآشوب تھا، وہ سلطان محمود بن لطیف خاں کے زمانہ میں مکہ معظمہ سے واپس آئے تھے، یہ خانہ جنگی کا زمانہ تھا، سلطان تخت نشینی کے وقت بہت کم سن تھا اس لیے زمام حکومت امرائے دولت کے ہاتھ میں تھی اور ان میں اقتدار کے لیے باہم سخت رسہ کشی جاری تھی اور ہر طرف شورش وانتشار برپا تھا، ملک میں امن وامان مفقود تھا، اہل علم ان حالات سے سخت پریشان تھے کیوں کہ سکون و جمعیت خاطر کے ساتھ علمی و تعلیمی کام انجام دینے کا موقع میسر نہیں تھا، علامہ محمد بن طاہر نے اس زمانہ کے ابتر حالات اور ارباب حکومت کے ظلم وجور کا اپنی بعض تصنیفات میں کہیں کہیں ذکر کیا ہے، لیکن جب گجرات ممالک محروسہ میں شامل ہوگیا تو سیاسی استحکام پیدا ہوا اور خانہ جنگی وانتشار کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

شیخ کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی علوم کے چھ بڑے مرکز تھے:

۱۔دہلی ۲۔پنجاب ۳۔پورب یعنی جونپور، الٰہ آباد اور لکھنؤ کا علاقہ ۴۔گجرات ۵۔سندھ ۶۔برہان پور۔

گجرات میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد بن طاہر پٹنی (۱۵۷۸ء) اور علامہ وجیہ الدین گجراتی (متوفی ۱۵۹۰ھ) نے پائی۔(۲)

تحصیل علم: ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بلوغ سے قبل ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، اس کے

---

(۱) تاریخ گجرات کے مشہور فاضل مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے صحیح لفظ بیگڑو بتایا ہے (تذکرہ محمد بن طاہر، ص۴۳)۔ (۲) رود کوثر، ص۳۹۰، ۳۹۲۔

بعد دوسرے فنون کی جانب متوجہ ہوئے، انہوں نے طلب علم میں بڑی سعی ومحنت کی اور اس میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا، پندرہ برس کی عمر میں معقول ومنقول اور اصول وفروع میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے فاضل وکامل خیال کیے جانے لگے، اسی زمانہ سے درس بھی دینے لگے تھے، مؤرخین کا بیان ہے کہ گجرات میں شیخ محمد بن طاہر اور شیخ وجیہ الدین سے زیادہ ممتاز کوئی آدمی نہ تھا۔(۱)

اساتذہ: شیخ محمد بن طاہر کے زمانہ میں گجرات ایک بڑا علمی مرکز تھا، خود ان کے وطن نہر والہ (پٹن) میں علوم وفنون کا چشمہ جاری تھا، قدیم پایہ تخت ہونے کی وجہ سے یہاں اصحاب علم وفن اور صوفیہ ومشائخ کی بڑی تعداد موجود تھی، اس لیے سب سے پہلے شیخ نے اپنے وطن ہی کے علما وفضلا اور ارباب کمال کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان کے یہاں کے اساتذہ میں سے جن لوگوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مولانا شیخ ناگوری۔ شیخ برہان الدین سمہودی۔ مولانا یداللہ سوہی۔ ملامتھ یا مٹھ یہ چاروں بزرگ گجرات کے علمائے کبار میں رہے ہوں گے، شیخ محمد بن طاہر نے ملا مٹھ کی خدمت میں تعلیم ختم کی، ان کا لقب استاد الزماں تھا، یہ پٹن کے ایک بہت بڑے عالم تھے، ان کا اصلی نام معلوم نہ ہوسکا، انہوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

علامہ محمد بن طاہر پٹنی اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، ان کے علاوہ اور بہت سارے لوگ اس مدرسہ سے فیض یاب ہوئے تھے، شیخ عبدالوہاب کا بیان ہے کہ جب عارف ربانی شیخ متھ کا انتقال ہوا جو شیخ محمد بن طاہر کے ہندوستانی استاد تھے اور جن سے آخری درجہ کی سب کتابیں پڑھی تھیں تو ان کے کوئی لڑکا نہ تھا جو جانشین ہوتا، اس بنا پر شیخ ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔(۲)

(۱) النور السافر، ص ۶۱، ۳۶۲ و ۳۶۳ و ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۸۹۔ (۲) تذکرہ شیخ محمد بن طاہر، ص ۲۹، حاشیہ یاد ایام، ص ۵۵، گجرات کی تمدنی تاریخ، ص ۱۹۸، ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۹۴۔

شیخ محمد بن طاہر اپنے وطن میں تعلیم مکمل کرنے اور کتب متداولہ سے فراغت کے بعد حرمین تشریف لے گئے اور وہاں کے مندرجہ ذیل بزرگوں سے فن حدیث کی تحصیل کی:

شیخ ابوالحسن بکری، علامہ احمد بن حجر ہیثمی، شیخ احمد بن حجر مصری مکی صاحب صواعق محرقہ، شیخ علی بن عراق، شیخ جار اللہ بن فہد مکی، شیخ عبداللہ عیدروس مدنی، شیخ علی مدنی، شیخ برخوردار سندھی، شیخ عبیداللہ حضرمی، شیخ ابی عبیداللہ زبیدی۔

مکہ معظمہ ہی میں شیخ اجل علی متقی ہندی کی بارگاہ فضل وکمال میں بھی ان کی رسائی ہوئی اور ان سے خاص طور پر استفادہ کیا، اپنی کتاب مجمع بحار الانوار کی ابتدا میں ان کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے، یہ عقیدت اور تعلق اس قدر بڑھا کہ ان سے بیعت بھی ہوئے۔(۱)

تلامذہ: شیخ کا دائرۂ فیض بھی بہت وسیع تھا اور وہ طلبہ کی مالی امداد بھی کرتے تھے، ان کے فیاضانہ سلوک کی وجہ سے ان کے یہاں طالب علموں کا ہجوم لگا رہتا تھا، ان کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے ان کے حالات میں رسالہ مناقب لکھا تھا، اس میں ان کے حسب ذیل شاگردوں کے نام درج ہیں:

ابوالبشر محمد فضل، شیخ ضیاء الدین بن شیخ محمد غوث گوالیاری، ابوالفتح میاں احمد خاں پٹنی، شیخ داؤد بن شیخ حسن، برہان الدین واعظ، محمد اسحٰق، میاں جلال......بن جھن (شاہ عالم) محمد حسن، نور محمد حسن، عبدل بن فتح اللہ سارنگپوری، شیخ محمد شطاری، شیخ جیون سورتی، شیخ حسین سورتی، شیخ عبدالہادی احمد آبادی، شیخ فرید کاسب پٹنی، شیخ عبدالنبی صدر الصدور (بعہد محمد اکبر بادشاہ دہلی)

ان ناموں کے گنانے کے بعد وہ لکھتے ہیں ''ان کے علاوہ بے شمار دوسرے بزرگ بھی شاگردوں میں داخل ہیں جن میں سے کچھ مشہور کچھ غیر معروف ہیں، طوالت کے خیال سے حذف کردیا۔(۲)

---

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۶۴، مآثر الکرام، ص۱۹۴، النور السافر، ص۳۶۲، اتحاف النبلاء، ص۳۹۸۔ (۲) رسالہ مناقب اردو ترجمہ، ص۹۳و۹۴۔

حرمین کا سفر اور حج بیت اللہ: اوپر گزر چکا ہے کہ کتب متداولہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے حرمین تشریف لے گئے، مؤرخین کے بیان کے مطابق یہ سفر ۹۴۴ھ میں ہوا جب کہ ان کی عمر ۳۰ یا ۳۱ برس تھی، شیخ پہلے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد قبر نبویؐ کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ گئے، اس کے بعد مکہ معظمہ واپس آکر علما و مشائخ سے استفادہ کے لیے وہاں مدتوں قیام کیا۔(۱)

ذہانت و فطانت: شیخ نہایت ذہن اور تیز طبع تھے، اس کی وجہ سے انہیں تحصیل علم میں ابتلا اور مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ "تحصیل علم کے زمانہ میں انہیں طلبہ کی جانب سے سخت صعوبتیں جھیلنا پڑیں، جس مدرسہ میں جاتے وہاں کے طلبہ اور ہم عصر لوگ انہیں دق کرتے، یہ لوگ شیخ سے مباحثہ کی تاب نہ لانے کی وجہ سے ان سے جلتے اور رشک و حسد کرتے اور انہیں طرح طرح سے ایذا دینے کی فکر میں رہتے تھے، بعض اساتذہ کا برتاؤ بھی ان سے اچھا نہ تھا، اس ناگوار صورت حال کی بنا پر انہوں نے اسی زمانہ میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر اللہ نے مجھ کو علم سے بہرہ ور کیا اور درس دینے کے لائق بنایا تو میں رضائے الٰہی کے لیے علم کی نشر و اشاعت کروں گا اور تعلیم میں کسی قسم کے بخل سے کام نہ لوں گا، طالب علموں کی عزت کروں گا اور ان کے ساتھ لطف و شفقت کا برتاؤ کروں گا، کسی کو علم سے محروم نہ رکھوں گا بلکہ بہتے ہوئے چشمہ کی طرح سے ہر شخص کو فیض یاب ہونے کا موقع دوں گا۔(۲)

طلبہ کی امداد اور حسن سلوک: چنانچہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی جب درس و تدریس کے منصب پر فائز ہوئے تو انہیں نذر کی تکمیل کا موقع ملا اور انہیں استفادہ کے معاملہ میں کسی

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴، آثار الکرام، ج ۱، ص ۱۹۴، النور السافر، ص ۳۶۲۔ (۲) النور السافر، ص ۳۶۲ و ترجمہ اردو رسالہ مناقب، ص ۹۲۔

کسی طالب علم کے ساتھ بخل سے کام نہ لیا بلکہ ایسا فیاضانہ سلوک کیا کہ ان کے یہاں علم کے شائق لوگوں کا اژدحام رہتا تھا اور بے شمار طلبہ ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے تھے، وہ طلبہ کے وظائف پر بے دریغ خرچ کرتے تھے، انہیں اپنے والد سے کافی ترکہ ملا تھا، وہ سب طالب علموں کے لیے نچھاور کر دیا تھا۔

شیخ کا یہ بھی طریقہ تھا کہ ذہین اور ذی استعداد طلبہ سے ان کے حالات دریافت کرتے، جو طالب علم غنی اور مالدار ہوتے ان سے کہتے کہ مستعدی اور محنت سے علم حاصل کرو اور جو طلبہ محتاج اور ضرورت مند ہوتے ان سے فرماتے ''معاش کی طرف سے بے فکر رہو، میں تمہاری اور تمہارے متعلقین کی پوری کفالت کروں گا تاکہ تم سرگرمی اور انہماک سے علم حاصل کرو'' غرض جو بھی محتاج اور نادار طالب علم ہوتا اس کے ساتھ وہ یہی معاملہ کرتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیتے تھے، اس کی وجہ سے طلبہ کی ایک بڑی جماعت فراغت اور بے فکری سے مختلف علوم وفنون کی ماہر ہو کر نکلتی۔ (۱)

طلبہ کی عام کفالت اور ان کی ضروریات کی فراہمی کے علاوہ شیخ محمد بن طاہر ان کے لیے روشنائی بھی بناتے، اس کی تلقین ان کے شیخ علی متقی نے انہیں کی تھی، چنانچہ پڑھاتے وقت بھی سیاہی بنانے کا سلسلہ جاری رکھتے اور جب تیار ہو جاتی تو اسے طلبہ میں تقسیم کر دیتے۔ (۲)

درس وتدریس: حجاز میں کئی برس قیام کے بعد جب وہ وطن واپس تشریف لائے تو پورے طور پر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے (۳) انہوں نے اپنے وطن نہروالہ (پٹن) میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں ہر قسم کے علوم پڑھائے جاتے تھے، مگر یہ حدیث کی تعلیم کے لیے زیادہ مشہور تھا، وہ اس کے خود مدرس اعلیٰ تھے، ان کے بعد

(۱) النور السافر، ص ۳۶۲، رسالہ مناقب، ص ۹۳، شذرات الذہب، ج ۸، ص ۴۱۰۔ (۲) تاریخ احمدی، ص ۱۳۷، اخبار الاخیار، ص ۲۶۴، مآثر الکرام اول، ص ۱۹۴۔ (۳) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۴۔

ان کے لڑکے اور پوتے کے زیر اہتمام یہ مدرسہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا، عہد عالمگیر میں جب نیا مدرسہ قائم ہوا تو یہ مدرسہ اسی میں منضم ہو گیا۔(۱)

احمد آباد میں سلطان احمد کی مسجد میں بھی انہوں نے درس دیا تھا، جہاں دوسرے علما و فضلا بھی درس دیتے تھے، اس زمانہ میں دوسرے مدرسوں کے طلبہ بھی حل مشکلات اور بعض مسائل کی تحقیق کے لیے شیخ محمد بن طاہر کے حلقۂ درس میں آتے اور وہ ان لوگوں کی پوری طرح تشفی فرماتے تھے، سلطان محمود ثانی کے ایک وزیر کو ان کے درس کی خبر ہوئی تو وہ بھی ملاقات کے لیے آیا اور چند مشکل امور دریافت کیے جن کا شافی جواب پا کر مطمئن ہو گیا۔(۲)

ان کے درس کی مقبولیت اور شہرت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب ان کے استاد شیخ مٹھ کا انتقال ہوا جن کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے ان کی جانشینی کا مسئلہ پیش ہوا، لوگوں کا کسی خاص شاگرد پر اتفاق نہ ہوتا تھا، بالآخر لوگوں نے طے کیا کہ ان کی جگہ پر مصلیٰ خالی چھوڑ دیا جائے اور پھر جس کی طبیعت مائل ہو وہ آگے بڑھ کر نماز پڑھا دے، چنانچہ اس وقت شیخ محمد بن طاہر بھی موجود تھے بغیر کسی اشارے کے وہ خود بڑھ کر مصلے پر کھڑے ہو گئے اس سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ انہی کو استاد کا جانشین بنانا اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، اسی وجہ سے کسی اور شاگرد کو قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔(۳)

ملا مٹھ کی مسند درس پر بیٹھ کر انہوں نے ان کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔

شیخ کا کتب خانہ: شیخ نے اپنے علمی ذوق اور علم وفن سے غیر معمولی اشتغال کی بنا پر ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جو نادر، بیش قیمت اور اہم کتابوں پر مشتمل تھا، اس میں عرب وعجم سے کتابیں منگوا کر جمع کی تھیں، جب تک اس خاندان کے لوگوں کو علم سے اشتغال رہا، کتابیں محفوظ رہیں، پھر آہستہ آہستہ ضائع ہونے لگیں، اب بھی اس کا کچھ حصہ شیخ کے

---

(۱) گجرات کی تمدنی تاریخ، ص ۱۹۹۔ (۲) اردو ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۹۹۔ (۳) مقدمہ تذکرہ محمد بن طاہر، ص ۳۳ بحوالہ رسالہ مناقب۔

اہل خاندان اور ورثہ کے پاس باقی رہ گیا ہے مگر کتابیں نہایت خراب حال میں ہیں، اس کتب خانہ میں ان کی تصنیف مجمع بحار الانوار کا ایک قلمی نسخہ بھی موجود ہے جس کو خود انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے مگر کتاب کی کسی اندرونی شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔(۱)

علم حدیث میں بلند پائیگی: شیخ محمد بن طاہر مروجہ علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ارباب تذکرہ نے ان کو متعدد فنون میں ماہر و فائق قرار دیا ہے(۲) ان کے علمی تبحر اور فضل و کمال کے متعلق شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ بیان نقل کرنا کافی ہوگا کہ "حق سبحانہ وتعالیٰ اوراعلم وفضل داد" (۳) لیکن حدیث میں وہ خصوصیت سے بہت ممتاز اور بلند پایہ اور اس فن کے امام تھے، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں "تکمیل علوم خصوصاً تکمیل علم حدیث پورے طور پر کی (۴) گجرات میں ان کے درجہ ومرتبہ کا کوئی محدث نہ تھا، ان کے اس فضل وکمال کے تمام لوگ معترف ہیں۔

دراصل انہوں نے فن حدیث میں بے نظیر کمال حاصل کیا تھا (۵) اور اپنی زندگی اس مفید اور بابرکت علم کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی، ان کا شمار ہندوستان کے اکابر علما اور افاضل محدثین میں ہوتا ہے، رئیس المحدثین اور ملک المحدثین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے (۶) ان کے فضل وکمال اور علم حدیث میں خصوصیت وامتیاز کا آوازۂ شہرت ہندوستان سے گزر کر دنیائے اسلام میں بھی بلند ہوگیا تھا۔(۷)

حدیث کے علاوہ لغت اور عربی زبان کے بھی ماہر تھے اور لغوی کہلاتے تھے، اپنے اس کمال کی وجہ سے بھی انہوں نے علم حدیث کی بڑی مفید خدمت انجام دی اور اس کے مشکل الفاظ ولغات کا ایک جامع لغت مجمع بحار الانوار مرتب کی جس کی حیثیت احادیث شرح کی ہے۔

---

(۱) گجرات کی تمدنی تاریخ، ص ۳۲۳ و ۳۲۴۔ (۲) النور السافر، ص ۳۶۲۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔ (۴) ایضاً۔ (۵) اذکار ابرار، ص ۳۲۲، ترجمہ گلزار ابرار بحوالہ معارف مارچ ۵۵ء۔ (۶) النور السافر، ص ۳۶۱ و الرسالۃ المستطرفہ، ص ۱۲۴۔ (۷) یاد ایام، ص ۵۵۔

انہوں نے صرف احادیث کی شرح وتوضیح اور اس کی علمی خدمت ہی انجام نہیں دی ہے بلکہ حدیث وسنت کی خدمت اور اس کا فروغ واشاعت بھی زندگی کا خاص مقصد تھا، آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:

''خادم حدیث نبوی وناصر سنن مصطفوی است۔''(۱)

حدیث وسنت نبوی کے فروغ وترقی اور بدعات وخرافات کا قلع قمع کرنے کے لیے وہ ہر وقت مستعد اور سرگرم رہتے، اپنی قوم کی اصلاح اور اسے بدعات کی آلودگی سے پاک کرنے اور جادۂ سنت پر استوار رکھنے کے لیے انہوں نے جو مہم چلائی تھی اور جس میں ان کی جان بھی چلی گئی، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

مسلک ومذہب: اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ کا بوہرہ قوم کے کلاں فرقہ (سنیوں) سے تعلق تھا اور فقہی مذہب حنفی تھا۔(۲)

فیاضی وسخاوت: شیخ کی اخلاقی خوبیوں کے ذکر سے تذکرے خالی ہیں لیکن ان کی جود وسخا، داد ودہش اور فیاضی وسخاوت کا سب ہی تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے، ان کے جد بزرگوار علی پٹن کے ایک بڑے تاجر تھے، انتقال کے وقت ان کے پاس اتنی کافی دولت تھی کہ اسے اپنے دو حقیقی لڑکوں میں انہوں نے ترازو میں تول کر تقسیم کیا، شیخ کے والد بھی ایک کامیاب تاجر تھے اور ساری عمر اسی شغل میں مصروف رہے(۳) اس طرح شیخ محمد بن طاہر کو بھی ترکہ میں کافی دولت ملی مگر وہ اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے طلبہ کی امداد واعانت میں صرف کرتے، خود فقر وفاقہ سے گزر اوقات کرتے مگر مخلوق کے ساتھ داد ودہش میں کمی نہ کرتے(۴) اس معاملہ میں ان کے جذبۂ خیر اور فیاضی کا پہلے ذکر آ چکا ہے، اس لیے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

---

(۱) مآثر الکرام، دفتر اول، ص۱۹۴۔ (۲) ترجمہ اردو، رسالہ مناقب، ص ۸۸۔ (۳) مقدمہ تذکرۂ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۲۷و۲۸۔ (۴) ترجمہ اردو رسالہ مناقب، ص۹۴۔

صلاح وتقویٰ: وہ صلاح وتقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، ارباب تذکرہ نے ان کے ورع وصلاح کا ذکر کیا ہے، دینی حیثیت سے ان کے بلند مرتبہ ہونے کا ثبوت وہ خواب بھی ہیں جن کو اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے اوران کے شیخ علی متقی کے حال میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے جمعہ ۲۷/رمضان کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ سے پوچھا کہ اس زمانہ میں سب سے افضل کون ہے تو آپؐ نے فرمایا تم یعنی شیخ علی متقی! انہوں نے دریافت کیا پھر کون افضل ہے، فرمایا محمد بن طاہر ہندی۔

اسی شب میں شیخ علی متقی کے شاگرد شیخ عبدالوہاب کو بھی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اورانہوں نے بھی آپ سے یہی بات دریافت فرمائی تو آپؐ نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو شیخ علی متقی کو دیا تھا، شیخ عبدالوہاب اپنا خواب بیان کرنے کے لیے جب اپنے استاد علی متقی کی خدمت میں آئے تو انہوں نے ان کو کچھ کہنے سے پہلے ہی یہ فرمایا کہ میں نے بھی وہی خواب دیکھا ہے جو تم نے دیکھا ہے۔(۱)

رسالہ مناقب میں اس قسم کے اور بھی خواب مذکور ہیں۔

شیخ محمد بن طاہر میں بڑی دینی حمیت اور ایمانی غیرت بھی تھی، سنت کا اتباع اور اس کی ترویج اور رد بدعت ان کی زندگی کا مقصد تھا اور اس معاملہ میں ان کو جس درجہ تشدد تھا اس کا ذکر آگے آئے گا، ان کے پوتے شیخ عبدالوہاب لکھتے ہیں:

> ''حضرت شیخ شرعی احکام اور حدود دین کو قائم رکھنے میں اپنی ہمت صرف فرماتے تھے، کسی حاکم وقت یا طاقتور امیر کا خوف نہ کرتے تھے، وہ خالص خدا کے لیے محبت اور خالص خدا کے لیے عداوت کے قائل تھے، اس بنا پر وہ رسول اللہ کی سنت اختیار کرنے والے سے دوستی اور بدعتیوں سے دشمنی رکھتے تھے۔''(۲)

---

(۱) النور السافر ص ۳۱۵ و۳۱۶ و۳۶۱۔ (۲) ترجمہ رسالہ مناقب اردو، ص ۹۸۔

مخالفین کا حملہ اور زخم لگنا: شیخ محمد بن طاہر فرقہ مہدویہ کے سخت مخالف تھے اور مہدوی مذہب کو ماننے والے بھی شیخ سے بڑی نفرت کرتے تھے اور ان کے اور اہل سنت مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے، چنانچہ موسیٰ خاں اور شیر خاں طالب علم بن کر ان کے مدرسہ میں آتے اور موقع کے منتظر رہتے کہ اگر کبھی ان کو تنہا پا جائیں تو قتل کر دیں، چنانچہ ایک روز کوٹھے پر تنہا دیکھ کر وہ دونوں وہاں پہنچ گئے اور تلوار سے ان کے شانہ پر حملہ کیا جس سے شیخ زخمی ہو گئے، یہ لوگ اتر کر بھاگ گئے مگر گھبراہٹ اور جلدی میں ایک شخص زینہ سے اترتے وقت گر گیا اور اس کا سر نالی میں چلا گیا، شیخ کے ایک شاگرد نے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا اور بھاگ گیا مگر شیر خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس کے پیچھے سوار لگا دیے، سواروں نے احمد آباد کے قریب ایک گاؤں میں اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا۔(۱)

شیخ اس حادثہ کی وجہ سے زخمی ہو گئے لیکن جلد ہی ٹھیک ہو گئے، انہوں نے اپنی کتاب مجمع البحار میں بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''اس وقت جب کہ اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں زخمی ہوا تو ٹانکہ دیتے وقت جراح نے سولہ دفعہ سوئی سے کام لیا اور زخمی ہونے کے دن سے تندرست ہونے تک بیس بائیس روز کے اندر تین دفعہ کے سوا کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔''(۲)

جراح روزانہ آ کر مرہم پٹی کر جاتا اور ہر طرح سے خدمت انجام دیتا تھا جس سے بیس پچیس روز میں بالکل ٹھیک ہو گئے۔

قوم کی اصلاح اور رد مہدویت: شیخ محمد طاہر سنت کی اتباع و اشاعت اور بدعات کی تردید میں خاص شہرت و امتیاز رکھتے تھے اور اس معاملہ میں بڑے سرگرم تھے، ان کی قوم بوہرہ سنی اور شیعہ دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی، سنی بوہروں میں بھی زمانہ کے اثر اور شیعہ بوہروں

(۱) ترجمہ رسالہ مناقب اردو، ص ۹۸۔ (۲) ایضاً، ص ۹۹۔

کے اختلاط کی وجہ سے گوناگوں بدعتیں پھیل گئی تھیں اور دینداری مفقود ہوتی جارہی تھی، اس زمانہ میں مہدویت کا زور واثر بھی بہت بڑھ گیا تھا، اس کے پیش نظر شیخ بڑی سرگرمی اور نہایت جانفشانی سے بدعت اور مہدویت کے قلع قمع کرنے اور سنت و دینداری کے فروغ اور بول بالا کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

شیخ محمد طاہر مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد ہمہ تن درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کام میں لگے ہوئے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ہر طرف بدعتیں پھیلتی جارہی ہیں اور سنی بوہروں میں بھی غلط رسم ورواج اور خلاف سنت امور جڑ پکڑتے جارہے ہیں اور سیاسی انتشار اور امرائے گجرات کی خانہ جنگی کی وجہ سے مہدویت کا اثر و رسوخ بھی بڑھتا جارہا ہے، یہاں تک کہ پٹن کا حاکم شیر خاں فولادی اور اس کا پورا خاندان مہدویت کا پشت پناہ ہو گیا ہے تو انہوں نے اس کے خلاف جدوجہد شروع کی، وعظ، تقریر اور تحریر ہر طریقہ سے قوم کی اصلاح اور بدعت ومہدویت کے استیصال پر کمربستہ ہو گئے، عقلی ونقلی ہر قسم کی دلیلوں سے عقائد حقہ کا اثبات کیا اور عقائد باطلہ کی تردید کی، اس سلسلہ میں ایک رسالہ نصیحۃ الولاۃ بھی لکھا اور اسے شیر خاں کے پاس بھیجا، اس کے اثر سے کچھ دنوں کے لیے سکون ہو گیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد مہدویوں نے پھر سر اٹھایا جس میں شیر خاں کے خاندان والے زیادہ پیش پیش تھے، اس نے اور موسیٰ خاں نے شیخ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

شیخ بھی چپ رہنے والے نہ تھے، زخمی ہونے کے بعد بھی ان کی سرگرمی میں کمی نہیں ہوئی اور وہ اسی جوش وخروش کے ساتھ برابر مہدویت اور بدعت کے استیصال میں منہمک رہے، بالآخر مہدویوں کی شورش سے تنگ آ کر انہوں نے اپنے سر سے دستار فضیلت اتار دی اور یہ عہد کیا کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے تائب نہ ہو جائے گی اس وقت تک میں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔

وہ اپنی ان کوششوں میں پوری طرح سرگرم عمل تھے کہ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ نے گجرات فتح کیا، جب علامہ شیخ محمد بن طاہر سے بادشاہ کی ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے برہنہ سر رہنے کا سبب پوچھا، انہوں نے اس کے سامنے حقیقت حال بیان کی تو بادشاہ نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی حفاظت میرا فرض ہے، آپ اپنا کام جاری رکھیں، میں بھی اس میں آپ کی پوری مدد کروں گا، چنانچہ اس نے اپنے رضائی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو گجرات کا گورنر مقرر کیا، یہ راسخ العقیدہ سنی تھا، اس نے اپنے ایام حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی اور مہدویت کا زور واثر ختم کرنے میں ان کی مکمل امداد کی، اس کے نتیجہ میں پٹن میں امن وامان ہوگیا اور شیخ محمد بن طاہر مطمئن ہوکر درس وتدریس، رشد وہدایت اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے مگر کچھ عرصہ بعد خان اعظم تبدیل ہوگیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خانخاناں گورنر ہوا جس کے عہد حکومت میں شیعہ بوہرے پھر دلیر ہوگئے اور ان کی سرگرمیاں بھی تیز ہوگئیں، شیخ نے یہ صورت حال دیکھی تو پھر اپنا عمامہ سر سے اتارا اور آگرہ کا رخ کیا تاکہ بادشاہ کے حضور عرض حال کریں۔

اس ارادہ سے ۹۸۶ھ میں وہ آگرہ کے لیے روانہ ہوئے، پہلے مالوہ پہنچے اور مشہور شہر سارنگ پور میں تین روز قیام کیا، جب وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک گاؤں سوجی پہنچے جو اجین کے قریب تھا۔

دوسری طرف شیخ کی روانگی کی اطلاع پاکر مہدوی فرقہ کے لوگ بھی ان کے تعاقب میں نکلے تاکہ کہیں موقع پاکر ان کا کام تمام کردیں، چنانچہ ۶ رشوال ۹۸۶ھ کو اسی گاؤں میں جب شیخ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے تو مہدویوں نے نہایت بے رحمی سے انہیں شہید کردیا۔(۱)

شاہ عبدالحق صاحب نے اس واقعہ کا اختصار سے ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''بوہرہ قوم میں مروج بعض بدعتوں کی اصلاح کی اور اس قوم کے

(۱) ترجمہ اردو رسالہ مناقب، ص ۱۰۵ و ۱۰۶ و مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۵۔

اہل سنت و بدعت میں تفریق و امتیاز پیدا کر دیا ...... انہوں نے ازالہ بدعات
اور اس علاقہ کے اہل بدعت کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، بالآخر
انہیں مبتدعین کے ہاتھوں ان کی شہادت واقع ہوئی۔"(۱)

علامہ محمد بن طاہر نے جب آگرہ جانے کا ارادہ کیا تھا تو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے انہیں اشارۃً وکنایۃً مختلف طریقوں سے اس ارادہ سے روکنا چاہا لیکن محمد بن طاہر اپنے ارادہ سے باز نہ آئے، شیخ وجیہ الدین گجرات کے علمائے کبار اور صوفیائے عظام میں تھے، ان کی عظمت و بلند پائیگی کا یہ حال تھا کہ حضرت سید محمد غوث گوالیاریؒ کے قتل کا فتویٰ جب سلطان محمود ثالث کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اس کو صرف اس لیے قبول نہیں کیا کہ اس پر علامہ وجیہ الدین کے دستخط نہ تھے، وہ علامہ طاہر کے معاصر تھے اور دونوں میں مخلصانہ تعلقات تھے مگر وہ علامہ طاہر کے اصلاحی خیالات کو مصالح اور تقاضائے وقت کے خلاف سمجھتے تھے اور فرماتے تھے "اے برادر من! سیاست، فراست کی بات نہیں ہے اور مشغولی حق کے ساتھ ہی ہونا زیبا ہے، نہ خلق کے ساتھ۔"

هذا وان السكوت والتزام البيوت (۲) یہ زمانہ خاموشی اور مکان میں بیٹھ رہنے کا ہے۔

مہدویت کی سرکوبی اور ازالہ بدعات کے علاوہ شیخ کی آگرہ کی روانگی کا یہ سبب بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کی گمراہی اور بے دینی کی اصلاح کے خیال سے وہاں جا رہے تھے، کیوں کہ انہیں پتہ چلا تھا کہ ابوالفضل اور فیضی نے بادشاہ کو گمراہ اور بے دین کر دیا ہے، اسی لیے ان کے قتل کے بارہ ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ جب ابوالفضل اور اس کی پارٹی کو معلوم ہوا کہ علامہ محمد بن طاہر ہمارے جتھے کو منتشر کرنے اور اکبر کو قدیم دینداری کے طریقہ پر لانے کے لیے آگرہ تشریف لا رہے ہیں تو یہ سب لوگ بہت گھبرائے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔ (۲) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۳۸ و ۳۹ بحوالہ تذکرہ ابرار، ص ۳۲۴۔

کیوں کہ انہیں شیخ کے غیر معمولی فضل و کمال کا اندازہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ بحث و مناظرہ میں ان سے پیش نہیں آسکتے اس لیے ان لوگوں نے علامہ موصوف کے قتل کے لیے کچھ لوگوں کو مقرر کر دیا جنہوں نے موقع پا کر ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔(۱)

تجہیز و تکفین: اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کی شہادت کا واقعہ ۶ شوال ۹۸۶ھ کو اجین اور سارنگ پور کے درمیان پیش آیا تھا، لاش وہاں سے پٹن لائی گئی اور آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ نے اپنے جن مرید کے یہاں سارنگ پور میں تین روز قیام کیا تھا ان کا نام شیخ حاجی محمد تھا، انہوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے مجھ کو شہید کر دیا تم آکر کفن دفن کرو، چنانچہ وہ اپنے عزیزوں کو لے کر وہاں پہنچے اور جسد مبارک کو سارنگ پور میں لا کر تجہیز و تکفین کی، جنازہ کی نماز بڑی شان سے ہوئی اور کئی دفعہ ہوئی اور شیخ بھکاری کے قبہ میں دفن کیے گئے، اکبر بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے لاش پٹن میں منتقل کر دینے کا حکم دیا، چنانچہ لاش پٹن لائی گئی اور ان کی اولاد نے ایک مشہور تعمیر شدہ گنبد خرید کر اس میں دفن کیا جہاں آج تک لوگ زیارت اور فاتحہ خوانی کے لیے جاتے ہیں۔(۲)

اولاد و احفاد: تاریخ گجرات کے مشہور محقق و فاضل مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے شیخ محمد بن طاہر کا مختصر شجرۂ نسب تحریر کیا ہے(۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل چار حضرات ان کی جسمانی یادگار تھے

۱۔ ابراہیم: شیخ محمد بن طاہر کے خلف اکبر تھے۔

۲۔ احمد: رسالہ مناقب کے مصنف قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب کے والد ماجد تھے۔

---

(۱) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۷۳ تا ۷۶ (۲) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی، ص ۷۵-۷۶ و ترجمہ رسالہ مناقب، ص ۱۰۵ و ۱۰۶، مآثر الکرام، ج ۱، ص ۱۹۵، النور السافر، ص ۳۶۱۔

(۳) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۸۵۔

۳۔ابوبکر

۴۔نورالحق

ان لوگوں کے حالات نہیں ملے، البتہ احفاد میں بعض کے نام اور حالات معلوم ہوئے ہیں جن کو یہاں اس خیال سے پیش کیا جاتا ہے کہ شاید آئندہ پھر ان پر لکھنے کا موقع نہ مل سکے۔

شیخ عبدالوہاب: یہ احمد کے بیٹے اور شیخ کے پوتے تھے، ان کی پیدائش اور تعلیم پٹن میں ہوئی، اصول اور فقہ کی جانب ان کا میلان زیادہ تھا، شاہجہاں کے دور میں پٹن کے قاضی مقرر ہوئے، عالمگیر کے ایام شاہزادگی میں دکن پہنچے، اس نے بڑی عزت افزائی کی اور جب خود تخت نشین ہوا تو قاضی عسکر بنایا، یہاں ان کا اثر واقتدار بڑھتا گیا، وہ عرصہ تک قاضی کے عہدہ پر فائز رہے، پھر قاضی القضاۃ اور آخر میں اقصی القضات کے عہدہ پر پہنچ گئے۔

شیخ عبدالوہاب دینی معاملہ میں سخت تھے اور کبھی رشوت نہیں لیتے تھے، بلکہ اپنے مال سے تجارت کے ذریعہ گزربسر کرتے تھے، امراان سے حسد کرتے تھے مگر ان کے غیر معمولی رسوخ واقتدار کی بنا پر ان سے خوف بھی کھاتے تھے، رسالہ مناقب انہی کی تصنیف ہے جس میں اپنے دادا کے حالات وکمالات تحریر کیے ہیں، آخر عمر میں علالت کی وجہ سے پنجاب سے دہلی آئے اور ۱۸ر رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ کو وفات پائی (۱) ان کے چار لڑکے تھے جو فضل و کمال اور زہد واتقا میں یگانہ و بے مثال تھے۔

شیخ الاسلام بن شیخ عبدالوہاب: بڑے لڑکے کا خطاب شیخ الاسلام تھا، یہ ابتدا میں دہلی کی قاضی پھر قاضی عسکر ہوئے، بڑے دیانت دار تھے، اپنے باپ کے ترکہ میں سے کچھ نہ لیا اور اپنا حصہ باپ کے دوسرے وارثوں میں تقسیم کردیا، ان کے حصہ کی مقدار جواہرات اور اثاث البیت کے علاوہ ایک لاکھ اشرفی اور پانچ لاکھ روپے نقد تھی، باپ کے انتقال کے بعد

(۱) مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۷ و ۸۔

۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے مجبور کر کے انہیں اقضی القضات کا عہدہ عنایت کیا، اس بڑے منصب کے فرائض بھی انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے، وہ بادشاہ کے سامنے بھی حق کہنے میں دریغ نہ کرتے، مقدمات میں اکثر یہ کوشش کرتے کہ فریقین صلح کر لیں، انہوں نے اکثر مقدمات کا تصفیہ اسی طرح کیا، ۱۰۹۶ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، واپس آ کر گھر پر بیٹھ رہے اور ملازمت ترک کر دی، عالمگیر ان کی خوبیوں کی وجہ سے ان کا بہت گرویدہ تھا اور ملازمت کی پیشکش بھی کرتا رہتا تھا مگر وہ ہمیشہ انکار کر دیتے تھے، ۱۱۰۹ھ میں اس نے ملاقات کے لیے طلب کیا، اس کا خیال تھا کہ سامنے آنے پر جب کوئی خدمت سپرد کی جائے گی تو انکار نہ کر سکیں گے۔

بادشاہ کی طلب پر وہ روانہ ہوئے مگر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ خداوندا میری اور بادشاہ کی ملاقات نہ ہو، چنانچہ راستہ ہی میں انتقال فرما گئے، شیخ الاسلام کے بھی چار لڑکے تھے:

سراج الدین، اکرام الدین یا اکرام الحق، نورالحق، عبدالحق۔(۱)

اکرام الحق: یہ صوبہ احمد آباد کے صدر ہوئے، شیخ الاسلام خاں ان کا خطاب تھا، اچھی عمر پائی اور اللہ نے دولت وثروت سے بھی نوازا، احمد آباد میں کافی صرفہ سے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کے ساتھ دارالاقامہ اور مسجد بھی تھی جواب بھی احمد آباد کے محلہ استوریہ قاضی دھابہ میں موجود ہے، یہ مدرسہ اپنے استاد شیخ نورالدین کے سپرد کیا جن کی قبر اسی احاطہ میں آج بھی موجود ہے، شیخ الاسلام آخر عمر میں حج کے لیے تشریف لے گئے، واپسی کے بعد ابتر سیاسی حالات اور مارواڑیوں اور مرہٹوں کے گجرات پر قابض ہو جانے کی وجہ سے وہاں آنے کے بجائے سورت ہی میں مقیم ہو گئے اور یہیں وفات بھی پائی، لاش احمد آباد لائی گئی اور اپنے تعمیر کردہ مدرسہ میں دفن ہوئے۔(۲)

---

(۱) مقدمہ، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۸۔ (۲) ایضاً، ص ۸و۹ بحوالہ مآثر الامراو خاتمہ مرأۃ احمدی، مطبوعہ بمبئی۔

نورالحق: قاضی عبدالوہاب کے دوسرے صاحبزادے نورالحق بھی صاحب فضل وکمال اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، عالمگیر کے زمانہ میں محتسب عسکر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔(۱)

عبدالحق: یہ بھی قاضی صاحب کے صاحبزادے اور عہد عالمگیری میں باریاب حضور تھے، وقتاً فوقتاً مختلف عہدوں پر فائز رہے، زیادہ تر شاہی کارخانوں کی داروغگی کے منصب پر مامور رہے، دارونگی انہی امرا کو دی جاتی تھی جن پر بادشاہ کو اعتماد ہوتا تھا۔(۲)

محی الدین: قاضی عبدالوہاب کے بیٹے اور عہد عالمگیری میں عہدہ دار تھے، قاضی القضاۃ بھی ہوئے، ۱۱۰۰ھ میں وفات پائی۔(۳)

شیخ عبدالقادر: یہ ملا محمد بن طاہر کے پوتے اور ان کے صاحبزادے ابوبکر کے بیٹے تھے، علم وفضل، فصاحت وبلاغت اور بالخصوص فقہ وافتا میں یکتائے روزگار تھے، برسوں حرم کے مفتی رہے، ان کی تصنیفات میں چار جلدوں پر مشتمل فتاویٰ کا ایک مجموعہ تھا، وفات ۱۱۳۸ھ میں ہوئی، شیخ عبداللہ طرفہ انصاری ان کے استاد تھے اور انہوں نے ان کی وفات پر مرثیہ بھی کہا تھا، جس میں شیخ محمد بن طاہر کے صدیقی ہونے کی صراحت کی ہے۔(۴)

تصنیفات: گو شیخ محمد بن طاہر آخر عمر میں اپنے وطن کے پرآشوب حالات، بدعتوں کے فروغ اور مہدویت کے زور کی وجہ سے کافی پریشان رہے اور انہیں وہ سکون، دلجمعی اور فراغ خاطر نصیب نہ تھا جو تصنیف وتالیف کے لیے درکار ہوتا ہے، تاہم وہ جب علوم کی تحصیل کے بعد حجاز سے اپنے وطن تشریف لائے تو ان کی تمام تر توجہ علمی کاموں کی جانب ہی مبذول رہتی تھی، مؤرخین کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے علاوہ ان کا مشغلہ کوئی اور نہ تھا(۵) اس سے قطع نظر وہ فطری مصنف تھے، اس لیے انہوں نے بہت سے علمی رسائل اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، فن حدیث سے ان کو زیادہ شغف تھا اور اس موضوع پر ان کی کتابیں بے نظیر اور عظیم الشان ہیں جن کی اہمیت ومقبولیت

(۱) یادایام، ص ۱۷۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) اتحاف النبلا، ص ۳۹۸۔ (۵) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔

میں اب بھی فرق نہیں آیا ہے اور ان سے ہندوستان کی طرح حجاز، یمن اور دوسرے عرب ملکوں کے لوگ بھی فیض یاب ہو رہے ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام دیے جاتے ہیں اور اہم کتابوں پر مختصر تبصرہ بھی قلم بند کیا جاتا ہے:

۱۔ توسل (فن رجال میں ہے)

۲۔ چہل حدیث

۳۔ حاشیہ توضیح وتلویح (نام سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مشہور فقہی کتاب توضیح و تلویح پر یہ حاشیہ لکھا تھا)

۴۔ حاشیہ صحیح بخاری

۵۔ حاشیہ صحیح مسلم

۶۔ حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح

(ناموں سے ظاہر ہے کہ صحیحین اور مشکوٰۃ پر مصنف نے حواشی تحریر کیے تھے۔)

۷۔ حاشیہ مقاصد الاصول

۸۔ خلاصۃ الفوائد (علم صرف میں ہے)

۹۔ دستور الصرف (یہ بھی صرف میں ہے)

۱۰۔ رسالہ احکام بیر فقہی رسالہ معلوم ہوتا ہے جس میں کنوئیں کے احکام و مسائل درج ہوں گے۔

۱۱۔ رسالہ امساک مطر

۱۲۔ رسالہ فضیلت صحابہ

۱۳۔ رسالہ تحکیہ

۱۴۔ رسالہ نہرو الہ (دشمنوں کے خوف سے رسالہ یکیہ کے نام سے مشہور ہے)

۱۵۔ سوانح نبویؐ عربی زبان میں یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں رسول اللہ کی ولادت سے وفات تک کے حالات سال بسال تحریر کیے ہیں۔

۱۶۔ سوانح نبویؐ — اسی قسم کا رسالہ فارسی زبان میں بھی تحریر کیا ہے۔

۱۷۔ شرح عقیدہ — (علم کلام میں ہے)

۱۸۔ طبقات حنفیہ

۱۹۔ عدۃ المتعبدین

۲۰۔ کفایۃ المفرطین — (شافیہ کی شرح اور علم صرف میں ہے) اس کا ایک نسخہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانہ میں ہے، یہ ۹۶۱ھ کی تصنیف ہے، یہ شرح طالب علموں کے لیے آسان زبان میں لکھی گئی ہے، اس میں اصل میں مذکور مشکل لفظوں کے معنی اور پیچیدہ جملوں کو آسان لفظوں میں حل کیا گیا ہے اور جہاں مصنف نے غیر معروف مثالیں دی ہیں شارح نے ان کو واضح کر دیا ہے۔(۱)

۲۱۔ مختصر اتقان — (علامہ سیوطی کی مشہور تصنیف اتقان کا مختصر ہے)

۲۲۔ مختصر مستظہر

۲۳۔ مقاصد جامع الاصول — (صحاح ستہ کی حدیثوں پر مشتمل ہے)

۲۴۔ منہاج السالکین — (راہ سلوک میں سالکین کو جن احادیث کی ضرورت ہوتی ہے انہیں اس میں پیش کیا ہے۔)

۲۵۔ نصاب البیان — (علم معانی میں)

۲۶۔ نصاب المیزان — (علم منطق میں)

۲۷۔ نصیحۃ الولاۃ والرعاۃ والرعیۃ: سلطان محمود حاکم گجرات کی وفات کے بعد شیر خان اور موسیٰ خان فولادی حاکم پٹن خود مختار ہو بیٹھے، یہ دونوں فرقہ مہدویہ کے پیرو تھے اور اہل سنت کو بہت ایذا دیتے اور نقصان پہنچاتے تھے، ان کو اس ظلم و جور سے باز رکھنے کے لیے شیخ نے

(۱) مقدمہ تذکرہ محمد بن طاہر محدث پٹنی، ص ۸۲۔

یہ رسالہ تحریر فرما کر اس کا حاکموں کے پاس ایک ایک نسخہ بھیجا، اس میں خدا کا خوف، عدل، ظلم وغیرہ کے بعد میٹھے الفاظ میں پند ونصائح بھی تحریر کیے۔

یہ تحریر لکھی جا چکی تھی کہ پاکستان کے ایک فاضل محقق ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک مقالہ ہماری نظر سے گزرا، ان کو ۹۷ء میں خط مہران کے ایک مطالعاتی دورے کے دوران خیر پور پبلک لائبریری میں شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی مذکورہ بالا کتاب کا ایک قدیم مخطوطہ دیکھنے میں آیا، اس مقالہ میں اس نسخہ کا تعارف اور محمد بن طاہر کے حالات قلم بند کرنے کے علاوہ کتاب کا پورا متن بھی شائع کیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اسے محمد بن طاہر کی ایک نو دریافت تالیف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:

''شیخ محمد بن طاہر کے آثار کی فہارس میں اس کتاب کا نام تو کجا اس بات کا بھی ذکر نہیں ملتا کہ انہوں نے اس موضوع پر کبھی قلم بھی اٹھایا تھا'' تاہم ان کے شائع کردہ متن میں رسالہ کا نام 'تحفة الولاة ونصيحة الرعية والرعاة '' دیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ خیر پور کی پبلک لائبریری کا مخطوطہ ½۱۸×½۱۰ سم سائز کے ۸۱ صفحات پر محیط ہے اور ہر صفحے پر ۶ سم لمبی تیرہ سطریں ہیں، کتابت خط نستعلیق میں ہے اور عناوین سرخ روشنائی میں مرقوم ہیں، اہم الفاظ وعبارات کی نشاندہی سرخ خطوط سے کی گئی ہے، املا کی بعض خصوصیات بھی ہیں، یہ نسخہ ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۵ء کا لکھا ہوا ہے، گویا مصنف کی وفات ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء کے نصف صدی کے بعد کا نسخہ ہے۔

کتاب کی ابتدا میں حمد ونعت اور منقبت کے بعد مصنف لکھتے ہیں:

''جب اس شاہ شیران اعظم وخانخانان معظم'' نے اپنے بھائی قطب بخوانین مرحوم طاب ثراه وجعل الجنة مثواه کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلق خدا کے سروں پر سے جباروں اور غمازوں کے دبدبے کو ختم کر کے ان کی آسودگیِ خاطر کے لیے عدل کو عام کرنے، شرعی قوانین کو رواج دینے

وغیرہ کا فیصلہ کیا اور اولوالامر وقضات کی دوستی اور نصیحت کے جذبے نے
مجھے اس بات پر ابھارا کہ اس موضوع سے متعلق نبی کریمؐ کی چند احادیث
اور ماضی کے فضلا کے کچھ اقوال کو الگ سے لکھا جائے تاکہ وہ متذکرۂ بالا
سعی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور قطب محروم کی مرضی کے اجرا میں مفید و
مددگار ثابت ہو سکیں اور پھر اس مجموعے کے ساتھ علم فراست پر مبنی چند لطائف
کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو امور سلطنت کی تفویض اور مستحقین کو مختلف
مناصب کے اعطا میں ایک ناصح وزیر اور واضح دستور کا کام دیں اور ان سے
تمام ارباب نظم ونسق کو فائدہ پہنچے اور وہ ان پر عمل پیرا ہو کر آخرت کی ابدی اور
دنیا کی عارضی زندگی کے ثمرات سے بیک وقت کما حقہ بہرہ ور ہو سکیں۔''

مقدمہ کے علاوہ کتاب کے مباحث ومشمولات کی فہرست یہ ہے:

۱۔ فصل در مکارم اخلاق ۲۔ فصل فی فضلہ (عام لوگوں کے مقابلے میں سلطان عادل کی فضیلت) ۳۔ فصل فی خطرہ (اس میں یہ دکھایا ہے کہ اقتدار و بادشاہی جہاں اعزاز کی چیز ہے وہاں اس کے کچھ لوازم بھی ہیں جن کی بجا آوری میں کوتاہی قیامت کے دن سلطان کو گرفتار عذاب بھی کرا سکتی ہے) ۴۔ فصل در سیرت سلاطین سلف (نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ اور خلفائے راشدین کے ذکر میں) ۵۔ فی شرائط السلطنت (بادشاہوں کو کن چیزوں کو کرنا اور کن چیزوں سے بچنا چاہیے) ۶۔ فصل در حقوق رعایا (مسلم وغیر مسلم رعایا کے بادشاہ پر کیا حقوق ہوتے ہیں) ۷۔ فصل در بعض نصائح (سلطان محمد ملک شاہ کے نام امام غزالی کا ایک خط درج کیا ہے)

علامہ محمد بن طاہر کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے رسالہ مناقب میں مذکورۂ بالا کتب ورسائل کا ذکر کیا ہے، اب ہم ان کی تصنیفات کا ذکر کریں گے، ان کتابوں کا اکثر مصنفین نے بھی ذکر کیا ہے اور انہی کی وجہ سے علامہ کا درجہ حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ

میں بہت بلند ہے۔

۲۸۔المغنی: اسماء الرجال کی مفید اور عمدہ کتاب ہے، تذکروں اور فہرستوں میں اس کا مکمل نام مختلف طور پر درج ہے لیکن خود مصنف نے مجمع بحار الانوار کے مقدمہ میں اس کا نام المغنی فی ضبط الرجال لکھا ہے، اس میں رواۃ و رجال کے ناموں کو ضبط کیا گیا ہے اور ان کی تصحیح کی گئی ہے، شاہ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں:

در رسالہ دیگر مسمی بمغنی کہ تصحیح اسماء الرجال کردہ بے تعرض بہ بیان احوال بغایت مختصر ومفید۔(۱)

دوسرا مختصر رسالہ جو مغنی کے نام سے موسوم ہے، اس میں اسماء الرجال کے ناموں کی تصحیح کی گئی ہے اور ان کے حالات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، نہایت مختصر مگر مفید ہے۔

شیخ محمد بن طاہر مجمع بحار الانوار میں رواۃ و رجال کے ناموں اور مقامات کو مکمل طور پر ضبط نہ کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس پر اصل بحث المغنی میں ہو چکی ہے (۲) اس لطیف و عالمانہ اور عمدہ تصنیف کا اصل مقصد رواۃ کے ناموں کا صحیح تلفظ حروف وحرکات کے ذریعہ ظاہر کرنا ہے، اس لیے اس میں ان کے حالات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، آخر میں رسم کتابت پر ایک فصل سپرد قلم کی گئی ہے اور ایک فصل میں علما کی تاریخ پیدائش و وفات کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے، بعض کتابوں کے ساتھ بھی اور علاحدہ بھی، دہلی سے ابن حجر عسقلانی کی تقریب التہذیب کے حاشیہ پر بھی طبع ہوئی تھی۔

تذکرۃ الموضوعات: یہ کتاب بھی اہم اور محققانہ ہے جو امام شعر کانی اور ملا علی قاری کی اس فن کی تصنیفات سے ضخامت اور حجم میں زیادہ ہے، یہ ۹۵۸ھ کی تصنیف ہے، اس میں موضوع حدیثوں کے علاوہ ان کے بارے میں محدثین اور نقادان فن کے اقوال بھی اس لیے نقل کیے ہیں تاکہ لوگ احادیث کو موضوع، ضعیف یا صحیح قرار دینے میں افراط وتفریط

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔ (۲) مقدمہ مجمع بحار الانوار۔

کے بجائے احتیاط سے کام لیں، کیوں کہ غالی اور مفرط قسم کے لوگ محض سنی سنائی باتوں کی وجہ سے حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ کر دیتے ہیں اور خود غور و فکر سے کام نہیں لیتے، اسی لیے شیخ محمد بن طاہر نے اس کے مقدمہ میں متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی مصنف کسی حدیث کو موضوع بتائے تو جب تک دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق و تائید نہ ہو جائے اس حدیث کو موضوع نہ سمجھا جائے، حافظ ابن جوزی اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں مگر انہوں نے حدیثوں کو موضوع قرار دینے میں افراط سے کام لیا ہے، اسی لیے علمائے فن نے ان پر نقد و تعاقب کیا ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ان کی کتاب موضوعات میں ضعیف تو درکنار بہت سی صحیح اور حسن روایتوں کی بھی تخریج کی گئی ہے، علامہ ابن صلاح نے ابن جوزی کی کتاب کی تین سو حدیثوں کے متعلق بتایا ہے کہ یہ موضوع نہیں ہیں، ان میں ایک حدیث صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی بھی ہے جو حماد بن شاکر سے مروی ہے اور بقیہ حدیثیں صحاح و سنن کی دوسری کتابوں کی ہیں، احمد بن ابی المجد سے منقول ہے کہ ابن جوزی کا ان روایتوں کو موضوع بتانا درست نہیں ہے، جن کے کسی راوی پر اس قسم کا نقد کیا گیا ہے کہ "وہ ضعیف یا لین ہے، یا قوی نہیں ہے" کسی راوی کے بارے میں اس قسم کے کلام کی وجہ سے اس کی روایت کو موضوع سمجھ لینا زیادتی ہے، اس افراط اور تشدد کے مقابلہ میں بعض کوتاہ اور سہولت پسند قسم کے لوگ ہر اس چیز کو جو حدیث کے نام سے بیان کی جاتی ہے صحیح باور کر لیتے ہیں۔ (۱)

اس کتاب میں مختلف عنوانات قائم کر کے ان کے تحت موضوع حدیثیں نقل کی گئی ہیں، مصنف نے یہ کتاب بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھی ہے اور اس کی تالیف میں متعدد کتابوں سے مدد لی ہے جن کا ذکر بھی دیباچہ میں کیا ہے، مصر سے یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۳۰۔ قانون الموضوعات: یہ کتاب بھی مفید اور اہم ہے، اس میں غیر صحیح، وضاع اور کذاب راویوں کا ذکر ہے، مصنف نے اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے ان راویوں کو جمع کیا ہے

(۱) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص ۳۔

جو موضوع حدیثیں بناتے تھے یا بیان کرتے تھے، آخر میں دو فصلیں کنیت اور نسب میں ہیں، انہوں نے راویوں کے نام کے ساتھ ان کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں جن سے ان کا غیر معتبر ہونا واضح ہو جاتا ہے اور کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں، اسے تذکرۃ الموضوعات کے بعد مرتب کیا تھا، وہ خود لکھتے ہیں کہ ''تذکرۃ الموضوعات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ ضعیف، کذاب، وضاع اور مفتری راویوں کو جمع کر دوں تا کہ اس کی حیثیت موضوع روایات کی معرفت اور ضعیف اور گڑھی ہوئی حدیثوں کے ضبط کے بارے میں ایک کلی قاعدہ وقانون کی ہو جائے۔(۱)

یہ کتاب بھی محنت وتحقیق کا نتیجہ ہے اور تذکرۃ الموضوعات کے ساتھ یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

۳۱۔ مجمع بحار الانوار: اس کتاب کا اصل اور مکمل نام مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل الاخبار ہے، مگر اختصار اور عرف کی بنا پر عموماً لوگوں نے پورا نام لکھنے کے بجائے صرف مجمع البحار لکھا ہے، یہ مصنف کی سب سے اہم اور مہتم بالشان کتاب ہے، ان کا بیان ہے کہ اس کی بنیاد نہایہ ابن اثیر اور ناظرعین الغریبین پر رکھی ہے، یہ ایک جامع لغت ہے جس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق کی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ مشکل اور غریب الفاظ حدیث کی توضیح کے لیے لکھی گئی ہے اور اس لحاظ سے یہ واقعہ عدیم المثال ہے مگر مصنف نے چونکہ ان حدیثوں کو بھی نقل کر دیا ہے جن میں یہ الفاظ مذکور ہیں، اس طرح یہ حل لغات کے علاوہ حدیثوں کی عمدہ شرح وتفسیر بھی ہے، اسی لیے علمائے فن نے اس کو صحاح ستہ کی شرح بھی کہا ہے، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

ازآنجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح است مسمّٰی بہ مجمع البحار۔(۲)	ان کی تصنیفات میں ایک کتاب جو صحاح کی شرح کی ضامن ہے اس کا نام مجمع البحار ہے۔

(۱) دیباچہ تذکرۃ الموضوعات، ص۲ ودیباچہ قانون الموضوعات، ص۲۳۰۔ (۲) اخبار الاخیار، ص۲۶۴۔

گلزار ابرار کے مصنف لکھتے ہیں:

''ایک مشکل شرح احادیث کی صحاح ستہ پر ہے۔''(۱)

تاریخ احمدی میں ہے:

''صحاح ستہ کی شرح کو حاوی ہے۔''(۲)

شیخ عبدالوہاب کا بیان ہے:

''جو ایک طرح سے حدیث کی شرح ہے۔''(۳)

اور احادیث کی طرح یہ قرآنی الفاظ کا بھی جامع لغت ہے، اس کی ترتیب مادہ کے حروف پر کی گئی ہے جو اس فن کی کتابوں میں فائق اور عمدہ ہے، نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''یہ عمدہ اور پاکیزہ کتاب قرآن و حدیث کے غرائب کی جامع ہے جس کے پاس یہ کتاب موجود ہو اسے اس فن کی دوسری کتاب کی احتیاج نہیں رہتی۔''(۴)

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی لکھتے ہیں:

''اس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل لغات کا حل اس انداز سے کیا ہے کہ صحاح ستہ کی شرح بھی ضمناً ہو گئی ہے۔''

(مقالات شروانی، ص ۳۹۸)

ڈاکٹر زبید احمد صاحب رقم طراز ہیں:

''شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی تصنیف لطیف ہے، اس کو اپنے مرشد کامل شیخ علی متقی کے نام گرامی سے معنون کیا ہے، یہ تصنیف قرآن و حدیث کا

(۱) اذکار ابرار اردو ترجمہ گلزار ابرار، ص ۳۲۲، بحوالہ معارف مارچ ۵۵ء۔ (۲) تاریخ احمدی، ص ۱۳۷۔

(۳) رسالہ مناقب، ص ۹۹۔ (۴) اتحاف النبلاء، ص ۱۳۴۔

جامع لغت ہے، الفاظ کی ترتیب مادہ کے حروف پر ہے، ایک مادہ کے جس قدر حروف قرآن وحدیث میں آئے ہیں ان سب کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں اور جن احادیث میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کو بھی نقل کرتے ہیں، اس سے پہلے غرائب قرآن وحدیث پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن میری ناقص رائے میں یہ سب سے بہتر اور جامع تر ہے۔''(۱)

صاحب معجم المطبوعات تحریر کرتے ہیں:

''آیات وحدیث کے مطالب کے کشف اور کتاب وسنت کے معانی کی توضیح کے لیے یہ بڑی جامع کتاب ہے۔''(۲)

غالباً طوالت کے خوف سے حدیثیں بلا سند نقل کی ہیں لیکن ان کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں جن سے حدیثیں ماخوذ ہیں کتاب کے شروع میں ان رموز واشارات کا ذکر بھی کیا ہے جو کتابوں اور مصنفوں کے دیے گئے ہیں۔(۳)

کتاب کی اس عظمت واہمیت کی بنا پر اسے غیر معمولی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور جب سے یہ تصنیف ہوئی ہے اسی زمانہ سے اسے اہل علم میں بڑا حسن قبول حاصل ہے، خود مصنف کی زندگی ہی میں اسے بڑی شہرت ومقبولیت ہوگئی تھی اور اس کی نقلیں اور نسخے دور دراز کے شہروں میں پھیل گئے تھے، اسے مرتب کر کے مصنف نے دراصل علما پر بہت بڑا احسان کیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''علمائے اعلام نے اس کی جانب غیر معمولی اعتنا کیا، یہی وجہ ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں یہ کتاب پورے طور پر مقبول ہوگئی اور اس کی نقلیں دور دراز کے شہروں میں پھیل گئیں، انہوں نے اس کی نقل میں ایسی رغبت دکھائی کہ ہندوستان کے شہروں کا شاید ہی کوئی قابل ذکر کتب خانہ

---

(۱) معارف دسمبر ۴۲ء۔ (۲) معجم المطبوعات کالم ۱۷۱۶۔ (۳) اکتفاء القنوع، ص ۱۳۵۔

ایسا ہو جس میں اس کا نسخہ موجود نہ ہو، یہ کتاب علوم دینیہ سے شغف رکھنے والے تمام اصحاب علم کے پیش نظر رہتی ہے، ان کے حوالہ و ماخذ کا کام دیتی ہے اور وہ اس سے مشکلات میں استفادہ کرتے ہیں۔"(۱)

شیخ محمد بن طاہر کے پوتے شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں:

"اس یگانہ روزگار کی کتابیں بے حد مقبول ہوئیں، چنانچہ قدرۃ المحققین شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس فقیر سے خود فرمایا کہ میں مکہ معظمہ میں تھا اور ہندوستان آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ عارف کامل حضرت مولانا شیخ علی متقی کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ گھر جاتے وقت پٹن کی طرف سے جانا کہ وہاں تم کو ایک بڑی نعمت حاصل ہوگی، چنانچہ اپنے مرشد اور استاد کے علم کے بموجب اس ارادہ سے واپس ہوا، جب موضع کجیہ پہنچا جو پٹن سے دو کوس پر واقع ہے تو شیخ کریم یعنی محمد بن طاہر کے بڑے لڑکے شیخ محمد ابراہیم جو میرے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے مجھے ملے اور وہ مجھ سے اس طرح ملے جیسے مخلص اور شناسا آدمی کے ساتھ ملتا ہے، پھر مجمع البحار مجھے عنایت کی اور باوجود اس کے کہ ہماری ان کی کبھی کی ملاقات نہ تھی پھر بھی صداقت، خلوص اور محبت ایسی دکھائی جو دوستوں کے شایان شان ہے، اس لیے ان سے اس کا سبب پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ اس رات کو حضرت شیخ نے مجھے خواب میں فرمایا کہ شیخ عبدالحق مکہ سے روانہ ہو کر اس ملک کے اطراف میں آئے ہیں، تم جا کر ان کا استقبال کرو اور کتاب مجمع البحار ان کو دے دو، اس کے بعد عرصہ تک پٹن میں مقیم رہا اور چونکہ اس کتاب کے سوا کوئی دوسری چیز مجھے نہیں ملی، سمجھا کہ "نعمت عظمیٰ"

---

(۱) مقدمہ مجمع البحار مطبوعہ حیدر آباد۔

سے مراد یہی کتاب ہے۔"(۱)

کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے علم حدیث کی اہمیت بیان کی ہے اور غرائب پر قدیم مصنفین اور علمائے اسلام کے اعتنا اور کتابیں لکھنے کا ذکر کیا ہے، پھر خود اس موضوع پر یہ کتاب لکھنے کی وجہ، اس کی نوعیت اور وہ اصول تحریر کیے ہیں جن کو اس کتاب میں مدنظر رکھا ہے، کتاب کے آخر میں مصطلحات حدیث کی وضاحت اور سادات کی تاریخ درج ہے، ذیل میں اس کی نمایاں خصوصیات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ یہ اپنے موضوع پر اہم اور حاوی ہونے کے علاوہ احادیث کی تشریح وتفسیر کے لحاظ سے بھی نہایت مفید، کارآمد اور بلند پایہ کتاب ہے۔

۲۔ ابن اثیر کی نہایہ اس موضوع پر بے نظیر کتاب خیال کی جاتی ہے، مجمع البحار میں اس کے تمام مباحث سمیٹ لیے گئے ہیں، اس کی کوئی اہم بحث شاذ و نادر ہی اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہو، البتہ جو باتیں زیادہ مشہور ہیں انہیں اس میں قلم انداز کر دیا گیا ہے، النہایہ کے علاوہ بھی اس فن کی اہم تصانیف کے مندرجات اور مفید بحثوں کو بھی اس میں نقل کیا گیا ہے۔

۳۔ اس موضوع پر اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب کی جامع بھی ہے اور ان پر اضافہ بھی ہے کیوں کہ اس میں متعدد ایسے امور سے بھی تعرض کیا گیا ہے جن کے ذکر سے اس فن کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

۴۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابن اثیر کی النہایہ اس فن کی مہتم بالشان تصنیف ہے جس کے مباحث کو مجمع البحار میں سمیٹ لیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں اس پر متعدد اضافے بھی کیے ہیں جیسے ابن اثیر نے عموماً کلمات کو ضبط نہیں کیا ہے مگر علامہ پٹنی ان کے ضبط کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اور طلبہ کی سہولت کے خیال سے لفظوں کو اسی

(۱) رسالہ مناقب، ص ۹۲۔

ہیئت میں نقل کرتے ہیں جس میں وہ حدیث میں آئے ہیں، اسی طرح صاحب النہایہ مادہ کے ذکر میں حدیث میں وارد اس کے دوسرے صیغوں اور مشتقات کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر صاحب مجمع البحار صیغوں اور مشتقات کا بھی ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بعض شارحین کے حوالہ سے بھی ابن اثیر کے بیان پر اضافے کیے ہیں۔

۵۔ یہ کتاب شرحوں کی کتابوں کے مباحث کی جامع بھی ہے، اس موضوع کی کتابوں میں لفظوں کے جو وضعی معنی بیان کیے گئے ہیں ان سے واقفیت کے بعد بھی حدیث کے مفہوم میں اشکال باقی رہتا ہے جس کے حل کے لیے کتب شروح کی احتیاج رہ جاتی ہے لیکن اس کتاب کا مطالعہ شروح سے بے نیاز کر دیتا ہے کیوں کہ مصنف ان امور کو بھی بیان کرتے ہیں جو شرحوں میں مذکور ہیں۔

۶۔ غریب الحدیث کے مصنفین نے ان لفظوں کے معنی نہیں لکھے ہیں جن کے وضعی معنی معلوم ومشہور ہیں لیکن مجمع البحار میں اسے اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ زیر بحث حدیث میں اس لفظ کی تاویل کسی خاص نوعیت کی ہوتی ہے۔

۷۔ معنی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے وہ شارحین کے بیان پر اضافہ بھی کرتے ہیں، اس لحاظ سے یہ عام شرحوں پر بھی یک گونہ اضافہ ہے۔

ذیول، تکملے اور تعلیقات: مصنف نے خود اس کتاب کا تکملہ اور ذیل بھی لکھا تھا، ان میں اصل پر بعض مفید اور قیمتی اضافے ہیں، تکملہ اور ذیل دونوں اصل کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔

پٹن میں مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو قلمی نسخہ اب تک محفوظ ہے، اس کے حاشیہ پر مفید تعلیقات بھی درج ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مصنف ہی کی تحریر کی ہوئی ہیں۔

مجمع البحار کی اہمیت کی وجہ سے مصنف کی زندگی ہی میں اہل علم نے اس کی بے شمار نقلیں تیار کی تھیں، اس لیے مختلف کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، خود مصنف

کے کتب خانہ کی جو کتابیں ابھی تک محفوظ رہ گئی ہیں ان میں مجمع البحار کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جو خاص مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مولانا ابوظفر ندوی مرحوم نے اسے ملاحظہ فرمایا تھا ان کے خیال میں اس کی کسی اندرونی شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔(۱)

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی نظر سے بھی لکھنؤ اور حیدر آباد میں اس کے دو قلمی نسخے گزرے ہیں جن کے بارہ میں ان کا خیال ہے کہ ''دونوں مصنف کی زندگی میں لکھے گئے تھے۔''

اسلامی علوم وفنون کی کتابوں کی اشاعت میں منشی نولکشور کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، انہوں نے اپنی سعی بلیغ سے اس کے چھ نسخے حاصل کر کے اور مولانا محمد مظہر سے مقابلہ وتصحیح کرا کے ۱۲۸۳ھ میں غالباً پہلی دفعہ اسے لکھنؤ سے شائع کیا تھا، اس مطبوعہ ایڈیشن میں شاہ عبدالحق دہلوی کے قلمی نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے جسے شیخ کے صاحبزادے شیخ ابراہیم نے دیا تھا اور جو ۱۰۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے، منشی جی کے اہتمام میں مجمع البحار کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے مگر اس کے بعد یہ کتاب کمیاب ہوگئی تھی اس لیے مصنف کے بعض اہل خاندان نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے اس کی اشاعت کی درخواست کی، انہوں نے ندوۃ العلما کے سابق استاذ ادب مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم کو اس کے مقابلہ وتصحیح کے کام پر مامور کیا جس کی نگرانی مشہور محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے کی، چنانچہ ان کی نظر ثانی کے بعد مجمع البحار کا نیا ایڈیشن ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوا جو شاندار اور موجودہ دور کے طباعتی معیار کے مطابق ہے، اس ایڈیشن میں مولانا اعظمی کا فاضلانہ مقدمہ اور عالمانہ حواشی بھی شامل ہیں جن سے اس کی اہمیت دوچند ہوگئی۔

☆☆☆

(۱) گجرات کی تمدنی تاریخ، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

(المتوفی ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء)

نام ونسب: عبدالحق نام، ابوالمجد کنیت، حقی تخلص اور محدث دہلوی عرف ہے، نسب نامہ حسب ذیل ہے:

''عبدالحق بن سیف الدین بن سعداللہ بن فیروز بن ملک موسیٰ بن ملک معزالدین بن آغا محمد ترک بخاری۔''(۱)

خاندان: عبدالحق ایک سربرآوردہ اور ذی وجاہت خاندان کے فرد تھے، وہ نسلاً ترک تھے، ان کے آباواجداد کا تعلق ماوراء النہر سے تھا، سب سے پہلے اس خاندان کے آغا محمد ترک بخاری سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں بخارا سے دہلی آئے، وہ اپنے خاندان کے سردار اور سربراہ تھے، اس لیے ان کے ہمراہ بہت سے ترک بھی اپنا اصل وطن چھوڑ کر دہلی چلے آئے جن میں ان کے اعزہ واقربا کے علاوہ مریدین ومتوسلین اور خدم بھی تھے۔(۲)

آغا محمد ترک اوران کے بیٹے ملک معزالدین: آغا محمد ترک پر سلطان علاء الدین خلجی کی خاص نظر عنایت رہی اور وہ بلند مراتب پر فائز ہوئے، یہ جس وقت دہلی تشریف لائے تھے اس وقت گجرات کی مہم کی تیاری ہورہی تھی، بادشاہ نے اپنے امرا واعیانِ حکومت کے ساتھ انہیں بھی وہاں روانہ کیا اور گجرات فتح ہوجانے کے بعد وہیں مقیم رہنے کا حکم دیا، مگر

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۷۹ ومابعد مطبع ہاشمی، میرٹھ مطبوعہ ۱۲۷۸ھ۔ (۲) ایضاً، ص ۲۷۹۔

کسی امیر سے کسی بات پر ان سے کچھ ان بن ہوگئی، اس لیے وہ گجرات سے دہلی واپس آ گئے اس دفعہ بادشاہ نے پہلے سے زیادہ ان کا اعزاز کیا اور بلند عہدے تفویض کیے۔

سلطان علاء الدین کے قطب الدین اور تغلق شاہ کے زمانہ میں بھی وہ اپنے خاندان کے ساتھ عزت وفراغت سے زندگی بسر کرتے رہے، دولت وثروت کے ساتھ اللہ نے ان کو اولاد کی کثرت سے بھی نوازا تھا مگر دفعتاً ایک حادثہ میں سب سے بڑے صاحبزادے ملک معز الدین کے علاوہ سب فوت ہو گئے، اس جاں گداز سانحہ نے آغا محمد ترک کا سارا عیش ونشاط ختم کر دیا اور انہیں امارت ودولت، لاؤ لشکر اور خیل وحشم کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں رہی، چنانچہ ایک سیاہ ماتمی لباس پہن کر شیخ صلاح الدین سہروردی کی خانقاہ میں مقیم ہو گئے، ایک مدت کے بعد شیخ نے ان کو اہل وعیال کے پاس واپس جانے کی ترغیب دی اور یہ بشارت بھی سنائی کہ انشاء اللہ اسی ایک باقی ماندہ فرزند سے تمہاری نسل قیامت تک باقی رہے گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ملک معز الدین کو پوری طرح سے نوازا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تنہا ان کی ذات میں فوت ہونے والے تمام فرزندوں کی خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔

۱۷/ربیع الآخر ۷۹۳ھ کو آغا محمد ترک کی وفات ہوئی، ان کا مقبرہ عیدگاہ شمسی کے عقب میں ہے، اس کے بعد ملک معز الدین کے یہاں ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام موسیٰ ملک رکھا گیا، مگر کچھ ہی عرصہ بعد ملک معز الدین بھی دولت وثروت اور دنیوی جاہ وحشمت چھوڑ کر عالم آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔(۱)

ملک موسیٰ: ملک موسیٰ بھی نجابت وسعادت اور فضائل وکمالات سے متصف اور بڑی عزت وشہرت کے مالک تھے، فیروز تغلق کی وفات کے بعد ملک میں بدامنی اور شورش بڑھ گئی تو انہوں نے ماوراء النہر کی راہ لی، مگر امیر تیمور گورگان کے لاؤ لشکر کے ساتھ پھر دہلی واپس آ کر مستقل طور پر یہیں فروکش ہو گئے اور نہ صرف وہ بلکہ اس خاندان کے کسی اور فرد نے بھی

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۷۹ و ۲۸۰ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ، مطبوعہ ۱۲۷۸ھ۔

اس کے بعد دہلی سے باہر قدم نہیں نکالا۔(۱)

شیخ فیروز: ملک موسیٰ کے کئی بیٹے ہوئے، ان میں ایک کا نام شیخ فیروز تھا جو بڑے جامع کمالات شخص تھے، فن حرب اور سپہ گری میں خاص طور پر یکتا ہونے کے علاوہ علم و فن، شعر وشاعری، شجاعت وسخاوت، ظرافت و لطافت طبع اور دوسرے اوصاف وکمالات میں اپنی مثال آپ تھے، انہوں نے دولت وحشمت اور عزت وعظمت میں بھی ناموری حاصل کر کے خاندان کی شہرت میں چار چاند لگا دیے، خاندان میں شاعری، سخنوری، خوش طبعی اور ظرافت کی بنیادیں انہی کی ذات سے استوار ومحکم ہوئیں، شیخ فیروز سلطان بہلول لودی کی حکومت کے ابتدائی دور میں موجود تھے، انہوں نے سلطان حسین شرقی کے دہلی آنے اور سلطان بہلول سے جنگ کرنے کے واقعہ کو نظم کیا تھا جس کے دو شعر شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں نقل کیے ہیں، حسین شرقی بہلول لودی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

ایا قابض شہر دہلی شنو
حیاتت چو خواہی ازیں جا برو
منم قابض ملک و ماراست ملک
خدا داد مارا خدا راست ملک

ترجمہ: اے دہلی پر قابض شخص سنو! اگر اپنی زندگی کے خواہش مند ہو تو یہاں سے چلے جاؤ، اب اس ملک پر میں قابض ہوں گا اور یہ میرا ملک ہوگا، کیوں کہ خداوند قدوس نے اسے مجھے عطا کیا ہے اور ملک تو دراصل خدا ہی کا ہے۔

شیخ فیروز کسی جنگ میں بہرائچ گئے اور ۸۶۰ھ میں جام شہادت نوش کیا، ان کی تدفین بہرائچ ہی میں ہوئی، جب گھر سے روانہ ہو رہے تھے تو ان کی بیوی نے کہا "میں امید سے ہوں" فرمایا میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ نرینہ اولاد پیدا ہو اور اس کی نسل خوب پھلے پھولے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۰۔

اور اس سے بکثرت اولاد ہو، اس کو اور تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں، آئندہ معلوم نہیں کیا پیش آئے۔(۱)

شیخ سعداللہ: شیخ فیروز کی دعا اللہ نے سن لی اور ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیخ سعداللہ تھا، یہی شیخ عبدالحق کے حقیقی دادا تھے، یہ بڑی خوبیوں سے متصف اور اپنے والد بزرگوار کے کمالات کے وارث تھے، بچپن ہی سے رشد و ہدایت کے آثار ان کی پیشانی سے نمایاں تھے، علم وفضل کی تحصیل کر چکے تو شیخ محمد منکن سے بیعت ہوئے جو اپنے زمانہ کے مرد کامل اور مصباح العاشقین کے لقب سے مشہور تھے، شیخ سعداللہ نے ان کی خدمت میں رہ کر بڑی ریاضت کی اور انہی کی رہنمائی میں سلوک و معرفت کی راہیں طے کر کے ان سے اجازت وخلافت حاصل کی، شیخ سعداللہ نے اپنے بڑے صاجزادے شیخ رزق اللہ کو بھی اپنے مرشد سے بیعت کرایا، ان کے بیٹے اور شیخ عبدالحق کے والد شیخ سیف الدین کا بیان ہے کہ ''میرے والد ہمیشہ ذوق وشوق، ریاضت ومجاہدہ اور طلب فقر وفنا میں سرگرداں رہتے تھے، راتوں کو جاگتے، گریہ وزاری کرتے اور عاشقانہ اشعار پڑھتے'' ان کی وفات جمعہ ۲۲ ربیع الاول ۹۲۸ھ کو ہوئی۔(۲)

شیخ سعداللہ کی اولاد: شیخ سعداللہ کو اللہ نے کئی بیٹے عطا کیے تھے، اس شہر کے تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ دہلی انہیں بھائیوں (شیخ سعداللہ کی اولاد) سے عبارت ہے، حصول معاش کے لیے گو یہ لوگ امرا سے بھی متوسل رہے لیکن اہل دربار اور مصاحبین ان لوگوں کے فقر وفنا سے واقف نہ تھے، شہر والوں میں بھی کم ہی لوگ ان سب بھائیوں کے فقر و معرفت کے حالات سے باخبر تھے کیوں کہ یہ لوگ اخفائے حال سے کام لیتے تھے اور ان کا ظاہری فضل وکمال ان کی باطنی کیفیات کے لیے حجاب بن گیا تھا، ان کے ظاہری حالات کی وجہ سے اکثر لوگ صرف ان کے علم وفضل، شعر وشاعری اور ظرافت وخوش طبعی کو دیکھتے اور

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۰۔ (۲) ایضاً، ص ۲۸۱۔

انہی چیزوں کا ذکر کرتے ، مگر جن لوگوں کو ان حضرات کی خلوتوں کے مشاہدہ کا موقع ملا ہوگا وہی ان کے فقر و معرفت سے کسی قدر واقف رہے ہوں گے ۔(۱)

ان سب بھائیوں میں دو کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی ، اس لیے ان کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں:

شیخ رزق اللہ مشتاقی: یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے ، بڑے کامل و فاضل اور عارف شخص تھے جو اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار اور یادگار سلف خیال کیے جاتے تھے ، ان کی ذات گوناگوں ظاہری و باطنی کمالات کا مجموعہ تھی ، عشق و محبت ، سلامتی عقل ، وسعت ظرف ، مصائب پر صبر کرنے والے اور استقامت و دوام حضور میں یگانہ تھے ، ان کے مرشد مصباح العاشقین شیخ محمد منکن کی ان پر خاص نظر عنایت تھی ، شیخ رزق اللہ کو ان سے سوز و درد کا وافر حصہ ملا تھا ، بانوے برس کی عمر میں بھی ان کے ذوق و محبت اور درد و سوز میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی ، اگر کوئی شخص ان کی خدمت میں پہنچ جاتا تو ان کی ان باتوں کو جو معارف و حقائق اور محبت کے اسرار و دقائق سے پر ہوتی تھیں ، سن کر محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا ۔

طبیعت کی سلامتی اور قلب کی پاکیزگی کی دولت بھی حصہ میں آئی تھی ، بات نہایت اطمینان سے کرتے اور اس میں بڑی لطافت و شیرینی ہوتی ، دوسروں سے گفتگوئے محبت کرتے یا سنتے تو ان پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ، سفر و سیاحت بہت کی اور لوگوں سے مل کر تجربے حاصل کیے ، بہت سارے مشائخ و فقرا کی صحبت میں بھی رہے ۔

شیخ رزق اللہ سنسکرت ، ہندی ، فارسی اور عربی کے فاضل اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے ، ہندی اور فارسی دونوں میں داد سخن دیتے ، ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص تھا ، تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی ، ہندی میں متعدد رسالے لکھے جن میں پیمان جودت ترجمن بہت مشہور ہوئے ، بزرگوں کی حکایتیں اور سلاطین ہند کے تاریخی واقعات

(۱) اخبار الاخیار ، ص ۲۸۱ ۔

وقصص بہت دلچسپی اور شوق وذوق کے ساتھ سناتے تھے، ان حکایات وواقعات کا ایک مجموعہ بھی ''واقعات مشتاقی'' کے نام سے مرتب کیا تھا، یہ سلطان بہلول لودیوں کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے، اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں (۱) لودھیوں کی تاریخ کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے، ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، ایلیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ کیا ہے۔ (۲)

شیخ سیف الدین: یہ شیخ سعد اللہ کے چھوٹے لڑکے اور حضرت شیخ عبدالحق محدث کے والد ماجد تھے، ۹۴۰ھ/۱۵۱۴ء میں پیدا ہوئے، والد کے وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ برس تھی، جب ان کی رحلت کا زمانہ قریب ہوا تو ایک روز سحر کے وقت شیخ سیف الدین کو لے کر بالا خانہ پر گئے، تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر انہیں قبلہ رو کھڑا کیا اور بارگاہ خداوندی میں یہ دعا کی:

> ''خداوندا تو جانتا ہے کہ میں اپنے سب بچوں کی تربیت سے فارغ اور ان کے حقوق ادا کر چکا ہوں لیکن اس لڑکے کو یتیم و بے کس چھوڑ رہا ہوں، اس کے حقوق میرے ذمہ رہ گئے ہیں، اسے تیرے سپرد کرتا ہوں، تو اس کو اپنی تولیت، سرپرستی اور نگرانی میں لے لے۔'' (۳)

والد کی دعا کے اثرات سے ان میں روز بروز رشد وترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے، موانع ومشکلات کے باوجود انہوں نے علم وفضل کی تحصیل میں کسی طرح کی کمی اور کوتاہی نہیں کی، شاعری، علمی فضیلت، مقبولیت، ذوق وشوق، محبت، ظرافت، لطافت، زہد، دنیا سے بے رغبتی، دل کی پاکیزگی، حضور قلب، نکتہ سنجی اور فہم ودقائق واشارات میں بے مثال اور یگانہ تھے۔ (۴)

---

(۱) فہرست مخطوطات، ج ۳، ص ۹۲۱۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق از پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص ۶۱۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۸۱۔ (۴) ایضاً۔

شیخ سیف الدین ایک صاحب دل بزرگ تھے ، ابتدا میں سلسلہ سہروردیہ کے ایک عالم سے بیعت ہوئے ، پھر شیخ امان اللہ پانی پتیؒ (م ۹۵۷ھ) کی صحبت میں سلوک کی منزلیں طے کیں اور انہی سے خلافت بھی پائی ، قدرت نے انہیں نگاہ کیمیا اثر اور فقر وفنا ، توحید ، تجرید اور تفرید میں سے وافر حصہ عطا کیا تھا ، ان کو نہ دولت دنیا کی ہوس تھی اور نہ کبھی اس کی طلب کا کوئی داعیہ ان میں پیدا ہوا ، صرف فقر ومحبت کی جانب ان کی توجہ رہی ، مشرب توحید کا ان پر شدید غلبہ تھا جس کو شیخ امان اللہ کی تربیت نے خوب چمکا دیا۔

شیخ امان اللہ کے دل میں عشق حقیقی کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی اور ان کو نظریۂ وحدت الوجود پر پورا عبور تھا ، وہ اس مسئلہ پر بڑی مدلل تقریر کرتے اور نہایت برملا طور پر توحید کے اسرار وحقائق بیان کرتے تھے ، انہوں نے تصوف وتوحید میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں ، درس وتدریس کا شغل بھی تھا۔

شیخ سیف الدین پر ان کی تربیت کا بڑا اثر تھا ، وہ گو خود صاحب علم تھے مگر فرماتے تھے کہ متقی کم علم اس عالم سے بہتر ہے جو جاہ کا طلب گار ہو ، ایک دفعہ شیخ عبدالحق سے فرمایا کہ جب میں نے اس زمانہ کے اکابر علما کا جاہ کا طلب گار ، مال ودولت کا حریص ، دنیوی لذتوں میں منہمک اور بحث وجدال میں مشغول دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم نے تھوڑا علم حاصل کیا اور ہمارا شمار اکابر علما میں نہیں ہوتا ، وہ اپنے فرزند کو برابر تاکید کرتے تھے کہ "علم کے معاملہ میں نہ کسی سے بحث ونزاع کرو اور نہ کسی کو تکلیف واذیت دو ، اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ حق دوسری جانب ہے تو فوراً اسے مان لو اور اگر اس کے برخلاف یہ یقین ہو کہ تم ہی حق پر ہو تو دو تین دفعہ اپنے فریق کو سمجھانے کی کوشش کرو ، اگر مان لے تو فبہا ورنہ بحث نہ کرو اور یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو جاؤ کہ مجھے تو یہی معلوم ہے ممکن ہے جو تم کہہ رہے ہو وہی صحیح ہو ، اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔

---

(۱) اخبار الاخیار ، ص ۲۸۲۔

شیخ سیف الدین کو شعر و سخن کا عمدہ ذوق تھا اور سیفی تخلص کرتے تھے، اخبار الاخیار میں ان کی دو غزلیں درج ہیں جن سے ان کے شاعرانہ کمالات کا پتہ چلتا ہے، ان کی ایک مثنوی سلسلۃ الوصال کا پتہ بھی چلتا ہے جو تقریباً پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے، شیخ سیف الدین کو تصنیف و تالیف سے زیادہ مناسبت نہ تھی، ان کے پیر و مرشد شیخ امان اللہ اپنے مریدوں کو تقریر کرنے کا حکم دیتے تھے تاکہ اس سے اندازہ ہو کہ وہ شیخ کے ارشادات و تعلیمات کو پوری طرح اخذ کر سکے ہیں کہ نہیں، اس مقصد سے جب انہوں نے شیخ سیف الدین کو بھی تقریر کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ فقیر کو آپ کے سامنے تقریر کی مجال نہیں ہے، اگر حکم ہو تو لکھ کر پیش کروں، شیخ نے اجازت دی، اس طرح جو رسالے مرتب ہوئے ان میں سے ایک کا نام مکاشفات ہے (۱) جس کے اقتباسات شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں نقل کیے ہیں۔

شیخ سیف الدین کو دینی علوم سے بڑا شغف تھا، انہوں نے شیخ عبدالحق کی علمی تربیت پر پوری توجہ کی تھی، ان کے خانوادہ کے علمی سلسلہ کا نقطۂ آغاز ان کے فرزند حضرت شیخ عبدالحق دہلوی کو مانا جاتا ہے مگر مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''آج تک شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے علمی خانوادہ کا آغاز انہی کی ذات سے کیا جاتا ہے مگر حکیم (حبیب الرحمٰن) صاحب (ڈھاکہ) کے پاس ایک دستاویز ایسی ہے جو اس آغاز کو ایک پشت اوپر تک لے جاتی ہے، یعنی علامہ ذہبی کی الکاشف جو اسماء الرجال کی ایک کتاب ہے، اس کا ایک ایسا نسخہ حکیم صاحب کی ملکیت میں ہے جس کے پہلے صفحہ پر مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے والد ماجد مولانا سیف الدین ترک کے قلم کی عبارت تحریر ہے۔'' (۲)

دراصل شیخ سیف الدین ایک صوفی بزرگ منش تھے، ان کا خود بیان ہے کہ مجھے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۶ و ۲۸۷۔ (۲) معارف فروری ۱۹۲۹ء، ص ۸۷ و مقالات سلیمان جلد دوم، ص ۷۷۔

سات برس کی عمر کی عمر سے جس میں ادراک، شعور اور عقل کی ابتدا ہوتی ہے، درد و محبت، طلب الٰہی اور معرفت کا شوق دامنگیر تھا اور اسی ذکر و فکر میں عمر بسر ہوئی، مجاہدہ و ریاضت کے زمانہ میں میں نے وہ حالات دیکھے ہیں جن کا اظہار نہ کرنا ہی مناسب ہے کیوں کہ ستر و اخفا فقر کے لیے لازم اور ضروری ہے۔(۱)

وہ فرماتے تھے کہ طریقت کے کئی راستے ہیں جن لوگوں نے اختیار کیا ہے لیکن اصل حقیقت صرف اس قدر ہے کہ معیت حق کو ہر حال میں پیش نظر رکھا جائے، دنیا کے کام میں لگے رہو مگر دل کو یار کی طرف لگائے رکھو، انسان کا ظاہر و باطن یکساں ہونا چاہیے اور اصل معاملہ تو اللہ کے ساتھ راستی اور راست بازی کا ہے جو ہمیشہ ٹھیک رہنا چاہیے۔(۲)

شیخ سیف الدین پر بڑھاپے میں محویت و فنا کا غلبہ تھا، کھانے پینے، پہننے، عیش و فراغت، صحبت و ملاقات اور ادب و شاعری وغیرہ سے کوئی رغبت باقی نہیں رہ گئی تھی، اگر ان کے علاج کی سعی کی جاتی تو فرماتے کہ میں نے کون سے اچھے کام کیے ہیں جو صحت و تندرستی کی خواہش کروں، میرا وجود اور عدم برابر ہے، غرض ہر وقت خوف و خشیت کا غلبہ رہتا اور کبھی اس حال سے فارغ نہ رہتے، مگر جب وفات کا وقت قریب آیا تو ذوق و شوق کی کیفیت طاری رہنے لگی، اسی حالت میں اپنے فرزند عبدالحق محدث سے فرمایا کہ دعا کرو کہ خدا مجھے جلد یہاں سے لے جائے، مجھے جس چیز کی طلب تھی وہ اب حاصل ہوئی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ ہاتھ سے چلی جائے، میں تمام عمر دعا کرتا رہا کہ ''خداوندا آخر وقت میں ذوق و شوق کے عالم میں مجھے اس جگہ سے لے جائیو'' اب یہ مراد اچھی طرح بر آئی ہے اگر اس حالت میں میرا مولیٰ مجھے اپنے سامنے بلا لے تو اس کی بڑی عنایت اور انتہائی کرم ہوگا، عیادت کے لیے آنے والے اگر ان کے لیے دعائے صحت کرتے تو آزردہ خاطر ہوتے اور فرماتے کہ اللہ سے اس کی دعا کرو کہ وہ مجھے یہاں سے بلا لے۔(۳)

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۸۲۔ (۲) ایضاً، ص ۲۸۳۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۲۸۸و ۲۸۹۔

بالآخر ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو واصل بحق ہو گئے **ولی تحت القباب** سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔(۱)

ولادت: شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسی ذی حیثیت اور ممتاز گھرانے کے فرد اور ایسے مرد کامل بزرگ کے بیٹے تھے، جو محرم ۹۵۸ھ (مطابق جنوری ۱۵۵۱ء) میں منتخب روزگار شہر دہلی میں پیدا ہوئے، ''شیخ اولیا'' سے ان کی تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔

تعلیم وتربیت: حضرت شیخ عبدالحق کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں ان کے والد بزرگوار کے سایہ عاطفت میں ہوئی، بڑھاپے میں ان کے والد کی ساری توجہ انہی کی جانب مرکوز ہوگئی تھی اور ہر وقت ان کو اپنے ساتھ رکھ کر ان کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہتے، خود شیخ بیان کرتے ہیں:

> ''آخر عمر میں جب والد بوڑھے اور ضعیف ہو گئے تھے تو خصوصیت کے ساتھ میری جانب ان کی توجہ اور دلبستگی بہت زیادہ ہوگئی تھی، میں تین یا چار برس کا تھا کہ ان کو ایام جوانی گزر جانے اور غمگسار دوستوں کی رحلت کی وجہ سے ایک سخت بیماری لاحق ہوئی، اس بیماری میں ان کی دلجوئی اور ضعف پیری کی کلفتوں کو دور کرنے کے لیے یہ فقیر شب وروز ان کی خدمت میں رہتا تھا اور ان کی آغوش شفقت میں برابر تربیت پاتا تھا، اسی زمانہ طفولیت میں والد حضرات صوفیہ کے اقوال وارشادات میرے دل ودماغ میں ڈال کر میری باطنی تربیت بھی کرتے تھے، میں خود بھی فطرۃً ان باتوں کا دلدادہ تھا، وہ جب ذرا دیر کے لیے خاموش ہوتے تو میں بھی خود فراموشی کی حالت میں ہو جاتا اور پھر واقفان حال کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کے لیے کہتا، اس زمانہ کی بعض باتیں میرے حافظۂ خیال میں

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۰۔

محفوظ رہ گئی ہیں اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ فقیر کو اپنے دودھ
چھوڑنے کے وقت کی باتیں بھی اس طرح یاد ہیں گویا یہ کل کی بات ہے،
حالاں کہ اس وقت میری عمر دو ڈھائی برس کی رہی ہوگی۔"(۱)

شیخ کے والد نے بہت نرالے انداز اور انوکھے انداز سے ان کی تعلیم کی ابتدا کی تھی، لکھتے ہیں:

"بغیر سابقہ تعلیم اور قواعد تہجی کے جو عام بچوں کے پڑھنے پڑھانے
کا طریقہ ہے، پہلے قرآن مجید کے دو تین جز بلکہ اس سے بھی کم کی تعلیم دی،
وہ سبق لکھ دیتے تھے اور میں پڑھ لیتا تھا، قرآن حکیم کی یہی مقدار میں نے
ان سے سبقاً پڑھی، اس کے بعد ان کی تربیت وشفقت سے اس قدر استعداد
ہوگئی کہ روزانہ قرآن کی ایک مقدار خود سے پڑھتا اور جو مقدار پڑھتا اسے
ان کے سامنے دہرا دیتا، اس طرح میں نے دو تین ماہ میں قرآن مجید ختم
کر دیا، معلم جس طرح بچوں کو سبق رٹا کے یاد کراتے ہیں وہ میں نے نہیں
کیا اور نہ یہ مفید ہے۔

والد بزرگوار نے مجھے بچوں کے طریقہ پر فا اور قاف تک تختی لکھائی
تھی، اس کے بعد تھوڑی مدت میں اگر ایک ماہ کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا
کتابت وانشا کا سلیقہ پیدا ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ اور نظر میں ایسا
اثر اور ایسی خاصیت رکھی تھی کہ غبی اور قوت اخذ واستعداد میں بہت کمتر
شخص بھی ان کی توجہ وتربیت سے چمک اٹھتا تھا اور اس کی مخفی صلاحیتیں
بہت ظاہر ہونے لگتی تھیں، مجھے جو کچھ بھی ملا وہ انہی کی توجہ وعنایت کا اثر و
نتیجہ ہے، ان کے پدری اور تعلیم وتربیت کے تمام حقوق اس نامراد کے
ذمہ ثابت ومسلم ہیں۔

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۰۔

اسی زمانہ میں تحصیل علم میں مشغول ہوا، شب و روز والد محترم کی خدمت میں رہتا اور بحث و تکرار میں مصروف رہتا، اسی میں راتیں گزر جاتی تھیں، وہ بندہ کو ہم زبانی کا شرف عطا کر کے بہت خوش ہوتے تھے، خاص طور پر علم توحید کی تلقین اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی تحقیق اس طرح فرماتے تھے کہ گویا آنکھوں دیکھی باتیں کر رہے ہیں، اگر کبھی ان علوم و مسائل کے سمجھنے میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے تو فرماتے کہ ہم کو بھی اسی طرح کے مسائل میں بہت سے شکوک و شبہات پیش آتے تھے، انشاء اللہ رفتہ رفتہ یہ سب دور ہو جائیں گے اور تم جمال یقینی کا مشاہدہ کر لو گے مگر شرط یہ ہے کہ ہمیشہ اسی خیال اور دھن میں لگے رہو اور جہاں تک ہو سکے اس کے سمجھنے کی فکر و کوشش کرتے رہو۔"(۱)

اعلیٰ تعلیم: اپنی آگے کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے شیخ بیان کرتے ہیں کہ:

"جن منظوم کتابوں کی تعلیم کا اس ملک میں رواج تھا ان میں سے والد نے شاید گلستاں و بوستاں کے چند جزو اور دیوان حافظ کی تعلیم دی، لڑکپن ہی میں ختم قرآن کے بعد میزان الصرف سے مصباح و کافیہ تک خود پڑھایا، اسی زمانہ میں اکثر یہ ارشاد فرماتے تھے کہ انشاء اللہ تم جلد ہی عالم بن جاؤ گے، یہ بھی فرماتے کہ مجھے اس تصور سے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس درجۂ کمال تک پہنچا دے جس کا مجھے خیال ہے اور میں تمہارے حلقۂ درس و افادہ میں اپنے بڑھاپے میں اعتماد کر کے بیٹھا رہوں اور کبھی چند کتابوں کا نام لے کر فرماتے کہ بس ان کو پڑھ لو تو عالم ہو جاؤ گے۔

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۰۔

میرے والد بزرگوار فرماتے کہ ہر علم میں سے ایک مختصر پڑھ لو، یہ تمہارے لیے کافی ہے،اس کے بعد انشاء اللہ برکت وسعادت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور تم تمام علوم بلا تکلف حاصل کرلو گے، ان کے ان پاکیزہ ارشادات کا یہ اثر ہوا کہ میں نے علوم کی تحصیل اتنی جلدی کرلی کہ جسے طے زمان ومکان کہتے ہیں، فن نحو کے مختصرات جیسے کافیہ اور ادب و ارشاد کے ایک ایک جز بلکہ اس سے بھی زیادہ بعض اوقات پڑھ لیتا، علوم کی تحصیل سے فراغت اور تکمیل کا شوق وحرص اس قدر تھا کہ اگر ان مختصرات میں کسی کا صحیح اور حاشیہ والا کوئی نسخہ ہاتھ آجاتا تو اسے استاد سے پڑھنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور دوران مطالعہ متن سمجھ لینے کے لیے محض حواشی دیکھ لینا کافی ہوتا اور پھر دوسرے جز کے مطالعہ میں منہمک ہوجاتا اور اگر کوئی آسان بحث ہوتی یا وہ مضمون پڑھا ہوا پہلے سے معلوم ہوتا تو میری طبیعت اس میں غور وفکر پر آمادہ نہ ہوتی بلکہ آگے بڑھ جاتا، خدا ہی جانتا ہے کہ میں ان دنوں کیا پڑھتا اور کیا سمجھتا تھا، تاہم ہر کتاب کے متن اور حاشیہ سے پورا فائدہ حاصل کرتا اور انہیں اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، جو کتابیں بھی میری نظر سے گزرتی یا اس کا کوئی جز بھی کسی وقت ہاتھ لگ جاتا خواہ وہ شروع کا ہوتا یا آخر کا، اسے پڑھ کر اس پر عبور حاصل کرنا اس وقت کا اہم مشغلہ ہوتا، میں اس کا پابند نہیں تھا کہ کتاب کو اول سے شروع کرنا اور آخر میں ختم کرنا چاہیے بلکہ جو حصہ جہاں کا مل جاتا اسی کو پڑھنا شروع کردیتا کیونکہ میرا مقصد تحصیل علم تھا خواہ یہ جیسے بھی ممکن ہو۔

بارہ یا تیرہ برس کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھی اور پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں مختصر ومطول ختم کرلی، پھر میں نے علوم عقلیہ ونقلیہ کی

پوری تحصیل کر لی۔''(۱)

قرآن مجید کا حفظ: ''الحمد للہ کہ اس کے بعد قرآن مجید کے حفظ کی توفیق بھی نصیب ہوئی اور میں اس طرح اللہ کے کلام کی حفاظت میں آ گیا، یہ نعمت مجھے ایک برس سے کچھ زیادہ عرصہ میں حاصل ہوگئی جس کے ایک حرف کا شکر سو برسوں میں بھی ادا نہیں ہو سکتا۔''(۲)

ماوراء النہر کے علما سے استفادہ: ''اس طرح میں نے تمام کتابوں پر عبور حاصل کر لیا اور ادب و عربیت اور منطق و کلام کی کتابوں میں مکمل دستگاہ ہو جانے کے بعد سات آٹھ برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ تک ماوراء النہری علما سے اس طرح درس لیا کہ شب و روز میں دو تین ساعت کے لیے مطالعہ، غور و فکر اور مشغولیت سے فرصت ملتی۔''

شوق علم اور مطالعہ سے شغف: شیخ کی تعلیم و تربیت کی جو تفصیل ان کی زبان سے پیش کی گئی ہے اس سے ان کے شوق و طلب علم اور مطالعہ میں غیر معمولی انہماک اور دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ذیل میں اس سلسلہ کی کچھ مزید باتیں بھی خود ان ہی کے حوالہ سے قلم بند کی جاتی ہیں، شیخ عبدالحق علمائے ماوراء النہر سے اپنے استفادہ اور ان کے یہاں قیام کے زمانہ کے علمی اشغال وغیرہ کا حال بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا شوق تھا اور کیسی طلب تھی، اگر اس قدر شوق و ذوق طلب مولیٰ اور باطنی ریاضت کے لیے ہوتا تو معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا، ایک مرتبہ چند طالب علم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کر رہے تھے کہ تحصیل علم کا کیا مقصد ہے؟ بعض نے تکلف و تصنع سے کام لے کر کہا کہ ہمارا مقصد معرفت الٰہی کی طلب ہے اور بعض نے

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۱۔ (۲) ایضاً، ص ۲۹۲۔

سادگی اور سچائی سے بتایا کہ ہماری غرض دنیا طلبی ہے، میں نے اس زمانہ میں کافیہ بلکہ اس سے بھی نیچے کی کتابیں پڑھتا تھا، ان لوگوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ تم بھی تو بتاؤ کہ علم حاصل کرنے سے تمہارا کیا مقصد وارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ تحصیل علم کا نتیجہ معرفت الٰہی کی صورت میں ظاہر ہوگا یا اس سے لہو ولعب کے اسباب مہیا ہوں گے، مجھے اس وقت صرف یہی شوق دامنگیر ہے کہ یہ جان جاؤں کہ جو علما و فضلا گزرے ہیں انہوں نے کیا کہا ہے اور کشف وحقیقت اور معلومات مسائل میں کیا موتی پروئے ہیں، حصول علم کے بعد کیا صورت پیش آئے گی، نفس کو لذت وسرور حاصل ہوگا یا مولیٰ کی محبت ملے گی، دنیا کی طلب وتحصیل کی طرف دل مائل ہوگا یا عقبیٰ کا طلب گار ہوگا۔

زمانۂ طفولیت ہی سے مجھے پتہ نہیں کہ کھیل کود کیا چیز ہے؟ نیند کیسی ہوتی ہے؟ مصاحبت اور لطف کس کو کہتے ہیں، آرام وآسائش کیا ہے اور سیر وتفریح کیا ہوتی ہے۔

شب خواب چہ سکون کدام است
خود خواب بعاشقان حرام است

روزانہ سخت ٹھنڈی ہوا اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں دو بار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا جو غالباً میرے گھر سے دو میل کے فاصلہ پر تھا، دوپہر کو گھر میں بس چند لقمے کھانے کے لیے رکتا تاکہ جسم وجان میں حرکت وقوت باقی رہے، اس سے زیادہ اس وقت گھر پر نہ رہتا، ایک مدت تک صبح ہونے سے پہلے ہی مدرسہ پہنچ جاتا اور چراغ کی روشنی میں ایک جز لکھ لیتا، اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ گو سارا وقت مطالعہ اور پڑھی ہوئی کتابوں

کی بحث وتکرار میں گھرا رہتا تھا مگر اس کے باوجود میں ان شروح وحواشی کو جو نظر ومطالعہ سے گزرتے تھے لکھ لینا بھی ضروری سمجھتا تھا، رات کا زیادہ حصہ اور دن کا کچھ حصہ مطالعہ میں صرف ہوتا تھا اور رات کا تھوڑا اور دن کا بڑا حصہ لکھنے میں گزرتا تھا۔

میرے والدین برابر اس کے آرزومند رہے کہ تھوڑی دیر محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو جاؤں اور رات کو وقت پر سو جایا کروں، میں ان سے عرض کرتا کہ آخر کھیل کود کا مقصد تو دل کو خوش کرنا ہے اور میرا دل اس سے خوش ہوتا ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں، عموماً ماں باپ اپنے بچوں کو مدرسہ جانے اور پڑھنے کے لیے تاکید وتنبیہ کیا کرتے ہیں، اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی تاکید کی جاتی تھی، کبھی اثنائے مطالعہ میں آدھی رات ہو جاتی تو والد ماجد پکار کر فرماتے بابا کیا کرتے ہو؟ میں اس خیال سے فوراً لیٹ جاتا کہ جھوٹ نہ بولنا پڑے اور کہتا کہ میں سویا ہوں، آپ کیا فرماتے ہیں؟ اس کے بعد پھر اٹھ جاتا اور پڑھنے میں مشغول ہو جاتا، کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ عمامہ اور سر کے بالوں میں چراغ سے آگ لگ گئی لیکن مجھے اس وقت پتہ چلا جب اس کی حرارت دماغ کو پہنچی۔''(۱)

اساتذہ: شیخ عبدالحق نے زاد المتقین، اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث اور اسماء الاستاذین کے نام سے جو کتابیں لکھی تھیں ان میں ان کے استاذوں کا ذکر ہے، غالباً ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کے استاذوں کا اسی لیے کوئی ذکر نہیں کیا کہ خود شیخ ان کے بارے میں مستقل رسالے لکھ چکے ہیں مگر اب شیخ کی یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں اس لیے ان کے عام استاذوں کا نام معلوم نہیں ہو سکا، تاہم جن کا نام تلاش وتفحص سے

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۲۔

معلوم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ **شیخ سیف الدین:** اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ عبدالحق نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی تھی، نحو، منطق، عقائد، معانی اور بلاغت کی مروج کتابوں اور فارسی ادب گلستاں، بوستاں اور دیوان حافظ کا درس انہی سے لیا تھا۔(۱)

والد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدرسہ دہلی میں داخل ہوئے (۲) جہاں کئی برس تک درس لیتے رہے، انہوں نے درسیات سے باقاعدہ فراغت اور تکمیل یہیں کی تھی، ظاہر ہے اس مدرسہ میں انہوں نے متعدد استاذوں سے تعلیم پائی ہوگی مگر تذکروں میں صرف ایک کا نام ملتا ہے۔

۲۔ **محمد مقیم:** یہ امیر محمد مرتضیٰ شریفی کے شاگرد تھے۔(۳)

مدرسہ دہلی کے بعد انہوں نے ماوراء النہر کے علما وفضلا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اس کا ذکر خود شیخ نے اخبار الاخیار میں کیا ہے (۴) لیکن ان لوگوں کے نام نہیں لکھے ہیں، اس کے بعد جب حرمین شریفین تشریف لے گئے تو وہاں کے فضلا سے بھی استفادہ کیا جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

۳۔ **شیخ عبدالوہاب متقی:** یہ شیخ علی متقی کے خاص شاگرد اور جانشین تھے، ان کا حال شیخ علی متقی کے تذکرہ میں گزر چکا ہے، شیخ عبدالحق نے ان کی خدمت میں دو برس گزارے اور ان سے بہت استفادہ کیا، ظاہری وباطنی دونوں طرح کے علوم ان سے حاصل کیے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ علی متقی اور شیخ احمد بن حجر مکی سے بھی ان کے تلمذ کا ذکر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے کیوں کہ اول الذکر کا انتقال ۹۷۵ھ میں اور مؤخر الذکر کا ۹۷۴ھ میں ہوا، اس وقت شیخ عبدالحق ہندوستان میں تھے اور غالباً مدرسہ دہلی میں زیر تعلیم تھے اور

---

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۱۔ (۲) ایضاً، ص۲۹۲۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص۲۰۱۔ (۴) اخبار الاخیار، ص۲۹۲۔

۹۹۶ھ میں حجاز میں تشریف لے گئے تھے، اسی طرح ملا علی قاری سے بھی ان کا تلمذ کا ذکر کیا جاتا ہے جو محل نظر ہے۔(۱)

مکہ اور مدینہ کے چند اور شیوخ کے نام یہ ہیں:

۴۔ قاضی علی بن جاراللہ بن ظہیرہ قرشی مخزومی مکی۔

۵۔ شیخ احمد بن محمد بن محمد ابی الحزم مدنی۔

۶۔ شیخ حمیدالدین بن عبداللہ سندی مہاجر۔(۲)

تعلیم سے فراغت اور دانش مندان ماوراء النہر سے استفادہ کا زمانہ: شیخ عبدالحق نے اپنی تعلیم کی جو سرگزشت بیان کی ہے اس میں بتایا ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شرح شمسیہ و شرح عقائد ان کے زیر درس تھی اور پندرہ سولہ برس کی عمر میں وہ مطول و مختصر ختم کر چکے تھے، پھر ایک دو برس کے اندر وہ علوم عقلیہ سے اپنی فراغت و تکمیل کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ علوم کی تحصیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ قرآن کی سعادت بخشی اور اس میں برس سوا برس لگے(۳) اس طرح تعلیم اور حفظ قرآن مکمل کر لینے کے وقت ان کی عمر انیس بیس برس رہی ہوگی جیسا کہ عبدالحمید لاہوری نے بھی لکھا ہے۔(۴)

شیخ عبدالحق کی ولادت محرم ۹۵۸ھ میں ہوئی تھی، اس طرح گویا وہ ۹۷۷ھ تک جملہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے، گو اب وہ تعلیم مکمل کر چکے تھے، اس کے باوجود شوق وطلب علم میں کوئی کمی نہ آئی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:

غیر آنکہ مدت ہفت ہشت سال بلکہ زیادہ	ادب وعربیت اور منطق وکلام کی کتابوں پر
بعد از رسیدن بکتب عربیت و منطق وکلام و	عبور اور مکمل دستگاہ حاصل کرنے کے بعد

(۱) ان حضرات سے تلمذ کا ذکر سید محمد مرتضیٰ زبیدی نے کیا ہے (ملاحظہ ہو تاج العروس، ج ۷، ص ۳۲۸)۔

(۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۲، شیخ حمیدالدین سندی سے مشکوٰۃ کی اجازت کا ذکر خود شیخ عبدالحق نے لمعات شرح مشکوٰۃ کے دیباچہ میں کیا ہے۔(۳) اخبار الاخیار ص ۲۹۱۔(۴) بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، ص ۳۴۱۔

حصول نوعے از قوت امکان و اتمام ملازمت	ساتھ آٹھ برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ
درس بعضے از دانش مندان ماوراء النہر بطوری	تک بعض ماوراء النہری علما کے حلقہ درس
نمودہ شد کہ در تمامی شب و روز شاید کہ دو سہ	میں اس طرح سے شریک رہا کہ شب و روز
ساعت از مطالعہ و تعقل و اشتغال فرصتے	میں شاید دو تین گھنٹہ کے لیے مطالعہ، غور و
دست نمی دادہ باشند۔(۱)	فکر اور علمی اشغال سے فرصت ملتی تھی۔

گویا ۹۸۵ھ تک یا اس سے پہلے کا زمانہ انہوں نے دانش مندان ماوراء النہری کی خدمت میں گزارا، اس کے بعد کے واقعات کا ذکر آگے آرہا ہے۔

شیخ موسیٰ سے بیعت: شیخ کو تصوف سے طبعاً بھی مناسبت اور دلچسپی تھی اور اپنے والد سے بھی ان کو اس کا ذوق ورثہ میں ملا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی، جب وہ رسمی اور ظاہری تعلیم سے فارغ اور دانش مندان ماوراء النہر سے استفادہ اور کسب فیض حاصل کر چکے تو ان کو اصلاح باطن کی فکر دامنگیر ہوئی جس کے لیے مرشد کامل کی تلاش ہوئی تا کہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے سکیں، بخت نے یاوری کی اور یہ نعمت خداداد بھی میسر آ گئی، چنانچہ ۶ شوال ۹۸۵ھ کو شیخ موسیٰ بن حامد جیلانی اچی سے بیعت کا شرف حاصل کیا، اخبار الاخیار میں اس واقعہ اور شیخ موسیٰ کا بہت والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے(۲) اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہے کہ اپنے والد کے حکم سے حضرت شیخ موسیٰ گیلانی کا مرید ہوا۔(۳)

شیخ موسیٰ قادریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ مخدوم سید حامد گیلانی (م ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء) کے فرزند و خلیفہ تھے، شیخ حامد بلند مرتبہ و مقام کے حامل تھے، باوجودیکہ ہر قسم کا مال و اسباب ان کو میسر تھا مگر کبھی صاحب نصاب نہیں ہوئے جو زکوٰۃ واجب ہونے کی شرط ہے، وہ اپنے دادا شیخ عبدالقادر ثانی کے مرید تھے جن کو قبول عظیم حاصل تھا، شیخ حامد نے اپنے نیک بخت فرزند شیخ موسیٰ کو اپنی زندگی ہی میں خلافت و سجادہ نشینی اور سلسلہ کے جملہ امور تفویض کر دیے تھے

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۲۔ (۲) ایضاً، ص ۲۹۵ و ۲۹۶۔ (۳) بحوالہ حیات عبدالحق، ص ۱۳۰۔

کیوں کہ وہ ان سے ہر طرح راضی اور خوش تھے اور بڑی محبت بھی کرتے تھے، اس کے علاوہ ان میں خود بھی اس کی مکمل اہلیت واستعداد تھی (۱) ملا عبدالقادر بدایونی تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ حامد کے انتقال کے بعد شیخ موسیٰ اور ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالقادر میں مدت دراز تک سجادہ نشینی کا جھگڑا رہا (۲) اس کی وجہ سے شیخ موسیٰ اچہ چھوڑ کر دربار سے متوسل ہوگئے تھے اور اکبر نے ان کو پانسو کا منصب دیا۔'' (۳)

ان کی وفات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی، مزار پُر انوار ملتان میں ہے۔ (۴)

درس وتدریس کا آغاز: ۹۸۵ھ کے بعد اور حجاز کو روانگی سے پہلے انہوں نے درس وتدریس کا کام بھی انجام دیا، گو شیخ کے عام سوانح نگاروں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے مگر عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں:

''وچوں سنین عمرش بعشرین رسید از پایۂ تحصیل بدرجہ تدریس وچندے ہنگامہ افادہ گرم داشتہ بپائے طلب بادیہ پیمائی سفر حجاز گردید۔'' (۵)

جب ان کی عمر بیس برس کی ہوئی اور تحصیل علم سے فارغ ہو چکے تو منصب تدریس پر فائز ہوئے اور کچھ دنوں یہ شغل اختیار کرنے کے بعد حجاز روانہ ہوئے۔

محمد صالح کنبوہ کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کو روانہ ہونے سے پہلے ''روزے بتدریس وتعلیم گزرانید'' لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ تکمیل علوم کے بعد وہ سات آٹھ برس سے زیادہ عرصہ تک دانشوران ماوراء النہر سے استفادہ کرتے رہے، جیسا کہ شیخ عبدالحق نے بھی اخبار الاخیار میں لکھا ہے، اس لیے بیس برس ہی کی عمر میں منصب درس و تدریس پر فائز ہوجانے کی بات محل نظر ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ علمائے ماوراء النہر سے استفادہ

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۱۹۳ و ۱۹۴۔ (۲) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۹۱۔ (۳) ایضاً، ج ۲، ص ۴۰۴۔ (۴) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۳۸۔ (۵) بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، ص ۳۴۱۔

اور شیخ موسیٰ سے بیعت کے بعد ۹۸۶ھ میں وہ درس و تدریس کی مسند پر متمکن ہوئے ہوں، اس کی تائید اخبار الاخیار کی اس تصریح سے بھی ہوتی ہے جس میں شاہ صاحب نے تعلیم سے فراغت اور ماوراء النہر کے علما اور شیخ موسیٰ سے بیعت ہونے کے بعد تعلیم و افادہ میں اپنے مشغول ہونے کا ذکر کیا ہے:

تا الآن کہ بفضل یا نتناہی الٰہی و ما توفیقی الا باللہ جزائے وافر و قسطے کامل کہ من غریب شکستہ در خود ایں ہمہ انعام و اکرام از حضرت غریب نواز شکستہ پرور حاصل وقت شدہ است زیادہ تر از اں محنت و ریاضت می کشم و بمشغولی تعلیم و افادہ معاذ اللہ بلکہ تعلیم و استفادہ بسر می برم(۱)

(ذوق سحر خیزی کی وجہ سے) مجھ غریب و مسکین کو اللہ کے فضل نامتناہی اور اس کی توفیق کے تحت کافی نعمتیں ملی ہیں اور اب بھی حضرت غریب نواز کے فیض سے پہلے سے زیادہ محنت و ریاضت اور تعلیم و افادہ میں مشغول ہوں، معاذ اللہ تعلیم و افادہ نہیں بلکہ تعلیم و استفادہ میں بسر کر رہا ہوں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شیخ عبدالحق نے حج بیت اللہ کو جانے سے پہلے بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دی تھی۔

فتح پور سیکری میں قیام: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی طبعاً عزلت پسند اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے اور وہ اپنے علمی ذوق و انہماک کی وجہ سے بھی لوگوں سے زیادہ ربط و ضبط اور میل جول رکھنا پسند نہ کرتے تھے کیوں کہ اختلاط اور میل جول کی کثرت، یکسوئی، جمعیت قلب اور سکون خاطر کو ختم کر کے ذہن کو منتشر کر دیتی ہے اور علمی کاموں میں خلل انداز ہوتی ہے، علاوہ ازیں لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر آدمی ان کے ضرر سے محفوظ رہتا ہے اور لوگ اس کے ضرر سے مامون رہتے ہیں، شیخ نے اپنی ابتدائی تعلیم اور مطالعہ سے شغف کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی طبیعت کی اس افتاد اور مزاج کے رنگ کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۳۔

''ایام طفلی ہی سے میں لطف صحبت اور ہم نشینی سے نا آشنا ہوں'' (۱) پھر تعلیم سے فراغت کے بعد بھی ان کی یہی کیفیت رہی، چنانچہ لکھتے ہیں:

''دنیا کے نیک و بد سے الگ تھلگ گوشہ غربت میں پڑا رہوں، کسی کے خلاف دل میں کوئی کدورت نہیں ہے اور ان کی اور ان کی مصاحبت سے بھی بے نیاز اور دستکش ہوں بلکہ نحوی ترکیب میں زید و عمر کا جو ذکر مثالاً آیا کرتا ہے اس کے قصوں سے بھی پاک ہوں۔

صد شکر کہ باہیچ کم کارے نیست
وازمن بدل ہیچکس آزارے نیست
گر بر دل دشمنان من بارے نیست
بر خاطر دوستان من بارے نیست

خداوند عالم نے جس کی نعمتوں کا شمار نہیں ہوسکتا اس نے مجھ غریب کو اپنے لطف سے مالا مال کیا ہے اور مجھے یہ مخصوص حالت و کیفیت عطا کی ہے، میرا دل اور میرا وقت اس کے حضور میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کے میل سے کنارہ کش رہ کر اپنے خیال میں مست اور مگن رہتا ہے۔'' (۲)

مگر تعلیم مکمل کر لینے اور غالباً اپنے والد کے انتقال کے بعد اہل تعلق و حقوق کے اصرار پر انہیں دہلی کے گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر فتح پور سیکری جانا پڑا جو اس وقت اکبر کا دارالسلطنت اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

ملک الشعراء فیضی سے ان کے تعلقات پہلے سے تھے، اس کی کشش اور تحریک بھی فتح پور آنے کا باعث بنی ہوگی۔

دربار اکبری میں شیخ کا پرتپاک خیر مقدم ہوا، خود اکبر نے بھی بڑی قدر دانی کی،

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۲۔ (۲) ایضاً، ص۲۹۳۔

شیخ کو خود بھی اعتراف ہے کہ:

"جب اللہ کے فضل وکرم سے مجھے علم کا خاصہ حصہ مل گیا تو بعض اہل حقوق نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا اور میں بادشاہ وقت اور امرا کے پاس گیا، انہوں نے میری طرف بہت توجہ کی۔ میرا رتبہ بلند کیا۔"(۱)

ملا عبدالقادر شیخ کے دربار میں پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وچندگاہے در فتح پور بنا بر الفت قدیم با شیخ فیضی و میرزا نظام احمد مصاحب بود و فقیر نیز بتقریب ایشاں شرف خدمتش را دریافتہ پیوستہ از فوائد صحبتش محظوظ بودم۔(۲)	شیخ فیضی سے قدیم محبت وتعلق کی بنا پر کچھ عرصہ تک فتح پور میں قیام کیا اور فیضی اور میرزا نظام احمد کی مصاحبت کی، مجھ کو بھی اسی تقریب سے ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا اور میں ان کی صحبت سے فیض یاب اور لطف اندوز ہوا۔

دربار میں اس وقت دانشور امرا کا اچھا مجمع تھا، ان کی کشش اور علمی ماحول کی وجہ سے شیخ نے وہاں کا قصد فرمایا ہوگا، ان کے سفر کا مقصد سلطان کا تقرب، دنیوی جاہ ومنزلت کی طلب، جلب منفعت اور حصول مال وزر نہ تھا، یہ باتیں ان کے ذوق ومزاج کے سراسر خلاف تھیں اور انہوں نے ان کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فرماتے ہیں:

"لیکن علم واصحاب علم کا مرکز ہمیشہ دہلی مرحوم ہی رہی، علی الخصوص وہ علمائے حق جو بادشاہی تعلقات کی ابتلاؤں سے بچنا چاہتے تھے اور حرص وطمع دنیا کی آلودگی سے پاک دامن تھے، اس گوشۂ علم کے سکون کو دارالحکومت کے شوروغوغا پر ترجیح دیتے تھے، حضرت شاہ عبدالحق محدث اسی عہد میں تھے،

(۱) زاد المتقین بحوالہ رود کوثر، ص۳۴۹۔ (۲) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص۱۱۳۔

فرماتے ہیں ؂

حقی از گوشہ دہلی نہ نہم پا بیروں
خود گرفتیم کہ ملک گجراتم دادند

لیکن جب خاندان مبارک کو دربار حکومت میں عروج ہوا اور دربار شاہی کی مذہبی حالت دگرگوں نظر آئی تو ہندوستان سے قطع تعلق کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔''(۱)

زمانۂ حال کے بعض محقق اہل قلم کا بھی یہی خیال ہے، ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اپنے والد کی وفات ۹۹۰ھ کے بعد وہ اکبر بادشاہ کے دربار میں فتح پور میں پہنچے، اس زمانہ میں یہاں کے دانشوروں کا اچھا مجمع تھا، اس نے شیخ کا بڑھ کر استقبال کیا اور بادشاہ کی جانب سے بھی بڑی پذیرائی ہوئی۔''(۲)

مگر شیخ کو جلد ہی متنبہ ہو گیا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں، اس ماحول میں دین وایمان سلامت نہیں رہ سکتا کیوں کہ دربار کی دینی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی جارہی ہے اور وابستگان دولت ان کو استعمال کر کے اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانا اور اپنے غلط مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ان کو یہاں گھٹن محسوس ہونے لگی اور وہ یہاں سے بالکل ہی دل برداشتہ ہو گئے، چنانچہ مکہ پہنچ کر وہ اپنے پیرومرشد شیخ عبدالوہاب سے اس کی اس طرح فریاد کرتے ہیں:

''سیدی! صغر سنی ہی سے علم وعبادت گزاری کی محنت وریاضت میں میری نشوونما ہوئی ہے، میں نے عام لوگوں کے اختلاط اور میل جول سے اپنے کو الگ رکھا اور جب فضل خداوندی سے مجھے علم کا اچھا خاصہ حصہ مل گیا اور میں نے یہاں کی اپنی ضرورتیں پوری کر لیں تو بعض اہل حقوق نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا، چنانچہ میں بادشاہ وقت اور امرا کے یہاں گیا،

(۱) تذکرہ مرتبہ مالک رام مطبوعہ ساہتیہ اکاڈمی، ص ۳۴۔ (۲) مقدمہ رسالہ نوریہ سلطانیہ، ص ۲۔

انہوں نے میری جانب بہت اعتنا کیا، میرا رتبہ بلند کیا اور یہ چاہا کہ میرے ذریعہ سے اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ ناتواں سے اپنی قوت مستحکم کریں لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور ان کے ساتھ مجھے نہیں چھوڑا، اپنے بندہ کے دل میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچایا۔''(۱)

اس بیان سے درباری لوگوں کے ذہن ومزاج اور شیخ کی جانب ان کے غیر معمولی اعتنا واعزاز کے اسباب بھی معلوم ہو جاتے ہیں، ان چیزوں کی وجہ سے ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی اور ان پر ایسی وحشت وگھبراہٹ طاری ہوئی کہ وہ دنیاوی جاہ ومنزلت کو ٹھکرا کر اپنے گوشۂ عزلت میں پناہ گیر ہو جانے کے لیے مجبور ہو گئے۔

دربار میں شیخ کب پہنچے، کتنے روز وہاں مقیم رہے، کب واپس ہوئے اور وہاں ان کی سرگرمیاں اور مشغولیتیں کیا تھیں؟ ان چیزوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، لیکن ان کے علمی ذوق وشغف کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دربار میں بھی انہوں نے درس وافادہ اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا ہوگا، شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں:

''یہاں آپ نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار کیا لیکن علمی اور روحانی ترقیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ایک برگزیدہ اور نڈر بزرگ سے اسی زمانہ میں بیعت ہوئی۔''(۲)

حجاز جانے سے قبل شیخ کے درس وافادہ کا غلغلہ بلند کرنے کا ذکر بہت پہلے آ چکا ہے اس لیے ممکن ہے یہ سلسلہ یہاں بھی قائم رہا ہو مگر دربار میں پہنچ کر بیعت ہونے کی بات درست نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ شیخ اپنے والد کے ایما سے ان کی زندگی ہی میں ۹۸۵ھ میں بیعت ہو چکے تھے اور ان کے انتقال ۹۹۰ھ کے بعد دربار سے متوسل ہوئے، گو اس کا کوئی متعین ثبوت نہیں ہے تاہم مؤرخین کے اشارات اور بعض قرائن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) المکاتیب والرسائل، ص۲۷۹، بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۹۲۔ (۲) رود کوثر، ص۳۴۸۔

اب رہا یہ سوال کہ دربار میں کس زمانہ میں پہنچے اور کب تک رہے تو اس کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال ۹۹۰ھ کے بعد وہاں تشریف لے گئے تھے۔

یہ بات بھی ثابت ہے کہ شیخ دربار سے دل برداشتہ ہو کر ۹۹۵ھ ہی میں حج کے قصد سے روانہ ہو گئے تھے، اس لحاظ سے ۹۹۰ھ کے بعد اور ۹۹۵ھ کے درمیان انہوں نے کچھ عرصہ کے لیے فتح پور میں قیام کیا، کیوں کہ ملا عبدالقادر بدایونی کے الفاظ" وچندگاہے در فتح پور " سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ فتح پور میں زیادہ مدت تک نہیں رہے، اس بنا پر شیخ محمد اکرام کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کہ" سیکری میں شیخ عبدالحق کا قیام کوئی دس بارہ برس رہا ہوگا" (۱) کیوں کہ دس بارہ برس کی مدت کو" چندگاہے" نہیں کہہ سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ صاحب رود کوثر شیخ کی بیعت ۹۸۵ھ ہی سے ان کو فتح پور میں مقیم خیال کر بیٹھے ہیں جب کہ قوی بات یہ ہے کہ وہ ۹۹۰ھ کے بعد وہاں تشریف لے گئے، اس لیے اگر ۹۹۰ھ اور ۹۹۵ھ تک کے تمام درمیانی عرصہ کو بھی شیخ کے فتح پور کا زمانہ مان لیا جائے تب بھی دس بارہ برس فتح پور میں قیام کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔

سفر حجاز: شیخ عبدالحق دربار اکبری میں شریعت محمدی کی بے حرمتی اور پامالی نیز علمائے سو اور مفاد پسند امرا کی دنیا طلبی کے لیے ہنگامہ آرائی اور ریشہ دوانی سے گھبرا کر اپنے وطن دہلی واپس آ گئے مگر یہاں بھی ان کو سکون وقرار نہ ملا بلکہ ان کی وحشت و بیزاری میں برابر اضافہ ہوتا رہا، غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ اکبر کے عروج واقبال اور مستحکم اقتدار کی موجودگی میں دین کی خدمت واشاعت اور شریعت محمدی کی حفاظت وصیانت ممکن نہیں، ایسے ماحول اور ناسازگار حالات میں آدمی کے لیے دین وایمان پر قائم رہنا بھی مشکل ہے، اس لیے انہوں نے وطن چھوڑ کر دربار خداوندی میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا، اس موقع پر توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور ان کا جذبہ صادق دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھر کی طرف بلالیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے

(۱) رود کوثر ص ۳۴۹۔

وہ خود رقم طراز ہیں:

> ''اللہ کی طرف رجوع وانابت کرنے والا خائب وخاسر نہیں ہوتا، جس نے اس کی پناہ طلب کی اس کو نجات ملی، چنانچہ دفعتاً بے کسوں کے چارہ گر اور پریشان حال لوگوں کے راہ نما نے مجھے اپنی طرف لیا اور مجھ بے خانماں کی گردن میں زنجیر شوق ڈال کر اپنے گھر کی طرف کھینچ لیا اور مجھ نامراد کو منزل مراد تک پہنچا دیا، یعنی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی درگاہ میں جگہ دی اور حریم مرحمت وعنایت سے محروم واپس نہیں کیا۔''(۱)

اپنے شیخ ومرشد عبدالوہاب متقی سے بھی اس خاص فضل خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور ان (امرا) کے ساتھ مجھے نہیں چھوڑا، اپنے بندہ کے دل میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچا دیا۔''

شیخ عبدالحق نے زاد المتقین اور جذب القلوب وغیرہ میں بھی ہندوستان کے ماحول سے اپنی وحشت وبیزاری اور غیب سے حج وزیارت کے جذبہ خالص پیدا ہو جانے کا ذکر کیا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:

> '' جب زمانہ اور ابنائے زمانہ کی فتنہ سامانی اور مکروہات نیز واقف وآشنا لوگوں کی وضع وروش سے تنگ آ گئے اور فلاں وفلاں اشخاص کی صحبت سازگار نہ دکھائی دی تو کعبہ شریف جانے کی توفیق ان کے شامل حال ہوئی اور جذبہ کے عالم میں بغیر کسی ساز وسامان کے وہ دہلی سے گجرات کو روانہ ہوئے اور مرزا نظام الدین احمد مرحوم کی مساعی جمیلہ اور امداد سے جہاز میں بیٹھ کر حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے۔''(۲)

شیخ عبدالحق حج وزیارت کعبہ کے ارادہ سے دہلی سے روانہ ہوئے تو پہلے اجین و

(۱) اخبار الاخیار، ص۲۹۴۔ (۲) منتخب التواریخ، ج۳، ص۱۱۳۔

مالوہ میں وہاں کے امیر و حاکم خان اعظم میرزا عزیز کوکہ کے یہاں قیام کیا، یہ اکبر کا رضاعی بھائی اور بڑا لائق شخص تھا، علمی فضائل کے ساتھ ہی حسن سیرت اور حسن اخلاق سے بھی متصف تھا، اس نے شیخ کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا، اسی نے زاد و راحلہ مہیا کیا تو احمد آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ (۱)

مالوہ سے مانڈو پہنچے، یہاں محمد غوثی شطاری صاحب گلزار ابرار نے ان سے ملاقات کر کے استفادہ کیا (۲) ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالوہ ہوتے ہوئے ۹۹۵ھ میں گجرات پہنچے تھے، احمد آباد میں مرزا نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری نے ان کا استقبال کیا، یہ ان دنوں یہاں کے بخشی تھے، ان کے اصرار پر شیخ آئندہ موسم حج تک کے لیے یہاں رکے رہے۔ (۳)

گجرات کے قیام کے زمانہ میں وہ حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کے طریقہ قادریہ کے بعض اشغال واذکار بھی سیکھے، شیخ وجیہ الدین جید عالم اور جامع کمالات کے بزرگ تھے، علم ظاہر کی طرح علم باطن کی دولت سے بھی مالا مال تھے، ان کو مختلف بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی اور آخر میں سید محمد غوثی گوالیاری شطاری کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، احمد آباد میں ان کا حلقۂ درس مدتوں قائم رہا، وہ صاحب تصنیف کثیرہ بھی تھے، شیخ عبدالحق ان سے اپنے فیض یاب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''راقم سطور جس وقت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے قصد سے اس دیار (گجرات) میں پہنچا تو اس نے یہاں کے متاخرین مشائخ میں شیخ وجیہ الدین کی ملاقات کی سعادت حاصل کی اور سلسلۂ عالیہ قادریہ کے کچھ اذکار واشغال بھی ان سے سیکھے۔'' (۴)

---

(۱) گلزار ابرار، اردو ترجمہ، ص ۵۵۹، بحوالہ حیات شیخ عبدالحق، ص ۹۲۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) اخبار الاخیار، ص ۱۵۳۔

مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق نے گجرات میں بڑی مشغول زندگی بسر کی، اس کی کسی قدر تفصیل شیخ محمد اکرام نے بھی تحریر کی ہے، ملاحظہ ہو:

''پھر احمد آباد پہنچے اور اپنے قدیمی دوست مرزا نظام الدین صاحب طبقات اکبری کے پاس قیام کیا جو ان دنوں صوبہ گجرات کے بخشی تھے، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے، چنانچہ کوئی ایک سال تک رکنا پڑا، اس دوران میں علمی اور روحانی مشاغل برابر جاری رہے بلکہ شاید آپ کے مشہور تذکرۃ الاولیا، اخبار الاخیار کے زیادہ وسیع نقطہ نظر اور زیادہ صحیح معلومات کا ایک سبب یہ ہے کہ آپ نہ صرف دہلی کے اہل علم یا ان بزرگوں سے جو اپنی ضروریات کے سلسلے میں دارالخلافہ میں آتے تھے، واقف تھے بلکہ آپ نے (حجاز کے علاوہ) پنجاب، بندیل کھنڈ، مالوہ اور گجرات کا سفر کیا تھا، وہاں کی زیارتیں دیکھی تھیں، اہل علم سے ملاقاتیں کی تھیں اور اطراف ملک کے کی روحانی زندگی سے ذاتی واقفیت تھی، احمد آباد میں آپ کو وہاں کے سب سے برگزیدہ عالم شیخ وجیہ الدین علوی سے ملنے اور فیض پانے کا موقع ملا اور اخبار الاخیار میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے ان سے قادریہ سلسلہ کے کئی اذکار و اشغال بھی حاصل کیے، مولانا سلیمان کردی نے (جن کے صاحبزادے مولانا احمد کردی احمد آبادی گجرات کے مشہور فاضل شیخ نور الدین احمد آبادی کے استاد تھے) آپ سے احمد آباد میں حدیث پڑھی۔''(۱)

گجرات سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہاں کے علما سے اپنی تشنگی بجھائی اور ان سے احادیث کی سند کی، یہاں سب سے زیادہ حضرت شیخ عبدالوہاب متقی کی ذات گرامی

(۱) رود کوثر، ص ۳۵۱، ۳۵۲۔

ان کی عقیدت و شیفتگی کا مرکز رہی، ان سے علم و فن کی تکمیل بھی کی اور سلوک و احسان کی راہیں بھی طے کیں۔

شیخ عبدالحق نے پہلے ان سے مشکوۃ کا درس لیا اور آخر میں صحیح مسلم پڑھی، ان کی خدمت میں رہ کر خلوت و ذکر الٰہی سے لذت آشنا ہوئے اور تصوف کے سلسلہ قادریہ شاذلیہ مدنیہ و چشتیہ کی ان سے اجازت بھی پائی، ان کی رہنمائی میں تصوف کے اسرار و آداب بھی سیکھے اور اس کی متعدد کتابیں بھی پڑھیں، منهج السالك الى اشرف المسالك ... قواعد الطريقة في الجمع بين الشريعة والحقيقة کا خاص طور پر ان سے درس لیا، شیخ عبدالوہاب کی تعلیم و تربیت نے دراصل ان کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا جس کی تفصیل حسب موقع آگے آئے گی۔

حج و زیارت مدینہ: غرض حجاز کے قیام میں انہوں نے بڑے علمی و روحانی مراتب طے کیے، مگر شیخ نے یہ مقدس اور بابرکت سفر اپنی وحشت دل اور اضطراب و بیزاری دور کرنے کے لیے کیا تھا، اس لیے خیال ہے کہ انہوں نے زیادہ عرصہ حرمین میں گزارا ہوگا تاکہ ہر سال حج و زیارت کعبہ سے مشرف ہو کر بیش از بیش اس کی روحانی برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں، وہ عشق نبوی میں بھی سرشار تھے، اس لیے دربار نبوت میں حاضر ہو کر مدینہ کے انوار و برکات سے بھی متمتع ہونے کے لیے بھی نہایت بے تاب تھے، وہ تین برس سے زیادہ حرم میں مقیم رہے، ظاہر ہے یہ موقع انہوں نے غنیمت سمجھا ہوگا اور ہر سال حج و زیارت سے مشرف ہوئے ہوں گے مگر تذکرہ نگاروں نے ایک یا دو بار حج کرنے کا ذکر کیا ہے۔

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ اپنے گھربار اور اعزہ و اقارب کو ۹۹۵ھ ہی میں چھوڑ کر اس مقدس سفر کے لیے دہلی سے روانہ ہوئے تھے، مگر یہ پورا برس گجرات ہی میں گزارنا پڑا اور وہ ۹۹۶ھ میں مکہ معظمہ تشریف لے جا سکے۔

شیخ کی حجاز سے ہندوستان سے واپسی ۱۰۰۰ھ میں ہوئی مگر مورخین لکھتے ہیں کہ وہ

۹۹۹ھ کے ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے پیرو مرشد شیخ عبدالوہاب متقی کے حکم سے مکہ معظمہ چھوڑ چکے تھے، اس طرح گویا تین حج کا زمانہ ان کو مکہ میں ملا مگر بعض مؤرخین کے خیال کے مطابق انہوں نے ایک دفعہ اور بعض کے بیان کے مطابق دو دفعہ حج کیا۔

کہا جاتا ہے کہ ۹۹۶ھ میں مکہ معظمہ پہنچے تو اس سال فریضۂ حج ادا کیا، مکہ پہنچنے کے دس ماہ بعد ۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے اور رجب ۹۹۸ھ کے آخر تک وہیں رہے، اس کے بعد دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لائے اور اس سال دوسری دفعہ حج کیا، شعبان ۹۹۹ھ کے آخری ایام میں طائف تشریف لے گئے، پھر مکہ معظمہ آکر تھوڑی مدت تک قیام کرنے کے بعد اسی سال ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔(۱)

دوسرے مؤرخین کا خیال ہے کہ ان کا تمام وقت علوم کی تحصیل میں گزرا اور انہوں نے صرف ایک بار فریضۂ حج ادا کیا، خافی خاں لکھتے ہیں:

بعد ادائے حج واجب مدت مدید محض برائے تحقیق صحت احادیث دراں مکاں بسر بردہ۔(۲)	فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ مدت مدید تک صحت و تحقیق احادیث کی غرض سے اسی جگہ مقیم رہے۔

اس سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف ایک بار فریضۂ حج ادا کیا، اس کے علاوہ انہوں نے سارا وقت علمی مشاغل اور احادیث کی طلب و تحصیل میں گزارا۔

سب سے زیادہ حیرت ناک بیان ملا عبدالقادر بدایونی کا ہے، وہ حضرت شیخ کے معاصر اور اہل تعلق تھے، انہوں نے ان کی مدینہ طیبہ کی حاضری کی تردید کی ہے، لکھتے ہیں:

و بجہت تیغ بعضے موانع طبیعی بمدینہ طیبہ سکینہ علی ساکنہا السلام والتحیات نتوانست مشرف شد۔(۳)	بعض طبعی اسباب و مواقع کی وجہ سے مدینہ طیبہ کی زیارت سے مشرف نہیں ہو سکے۔

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۲ و فوائد جامعہ، ص ۱۴۱۔ (۲) منتخب اللباب حصہ اول، ص ۲۴۰۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہمارے خیال میں ملا صاحب کا یہ بیان محل نظر ہے۔ حضرت شیخ تو مدینہ طیبہ پہنچنے اور دربار نبوی میں حاضری کے لیے سراپا شوق واضطراب بنے ہوئے تھے، ایسی صورت میں تین برس تک وہاں قیام کرنے کے باوجود بھلا وہ کس طرح زیارت مدینہ سے محروم رہتے، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبدالحق دہلوی کو رسول اکرم ﷺ کی ذات پاک سے عشق تھا،
> دیار حبیب میں داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے تھے، تحفۃ الکرام میں لکھا ہے:
> درمدینہ برہنہ پا گردیدے۔ (۱)   مدینہ میں ننگے پاؤں پھرتے تھے۔''

خود شیخ نے مدینہ طیبہ کے انوار و برکات اور فتوحات وانعامات کا جس والہانہ و سرشارانہ انداز میں ذکر کیا ہے وہ بھی ملا صاحب کے بیان کو مشکوک اور نامعتبر بنا دیتا ہے، فرماتے ہیں:

> ''مجھ فقیر حقیر کو حضرت بشیر نذیر صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام وانعام سے جو بشارتیں ملیں ان کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا، مجھے امید ہے کہ اس کے آثار وانوار ظاہر ہوتے رہیں گے۔'' (۲)

ایک اور جگہ درگاہ رسید المرسلینؑ کے اپنے اوپر مخصوص انعام واکرام کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی صراحت بھی کی ہے کہ انہیں خواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ولقا کا شرف دوبار حاصل ہوا، آپ سے بلا واسطہ حدیث کا سماع کیا اور مقصود ومراد پا لینے کی بشارت پائی۔ (۳)

حجاز سے واپسی کے بعد کے بعض واقعات: شیخ عبدالحق حرمین چھوڑ کر ہندوستان

سابقہ حاشیہ: (۳) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۱۱۳۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۱۲۔ (۲) اخبار الاخیار، ص ۲۹۴۔ (۳) فہرس التوالیف بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۴۰۔

واپس آنے کے لیے آمادہ نہ تھے مگر مرشد و مربی کے حکم کے آگے ان کی کچھ نہ چل سکی، ان کی طرف سے جس قدر حجاز میں قیام کے لیے اصرار ہو رہا تھا مرشد کی جانب سے اسی قدر شدت سے ہندوستان واپسی پر زور دیا جا رہا تھا، بالآخر ۹۹۹ھ کے آخر میں انہوں نے حجاز چھوڑ دیا اور ۱۰۰۰ھ میں دہلی واپس آ گئے۔

شیخ جن حالات سے دل برداشتہ ہو کر ہندوستان سے گئے تھے وہ ان کی واپسی کے بعد بھی برقرار تھے لیکن اب ان کی علمی و روحانی تعلیم و تربیت ہر طرح سے مکمل ہو چکی تھی اور وہ حرمین کے انوار و برکات کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے، اس لیے وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تازہ دم ہو گئے تھے، چنانچہ انہوں نے دینی علوم کی خدمت و اشاعت کے لیے اپنی مسند درس و ارشاد بچھائی اور علم دین اور رشد و ہدایت کی شمع روشن کر کے الحاد، بے دینی اور بدعات کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا، ان کی سرگرمیوں کا ذکر آگے حسب موقع کیا جائے گا۔

شیخ کی حج سے واپسی کے بعد فیضی نے متعدد خطوط لکھ کر شوق ملاقات ظاہر کی اور لاہور تشریف لانے کی دعوت کی، مگر غالباً گزشتہ تلخیوں کی وجہ سے شیخ اس کے پاس جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے معذرت لکھ بھیجی (۱) ملا عبدالقادر بدایونی کو بھی شیخ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، چنانچہ کچھ وقت نکال کر وہ بدایوں سے دہلی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جب اس کے بعد لاہور گئے تو ان کے اور شیخ کے درمیان خط و کتابت بھی رہی۔ (۲)

اتفاق سے شیخ کی واپسی کے وقت حضرت خواجہ باقی باللہ بھی دہلی آئے ہوئے تھے، شیخ عمر میں ان سے بڑے تھے، اس کے باوجود انہوں نے ان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر نقشبندیہ طریقہ کی تحصیل کی، محمد صادق دہلوی ان دونوں بزرگوں کے معاصر تھے، وہ کلمات الصادقین میں لکھتے ہیں کہ شیخ محدث حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی اشارے پر حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے تھے اور

(۱) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۵۔ (۲) ایضاً ص ۱۱۴۔

خواجہ صاحب ان سے لطف وکمال تواضع کے ساتھ پیش آئے۔(۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مجموعہ مکاتیب میں خواجہ صاحب کے نام سات خطوط ہیں جن میں متعدد اہم معاملات میں ان سے رہنمائی طلب کی گئی ہے، ان مکاتیب سے شیخ محدث کی ان سے عقیدت وشیفتگی اور دونوں کی باہمی محبت وخصوصیت اور اخلاص کا پتہ چلتا ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''ہمارے شہر میں نسبت نقشبندیہ کے داعی اور طالبین کے مرشد عارف کامل مولانا خواجہ محمد باقی قدس سرہ ہیں، وہ اس طریقہ سے ہمارے بھی شیخ ہیں'' اور رسالہ وصیت میں لکھا ہے کہ:

> ''جب ہندوستان واپس آیا تو خواجہ محمد باقی نقشبندی کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، ان سے عرصہ تک خواجگان کی نسبت کی مشق وتربیت حاصل کی اور ذکر، مراقبہ، رابطہ، حضور اور یادداشت کی تعلیم پائی۔''(۲)

شیخ عبدالوہاب متقی کی وصیت وہدایت: شیخ عبدالحق محدث نے حجاز پہنچ کر شیخ عبدالوہاب متقی کو اپنی قلبی کشمکش اور ہندوستان سے بیزاری کے جو اسباب بتائے اس کی بنا پر شیخ متقی نے ہندوستان واپس ہوتے وقت انہیں خاص طور پر گوشہ گیری اور عدم اختلاط کی تلقین اور مکمل یکسوئی وانہماک کے ساتھ علم ودین کی خدمت اور رشد وہدایت کا کام انجام دیتے رہنے کا مشورہ دیا تاکہ اہل دنیا انہیں دربار وغیرہ سے وابستہ کر کے ان کے اصلی کاموں اور علمی ودینی مشاغل سے منحرف وغافل نہ کر سکیں، شیخ عبدالحق ان کی اس تلقین اور حجاز سے واپسی کے بعد مشاغل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے فرمایا سبحان اللہ! کیا بہتر ہوتا اگر وہ ایک پیر سے معذور ہو جاتا اور گمنامی اور گوشہ عزلت میں بیٹھا رہتا، کیوں کہ وہ وصول وقبول کے مرتبہ کو پہنچا ہوا ہے، پھر فرمایا لیکن یہ عزلت نشینی بڑا دشوار کام ہے اور

(۱) مرآۃ العالم، بختاور خان، ج ۲، ص ۴۴۴۔ (۲) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۳۶ و ۱۳۷۔

اس میں ثابت قدم رہنا آسان نہیں، اس معاملہ میں اصل بات یہ ہے کہ انسان لوگوں سے اشتراک عمل کرے، امور خیر میں ان کے ساتھ رہے اور ان کی بری باتوں سے بچے، بس اسی وجہ سے بندہ نے لوگوں سے میل جول نہیں رکھا، حج سے واپسی کے بعد حریص، لالچی اور جھگڑالو حاجیوں کی طرح بلاد دکن، بیجاپور، برہان پور کی طرف نہیں گیا اور نذرانے وصول نہیں کیے، جو درویشوں اور اس طریقہ کے رہبروں پر لازم ہے، پس الحمدللہ وہ آفتوں سے بچ کر اور خدا کی مقدور کی ہوئی برکتیں لے کر اپنے وطن مالوف دہلی کو واپس آ گیا، جو فقرا اور درویشوں کا ٹھکانا اور عشاق محبین کا مسکن ہے اور اللہ پر بھروسہ اور اس کے فضل وکرم کا طالب ہو کر فقر کے دروازے پر بیٹھ گیا، شیخ نے مجھے خلوت، عزلت اور الگ تھلگ رہنے کا حکم دیا تاہم انہوں نے اس معاملہ میں آزمائش کا خیال کر کے نرمی اور رخصت سے کام لیا، تاکہ دشواری اور زحمت کا باعث نہ بنے، چنانچہ یہ بندہ ناتواں اللہ کی توفیق کے مطابق اپنے تمام اوقات اعمال واشغال کو انجام دینے میں بسر کرتا ہے لیکن بعض اوقات اور بعض حالات میں کہیں کہیں جاتا بھی رہتا ہے اور بعض احباب واصحاب خیر کی خدمت میں حاضر ہونے کی اور ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرتا ہے، اس طرح اغیار کے اختلاط اور نقصان اٹھانے کی داغ سے محفوظ رہتا ہے۔"(۱)

لاہور کا سفر اور شاہ ابوالمعالی سے استفادہ: شیخ عبدالحق شیخ عبدالوہاب متقی کی تاکید ووصیت کے مطابق دہلی میں فروکش رہ کر یکسوئی کے ساتھ علمی خدمت میں مشغول رہے مگر ان کی سہولت اور رخصت سے بھی فائدہ اٹھایا، اس لیے اہل علم کی خدمت میں حاضری

(۱) فوائد جامعہ، ص۱۹ و ۲۰۔

اور مشائخ کے پاس جانے کا وقتاً فوقتاً موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں فیض حاصل کرنے کے لیے جانے کا اوپر ذکر آیا تھا، اب ان کے لاہور جا کر مشہور شیخ طریقت حضرت شاہ ابوالمعالی سے ملاقات کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

شاہ ابوالمعالی سلسلۂ قادریہ کے صاحب کمال بزرگ اور شیخ داؤد کے مرید وخلیفہ تھے، شیخ عبدالحق ان کے بڑے قدرداں اور عقیدت مند تھے، شاہ صاحب بھی ان کے اور ان کی تصنیفات کے بڑے مداح تھے، وہ فرماتے تھے کہ ''ہم نے تمہاری کتابوں سے دینی و دنیاوی فائدے حاصل کیے ہیں۔''

انہوں نے شیخ عبدالحق کو مشکوٰۃ کی شرح کی تکمیل کی خاص طور پر ہدایت کی تھی، وہ جب ان سے رخصت ہو کر دہلی واپس ہو رہے تھے انہوں نے فرمایا کہ ''مشکوٰۃ کی شرح مکمل کر دو، انشاء اللہ اس سے ایک عالم مستفید ہوگا'' شیخ نے کتاب کی تکمیل کے لیے دعا کی درخواست کی تو ارشاد ہوا کہ وہ پوری ہو جائے گی، انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ شرح میں جا بجا اشعار بھی درج کریں تاکہ انداز بیان دلچسپ ہو۔ (۱)

فتوح الغیب کی شرح بھی شاہ ابوالمعالی کے اصرار سے لکھی تھی۔ (۲)

شاہ ابوالمعالی صاحب تصنیفات بھی تھے، شعرا کے کلام پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، خود بھی مشقِ سخن فرماتے تھے، غربتی تخلص تھا، شیخ عبدالحق کو ان سے غیر معمولی عقیدت تھی اور انہوں نے تصوف وسلوک میں ان کے بلند مرتبہ، بکثرت ریاضت ومجاہدہ اور مقبولیت وغیرہ کا نہایت وسعت قلب سے اعتراف کیا ہے (۳) وہ ان کی غیر معمولی عظمت ہی کی وجہ سے ان سے اصلاح اور رہنمائی کے بھی طالب ہوئے تھے، شاہ صاحب کا ان پر اس قدر اثر تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے ان کی مرضی سے لاہور میں مقید ہو گئے تھے، حضرت شاہ ابوالمعالی نے بھی ان لوگوں کے اختلاط اور میل جول سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا اور وہ ہر طرف سے

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۵۴۔ (۲) شرح فتوح الغیب، ص ۴۲۱۔ (۳) اخبار الاخیار، ص ۱۹۵۔

یکسو ہو کر محنت وتوجہ سے اپنا کام انجام دیتے رہنے کی ہدایت فرمائی تھی، اس معاملہ میں انہوں نے شیخ عبدالوہاب متقی کی طرح کوئی رخصت اور نرمی نہیں برتی تھی، یہاں تک تاکید کی تھی کہ وہ دہلی سے باہر قدم نہ نکالیں۔

درس وتدریس اور مدرسہ: شیخ عبدالحق کے کارناموں، علمی ودینی مشاغل اور عملی سرگرمیوں کی باقاعدہ ابتدا حجاز کے سفر سے واپسی کے بعد ہوتی ہے، اس زمانہ میں انہوں نے گوناگوں دینی، علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیے، اس سلسلہ میں ان کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ وہ حجاز سے آنے کے بعد مدۃ العمر درس وتدریس کی مسند پر فروکش رہے، اس کے لیے انہوں نے جو دینی مدرسہ قائم کیا تھا اس میں ایک نیا اور عام حلقہ ہائے درس سے مختلف نصاب تعلیم داخل کیا تھا۔

گو حجاز کی روانگی سے پہلے ان کے علمی فیضان کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، مگر حجاز سے واپسی کے بعد دینی علوم کی نشر واشاعت اور کتب دینیہ خصوصاً احادیث کی تعلیم کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور تقریباً ۵۲ برس تک درس وتدریس کے مشغلہ میں پوری یکسوئی، انہماک اور سرگرمی سے لگے رہے، اس کے لیے اپنا خواب وخور حرام کر دیا، ساری دلچسپیاں اور لذتیں ترک کر دیں، سیر وسفر اور لوگوں سے ملنا جلنا سب چھوڑ دیا جس کی شیخ عبدالوہاب متقی اور شاہ ابوالمعالی نے ان کو خاص طور پر ہدایت بھی کی تھی۔

ان کے حلقۂ درس وتدریس اور تعلیمی اصلاح وانقلاب کی خصوصیت واہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے عہد کے علمی وتعلیمی حالات کا مرقع بھی پیش نظر رہے۔

ہندوستان میں دینی علوم بالخصوص قرآن وحدیث کی تعلیم وتعلم کی جانب کم توجہ رہی، چنانچہ سندھ اور ملتان وغیرہ سے عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب غزنوی اور غوری سلاطین برسر اقتدار آئے تو ان کے زمانے میں ایران، خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں سے جو اصحاب علم ودرس ہندوستان آئے ان کو دینی علوم وتفسیر وحدیث میں زیادہ

درخور نہ تھا، اس کی وجہ سے یہاں علم حدیث عنقا کی طرح معدوم ہو گیا اور نجوم، فلکیات، ریاضی اور منطق و فلسفہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی گئی، قرآن مجید اور سنت نبوی کو پڑھنے پڑھانے کے بجائے دینی علوم میں صرف فقہ و تصوف سے سروکار باقی رہ گیا تھا، فقہ میں سارا زور فقہ حنفی کے فروع و جزئیات پر صرف کیا جاتا تھا، علم حدیث کی کسمپرسی اور غربت کا یہ حال تھا کہ اس سے صرف اس بنا پر اور اس حد تک سروکار رہ گیا تھا کہ فقہی بحثوں میں کہیں کہیں حدیثوں کا ذکر آجاتا تھا، حدیث کی امہات کتب کے بجائے صرف صغانی کی مشارق الانوار درس و تدریس میں داخل تھی، اگر کسی نے اس سے سوا توجہ دی تو مصابیح السنۃ بغوی اور مشکوٰۃ المصابیح کو بھی دیکھ لیا، محدث بننے کے لیے بس اسی قدر کافی تھا، نواب صدیق حسن خاں اور مولانا حکیم سید عبدالحئی دونوں نے ہندوستان کے اسلامی مدارس اور علما کے درس کی اس دردناک حالت کا ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''علم حدیث کا سرے سے کوئی چرچا نہ تھا، لوگ نہ خود اس کی جانب مائل تھے اور نہ دوسروں کو اس کے حصول کی کوئی ترغیب دیتے تھے، وہ اس فن کی کتابوں سے ناواقف اور محدثین کے ناموں سے ناآشنا تھے، بہت تھوڑے لوگ صرف مشکوٰۃ پڑھ لیتے تھے اور وہ بھی محض حصول برکت کے لیے، اس پر عمل کرنا اور اس کو سمجھنا ان کا مقصد نہ ہوتا، فقہ میں صرف فقہ حنفی اور علمائے ماوراء النہر کے فتووں اور اجتہادات پر قانع ہو گئے تھے اور محض فروع و جزئیات میں الجھے رہتے تھے، ان کا راس المال فقہ تھی وہ بھی تقلیدی رنگ و انداز میں، تحقیق سے معدودے چند لوگوں کو ہی دلچسپی تھی۔'' (۱)

مولانا سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''محمد تغلق المتوفی ۷۵۲ھ جس کے براہ راست تعلقات مصر کی

---

(۱) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ، ص ۷۰ والثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۳۵ تا ۱۳۸۔

عباسی خلافت سے تھے اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان، خلعت اور علم بھی ملا تھا اور خلیفہ عباسی سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے۔

الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری (متوفی ۶۵۰ ھ) کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) البغوی (المتوفی ۵۱۶ ھ) کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں یہاں کے علما کے درس میں تھیں۔''(۱)

علما اور اصحاب درس کی حالت یہ تھی کہ وہ نہ نصوص کی پروا کرتے تھے اور نہ بحث و استدلال میں احادیث کو حجت و بنیاد بناتے تھے، اجتہاد و تحقیق کا دروازہ ہی سرے سے بند تھا، فقہی اقوال کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر تولنے کے بجائے خود قرآن و حدیث کی کسوٹی فقہ کو بنالیا گیا تھا، نصوص کی بے دھڑک توجیہ و تاویل کی جاتی تھی یا سرے سے ان کو ترک ہی کر دیا جاتا تھا، معقولات کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان اور فلسفہ و کلام سے کثرت اشتغال کی وجہ سے دین کی حقیقت و صورت مسخ اور شریعت محمدی کی روح غائب ہوتی جارہی تھی اور بدعتوں اور گمراہیوں کا زور بڑھتا جارہا تھا۔

حدیث نبوی سے بے اعتنائی و بے رغبتی اور منطق و فلسفہ سے غیر معمولی شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ایران سے آنے والے علما تے علوم عقلیہ کو خاص طور پر بڑا رواج اور

(۱) مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۷۴ و ۷۵۔

فروغ دیا، شیخ فتح اللہ شیرازی نے متاخرین علمائے ایران محقق دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور مرزا جان وغیرہ کی تصانیف کو ہندوستانی مدارس کے نصاب میں داخل کر کے ان کی نشر و ترویج کی، چنانچہ طلبہ و متعلمین انہی کا درس لیتے اور انہی میں الجھے رہنے کی بنا پر قرآن و حدیث کے علوم سے نا آشنا اور بے خبر رہتے، ان کی ساری زندگی حکما و فلاسفہ کے نظریات کے مطالعہ و تحقیق میں بسر ہوتی، صوبہ گجرات کے مشہور زمانہ عالم و فاضل ابوالفضل گازرونی اکثر و بیشتر طوسی کی کتاب التجرید شیخ ابوعلی سینا کی شفا و اشارات اور بطلیموس کی مجسطی کا درس دیا کرتے تھے، طلبہ ان کے پاس سفر کر کے آتے تھے، پنجاب میں علامہ کمال الدین کشمیری اور ان کے شاگرد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے درس کا غلغلہ مچا ہوا تھا، یہ دونوں بزرگ مختلف علوم کا درس دیتے تھے مگر نہ مدارس کی اصلاح کر سکے اور نہ ان کے نصاب میں حدیث کو داخل کر سکے۔(۱)

اس زمانہ کے امرا و سلاطین کو رموز مملکت کی گتھیاں سلجھانے اور شورشوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی وہ تعلیم و تعلم کا نظم و اہتمام کیا کرتے، دہلی سے دور بعض علما کے علوم دینی کے مرکز قائم تھے لیکن جیسا کہ اوپر گزرا، ان میں سے اکثر و بیشتر میں کتاب و سنت کے بجائے معقولات اور متاخرین علمائے ایران کی تصنیفات زیر درس تھیں۔

یہی حالات تھے جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی مسند درس پر رونق افروز ہوئے اور انہوں نے ایک دینی مدرسہ کی دہلی میں داغ بیل ڈالی، وہ علم دین سے پوری طرح بہرہ ور تھے اور انہوں نے ہند و حجاز کے علمائے کاملین سے مکمل استفادہ کیا تھا، ان کے نزدیک بگڑے ہوئے مذاق و ماحول کی اصلاح اور فتنوں اور گمراہیوں کا انسداد علم دین کے فروغ و اشاعت ہی سے ہو سکتا تھا، اس لیے انہوں نے تیرہ و تار ماحول میں علم دین کی قندیل روشن کی اور علما کو فضول مذہبی مناقشوں، تکفیر و تفسیق کے ہنگاموں اور معقولات کی پر پیچ بحثوں کو چھوڑ کر

(۱) المحدثان، ص ۱ تا ۵، ڈاکٹر محمد احمد صدیقی۔

کتاب وسنت کی تعلیم کی جانب راغب ہونے کی دعوت دی اور فقہ وفروع میں الجھنے کے بجائے مہمات دین کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین کی۔

ان کے فیض سے دینی علوم خصوصاً علم حدیث کو بڑا فروغ نصیب ہوا جس کی مزید تفصیل آگے آئے گی، حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند میں ان کی بدولت کتاب وسنت کے علم کا عام چرچا ہوگیا، ہندوستان میں درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ بڑی حد تک انہی کی ذات سے شروع ہوا اور دہلی سلطنت وحکومت کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ علم دین کا بھی دار السلطنت ہوگیا۔

شیخ محدث کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں تمام شمالی ہند کا پہلا مدرسہ تھا جس میں دینی علوم خصوصاً حدیث کی اہم کتابوں کا درس ہوتا تھا، انہوں نے دینی تعلیم کا ایسا مستحکم نظام قائم کیا تھا جس سے ہندوستان میں ایک علمی انقلاب رونما ہوگیا اور جس سے مسلمانوں کے معاشرہ کو ایک نئی توانائی اور زندگی مل گئی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

> ''مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی اور ان کی تدریس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں قائم کردیا۔''(۱)

شیخ عبدالحق کے مدرسہ اور نصاب درس میں دینی علوم خصوصاً علم حدیث کو مرکزیت واولیت حاصل تھی، انہوں نے مسند درس اسی لیے بچھائی تھی کہ علم دین کا صحیح اور خالص ذوق پیدا کرکے دوسرے علوم سے مستغنی کردیں، کتاب وسنت کی تعلیم کو فروغ دے کر معقولات ومنظومات کی طرف سے رخ پھیردیں، عقلی علوم کی کتابوں کو درسیات سے خارج کرکے احادیث کی کتابوں کو نصاب درس میں شامل کردیں، ان کی درس گاہ کا نصاب اس زمانہ کی دوسری درس گاہوں سے مختلف تھا، اس نصاب درس میں قرآن وحدیث کو تمام علوم کا

(۱) تذکرہ، ص۳۰۱۔

مرکزی نقطۂ نظر قرار دیا گیا تھا اور اس کا اصل مقصد حدیث نبوی کی اس سرزمین اور اس ملک میں ترویج واشاعت تھا، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

> ''حج سے واپسی کے بعد ۵۲ برس تک استقلال و دلجمعی کے ساتھ درس وتدریس کے مشغلہ میں منہمک رہے، اپنے فرزندوں اور دوسرے طلبہ کو پڑھاتے رہے، علوم وفنون بالخصوص حدیث کی ترویج واشاعت کا کام انجام دیتے رہے، انہوں نے تعلیم وتدریس کا نیا انداز اور ایسا نہج اختیار کیا جس کو ممالک عجم کے متقدمین ومتاخرین علما نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، ان کا طریقہ درس امتیازی خصوصیات کا حامل تھا اور مدرسہ عام مدرسوں سے ممتاز ومستثنیٰ تھا۔''(۱)

شیخ عبدالحق کے مدرسہ سے سینکڑوں طلبہ اور کئی اساتذہ وابستہ تھے، طلبہ ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

تلامذہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے درس وتعلیم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس کی شہرت کی گونج ہندوستان سے باہر عرب ملکوں میں بھی سنائی دیتی تھی، ان سے استفادہ کے لیے ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے طلبہ ان کی خدمت میں آتے تھے، کشمیر سے بنگال اور دہلی سے جونپور تک ان کے تلامذہ پھیلے ہوئے تھے (۲) جن کی بدولت آج تک شیخ محدث کا سلسلہ چل رہا ہے، انہوں نے طویل عمر پائی تھی اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک وہ مسند درس پر فروکش رہے، اس طرح ہزاروں اہل علم اور طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا ہوگا اب اتنی مدت گزرنے کے بعد ان سب کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے، تاہم جن تلامذہ کا نام معلوم ہوسکا ہے ان کا ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ شیخ نور الحق دہلوی: (م ۱۰۷۳ھ) یہ حضرت شیخ کے فرزند اور علمی جانشین تھے،

(۱) مآثر الکرام، جلد اول، ص ۲۰۱۔ (۲) مقدمہ نوریہ سلطانیہ، ص ۵و ۶، از ڈاکٹر سلیم اختر۔

اس کتاب میں ان کا مستقل تذکرہ آگے ہوگا۔

۲۔ شیخ ہاشم۔

۳۔ رضی الدین ابوالمناقب شیخ علی محمد۔

۴۔ شیخ ابوالبرکات ولی الدین عبدالنبی: اول الذکر دونوں بزرگ شیخ عبدالحق کے فرزند تھے اور تینوں حضرات ان کے اجازت یافتہ تھے، رسالہ مثبت الشیخ عبدالحق دہلوی میں اس اجازت نامہ کی نقل ہے جس میں ان سب حضرات کے نام بہت بلند مدحیہ الفاظ کے ساتھ درج ہیں اور حدیث کی جو کتابیں ان لوگوں نے شیخ دہلوی کے پاس پڑھی ہیں ان کے نام بھی درج ہیں۔(۱)

۵۔ شیخ ابوالسعادت کمال الدین ابوالرضا بابارتن بن اسماعیل دہلوی: (م ۱۰۶۳ھ) یہ شیخ دہلوی کے نواسے تھے۔(۲)

۶۔ مولانا عبدالحکیم: (التوفی ۱۰۶۷ھ) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، انہوں نے بھی شیخ محدث سے استفادہ کیا تھا اور شیخ نے ان کو اپنی کتابوں کی روایت کی اجازت دی تھی اور ان سے ان کے فرزند عبداللہ لبیب نے ان کتابوں کی روایت کی ہے، عبداللہ لبیب سے عبداللہ بن سعد اللہ لاہوری (م ۱۰۸۳ھ) نے اور ان سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شیخ الحدیث ابوطاہر کردی نے روایت کی ہے، حضرت شاہ صاحب شیخ ابوطاہر کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ازاں جملہ شیخ عبداللہ لاہوری و کتب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ازوے روایت کند عن الشیخ عبداللہ اللبیب عن مولانا عبدالحکیم و کتب شیخ	ان کے استاذوں میں شیخ عبداللہ لاہوری بھی تھے، شیخ ابوطاہر ان سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی کتابوں کی روایت کرتے تھے، وہ شیخ

(۱) ماہنامہ برہان، مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۱۵۷، مضمون مولانا حبیب الرحمن اعظمی بعنوان حیات عبدالحق۔ (۲) ایضاً و فوائد جامعہ، ص ۳۹۔

عبدالحق بہ ہمیں واسطہ از مولانا عبدالحکیم روایت کند دوے از شیخ عبدالحق اجازت روایت۔(۱)	عبداللہ لبیب سے اور عبداللہ لبیب مولانا عبدالحکیم سے روایت کرتے تھے، شیخ عبدالحق کی کتابوں کی روایت بھی شیخ ابو طاہر اسی واسطہ اور سند سے کرتے تھے، یعنی عبداللہ لبیب مولانا عبدالحکیم سے اور مولانا عبدالحکیم شیخ عبدالحق سے اجازۃً روایت کرتے تھے۔

۷۔مولانا محمد حیدر دہلوی: مذکورہ بالا اجازت نامہ کے ساتھ ایک مستقل اجازت نامہ مولانا محمد حیدر بن مولانا محمد صادق بن مولانا حاجی علی کے نام سے بھی ہے جس کے آخر میں ۲۲ ذی قعدہ ۱۰۴۷ھ کی تاریخ درج ہے، اس رسالہ کے آخر میں ایک اور اجازت نامہ ہے جس میں مولانا حیدر نے شیخ مولانا احمد بن شاہ محمد بن ابراہیم کو حدیث کی سند اور روایت کی اجازت دی ہے اور اس پر مولانا حیدر نے اپنا دستخط اس طرح کیا ہے:

محمد حیدر بن محمد صادق بن میر محمد الدہلوی مولد الہمدانی اصلاً والجعفری نسباً۔(۲)

۸۔شیخ محمد حسین خافی نقشبندی: اس رسالہ کے سرورق پر ایک تحریر شیخ احمد ابوالخیر مکی کی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مؤلف (شیخ عبدالحق دہلوی) سے شیخ محمد حسین نقشبندی اور ان سے شیخ حسن عجیمی المدنی روایت کرتے ہیں اور میں متعدد طرق سے بواسطہ شیخ عبدالحق روایت کرتا ہوں جن میں سب سے عمدہ اور صحیح طریق وہ ہے جو میرے شیوخ کی ان استاذوں سے ہے جو شیخ حسین عجیمی سے متصل ہوتی ہیں (۳) شیخ محمد حسین صاحب تصانیف تھے، ان کی کتاب ''الطریقة المحمدیة فی بیان الطریقة النقشبندیة'' مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ عرب میں ان کے اور بعض دوسرے شاگردوں کے واسطہ سے

(۱) انسان العین، ص ۱۳، بحوالہ برہان، مارچ ۵۴ء، ص ۱۶۰ و ۱۶۱، مضمون مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔(۲) رسالہ برہان، مارچ ۵۴ء، ص ۱۵۸۔(۳) ایضاً۔

شیخ عبدالحق کا سلسلہ پھیلا۔(۱)

۹۔خواجہ خاوند معین الدین بن خواجہ خاوند محمود المعروف بحضرت ایشاں:
شیخ دہلوی کے نامور شاگرد اور سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ تھے، انہوں نے علوم حدیث، تفسیر، فقہ اور اصول میں شیخ سے کسب کمال کیا اور اپنے والد بزرگوار سے خرقۂ خلافت پایا، کتاب رضوانی ان کی تصنیف ہے۔(۲)

۱۰۔خواجہ حیدر بن خواجہ فیروز کشمیری (م ۱۰۵۶ھ): شیخ دہلوی کے نامور شاگرد، عالم، عارف وعامل کامل اور علمائے کشمیر کے استاد تھے، پہلے اپنے وطن کے علما ملا جوہر ناتھ اور بابا قطب الدین سے فنون کی تحصیل کی، آخر میں دلی آکر شیخ عبدالحق محدث کے حلقہ درس میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور حدیث، فقہ اور تفسیر کی تکمیل کی، ان سے ان علوم کی اجازت بھی پائی، یہاں سے واپس جا کر درس وتدریس اور ہدایت وارشاد میں مصروف ہوئے، والی کشمیر نے ہر چند چاہا کہ وہ قضا کا عہدہ قبول کرلیں مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

خواجہ حیدر کو قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا اور حفظ کے بعد مدۃ العمر ہر سال پورا قرآن شریف تراویح میں پڑھتے رہے، جس زمانہ میں یہ شیخ عبدالحق کے یہاں تحصیل علم میں مصروف تھے، شیخ کی فرمائش پر ایک سال شب برات کو پورا قرآن سنایا، کسی ایک جگہ بھی لقمہ دینے کی ضرورت پیش نہ آئی، صبح کو شیخ نے فرمایا ''تم نے بہت اچھا پڑھا اور خوب یاد رکھا لیکن اگر تھوڑا علم مخارج اور قواعد قرأت بھی حاصل کرلو تو بہتر ہو، چنانچہ اس کے بعد انہوں نے شیخ سے علم مخارج اور اصول قرأت کی تحصیل کی۔

بابا داؤد مشکوتی مصنف اسرار الابرار ان کے شاگرد ہیں۔(۳)

۱۱۔شاہ طیب ظفر آبادی: یہ سادات سیوانہ کی نسل سے تھے، علوم کی تکمیل

(۱)فوائد جامعہ، ص۳۹۔(۲)خزینۃ الاصفیا، ص۶۴۳ بحوالہ مقالات سلیمان، ج۲، ص۲۵۔(۳)اسرار الابرار بحوالہ برہان، مارچ ۵۴ء، ص۱۵۸و۱۵۹ و تذکرہ علمائے ہند، ص۵۴ بحوالہ مقالات سلیمان، ج۲، ص۲۵۔

مولانا شاہ عبدالحق دہلوی سے کی، فراغت کے بعد مدت تک درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا، اس کے بعد خداطلبی کی دھن پیدا ہوئی اور حضرت شیخ تاج الدین جھونسوی سے بیعت کی اور خلافت پائی تھوڑے عرصہ تک جھونسی اور بنارس کے اطراف میں قیام رہا، پھر ظفر آباد آکر محلہ مخدوم پور میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں انتقال فرمایا، مزار ظفر آباد ضلع جونپور میں ہے(۱) مصنف بحر زخار کے جد اعلیٰ شیخ محمد محمود قلندران کے ارشد خلفا میں تھے، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ طبیب کا انتقال گیارہویں صدی کے اوائل میں ہوا۔(۲)

۱۲۔ مخدوم دیوان محمد رشید بن مصطفیٰ جونپوری: یہ ممتاز عالم اور صاحب سلسلہ شیخ وصوفی تھے، مناظرہ رشید یہ ان کی مشہور تصنیف ہے، حدیث میں شیخ نورالحق دہلوی کے شاگرد تھے اور سند حدیث بھی انہی سے حاصل کی تھی، جب یہ حدیث کی تعلیم کے لیے دہلی پہنچے تو شیخ عبدالحق اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے مسند درس پر اپنے صاحبزادے شیخ نورالحق کو بٹھا چکے تھے مگر دیوان محمد رشید کی خاطر سے یہ منظور فرمایا کہ میری موجودگی میں تم نورالحق سے حدیث کا درس لو، چنانچہ شیخ عبدالحق کی موجودگی میں وہ شیخ نورالحق سے حدیث کا درس لیتے رہے، یہاں تک کہ فراغت حاصل کی۔(۳)

دیوان محمد رشید کے صاحبزادے دیوان محمد ارشد اپنے والد کی سند حدیث کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

واجازت حدیث از صحیح بخاری ومصابیح ومشکوۃ	کتب حدیث صحیح بخاری، مصابیح اور مشکوۃ
از حضرت شیخ نورالحق ولد قدوۃ المحدثین	کی اجازت حضرت شیخ نورالحق سے حاصل کی
اسوۃ العارفین حضرت شیخ عبدالحق الدہلوی	جو قدوۃ المحدثین حضرت شیخ عبدالحق دہلوی
البخاری یافتہ(۴)	کے فرزند تھے۔

(۱) تجلی نور، حصہ دوم، ص ۲۷۔ (۲) برہان ۵۴، ص ۱۶۱ و ۱۶۲۔ (۳) سمات الاخیار مؤلفہ حکیم مولوی عبدالمجید کاتب مصطفیٰ آبادی بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی از سید احمد عروج قادری، ص ۱۶۲۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مگر تذکرہ علمائے حنفیہ میں مذکور ہے:

"دیوان صاحب نے سند حدیث شریف کی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، وقت پڑھنے حدیث شریف کے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں نور الحق! دیوان صاحب حدیث شریف پڑھتے ہیں، ہم سنتے ہیں تم بھی سنتے جانا، دیوان صاحب نے کتب صحاح ستہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا، اس کے بعد شیخ نے آپ کو سند حدیث شریف کی دی، اس کے بعد دیوان صاحب دہلی سے جونپور تشریف لائے۔"(۱)

دیوان صاحب ملا محمود جونپوری کے ہم عصر و ہم سبق اور استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری اور ملا شمس نور برونوی کے شاگرد رشید تھے اور حضرت مخدوم طیب بناری کے چشتی سلسلہ میں خلیفہ تھے، دوسرے بزرگوں سے بھی اجازت وخلافت حاصل کی تھی، ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی، سال ولادت ۱۰۰۰ھ ہے۔ (۲)

۱۳۔ مولانا شیخ ابواحمد سلمان کردی: یہ اصلاً کرد کے باشندے تھے لیکن آخر میں احمد آباد (گجرات) میں متوطن ہو گئے تھے، اسی لیے احمد آبادی اور گجراتی کی نسبتوں سے بھی مشہور ہوئے، یہ اپنے وطن کرد سے نکلے، سیر وسیاحت کرتے ہوئے خراسان اور پھر لاہور میں کچھ دنوں قیام کرتے ہوئے دلی آئے اور یہاں آ کر حضرت شیخ کے حلقہ درس میں داخل ہوئے، مولوی رحمان علی کا بیان ہے کہ شیخ عبدالحق دہلوی کی خدمت میں فیوض حاصل کیے اور متبحر فاضل ہوئے، متعدد بلند تصنیفات ان کی یادگار ہیں (۳) انہوں نے شیخ محدث سے صرف حدیث کی سند ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کے خلیفہ اور روحانی جانشین بن کر دہلی سے نکلے اور احمد آباد گجرات جا کر بس گئے، حضرت شیخ کا علمی و

سابقہ حاشیہ: (۴) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۶۲۔

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۶۲۔ (۲) ماہنامہ برہان، مارچ ۵۴، ص ۱۶۲۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۔

روحانی سلسلہ انہی کے واسطے سے گجرات میں پہنچا، سیدنا عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک مثنوی منبع الخیرات لکھی، اس کا نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے، مولانا سلیمان کے صاحبزادے مولانا احمد بھی اپنے وقت کے یگانہ روزگار عالم تھے اور حدیث کی اجازت اپنے والد سے پائی تھی (۱) علوم میں اچھی دسترس رکھتے تھے، تصنیفات بھی ان سے یادگار ہیں، ازاں جملہ علم کلام میں ایک تصنیف فیوض القدس ہے، ۱۱۱۲ھ میں وفات پائی، ان کا اور ان کے والد مولانا سلیمان کا مزار احمد آباد میں ہے۔ (۲)

مولانا احمد کے ایک شاگرد مولانا شیخ نورالدین احمد آبادی تھے جو بلند پایہ محدث تھے، انہوں نے نورالقاری کے نام سے صحیح بخاری کی ایک شرح لکھی تھی جس کا قلمی نسخہ بھڑوچ کے محکمہ قضاۃ کے کتب خانہ میں موجود ہے، ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی، ان کے علوم و معارف کے وارث ان کے فرزند شیخ محمد صالح عرف پیر بابا تھے مگر ان کی وفات ۱۱۴۷ھ میں اپنے والد کی حیات ہی میں ہوگئی تھی۔ (۳)

۱۴۔ مولانا شاہ عبدالجلیل الہ آبادی: یہ ایک عارف کامل اور حضرت شیخ محمد صادق گنگوہی کے مرید و خلیفہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ (۴)

۱۵۔ شیخ عبدالقادر مفتی: رسالہ مثبت الشیخ عبدالحق الدہلوی کے سرورق پر ان کو بھی شیخ محدث دہلوی کا شاگرد بتایا ہے مگر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے نزدیک شیخ عبدالقادر مفتی مکہ (المتوفی ۱۱۳۸ھ) کا سماع یا لقا شیخ دہلوی سے مستبعد ہے، اس کے انہوں نے بعض قوی اسباب بھی بیان کیے ہیں، اس بنا پر مولانا اعظمی ان کو شیخ عبدالحق کا بلاواسطہ شاگرد نہیں تسلیم کرتے اور یہ فرماتے ہیں کہ غالباً ان کے اور شیخ محدث دہلوی کے درمیان ایک واسطہ چھوٹ گیا ہے۔ (۵)

---

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۶۴۔ (۲) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲ و ۱۳۔ (۳) ایضاً، ص ۲۱۵۔ (۴) انوار العاشقین، ص ۱۰۱، بحوالہ برہان مارچ، ص ۵۴ء، ص ۱۶۳۔ (۵) ماہنامہ برہان مارچ ۵۴ء، ص ۱۵۸۔

۱۶۔ شیخ عنایت اللہ بن الہداد صدیقی بلگرامی ۔(۱)

۱۷۔ شیخ شاکر محمد بن وجیہ الدین حنفی دہلوی (۲) (م ۱۰۶۳ھ)

شیخ محدث اور دینی علوم: شیخ عبدالحق محدث کی توجہ کا اصل مرکز دینی علوم تھے، خصوصاً احادیث سے ان کو زیادہ شغف رہا اور اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے انہوں نے علم حدیث ہی کی جانب زیادہ توجہ مبذول فرمائی اور دوسرے علوم کی جانب زیادہ اعتنا نہ کر سکے، تاہم ان کو تمام دینی علوم میں مکمل دستگاہ حاصل تھی اور سب میں انہوں نے مفید کتابیں بھی لکھی ہیں، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

تفسیر و علوم قرآن: قرآن مجید کے علوم و معارف اور تفاسیر پر وسیع نظر رکھتے تھے، گو اس کی جانب زیادہ اعتنا نہیں کر سکے مگر اس فن پر ان کو عبور حاصل تھا اور انہوں نے اس کی باقاعدہ تحصیل کی تھی، مفتی غلام سرور لاہوری کا بیان ہے کہ:

> ''علم حدیث کی مکمل طور پر تحصیل کی تھی اور وہ اس میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔'' (۳)

وہ قرآن مجید کی اہمیت و مرکزیت کے پوری طرح قائل تھے، فلسفیانہ اور کلامی تفسیروں کی خرابیوں پر بھی ان کی نظر تھی، خصوصاً متاخرین کی تفسیروں میں جن پہلوؤں سے نقائص راہ پا گئے ہیں وہ ان کی نظر میں تھے، اس سے تفسیر قرآن کے بارے میں ان کے درست اور صائب نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کو منطق و فلسفہ کے دلائل سے مخلوط اور گڈمڈ کر دینے پر ناگواری ظاہر کی ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے کتاب و سنت کے اصلی دلائل ان کے نیچے دب گئے ہیں، اپنی کتاب نکات الحق میں ایک جگہ فلسفہ کی مذمت اور متکلمین کی کج روی کا تذکرہ کیا ہے، اسی سلسلہ میں تفسیر بیضاوی کے متعلق یہ اظہار خیال بھی کیا ہے:

---

(۱) فوائد جامعہ، ص ۳۹۔ (۲) ایضاً۔ (۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۴۔

"قرآن مجید کی تفسیر اور اس باب کی حدیثوں کی شرح میں امام
بیضاوی سے بہت سی قباحتیں ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے،
اگر ان ساری جگہوں کو شمار کیا جائے تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔"(۱)

اس مختصر بیان سے اس فن پر ان کی عمیق نظر اور اس کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور جب بیضاوی کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ تفسیر کبیر وغیرہ کے بارے میں ان کی رائے کیا کچھ رہی ہوگی۔

شیخ عبدالحق نے اپنی تفسیری ذوق کی بنا پر بیضاوی کے ربع اول کا حاشیہ اور بعض سورتوں کی تفسیریں بھی لکھی تھیں جن کا ذکر تصنیفات میں آگے آئے گا۔

فقہ: شیخ عبدالحق دہلوی فقہ واصول میں بھی بڑی بصیرت ومہارت رکھتے تھے اور وہ فقیہ کی حیثیت سے بھی ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو فقیہ لکھا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب حدیث سے زیادہ ان کی فقہی معرفت وبصیرت کے قائل تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں "حدیث میں مہارت سے زیادہ ان کو فقہ میں دستگاہ حاصل تھی"(۲) دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں "حنفی فقہ کی کتابوں پر ان کو جس قدر عبور حاصل تھا وہ حیطۂ بیان سے باہر ہے"(۳) اوپر ذکر آچکا ہے کہ شیخ کے زمانہ میں فقہی فروع وجزئیات اور عقلی علوم کا عام چرچا تھا، اس کی وجہ سے لوگ کتاب وسنت کے علوم سے ناآشنا اور ان کے دلائل سے ناواقف تھے اور تقلید عام تھی، بعض ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر پورے ملک میں حنفی فقہ کا رواج تھا، سلاطین بھی اسی مذہب سے وابستہ تھے اور علما ومشائخ بھی جمود وتعطل کا شکار رہتے تھے، ایسے دور میں شیخ عبدالحق نے کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ کی دعوت دی اور درس نصاب میں حدیث کی کتابیں داخل کیں تاکہ فقہی جمود کا خاتمہ ہو جائے، وہ خود حنفی تھے مگر مقلد نہ تھے بلکہ محقق حنفی تھے، ان

(۱) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی از سید احمد قادری، ص ۱۴۰۔ (۲) تقصار جیود الاحرار، ص ۱۱۴۔
(۳) اتحاف النبلا، ص ۳۰۴۔

کی نظر احادیث پر بڑی گہری تھی، اس لیے انہوں نے اس عام رجحان کو مدلل طور پر تردید کی کہ ''فقہ حنفی مجرد رائے وقیاس پر مبنی ہے'' اور ثابت کیا کہ یہ مذہب کتاب وسنت کے مطابق اور روح دین کے موافق ہے، ایک محقق کی طرح انہوں نے اس مذہب کا دوسرے مذاہب فقہ سے مقابلہ وموازنہ کیا اور اس کی تائید میں دلائل وشواہد پیش کر کے دکھایا کہ حنفی مذہب کا دارومدار عقلی ونقلی دونوں طرح کے دلائل پر ہے، مگر اس تائید وترجیح میں انہوں نے غالی و متعصب مقلدین کی طرح دوسرے مذاہب کا کوئی استخفاف نہیں کیا بلکہ انہیں بھی قرآن و حدیث سے ماخوذ بتایا، اس کی وجہ سے ان پر غلو اور تعصب کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

تصوف وسلوک: حضرت شیخ عبدالحق پر تصوف وسلوک کا رنگ بہت غالب اور نمایاں تھا، ان کی جس ماحول میں پرورش ہوئی تھی وہ بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، ان کے پدر بزرگوار ایک صاحب دل بزرگ تھے، انہوں نے اپنے فرزند کو بھی بچپن ہی سے تصوف کا لذت شناس بنا دیا تھا، جن بزرگوں سے انہوں نے بیعت وارادت کا تعلق رکھا اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، یہاں ہم ترتیب سے سب کے ناموں کی فہرست درج کر رہے ہیں جن کی رہنمائی میں انہوں نے سلوک کی راہیں طے کی تھیں اور جن سے تصوف کے اذکار واشغال سیکھے تھے۔

۱۔ شیخ موسیٰ بن شیخ حامد سے سب سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے اور خلافت پائی۔

۲۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے طریقہ قادریہ کے بعض اشغال واذکار سیکھے۔

۳۔ شیخ عبدالوہاب متقی سے سلسلۂ قادریہ، شاذلیہ، مدنیہ، چشتیہ میں بیعت کی اور اجازت پائی۔

۴۔ خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے نقشبندیہ سلسلہ کی تکمیل کی۔

۵۔ شیخ ابو المعالی لاہوری سے بھی بڑا تعلق رہا اور ان کے ارشادات و ہدایات پر پورے طور پر کاربند رہے۔

شیخ عبدالحق کو سلسلہ عالیہ قادریہ سے زیادہ مناسبت تھی اور ان پر اسی نسبت کا غلبہ تھا، ان کو اور ان کے والد محترم کو شیخ عبدالقادر جیلانی سے والہانہ عقیدت و شیفتگی تھی اسی لیے اس سلسلہ میں ایک بزرگ حضرت موسیٰ سے اپنے والد کے ایما سے بیعت ہوئے جن کا نسبی تعلق بھی حضرت شیخ عبدالقادر سے تھا، مفتی غلام سرور کا بیان ہے:

اعتقاد کامل بجانب غوثیہ اعظمیہ بہم رسانیدہ بود۔(۱)	حضرت غوث اعظم کے سلسلہ کی جانب مکمل عقیدہ رکھتے تھے۔

شیخ نے خود لکھا ہے کہ "مجھے خواب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ پر مرید کیا تھا (۲) اپنی کتابوں میں ان کا ذکر نہایت عقیدت و محبت سے کرتے ہیں، ان کی شاید ہی کوئی تصنیف ان کے ذکر سے خالی ہو، ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اخبار الاخیار ہندوستانی صوفیہ کا تذکرہ ہے لیکن غایت عقیدت کی بنا پر اس کا آغاز حضرت شیخ ہی کے تذکرہ سے کیا ہے۔

تصوف کا ذوق شیخ عبدالحق کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، ان کے والد نے بچپن ہی میں صوفیہ و مشائخ کی پاکیزہ باتیں ان کے کانوں میں ڈال رکھی تھیں اور وہ اپنی فطرت و طبیعت کے اقتضا سے ان باتوں کے سننے میں خاص لذت و خوشی محسوس کرتے تھے اور زمانہ طفولیت ہی سے بزرگوں اور صلحا کے والہ و شیدا تھے، بچپن میں جب والد محترم توحید اور وحدت الوجود کے مسائل و نکات ان کو سمجھاتے اور وہ ان کی سمجھ میں نہ آتے اس لیے کچھ شک و تردد ظاہر فرماتے تو والد فرماتے کہ حقائق و دقائق کے بارے میں اس قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن انشاء اللہ رفتہ رفتہ حجاب اٹھ جائے گا، اصل چیز یہ ہے کہ اس کا خیال او جہل

---

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۴۔ (۲) زبدۃ الآثار قلمی نسخہ بحوالہ حیات، شیخ عبدالحق، ص ۱۴۲۔

نہ ہونے پائے بلکہ اس کی دریافت کی سعی وکاوش میں برابر لگے رہنا چاہیے(۱) چنانچہ شیخ کی محنت اور طلب صادق سے سارے حجابات اٹھ گئے اور حقیقت کا روئے روشن پوری طرح بے نقاب ہوگیا۔

تصوف کا ذوق عمر کے ساتھ ان میں زیادہ پختہ ہوتا اور بڑھتا گیا، چنانچہ اس میں ان کے فضل ومرتبہ کا اعتراف تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی فرماتے ہیں کہ ''وہ تصوف میں بلند مرتبہ رکھتے تھے'' (۲) مرزا نظام الدین احمد رقم طراز ہیں ''وہ دہلی میں صوفیوں کی وضع قطع میں زندگی گزارتے تھے'' (۳) نورالدین جہانگیر کا بیان ہے کہ ''ایک مدت سے شیخ عبدالحق دہلی کے ایک گوشہ میں توکل وتجرید کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، بزرگ آدمی ہیں، ان کی صحبت بے ذوق نہیں'' (۴) عبدالحمید لاہوری تحریر فرماتے ہیں ''وہ صوری ومعنوی کمالات کے جامع، زاہد وصوفی مشرب، صوری ومعنوی فضائل سے آراستہ اور اسرار غیبی سے واقف تھے..... نوے برس کی عمر میں بھی ان کی عبادت وریاضت اور اوراد ووظائف اور ذکر وتلاوت کے التزام میں کوئی فرق نہیں آیا (۵) طبقات شاہجہانی کے مصنف لکھتے ہیں ''شیخ عبدالحق سے طلب علم کرنے والے اور دہلی کے عام وخاص عارفین ان کے متبرک انفاس سے محظوظ ہوتے تھے..... ان کی ذات فیض حق کا مظہر اور نور مطلق کا مہبط ہے (۶) بختاور خان کا خیال ہے کہ ''وہ صاحب مقامات رفیعہ وسالک درجات منیعہ تھے'' (۷) شاہ نواز خان کے نزدیک ''شیخ عبدالحق کو مشائخ سے بڑی نعمتیں ملیں، عین جوانی میں مکہ معظمہ گئے اور دربار رسالت سے تربیت پاکر گم گشتگان بادیہ ضلالت کی رہنمائی پر مختار ہوئے'' (۸) غلام علی آزاد بلگرامی مولوی رحمٰن علی، نواب صدیق حسن خان

---

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۹۰۔ (۲) منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۴۔ (۳) طبقات اکبری، ج ۲، ص ۴۶۴۔ (۴) توزک جہانگیری، ص ۱۸۵۔ (۵) بادشاہ نامہ، جلد اول، دفتر دوم، ص ۳۴۱۔ (۶) عمل صالح، ج ۳، ص ۳۷۷۔ (۷) مرآۃ العالم، ج ۲، ص ۲۴۳۔ (۸) مرآۃ آفتاب نما بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۶۷۔

اور حکیم مولانا سید عبدالحیؒ وغیرہ نے بھی ان کو علوم ظاہر و باطن میں ممتاز و صاحب کمال، صوری و معنوی فضائل کا جامع اور تصوف و سلوک میں بلند پایہ قرار دیا ہے، مفتی غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں کہ:

> ''اپنے زمانہ میں علم و عمل اور زہد و ریاضت میں یکتا اور بے مثال تھے..... ظاہری و باطنی علوم میں کامل و اکمل تھے اور شریعت و طریقت میں مقتدائے وقت تھے۔''(۱)

مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

> ''بعض اولیاء اللہ ایسے بھی گزرے ہیں کہ خواب میں یا حالت غیبت میں روز مرہ ان کو دربار نبوی میں حاضری کی دولت نصیب ہوتی تھی، ایسے حضرات صاحب حضوری کہلاتے ہیں، انھی میں سے ایک حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں کہ یہ بھی اس دولت سے مشرف تھے اور صاحب حضوری تھے۔''(۲)

تصوف میں اس درجۂ بلند پر فائز ہونے کے باوجود شیخ اخفائے حال سے کام لیتے تھے، ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کے علمی و درسی اشغال کو ستر احوال پر محمول کیا ہے تاکہ لوگ سلوک و احسان میں ان کی عظمت و برتری سے ناواقف رہیں، ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

ستر حال خویش بافادہ و استفادہ علوم رسمیہ می کند۔(۳)	اپنی حالت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے انہوں نے ظاہری و رسمی علوم کے افادہ و استفادہ کا مشغلہ اختیار کیا تھا۔

ملا صاحب کے خیالات کی بازگشت شاہ نواز خاں کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے، فرماتے ہیں:

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج۱، ص۱۶۴۔ (۲) الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ، ج۷، ص۶۔ (۳) منتخب التواریخ، ج۳، ص۱۱۴۔

بشہر دہلی مراجعت نمود و تربیت ارباب ارادت بتدریس کتب احادیث مشغول۔(۱)	(حرمین سے) دہلی واپس ہوئے اور کتب احادیث کے درس میں مشغول رہ کر مریدین کی تربیت فرماتے رہے۔

مندرجہ بالا تحریروں سے تصوف وسلوک میں شیخ کی عظمت و بلند پائیگی پوری طرح ظاہر ہوگئی لیکن ان کی ذات گرامی طریقت کی طرح شریعت کی بھی جامع تھی اوران کی یہی جامعیت ان کے علم وتصوف دونوں میں نظر آتی ہے، وہ حقیقت میں تصوف کو تزکیہ باطن، اصلاح نفس اور علم وعمل کی تطہیر کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لیے وہ متقشف علمائے ظاہر اور فقہا کی طرح تصوف کے نہ مخالف تھے اور نہ بے راہ رو صوفیہ ومشائخ کی طرح ان کا تصوف فرائض واعمال سے غافل کرنے والا تھا، ان کے علم نے ان کو تصوف کی بے راہ روی سے محفوظ رکھا اور تصوف نے علم میں اخلاص کی شان پیدا کی، ان کے نزدیک شریعت طریقت پر مقدم ہے اور طریقت شریعت کے تابع ہے، ان کی کتابوں میں جن صوفیہ کے اقوال وعبارتیں منقول ہیں وہ علمی حیثیت سے بھی ممتاز دونوں طریقوں کے جامع اور ارباب شریعت واہل طریقت دونوں گروہوں کے متفق علیہ ہیں، فقہا وصوفیہ کے جو الگ الگ حلقے اور طبقے بن گئے ہیں اور یہ دونوں برابر ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں، شیخ اس تقسیم اور طبقہ واریت کے خلاف تھے، اس بنا پر انہوں نے دونوں جماعتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی اور اس معاملہ میں ان کو اپنے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی سے بڑی رہنمائی ملی، ان کی خاص تاکید تھی کہ تم شریعت وتفقہ کے عمل کو اولیت واہمیت دو، پھر اس کے بعد حقیقت و طریقت کے مراتب طے کرو، شیخ نے اس ہدایت پر عمل کر کے تصوف وتفقہ کی دوئی اور تضاد کو رفع کیا اور بتایا کہ تصوف کو فقہ کی احتیاج ہے مگر فقہ تصوف سے بے نیاز ہے، تصوف کا درجہ اعلیٰ ہے مگر عام ضرورتیں اور مصلحتیں فقہ سے وابستہ ہیں، شیخ عبدالوہاب کی تلقین یہ بھی تھی کہ

(۱) مرأۃ آفتاب نما بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۶۷۔

''تم فقیہ صوفی بنو اور صوفی فقیہ نہ بنو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ، عمل شریعت اور ظاہر کی حفاظت کو مقدم خیال کرو، اس کے بعد تصوف طریقت اور تصفیہ باطن کے مقامات طے کرو، یہی سلامتی اور کمال کی راہ ہے۔

دین وشریعت اور تصوف وطریقت کے رمز آشنا اور ہر ایک کے حدود ومراتب سے واقف ہونے کی بنا پر وہ ائمہ اسلام فقہا ومجتہدین اور صوفیہ ومشائخ سب کے عظمت شناس تھے۔

دراصل شیخ عبدالحق کے نزدیک بنیادی کتاب وسنت نبوی اور شریعت محمدی ہے اور وہ علما وصوفیہ دونوں جماعتوں کے اقوال کی کسوٹی انہی کو مانتے تھے اور ان حضرات کے یہاں جو چیزیں ان کو نصوص کے خلاف معلوم ہوتی تھیں انہیں وہ رد فرماتے تھے، بعض صوفیائے خام شریعت پر عمل نہیں کرتے اور شریعت وطریقت میں تفریق کرتے ہیں، شیخ محدث اس طرح کے لوگوں کو صوفی نہیں مانتے بلکہ گمراہ سمجھتے ہیں، ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ ''جس حقیقت کو شریعت مردود قرار دے وہ زندقہ ہے، وہ حضرت شیخ جنید بغدادی کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ ''کتاب وسنت طریقت کی بنیاد ہے اور جو چیز ان کے مخالف ہو وہ مردود وباطل ہے۔''(۱)

اس تفصیل سے تصوف کے معاملہ میں ان کے محتاط ومعتدل مسلک وروش کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے زمانہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدت الوجود کی شد ومد سے مخالفت کی، شیخ کے والد پر اس کا غلبہ تھا مگر شیخ نے احتیاط کی وجہ سے وحدت الوجود کی تردید وحمایت سے پرہیز کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان پر شیخ عبدالوہاب متقی کا زیادہ اثر تھا جو وحدۃ الوجود کے معاملہ میں افراط وتفریط کے بڑے مخالف تھے، ان کی تعلیم وتربیت کو بھی تصوف کے معاملہ میں شیخ عبدالحق کی روش کو معتدل بنانے میں بڑا دخل تھا، تصوف میں ان کا درجہ بلند تھا لیکن

(۱) یہ تمام باتیں شیخ کی بعض کتابوں اور مکاتیب ورسائل سے ماخوذ ہیں۔

ان کا اصل میدان علم وتحقیق ہے، اس لیے اندیشہ تھا کہ اگر وہ غلبہ حال کی بنا پر تصوف کی زبان میں گفتگو کریں گے تو عام لوگوں کی فہم واستعداد سے بالاتر ہوں گی اوران سے فائدہ سے زیادہ نقصان ہوگا، اس بنا پر شیخ عبدالوہاب نے اس قسم کی باتیں کرنے کی ممانعت کردی تھی، چنانچہ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں:

> ''اس بندہ کوحقائق واسرار کے متعلق کلام کرنے سے منع کیا گیا اور یہ اس بات پر مامور ہے کہ حدیثوں کے سلسلہ میں آداب شریعت کے سوا کچھ نہ بیان کرے، ہمارے شیخ نے اس کی وصیت فرمائی ہے کہ دین وملت ہی کے مسائل وابواب اوران امور میں بحث وکلام پر اکتفا کروں جن سے دین کی ترویج، شریعت کی تجدید، عقائد دین کی حفاظت ہوتی ہو، دائرۂ احتیاط واعتدال اور جادۂ استقامت سے باہر قدم نہ رکھوں اور وجودیوں کے اشارات اور باطنیوں کی تاویلات میں نہ پڑوں، کیوں کہ ان چیزوں سے حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں، انہوں نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی کہ ''مشائخ کی کتابوں کا مطالعہ اوران سے استفادہ بہتر ومبارک ہے لیکن سب مقدور مبہم اور مشتبہ باتوں میں پڑنا، اگر اہل طریقت کی باتیں ظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوں تو یا تو ان بزرگوں کی جانب ان کی نسبت ہی نفی کردو یا ان کی تاویل کر کے ظاہر شریعت ودین حق سے ان کی مطابقت بیان کردو اور اگر تطبیق وتاویل کی صورت ممکن نہ ہوتو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں سکوت اختیار کرو۔''(۱)

انہوں نے ان ہدایات کی پوری پابندی کی اورحقائق واسرار میں گفتگو سے احتراز کیا، اپنے کلام کوایہام، ابہام اور شطحیات سے پاک رکھا اور کشف وکرامات کے اظہار سے باز رہے۔

(۱) بحوالہ فوائد جامعہ، ص۲۲ تا ۲۴۔

شیخ عبدالحق اصلاً علمی شخص تھے، مولانا حکیم عبدالحئی کا بیان ہے کہ مشائخ کرام میں وہ علم کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے (۱) اس لیے علمی حیثیت سے انہوں نے تصوف کی گوناگوں مفید خدمات انجام دیں، اس فن میں ان کی متعدد بلند پایہ تصنیفات ہیں اور انہوں نے تصوف کی کئی اہم کتابوں کے مطالب ومسائل کی دلآویز شرح وتوضیح کی ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی ذات سے ان کو جو والہانہ عقیدت وتعلق تھا، اس کی بنا پر ان کی کتابوں کی شرح اور فارسی ترجمہ کی جانب انہوں نے زیادہ اعتنا کیا، ان کی ان کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں تصوف کے مسائل وحقائق سے عام لوگوں کو بھی واقفیت ہوگئی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے افکار وخیالات کی بھی عام اشاعت ہوئی۔

تصوف میں ان کا یہ کارنامہ بھی ہے کہ ان کے زمانہ کے صوفیہ ومشائخ لوگوں کی اصلاح وتربیت اور رشد وہدایت کے بنیادی اور ضروری کام سے غافل ہوگئے تھے، شیخ نے اس کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی اور انہیں اس کی ضرورت واہمیت سے آگاہ کرایا۔

علم حدیث: شیخ عبدالحق کو علم حدیث میں خاص عبور حاصل تھا، اس فن میں ان کی نمایاں خدمات اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے ''محدث'' ان کے نام کا جز ہوگیا ہے، داراشکوہ نے انہیں ''امام محدثان وقت'' کہا ہے (۲) خافی خان کا بیان ہے کہ ''وہ اپنے زمانہ کے مشہور محدث تھے، پورے ہندوستان میں تفسیر وحدیث میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔'' (۳)

انہوں نے اس فن سے عمر بھر اشتغال رکھا اور اس کی گوناگوں مفید خدمات انجام دی ہیں، اس میں عمدہ اور کثیر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، ان کی غیر معمولی اہمیت کی حامل کتب حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ وہ احادیث کی مشکلات وغوامض کو حل کرنے میں ید طولیٰ وما فوق العادت مہارت رکھتے تھے، مولانا غلام معین الدین عبداللہ کا بیان ہے کہ ''انہوں نے علم حدیث میں شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ علی متقی کا مکمل تتبع کیا اور اس علم کی تحقیقات کو انتہائی

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۱۔ (۲) بحوالہ سکینۃ الاولیاء، ص ۱۱۵۔ (۳) منتخب اللباب، ج ۱، ص ۲۴۰۔

حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔" (۱)

فن حدیث میں شیخ کی خدمات و کمالات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کو غیر معمولی فروغ دیا اور حجاز سے واپسی کے بعد وہ عمر بھر اسی علم کی آبیاری کرتے رہے، شیخ نے اس علم کی جانب خصوصیت سے اس لیے زیادہ اعتنا کیا کہ ان کے زمانہ میں کتاب وسنت کے بجائے دوسرے علوم وفنون لوگوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے، چنانچہ دین کے اصلی سرچشمہ سے غفلت اور دوری کی بنا پر حق وصداقت کی روشنی ماند پڑگئی تھی اور بے دینی، ضلالت اور بدعت کی تیرگی ہر طرف چھائی ہوئی تھی اس لے انہوں نے دین کی اصل حقیقت کو روشن کرنے کے لیے احادیث کی جانب شدت سے اعتنا کیا اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی، حدیث کے درس وتدریس کا غلغلہ بلند کر کے لوگوں کو اس کی اہمیت وضرورت کا احساس دلایا، اس کے رجال واسناد اور اصول ومتون کی تدوین وتحقیق، اس کے حقائق ومعارف کی جستجو ودریافت اس کے اسرار وغوامض کی عقدہ کشائی اور اس کی کتابوں کے شروح وحواشی لکھ کر اس کے خزانے کو سب کے لیے عام کردیا، ان کی اس سعی وبلیغ کے نتیجہ میں حدیث نبویؐ کی طرف لوگوں کا رجحان بہت بڑھ گیا اور اس کا ہر طرف عام چرچا اور بول بالا ہوگیا، ہندوستان میں علم حدیث کے احیا وترقی اور اس کی نشر واشاعت کی جو سعادت وفضیلت ان کے حصہ میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی، غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے "شیخ نے علوم وفنون کی اشاعت بالخصوص حدیث کی نشر واشاعت اور اس کی ترویج وترقی میں جو کارنامہ انجام دیا وہ متقدمین ومتاخرین میں سے کسی نے بھی ہندوستان میں انجام نہیں دیا۔" (۲)

شیخ کا یہ بھی زریں کارنامہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے درس وتدریس اور اس کی ترقی وتوسیع کا ایک ایسا وسیع نظام وسلسلہ قائم کردیا جو ان کے بعد بھی مدت دراز تک جاری تھا،

(۱) معارج الولایت قلمی بحوالہ مقدمہ نوریہ سلطانیہ، ص ۴ و ۵۔ (۲) سبحۃ المرجان، ص ۵۲۔

ہندوستان میں ان کی اور ان کے خانوادہ کی یہ بڑی اہم خصوصیت ہے کہ اس کی بدولت صدیوں علم حدیث کا چشمہ ابلتا رہا، دراصل انہوں نے علم حدیث کے سلسلہ میں متعدد ایسے اہم اور بنیادی کام انجام دیے جن کی بنیادوں پر آگے چل کر نہایت عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہوئیں، ہندوستان کی علمی تاریخ اور احادیث کی ترویج و اشاعت میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام بہت ممتاز ہے لیکن ان کے کاموں کی داغ بیل شیخ عبدالحق محدث ہی نے ڈالی تھی، شاہ صاحب نے انہی کی قائم کردہ روایات کو آگے بڑھایا اور پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، اس لیے جہاں تک ہندوستان میں حدیث کے فروغ و اشاعت کا معاملہ ہے اس کا اصل سہرا شیخ عبدالحق ہی کے سر بندھتا ہے، اسی لیے ایک زمانہ تک یہ مشہور رہا کہ ہندوستان میں علم حدیث کی داغ بیل ڈالنے اور یہاں اس کی تخم ریزی کرنے والے پہلے شخص وہی ہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہی سے علم حدیث معدوم تھا یہاں تک کہ اللہ نے اس سرزمین پر اپنا فضل و احسان کیا اور یہاں کے بعض علما جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ کو اس علم سے نوازا، شیخ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے اور اس کے باشندوں پر اس کا فیض عام کرنے والے پہلے شخص ہیں۔''(۱)

مولانا حکیم سید عبدالحی لکھتے ہیں:

> ''شیخ عبدالحق ہندوستان کے باشندوں میں علم حدیث کا فیض جاری کرنے والے پہلے آدمی ہیں، انہوں نے دارالحکومت دہلی میں اس کے درس و افادہ کا سلسلہ قائم کیا اور اپنی ساری محنت و توجہ اسی کام پر مرکوز کردی، اس فن میں کتابیں تصنیف کیں، حدیثوں کی تخریج کی اور نہایت جانفشانی

(۱) الحطہ، ص ۷۰۔

سے اس کی نشر و اشاعت کی۔''(۱)

یہ بات چاہے اس تفصیل کے ساتھ صحیح نہ ہو مگر ہندوستان کی سرزمین پر علم حدیث کے درس کا ایک منظم نظام اور تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کرنے کا شرف شیخ عبدالحق ہی کو حاصل ہے، ان سے پہلے گجرات اور بعض ساحلی علاقوں میں حدیث کی تعلیم و تعلم کا انفرادی طور پر رواج تھا مگر نہ تو اس کا کوئی باقاعدہ نظم و اہتمام تھا اور نہ اس کو پڑھنے پڑھانے کا کوئی خاص رواج و دستور تھا، خصوصاً شمالی ہند میں حدیث کا علم کبریت احمر کی طرح نایاب ہو گیا، مگر شیخ نے گجرات کے بجائے دہلی کو علم حدیث کا مرکز بنا دیا اور ان کی بدولت درس و تدریس کا منظم سلسلہ شمالی ہند میں بھی جاری ہو گیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''اکبر کے آخری عہد میں وہ بزرگ ہستی نمایاں ہوئی جس نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھا دیا اور جس نے دہلی کے شاہی دارالسلطنت کو ہمیشہ کے لیے علوم دین کا دارالسلطنت بنا دیا اور جس کی نسبت اہل علم کا اعتراف ہے کہ ''اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود ملا'' گو نئی تاریخ کی روشنی میں بزرگوں کا یہ پرانا مقولہ صحیح نہیں تاہم معنوی حیثیت سے اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقف عام کیا اور دل پسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ سے علمائے ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین و آفرین کی داد وصول کی۔''(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم رقم طراز ہیں:

''مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے، ان کی ذات سے شمالی ہند

(۱) الثقافة الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۳۷۔ (۲) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۳۔

میں علم حدیث کو زندگی ملی اور سنت نبوی کا خزانہ ہر خاص و عام کے لیے ہو گیا، ہمارے نزدیک کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے علما اور صوفی بس متاخرین کی فقہ اور معقولیت میں الجھ کر رہ گئے اور کم از کم شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا نہ ہو سکا، بد دینی اور بدعقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے، شیخ عبدالحق نے اس جہل کو دور کرنے کی کوشش کی اور اس لیے ہم آج ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔"(۱)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م۱۰۵۲ھ) بلکہ امام ولی اللہ دہلوی (م۱۱۷۶ھ) سے پہلے سنت کی گرم بازاری نہیں ہوئی۔"(۲)

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کتاب التمهيد في ائمة التجديد کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں اشاعت حدیث بارہویں صدی ہجری میں اس وقت ہوئی جب گیارہویں صدی کی ابتدا میں شیخ عبدالحق دہلوی (حرمین سے) تشریف لائے اور دہلی میں قیام پذیر ہو کر تقریباً ۵۰ برس تک حدیث کا درس دیا۔"(۳)

شیخ محدث کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اگرچہ اس کی شدومد سے تردید کی ہے کہ "شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی سے پہلے ہندوستان کے مسلمان علم حدیث سے ناآشنا تھے اور مشارق الانوار کے علاوہ کسی حدیث کی کتاب سے واقفیت نہ رکھتے تھے" تاہم وہ بھی شمالی ہند میں ان کی فیض رسانی، اولیت اور ان کے دور رس

(۱) الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۳۷۔ (۲) ایضاً، ص ۲۰۔ (۳) ایضاً، ص ۲۶۸۔

اثرات کا اس طور پر اعتراف کرتے ہیں:

''بہر حال حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہو چکا تھا، انہوں نے اس تنگ و تاریک ماحول میں علوم دینی کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھنچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہو گیا، علوم دینی خصوصاً حدیث کا مرکز ثقل گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آ گیا، گیارہویں صدی ہجری کے شروع سے تیرہویں صدی کے آخر تک علم حدیث پر جتنی کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ دہلی یا شمالی ہند میں لکھا گیا ہے، یہ سب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اثر تھا۔''(۱)

شیخ عبدالحق سے پہلے ہندوستان کی سرزمین میں جو ائمہ فن اور محدثین پیدا ہوئے انہوں نے دوسرے عرب اور اسلامی ملکوں میں بود و باش اختیار کر لی اور وہیں اپنے علم و فن کے جوہر بھی چمکائے، اسی لیے وہ ہندوستان کے بجائے ان ملکوں کی نسبت سے زیادہ مشہور ہوئے مگر شیخ عبدالحق غالباً پہلے ہندوستانی محدث ہیں جنہوں نے حرمین کا سفر کر کے وہاں کے علماء سے استفادہ تو بہت کیا مگر وہ ہندوستان ہی میں مقیم رہے اور اسی کو اپنی درسی اور تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز و محور بھی بنایا لیکن اس کے باوجود پوری دنیائے اسلام میں ان کا غلغلہ بلند ہوا اور ہر جگہ کے علماء نے ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور معانی حدیث کی فہم میں ان کے ممنون ہوئے، مولانا احمد سعید دہلوی لکھتے ہیں ''شیخ عبدالحق محدث دہلوی دہلی بلکہ ہندوستان کے پہلے محدث ہیں جو اپنی علمی خدمات اور ذوق و تصوف اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے بلاد اسلامیہ میں مشہور و معروف ہیں۔''(۲)

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۴۳۔ (۲) مقدمہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ا۔

شیخ عبدالحق کے اولیات: حدیث کے سلسلہ میں شیخ عبدالحق کی چند نمایاں خصوصیات اور اہم امتیازات ہیں جن کو ہم ان کی اولیات سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، گو اوپر ان کا ذکر آ چکا ہے تاہم ذیل میں ہم ان کو نمبر وار تحریر کرتے ہیں:

۱۔ وہ مسلسل ۵۲ برس تک حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، انہوں نے کتب حدیث کو اپنے زمانہ کے نصاب درس میں شامل کیا جس کا اس زمانہ میں کوئی رواج نہ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

> ''الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی الاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۵۱۶ھ کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں علما کے درس میں تھیں، شیخ عبدالحق دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا۔''(۱)

نظامی صاحب لکھتے ہیں ''کتب حدیث کو اپنے زمانے کے نصاب ومنہاج کا ایک لازمی جز بنا دیا، خود انہوں نے اپنے مدرسہ میں کتب احادیث کے باقاعدہ درس کی ابتدا کی، ان کے بیٹے اور پوتوں نے اپنے مدرسہ کی اس خصوصیات کو برقرار رکھا۔''(۲)

۲۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خود زندگی بھر حدیث کا درس دیا بلکہ اس کی تعلیم وتعلم کا ایک باقاعدہ سلسلہ جاری کر دیا جس کو ان کے بعد ان کی اولاد واحفاد نے بھی قائم اور باقی رکھا، ہندوستان میں ان کے خاندان کو سات آٹھ پشتوں تک فن حدیث کی خدمت کا شرف نصیب ہوا، نظامی صاحب لکھتے ہیں:

۳۔ ہندوستان میں علم حدیث کے اکثر اصول وروایات شیخ عبدالحق ہی نے

---

(۱) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۷۵۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۸۴۔

قائم کیے ہیں جن کو بعد کے لوگوں نے مزید ترقی واستحکام بخشا۔

۴۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے والے اور اس کی داغ بیل ڈالنے والے شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے شخص ہیں، یہ بات چاہے کلیۃً صحیح نہ ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ احادیث کے درس وافادہ اور ان پر باقاعدہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ انہی کی ذات سے شروع ہوا، اس طرح درس وتصنیف کے ذریعہ ہندوستان میں علوم حدیث کو رائج ونشر کرنے میں ان کو اولیت ضرور حاصل ہے، مولوی رحمان علی لکھتے ہیں ''علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از وشیوع یافتہ''(۱) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا بیان ہے:

''مولانا جمال الدین کے آخری دور میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی اور ان کے درس وتصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں عام کیا۔''(۲)

مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم فرماتے ہیں:

''وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے باشندگان ہند پر حدیث کا فیض عام کیا اور دہلی کے دارالسلطنت میں درس وافادہ کی مسند پر متمکن ہوئے اور اپنی ساری توجہ اسی کام کے لیے مرکوز کر دی۔''(۳)

یہ واقعہ ہے کہ شمالی ہند میں علم حدیث کے احیا کا سہرا انہی کے سر ہے، انہوں نے پہلی مرتبہ دہلی کے دارالسلطنت کو علم حدیث کا مرکز بنا دیا اور گھر گھر میں حدیث کا عام چرچا کر دیا، مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم ہندوستان میں حدیث کی عام ترویج کو ان کے فیوض وبرکات کا نتیجہ بتاتے ہوئے انہیں اول المحدثین قرار دیتے ہیں، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''ایک ایسے دور میں جب کہ علم حدیث شمالی ہندوستان میں تقریباً

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۹۔ (۲) تذکرہ مرتبہ مالک رام، ص ۳۰۱۔ (۳) الثقافة الاسلامية في الهند، ص ۱۳۷۔

ختم ہو چکا تھا انہوں نے اپنی مسلسل اور پر خلوص جدوجہد سے اس کو از سر نو
زندہ کیا۔“ (۱)

۵۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علمائے ہند میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حرمین کا سفر کیا، وہاں سے حدیث کی کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لائے اور انہیں داخل درس کیا، پورے ہندوستان کی نسبت سے اس بات کو اگر درست نہ مانا جائے تب بھی شمالی ہند اور دہلی کی حد تک اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

”شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا...... بہرحال شیخ عبدالحق کے ذریعہ مشکوٰۃ کے نسخے حجم کے کم ہونے کی وجہ سے عام ہو گئے اور بخاری کا نام اور حوالہ بھی کتابوں میں آنے لگا۔“ (۲)

سید صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”بہرحال رفتہ رفتہ عرب سے کتابیں ہندوستان آنے لگیں اور اس بارۂ خاص میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فیوض حرمین کا ممنون ہونا چاہیے۔“ (۳)

پروفیسر خلیق احمد نظامی تحریر کرتے ہیں:

”علم حدیث کی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ حجاز اور وہاں کے محدثین سے براہ راست تعلق پیدا کیا جائے، شیخ عبدالحق نے علم حدیث حجاز میں حاصل کیا، ان کے بعد ہندوستان میں محدث بننے کے لیے حجاز میں قیام اور علمائے حجاز سے استفادی ضروری سمجھا جانے لگا۔“ (۴)

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۴۸۳۔ (۲) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۵۷۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق مدراسی کا بیان ہے:

''اکبری دور کے ملحدانہ خیالات کی رو میں جاہ پرست علما کے قدم ڈگمگا گئے تھے لیکن شاہ صاحب کے خاندانی ماحول اور تربیت اور سفر حرمین شریفین کی وجہ سے ان میں وہ وہ ودیعتیں ابھر آئی تھیں جن کی بدولت ہندوستان میں علوم حدیث کے احیاو ترویج واشاعت کا سہران کے سر رہا۔''(۱)

۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عربی زبان کی کتابوں کا فارسی ترجمہ کر کے ان کے فوائد کو عام کیا، اس سلسلہ میں احادیث کی کتابوں کے بھی فارسی زبان میں ترجمہ کرنے اور ان کے متون کی فارسی میں شرحیں لکھنے کی سعادت سب سے پہلے انہی کی حصہ میں آئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم وتعلم کے بانی ہوئے اس کی ایک عام خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف وتراجم کی بنیاد ڈالی، خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نورالحق نے صحیح بخاری کا۔''(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی ؒ فرماتے ہیں:

''ان کا اور ان کے سلسلہ کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان کتابوں (حدیث کے متعلق) کا فارسی میں ترجمہ کیا اور فارسی میں ان کی شرحیں لکھیں۔''(۳)

سابقہ حاشیہ: (۳) ایضاً، ص ۷۹۔ (۴) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۸۵۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، پیش لفظ، ص ط۔ (۲) تذکرہ، ص ۳۰۳ و ۳۰۴۔ (۳) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۷۵۔

ذوق علم ومطالعہ اور شیخ کا کتب خانہ: شیخ عبدالحق کو علم ومطالعہ سے بڑا شغف تھا اور ان کا علم ومطالعہ وسیع اور گہرا تھا، علم وفن سے ان کا اشتغال اور مطالعہ وکتب بینی کا شوق و ذوق مدۃ العمر قائم رہا، چوں کہ شیخ کا علمی ذوق عمدہ اور بلند تھا اس لیے امہات فن اور منتخب و معیاری اور اعلیٰ کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں جن کے حوالے انہوں نے اپنی تصنیفات میں بکثرت دیے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا کتب خانہ بھی بڑا وسیع اور عظیم الشان تھا اور وہ بیش قیمت، اہم، نادر اور نایاب کتابوں پر مشتمل تھا، حجاز کے قیام کے زمانہ میں انہوں نے کتابوں کا بڑا ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا جن کو وہ اپنے ساتھ ہندوستان بھی لائے تھے، وہ جن کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے ان پر نوٹ یادداشت اور حواشی بھی قلم بند کرتے تھے، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> ''شیخ محدث کے کتب خانہ کی جس کتاب پر بھی خاکسار کی نظر پڑی ہے اس پر شیخ کے دست مبارک سے تصحیح ومقابلہ کے نشانات ضرور ملے ہیں، اس سے ان کے کتب خانہ کی افادیت اور علمی حیثیت بہت بڑھ جاتی ہے۔''(۱)

شیخ کی اولاد بھی علم وفن کی شیدائی تھی اور ان کے خاندان میں کئی پشتوں تک علم سے اشتغال رکھنے والے موجود تھے، اس لیے ان کے بعد بھی عرصہ تک ان کا کتب خانہ اچھے حال میں باقی رہا لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب دہلی کی حالت دگرگوں ہوئی اور مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں کی مسلسل ہنگامہ آرائی اور شورش سے یہ کتب خانہ بھی تباہ وبرباد ہو گیا، شیخ محدث کے پرپوتے شیخ الاسلام نے اپنی تصنیف شرح بخاری کے خاتمہ پر کتب خانہ کی بربادی کا نہایت دردو قلق سے اس طرح ذکر کیا ہے:

> ''اس ہنگامہ، لوٹ مار اور غارت گری کے زمانہ میں ہنگامہ پردازوں اور سرکشوں نے پرانی دہلی کو تاراج کر ڈالا اور وہ قدیم وجدید کتب خانہ بھی

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۵۴۔

ضائع ہو گیا جس کی اکثر کتابیں اس علاقہ میں کمیاب و نایاب ہیں، ان میں سے بعض کتابیں تو ایسی تھیں جو شیخ المحدثین شیخ اجل محقق دہلوی کی تصحیح و تحشیہ سے مزین تھیں اور انہوں نے ان کا درس بھی دیا تھا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اپنے گھر کے اندر گوشوں میں چند کتابیں شکستہ اور خستہ حالت میں پڑی رہ گئی ہیں۔"(۱)

شعر و سخن کا ذوق: شیخ محدث دہلوی کا ادبی و شعری ذوق بھی بہت عمدہ تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے ادبی ذوق کی پختگی اور طرز نگارش کی سلاست و روانی کا پتہ چلتا ہے جس پر آگے بحث آئے گی، یہاں ان کی موزونی طبع اور شعر و سخن میں کمال پر گفتگو مقصود ہے۔

شیخ کو شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی اور انہیں اس کا موروثی ذوق بھی تھا، ان کے جد امجد شیخ فیروز شعر و شاعری میں صاحب کمال تھے، ان کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی بھی فارسی اور ہندی کے کامیاب شاعر تھے اور والد بزرگوار کے متعلق شیخ کا خود یہ بیان ہے کہ "وہ سیفی تخلص کرتے تھے اور اپنے دور میں اپنے ہندوستانی معاصرین واقران سے سلاست سخن اور زبان کی درستی میں بہت ممتاز و فائق تھے۔"

حضرت شیخ عبدالحق جیسے یگانہ روزگار فاضل و صاحب کمال کے لیے شعر و شاعری کچھ زیادہ افتخار و امتیاز کی چیز نہیں لیکن وہ اس میں بھی ممتاز تھے، ان کے معاصر نظام الدین بخشی نے "زبان شعر دارد" (۲) کہہ کر ان کی موزونی کا اعتراف کیا ہے اور صاحب معارج الولایت لکھتے ہیں "شعر سے بھی پوری طرح رغبت رکھتے تھے...... ہر طرح کی نظمیں، ہر بحر و وزن میں کہنے پر قدرت تھی، ان کا تخلص حقی تھا، ان کے کتب و رسائل میں ان کے اشعار مرقوم ہیں۔"(۳)

---

(۱) شرح بخاری، قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری بحوالہ تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۵ و ۲۰۶۔ (۲) طبقات اکبری، حصہ دوم، ص ۴۶۴۔ (۳) بحوالہ شیخ عبدالحق دہلوی، ص ۲۱۱۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ شعر و سخن کا مشغلہ جوانی ہی تک جاری رہا، بعد میں اپنی سرگرمیاں درس و تصنیف اور علمی مسائل کی تحقیق و تدقیق کے لیے وقف کر دی تھیں، بختاور خان رقم طراز ہیں ''ان ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ہی ایام جوانی میں شعر گوئی کا بھی پورا ذوق رکھتے تھے اور حقی تخلص فرماتے تھے'' (۱) ان کا دیوان اب ناپید ہے مگر نواب علی حسن خان کی نظر سے گزرا تھا، وہ فرماتے ہیں '' دیوان مختلف اصناف سخن و انواع نظم کا مجموعہ اور بیشتر حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل تھا۔'' (۲)

ان کی تصنیفات میں جو بکثرت اشعار درج ہیں ان میں اکثر خود انہی کے معلوم ہوتے ہیں، انہوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست میں اپنے مجموعہ حسن الاشعار کا ذکر کیا ہے، اس کا اور ان کے دوسرے شعری رسائل کا ذکر تصنیفات کے ضمن میں آئے گا، نواب علی حسن خان نے بھی گلشن سخن میں حقی کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، ان سب سے ان کے حسن ذوق اور کلام کے درد و اثر سے معمور ہونے کا پتہ چلتا ہے، ان کو نعت گوئی سے زیادہ مناسبت تھی، نواب صاحب کا بھی بیان ہے کہ دیوان بیشتر نعتیہ قصائد پر مشتمل ہے، ان کا ایک طویل اور مؤثر نعتیہ قصیدہ اخبار الاخیار میں بھی نقل کیا ہے (۳) اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

بیا اے دل دمے از ہستی خود ترک دعوی کن
میفکن چشم بر صورت نظر در عین معنی کن

چند اشعار میں دوسرے انبیا پر نبی اکرمؐ کی فضیلت بیان کی ہے، اس سلسلہ کا ایک شعر ہے:

قیاس رتبہ و مقدار فضل از انبیا تا وے
ز قطرہ تا بدریا یا ز ذرہ تا بہ بیضا کن

یہ قصیدہ ہندوستان میں لکھا گیا تھا مگر جب شیخ زیارت نبویؐ کے لیے گئے تو اس کو خدمت اقدس میں نذر کیا، زاد المتقین میں ہے کہ اس شعر پر پہنچے تو گریہ طاری ہو گیا۔

(۱) مرآۃ العالم، ج ۲، ص ۴۴۴۔ (۲) صبح گلشن، ص ۱۴۱۔ (۳) حیات عبدالحق دہلوی، ص ۱۱۲ تا ۱۲۰۔

خرابم در غم ہجر جمالت یا رسول اللہ
جمال خود نما، رحمے بجان زار شیدا کن

ہندوستان کے مکدر حالات اور یہاں کی ابتر دینی فضا کا ذکر اس شعر میں ہے ۔

جہاں تاریک شد از ظلمت سیہ کاراں
بیاد عالمے را روشن از نور تجلی کن(۱)

شیخ شعر وسخن کے اچھے نکتہ شناس اور بڑے سخن فہم تھے، دہلی اور اطراف دہلی کے شعرا پر اگرچہ جچے تلے مختصر فقروں میں تبصرے کیے ہیں لیکن ان سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا کے کلام پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی اور شعر کے حسن و قبح، اس کی نزاکتوں اور باریکیوں سے آپ کا ذوق کس درجہ آشنا تھا، آپ نے اپنی تصانیف میں بکثرت اشعار استعمال کیے ہیں اور ان کا استعمال نہایت برمحل اور برجستہ ہے ۔(۲)

شیخ کی عظمت ومقبولیت اور اعتراف جامعیت وکمال: شیخ عبدالحق جامع کمالات تھے، قدرت نے ان کی ذات میں گوناگوں اوصاف وفضائل جمع کر دیے تھے، متعدد علوم و موضوعات ان کا مرکز توجہ رہے اور انہوں نے مختلف فنون میں مفید کتابیں لکھیں، علمی حیثیت سے ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور وہ اپنے معاصرین میں اپنے علم وفضل کے اعتبار سے نہایت فائق وبرتر تھے، تجوید وقرأت، تفسیر وحدیث، فقہ وتصوف، تاریخ، تذکرہ اور شعر وادب وغیرہ تمام علوم میں ان کو مکمل دستگاہ تھی، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، سرعت استحضار، جودت ذہن، وسعت علم اور مذاہب سلف سے واقفیت واطلاع میں بہت ممتاز تھے، اپنی ان خوبیوں اور خصوصیات نیز دوسرے خدمات وکمالات کی بدولت ان کو غیر معمولی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی، فارسی اردو اور انگریزی میں ہندوستان کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں یا اردو و فارسی میں علما ومشائخ کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان سب میں حضرت شیخ کا ذکر عقیدت اور

(۱) حیات عبدالحق دہلوی، ص۱۱۲ تا ۱۲۰۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۵۵۔

اعتراف فضل وکمال کے ساتھ موجود ہے، اللہ نے انہیں ایسا قبول عام عطا کیا تھا کہ امراد سلاطین، علما وفضلا اور صوفیہ ومشائخ سب ہی ان کی تعریف وتحسین میں رطب اللسان ہیں اور کسی کو نہ ان کے فضل وکمال کے اعتراف میں تامل ہوا اور نہ کسی نے ان کے خلاف کسی قسم کی لب کشائی کی ہے، شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر نے ان کو اہل فضل وارباب سعادت میں بتایا ہے(۱) ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ ''وہ مجموعۂ کمالات ومنبع فضائل تھے اور تمام عقلی و نقلی علوم میں درس دیتے تھے''(۲) مرزا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں ذی کمال لوگوں کی جو فہرست دی ہے ان میں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں ''ملا عبدالحق حقی علوم کے اقسام میں مشاق و ماہر ہیں''(۳) خافی خان لکھتے ہیں کہ ''شیخ عبدالحق اس زمانہ کے فاضل ترین شخص اور مشہور محدث ہیں''(۴) حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید خاص محمد صادق ہمدانی کا بیان ہے کہ ''آج کل دہلی کی برکت وسعادت اور رونق وخوبی حضرت شیخ محدث ہی کی ذات والا صفات سے قائم ہے، وہ علوم متداولہ وفنون متعارفہ کے عالم اور عارف ہیں، مختصر یہ کہ فضلائے روزگار میں ہیں''(۵) محمد صالح کنبوہ لکھتے ہیں ''جملہ علوم کے جامع، فقہ، حدیث اور تفسیر میں یکتا تھے''(۶) عبدالحمید لاہوری رقم طراز ہیں ''وہ صوری ومعنوی فضائل سے آراستہ، وہبی وکسبی کمالات سے پیراستہ اور فہم دقیق کے مالک تھے، علوم دین کے کاشف اور نامور فاضل ومحقق تھے، عربیت، فقہ، حدیث، تصوف، تاریخ اور سیر وغیرہ اکثر فنون کے ماہر تھے اور ہر ایک میں ان کی تصنیفات مشہور ہیں''(۷) شاہنواز خان فرماتے ہیں کہ ''ان کے صوری، معنوی اور کسبی کمالات کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہو جاتا ہے جن کی خوب ترویج ہوئی''(۸) مولانا آزاد بلگرامی نے بھی انہیں صوری ومعنوی کمالات کا حامل قرار

---

(۱) تزک جہانگیری، ص ۳۸۵۔ (۲) منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۱۱۳۔ (۳) طبقات اکبری، ج ۲، ص ۴۶۳۔ (۴) منتخب اللباب، ج ۲، ص ۲۳۹۔ (۵) کلمات الصادقین، بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۶۸۔ (۶) عمل صالح، ج ۲، ص ۶۸۔ (۷) بادشاہ نامہ، جلد اول، ص ۳۴۱۔ (۸) مرأۃ آفتاب نما، بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق۔

دیا ہے(۱) علامہ زبیدی نے انہیں اکابر محدثین وفضلا میں بتایا ہے۔(۲)

مفتی غلام سرور نے انہیں اپنے زمانہ کے نادر المثال فضلا اور ذی کمال علما میں بتایا ہے(۳) سر سید احمد خان لکھتے ہیں ''آپ بڑے محدثوں میں ہیں، کمالات آپ کے آفتاب سے سوا روشن ہیں، کہ غایت شہرت سے احتیاج مجھ خاکسار کے بیان کی نہیں رکھے'' (۴) مولوی رحمان علی فرماتے ہیں ''ان کو خداداد مقبولیت حاصل تھی، کسی بھی معقولیت وانصاف پسند کو اس کے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی'' (۵) نواب صدیق حسن خان مرحوم ارشاد فرماتے ہیں ''ظاہری و باطنی کمالات سے متصف تھے(۶) ان کو بڑی شہرت نصیب ہوئی'' (۷) ان کے صاحبزادہ والا تبار نواب علی حسن خان رقم طراز ہیں ''فرط شہرت کی بنا پر ان کے فضائل و کمالات محتاج شرح و بیان نہیں'' (۸)

شیخ عبدالحق کے اساتذہ نے جن الفاظ میں اور جس طرح ان کی تحسین فرمائی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہوسکتی ہے، دانش مندان ماوراء النہر کا قول پہلے نقل کیا جا چکا ہے، یہاں سے پھر اس کا اعادہ کیا جاتا ہے، شاہ عبدالحق خود تحریر فرماتے ہیں:

در اثنائے درس بحثہا وسخنان مفید از طبع فاتر این حقہ می زائید اکثر ایں عزیزان می گفتند کہ ما از تو مستفیدیم و مارا بر تو منتے نیست۔(۹)	اثنائے درس میں جب میری طرف سے مفید بحث اور اچھی گفتگو ہونے لگتی تو یہ لوگ فرماتے تھے کہ ہم لوگ تم سے استفادہ کرتے ہیں اور ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی شیخ کے مکی و مدنی اساتذہ کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان سب نے ان کی مدح و تحسین کی ہے اور قاضی علی بن جار اللہ نے

---

(۱) سبحۃ المرجان، ص ۵۲۔(۲) تاج العروس، ج ۷، ص ۳۲۸۔(۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۴۔(۴) آثار الصنادید، ص ۹۴، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق کراچی۔(۵) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۹۔(۶) تقصار جیود الاحرار، ص ۱۱۴۔(۷) ابجد العلوم، ص ۹۰۰۔(۸) صبح گلشن، ص ۱۴۱۔(۹) اخبار الاخیار، ص ۲۹۲۔

خاص طور پر ان کی بڑی ستائش کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "یہ خطۂ ہند میں علم میں یکتا اور منفرد شخص ہیں، اللہ نے انہیں طلب وتحصیل میں کے لیے ہمت بلند اور منزل مقصود تک پہنچانے والی سعی جدو جہد کی توفیق عطا کی ہے، علم حدیث کی خدمت میں انہوں نے نمایاں اور بہت ممتاز حصہ لیا ہے کچھ عرصہ تک انہوں نے مجھ کو اپنی حاضری سے مفتخر اور مشرف فرمایا اور مسجد حرام میں صحیح بخاری اور الفیہ عراقی کے کچھ حصوں کا مجھ سے درس لیا لیکن وہ خود ایک بحر زخار تھے، اس لیے انہوں نے مجھ سے جتنا استفادہ کیا اس سے زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا، درس کے درمیان جب وہ بحث میں حصہ لیتے تو نہایت عمدہ بحث کرتے اور بڑی خوبی سے پڑھتے، اس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ استفادہ سے زیادہ افادہ کے اہل ہیں اور انہیں معتاد طریقوں کے مطابق اشتغال علم میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔" (۱)

صلاح وتقویٰ اور عبادت میں انہماک: شیخ کے ابتدائی واقعات میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ بچپن اور طالب علمی کے زمانے ہی سے عبادت وریاضت سے ان کی دلچسپی بڑھی ہوئی تھی اور وہ اسی زمانے سے اوراد وظائف اور سحر خیزی اور شب بیداری کے عادی تھے، اس طرح شروع ہی سے علم کی طرح ان کو عمل سے بھی شغف تھا اور وہ زہد وتقویٰ میں بھی امتیازی شان کے مالک تھے، انہوں نے خود لکھا ہے کہ تحصیل علم میں غیر معمولی شغف وانہماک کے باوجود زمانہ طفولیت ہی سے نماز وظائف کی کثرت، شب خیزی اور دعا ومناجات میں بھی اپنی فطرت کی اقتضا کے مطابق برابر اس قدر مشغول رہتا تھا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ (۲)

عبادت سے یہ شغف آخر عمر تک قائم رہا اور بڑھاپے میں بھی وہ اسی ذوق وشوق کے ساتھ طاعت الٰہی میں سرگرم عمل رہتے تھے، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ:

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۲و۲۰۳۔ (۲) ایضاً، ص ۲۹۳۔

"نوے برس کی عمر ہو جانے کے بعد بھی اطاعت الٰہی میں انہماک اور عبادات کے التزام کا وہی عالم تھا اور وہ اسی شان سے ریاضت و ورد میں مشغول رہتے تھے جس طرح جوانی میں مشغول رہتے تھے۔"(۱)

خافی خان لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالحق صلاح و تقویٰ میں جو علم باعمل کے لیے لازم اور ضروری ہے، ممتاز و فائق تھے، دم واپسیں تک فرائض و سنن کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔"(۲)

غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں:

"علم و عمل اور زہد و ریاضت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔"(۳)

اصلاحی و دینی خدمات: شیخ عبدالحق اپنے دور کے مصلح و مرشد بھی تھے، سترہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی اور سماجی اصلاح و تربیت کا سہرا حضرت مجدد الف ثانی کی طرح ان کے سر بھی بندھتا ہے، البتہ دونوں کا انداز مختلف اور طریقۂ کار جدا تھا، شیخ عبدالحق نے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اور نہ بہت مجاہدانہ اور سرفروشانہ انداز میں اصلاح و تجدید کا کام کیا مگر وقت کے فتنوں اور گمراہیوں کا سد باب، باطل افکار و نظریات کی سرکوبی اور مسلمانوں کی معاشرتی و دینی اصلاح ان کے بھی پیش نظر رہی اور انہوں نے اسی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، وہ علمی آدمی تھے اور ان کی طبیعت اعتدال و سکون پسند تھی اس لیے تصادم اور ٹکراؤ سے کنارہ کش رہ کر انہوں نے اصلاح و تربیت کا کام انجام دیا، منکر پر نکیر سے زیادہ معروف کی تلقین و اشاعت پر زور دیا۔

اکبر کی غلط روش اور نادرست مذہبی پالیسی کی وجہ سے اس وقت جو خرابیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے بارہ میں دو طرح کے رجحانات پائے جاتے تھے، ایک گروہ تو اکبر کے

(۱) بادشاہ نامہ، ج ۱، حصہ دوم، ص ۳۴۴۔ (۲) منتخب اللباب، ج ۱، ص ۱۴۰۔ (۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۴۔

مبتدعانہ اعمال اور گمراہ کن طریقوں کو نہ صرف جائز اور روا بتاتا تھا بلکہ ان کی پرزور حمایت اور تائید بھی کرتا تھا مگر دوسرا گروہ ان باتوں کو شریعت اسلامی کے بالکل منافی سمجھتا تھا اور نہایت جوش و شدت سے ان کی مخالفت و مقابلہ کے لیے کمر بستہ رہتا تھا، شیخ عبدالحق کی روش ان دونوں گروہوں سے الگ تھی، انہوں نے اپنی سرگرمیاں علم ہی کی اشاعت و فروغ تک محدود رکھیں اور ارباب حکومت سے کشمکش و مزاحمت کو پسند نہیں کیا، ان کی خاموش مگر ٹھوس تحریک کے اثرات نہایت دوررس اور گہرے نکلے، جو لوگ شیخ عبدالحق کے کاموں کو اس نوعیت و حیثیت سے محسوس نہیں کرتے وہ ان کی قدر و قیمت کو بالکل ختم کر دیتے ہیں، حالاں کہ شیخ کی علمی سرگرمیوں، حدیثی خدمات، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا تمام تر مقصد اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے دین و شریعت، ترویج سنت اور اپنے زمانہ کی گمراہیوں اور خرابیوں کی اصلاح تھا، انہوں نے کتاب و سنت کے علم و تعلیم کا نظام قائم کر کے ان کی صحیح روح لوگوں میں پھونک دی اور دین کی اصل حقیقت واضح کر کے لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح و تصحیح کر دی اور باطل افکار و خیالات اور بدعات و منکرات کے فروغ کو روک دیا، اس لیے مسلمانوں کی مذہبی و دینی اصلاح کے سلسلہ میں ان کا نام اور کارنامہ بھی بڑا اہم ہے، ڈاکٹر سید معین الحق نے بجا طور پر لکھا ہے:

> ''شیخ عبدالحق ان بزرگوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اکبری عہد کے الحاد کو روکنے کی مؤثر کوشش کی، اس سلسلہ میں ان کی تصانیف ہی اہم نہیں ہیں بلکہ ان کے مکاتیب بھی قابل ذکر ہیں، جوانی میں آپ کو اس گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی جس کی سرکردگی ابوالفضل کرتا تھا لیکن باوجودیکہ آپ کے فیضی سے ذاتی تعلقات تھے آپ نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور ساری زندگی درس و تدریس اور اصلاح معاشرہ کے لیے وقف کر دی، مسلمانان برصغیر کی دینی اور معاشرتی تاریخ میں شیخ عبدالحق کی

دینی اور معاشرتی تاریخ میں شیخ عبدالحق کی شخصیت بہت نمایاں مقام پر نظر آتی ہے۔"(۱)

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا بیان پہلے نقل کیا گیا تھا کہ مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں، حدیث کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے علما اور صوفیہ بس متاخرین کی فقہ و معقولات میں الجھ کر رہ گئے، بددینی اور بدعقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے، شیخ عبدالحق نے اس جہل کے دور کرنے کی کوشش کی اور اس لیے آج ہم ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ (۲)

ذیل میں ہم شیخ عبدالحق کے علمی، دینی اور سماجی اصلاح کے بعض پہلوؤں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

دین کی غلط تعبیر اور بے جا تاویل و تحریف کی مخالفت: شیخ کے زمانہ میں کتاب و سنت کی تعلیم کو نظر انداز کر دینے اور کلام اور فقہی جزئیات سے سروکار رکھنے کی وجہ سے فلسفہ کا ذوق اور عقلیت پسندی کا رجحان اتنا بڑھ گیا تھا کہ نصوص دین کی غلط تعبیر اور بے جا تاویل و توجیہ ہی نہیں ان میں تحریف و تلبیس بھی کی جانے لگی تھی، اس طرح گوناگوں باطل افکار و خیالات پرورش پانے لگے تھے اور متعدد خرابیاں اور گمراہیاں رونما ہو رہی تھیں، شیخ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب و سنت کے درس و تعلیم کی جانب لوگوں کا رجحان پیدا کر کے انہیں دین کی اصل حقیقت اور صحیح روح سے واقف کر دیا، ان کے نزدیک باطل خیالات اور گمراہ کن نظریات کا علاج اور مداوا یہی تھا، اس لیے انہوں نے اس کی جانب اپنی مکمل توجہ مرکوز کر دی اور فلسفہ و کلام میں غور و خوض کو مذموم قرار دے کر عقلیت پسندی اور تاویل و تحریف کے دروازے کو مسدود کرنے کی فکر و سعی کی، ان کی متعدد تصنیفات اپنے دور کے رجحانات کے

---

(۱) حاشیہ آثار الصنادید، ص ۹۴، ۹۵۔ (۲) الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۳۷۔

ردعمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، ان میں اس قسم کے شکوک وشبہات اور باطل افکار ونظریات کی بڑی خوبی سے تردید کی گئی ہے۔

عقیدۂ نبوت کے منافی امور کا ردو ابطال: اکبری عہد کے فتنوں سے عقیدۂ نبوت و رسالت پر براہ راست زد پڑتی تھی، انہوں نے مدارج النبوۃ تصنیف کر کے عقیدۂ نبوت و رسالت کا اثبات کیا ہے، وحدت ادیان کا فتنہ بھی اسی سلسلہ کا شاخسانہ تھا، چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ خدا پر ایمان ہی اصل ہے، اس کے تقاضے مجرد عقیدۂ توحید کو مان لینے سے پورے ہو جاتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، شیخ نے مدارج النبوۃ میں آپ کے حقوق، مراتب ومناصب پر مفصل بحث کر کے بتایا کہ اسلام وایمان کی تکمیل کے لیے توحید ہی کی طرح نبوت محمدی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

نظریۂ الفی بھی اسی دور کی پیداوار ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام صرف ہزار برس کے لیے تھا، اب یہ مدت پوری ہوگئی اس لیے احکام دین اور شریعت محمدی بھی متروک ہوگئی اور اس کے اتباع کی ضرورت نہیں رہ گئی، شیخ نے اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس غلط نظریے اور گمراہ کن خیال کی بھی پرزور تردید کی اور ثابت کیا کہ احکام دین اور شریعت محمدی دائمی ہیں جن کی اتباع ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کے لیے ضروری ہے اور ایک ہزار سال کے بعد بھی ان میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔

مہدوی تحریک کا ردو ابطال: مہدوی تحریک سے بھی نبوت کے عقیدہ پر ضرب پڑ رہی تھی، شیخ عبدالحق کی ولادت جس زمانہ میں ہوئی اس وقت مہدوی تحریک پورے عروج پر تھی اس کا ذکر اس سے پہلے تذکروں میں آچکا ہے، اس کے بانی سید محمد جونپوری اور ان کے پیروؤں کی اولین جماعت بڑے پاک نفس اور خدا پرست لوگوں کی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت وحق پرستی پر پڑی تھی، یعنی

دعوت وتبلیغ حق واحیائے شریعت وقیام فرض، امر بالمعروف ونہی عن المنکر
اس کا مقصد اصلی تھا اور خود سید محمد اوران کے پیرووں کی پہلی جماعت کے
اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست لوگ تھے۔''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں یہ ایک اصلاحی و دعوتی تحریک تھی جس کا مقصد احیائے شریعت اور امر بالمعروف کا قیام تھا اور یہ اس دور کے علمائے سو اور جاہ پسند لوگوں کی دنیا طلبی اور جاہل صوفیہ کی بدعات ومنکرات کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، مگر سید محمد نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو علمائے سو اور دنیا پرست مشائخ کی طرف سے اس کی مخالفت کا ایک طوفان امنڈ پڑا، سلیم شاہ کے دور میں شیخ علائی اور شیخ عبداللہ نیازی وغیرہ مہدوی تحریک کے خاص داعی ومبلغ تھے، دوسری جانب مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری شیخ الاسلام وغیرہ نے اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا، انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے بادشاہ کو بھی ورغلایا، اس کی وجہ سے اس تحریک کے حامیوں کو بڑے دشوار گزار اور سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

آگے چل کر مہدوی تحریک کی اصلی خصوصیات باقی نہیں رہیں اور اس کے پیرووں میں بھی بڑی شدت اور غیر معمولی غلو پیدا ہو گیا اور اس کے عقائد ونظریات میں بھی گوناگوں خرابیاں رونما ہو گئیں، مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

''یہ فرقہ سید محمد جونپوری کی طرف منسوب ہے جن کی نسبت بیان
کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے، اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے
عقائد میں بہت سی نئی نئی باتیں اور حد غلو سے بھی گزرے ہوئے اعتقادات
شامل ہو گئے ......اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتدا میں کچھ ہوتے ہیں اور
آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں اور فتنہ غلو وتاویل پچھلی امتوں کی طرح

(۱) تذکرہ مرتب مالک رام، ص۲۷۔

اس امت کی ہر جماعت کے لیے بھی ایک بڑا فتنہ رہا ہے، یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت اخلاق کے غلو و محدثات میں گم ہو گئی۔"(۱)

یہاں تک کہ اس کے نظریات عقیدہ نبوت کے منافی ہو گئے، اس بنا پر علمائے حق اور محدثین کو بھی اس سے اختلاف ہوا اور شیخ علی متقی، شیخ ابن حجر مکی اور علامہ محمد بن طاہر وغیرہ اس کی مخالفت میں بہت پیش پیش رہے، شیخ عبدالحق نے بھی اپنے ان بزرگوں کی روش کے مطابق مہدوی تحریک کی مخالفت کی مگر وہ علمی شخص اور اعتدال پسند آدمی تھے، اس لیے اپنے دور کے فتنوں کے استیصال کے لیے وہ علمی انداز اختیار کرتے تھے اور ان کی مخالفت اعتدال پر مبنی ہوتی تھی، عقیدۂ نبوت کے باب میں مہدوی تحریک کی بے اعتدالی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ "سید محمد کا یہ عقیدہ کہ جو کمال محمد ﷺ کو حاصل تھا وہی مجھ کو بھی حاصل ہے، فرق صرف یہ ہے کہ آپ کو وہ کمال اصالتاً ملا تھا اور مجھے تبعیتاً ملا ہے۔"

علما و مشائخ کی فتنہ سامانی سے بیزاری: یہ ساری مصیبت اکبری عہد کے نام نہاد علما و مشائخ کی لائی ہوئی تھی جو دنیا کی طمع اور مال و زر کی حرص میں دیوانہ ہو گئے، یہ خود فسق و فجور میں ملوث تھے مگر دوسروں کی تفسیق، تضلیل اور تکفیر کا ہنگامہ برپا کیے رہتے تھے، ان کے گھر میں مال و دولت کا انبار جمع رہتا تھا مگر اپنے فتووں اور حیلوں کا سہارا لے کر ہمیشہ زکوٰۃ نکالنے سے اپنے کو بچا لیتے تھے، سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنا سارا اثاثہ اپنی بیویوں کے نام کر دیتے اور جب بیویوں کی ملکیت میں حولان حول کی نوبت آتی تو اسے اپنے نام منتقل کر لیتے تھے، یہ لوگ ڈاڑھی منڈواتے، فریضۂ حج ساقط ہو جانے اور اکبر کو سجدہ کرنے کا حکم دیتے تھے، گمراہ صوفیہ و مشائخ نے اپنے خودساختہ اعمال و اشغال اور مجاہدات کو تصوف کا نام دے رکھا تھا، انہوں نے طریقت کو شریعت سے علاحدہ کر کے بہت سی عبادات و احکام سے

(۱) تذکرہ مرتبہ مالک رام، ص ۴۷۔

اپنے کو دستکش کر لیا تھا۔

اس عہد کا سب سے بڑا فتنہ اکبر کا متوازی دین الٰہی تھا مگر اس کے مذہبی انحراف کا باعث بھی یہی علما و صوفیہ تھے، وہ ابتدا میں مذہب سے برگشتہ نہ تھا بلکہ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اور شعائر دین کا احترام کرتا تھا مگر جب علمائے سو کے فتووں اور اجتہادات، گمراہیوں، بدعتوں اور فسق و فجور کا بازار گرم ہو گیا اور اس کی موشگافیوں اور کج بحثیوں نے دین کو بازیچۂ اطفال بنا دیا تو اکبر نہ صرف ان کے طرز عمل سے بلکہ رفتہ رفتہ دین ہی سے متنفر ہو گیا۔

ان لوگوں نے ہر کس و ناکس اور اہل و غیر اہل تمام لوگوں کو اجتہاد کا حق دے دیا، اس طرح ہر شخص مذہبی امور و مسائل میں دخل دینے اور رائے زنی کرنے لگا، اکبر کو بھی اجتہاد کا حق درباری علما نے دے دیا تھا، یہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت شارع اور مطاع کی ہو گئی تھی، اس کے دربار میں مختلف مذاہب کو ماننے والے جمع ہوتے تھے، اس نے ہر مذہب و مسلک کے لوگوں کے لیے عام کر دیا تھا، ان مجلسوں میں کھل کر اسلام اور شریعت محمدی کو تختۂ مشق اور بحث و تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور جو چیز بھی خلاف عقل معلوم ہوتی اس کو بے تکلف رد کر دیا جاتا تھا، امرا و حکام دین کے بارے میں کج بحثی کرتے اور من مانی تاویل کر کے بادشاہ کو خوش کرنے کی فکر میں رہتے، اس کی خوشنودی کے لیے دین میں ہر قسم کی کتر بیونت جائز قرار دے دی گئی تھی، شیخ عبدالحق محدث ان رجحانات کی اصلاح میں بھی لگے، ان کے اس زمانہ کے بعض امرا سے اچھے تعلقات تھے جس کی تفصیل آگے آئے گی، شیخ نے ان لوگوں کو خطوط لکھ کر انہیں دین و شریعت کی حفاظت و پاسبانی کی دعوت دی اور شرور و فتن سے باز رہنے کی تلقین فرمائی، اس طرح ان کی مساعی سے دین و شریعت بازیچۂ اطفال بننے اور بے جا تاویل و تحریف کی زد میں آنے سے محفوظ رہی۔

عقلیت پسندی اور فلسفہ کی تردید: کتاب و سنت سے انحراف و برگشتگی اور عقلیت و فلسفہ کا زور اس قدر بڑھا کہ امت کے اندر بڑا اختلاف و انتشار پیدا ہو گیا اور لوگ اس دین

وشریعت کو بھول گئے جو خیر القرون میں رائج تھا، اس کی جگہ انہوں نے جو دین اختیار کر رکھا تھا، اس میں عجمی رنگ آمیزیاں اور فلسفہ وکلام کی موشگافیاں شامل ہو گئی تھیں، شیخ عبدالحق نے عقلیت پسندی کے اس رجحان اور فلسفیانہ قیل وقال کی سخت مذمت کی اور دین کی صحیح حقیقت ونوعیت واضح کر کے اس کو اختیار کرنے کی دعوت دی، اس موقع پر ان کی تحریروں کے اقتباس نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا، فرماتے ہیں:

> ''صحابہ وتابعین وتبع تابعین کے زمانوں کے بعد جو بمصداق حدیث نبوی خیر القرون تھے، عقائد واصول میں نزاع اور اختلافات پیدا ہوئے، چوں وچرا پیدا ہوا، سنت کا نور بجھنے لگا اور بدعت کی تاریکیاں دنیا پر چھانے لگیں، ہر شخص کے سر میں نیا سودا اور ہر ایک کے دل میں نئی رائے نے قدم جمایا، تاویل کے دروازے کھل گئے، ظواہر نصوص متروک ہوئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ اور مذہب سلف عزیز الوجود اور اجنبی ہو گیا، بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا الخ (اسلام شروع میں اجنبی تھا اور پھر اجنبی ہو جائے گا تو خوش خبری ہو ان کے لیے جو اس اجنبی اسلام پر جمے رہیں) کا منظر سامنے آ گیا۔
>
> سخت ترین حادثہ اور عظیم ترین مصیبت جو دین اسلام اور اعتقاد سلف پر آئی وہ علم فلسفہ کا ظہور اور عربی میں اس کا ترجمہ تھا جو بعض خلفائے عباسیہ کے زمانے میں واقع ہوا، اس سے مخالفوں اور دشمنوں کے ہاتھ میں جنگ وجدال کا حربہ آ گیا، بعضوں نے علم ودانش اور خصوصاً جدید ونادر علم کے حرص میں اور بعضوں نے عقائد اسلام اور قواعد ملت کو برباد وتباہ کرنے کے ارادے سے فلسفہ یونان میں توغل کیا اور اس دریا میں غوطے لگائے، علمائے دین اور اساطین امت کی ایک جماعت نے بھی مذہب سلف کی

حفاظت اور سنت کی پاسبانی کے قصد سے اس کو حاصل کیا اور عقائد شرعیہ کے اثبات اور فلسفیات کے رد و ابطال کے لیے مستعد ہوئے کیوں کہ کسی چیز کو جانے بغیر اس کا رد نہیں کیا جا سکتا، نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفیات خوب شائع ہوئے، جنگ و جدال اور قیل و قال کا دائرہ وسیع ہوا اور بازار سخن گرم ہو گیا، یہیں سے علم کلام کی پیدائش ہوئی، اگرچہ اہل اسلام اور ارباب علم کلام گمراہ فرقوں کے رد و ابطال کے قصد سے اس میدان میں داخل ہوئے تھے لیکن اس کے ضمن میں خود انہیں بھی نقصان عظیم پہنچا اور ان کی یہ مشغولیت عقائد اور قواعد دین میں تذبذب کا سبب بن گئی، تشکیک و تردید کا دروازہ کھل گیا، کم ہی کوئی ایسا ہوگا جو علم کلام میں خوض و غلو کے بعد گرداب حیرت سے سلامت نکلے اور اپنے سرمایہ یقین کو محفوظ رکھ سکے، ہاں بس اللہ ہی جسے بچائے تو بچائے اور یہ بہت نادر ہے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

راہ سلامتی کے رہرو اور طریق استقامت کے طالب پر لازم ہے کہ فلسفیات اور علم کلام میں توغل نہ کرے اور دلائل کلامیہ کی کج بحثیوں سے اپنا دامن بچائے، اہل سنت والجماعت کے اعتقاد کو دل میں جمائے اور ان کے اجمالی دلائل پر اکتفا کرے، منقول کو معقول کے تابع نہ کرے اور بے جا تاویل و تشکیک کے دروازے بند کر دے۔

دین کے بہت سے اصولی عقائد ایسے ہیں کہ وحی الٰہی کے سوا کوئی انہیں حل نہیں کر سکتا اور عقل انسانی وہاں سپر انداز ہو جاتی ہے، جب آج تک عقل انسانی ''انا'' کی حقیقت دریافت نہ کر سکی تو پھر خالق انا کی حقیقت کا پتہ کیا پائے گی، انسان کی ہستی سے قریب اس کا لطیفہ انانیت ہے کہ اسی سے وہ ''انا'' کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے ''میں نے کہا'' لیکن کیا

آج تک کوئی عاقل اور کوئی فلسفی اس کا فیصلہ کر سکا کہ ''انا'' کی حقیقت کیا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنکہ خود را شناخت نتواند

آفرینندہ را کجا داند

تو کہ در ذات خود زبوں باشی

عارف کردگار چوں باشی''(۱)

متکلمین کو فساد کا سرچشمہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس فساد کی بنیاد متکلمین ہیں اور اس کا باعث و سرچشمہ فتنۂ فلسفہ ہے، گو ان کو اس کی احتیاج و ضرورت تھی اور ان کے لیے سکوت کی گنجائش نہ تھی تاہم اس سے بڑا نقصان ہوا، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تحقیق دین اور حکمت و شریعت کی تطبیق ہے، یہ محض ان کی سخن طرازی اور لفاظی ہے، یہ لوگ فلسفہ و کلام کے جال میں پھنس کر جادۂ حق سے باہر ہو جاتے ہیں اور حق کو باطل کے تابع اور اس میں مخلوط و ممزوج کر دیتے ہیں، یہ شروع ہی سے دین اور مسلمانوں کے عقائد کو اختیار کر کے کیوں نہیں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔''(۲)

ان اقتباسات سے ان کی دینی غیرت وحمیت اور فلسفہ و کلام سے اس بنا پر ان کی نفرت و بیزاری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے اسلام کو نقصان عظیم پہنچا اور حیرت و درماندگی کے علاوہ ان کا کوئی حاصل نہیں۔

اسی طرح دوسرے باطل افکار و نظریات اور گمراہ فرقوں کے عقائد و خیالات کی

---

(۱) مرج البحرین قلمی نسخہ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۹۶ تا ۹۸۔ (۲) نکات الحق مطبع احتشامیہ، مراد آباد، ص ۱۱۳، بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۹۹۔

اصلاح و درستگی کو بھی انہوں نے اپنی مہم میں شامل کر لیا اور ان کی تردید اپنی تحریروں کے ذریعہ کی، مثلاً جبریہ وقدریہ دونوں کی نفی کر کے اس سلسلہ میں حق واعتدال کے مسلک کی اس طرح توضیح کی ہے:

''اہل حق کے نزدیک جبریہ وقدریہ دونوں کا مسلک باطل ہے، نہ جبر ہے نہ قدر اور حق یہ ہے کہ عامل کو اپنی جانب منسوب کرے اور اس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی رکھے کہ وہ اللہ کے خلق وتوفیق سے ہوا ہے، قضا وقدر اور اختیار کا مسئلہ غوامض واسرار میں ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس میں بحث لاطائل ہے، کیوں کہ حقائق واعمال میں سے کوئی چیز ان اسرار کے کشف پر موقوف نہیں ہے، عمل میں سعی واجب ہے، کیوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں سے اوامر ونواہی کے متعلق سوال کرے گا، اپنی ذات وصفات کے بارہ میں نہیں پوچھے گا۔''(۱)

شیعیت کے زور واثر کو مٹانے کے لیے بھی وہ سرگرم رہے، محرم میں رائج اعمال و اشغال اور بدعات واحداث کی تردید کے لیے انہوں نے **ماثبت بالسنة** لکھی اور **تکمیل الایمان** میں مسئلہ خلافت پر بحث کر کے شیعہ فرقہ کے اعتراضات واعتقادات کا معقول و مدلل رد لکھا۔(۲)

افراط وتفریط سے اجتناب اور اعتدال وسلامت روی: وہ دینی امور ومسائل میں حد درجہ محتاط ومعتدل روش پر گامزن تھے اور ان میں کسی طرح کی بے اعتدالی اور بے راہ روی کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ عموماً الوہیت ونبوت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اسی طرح نبوت اور ولایت کے حدود ومراتب بھی ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیے جاتے ہیں، حالانکہ ان چیزوں میں ادنیٰ لغزش اور معمولی بے احتیاطی بھی کفر وضلال کا موجب ہوتی ہے،

(۱) المحدث ثان الدکتور محمد احمد صدیقی الٰہ آباد، ص ۱۶ و ۱۷۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۳۸۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے والہانہ عقیدت وشیفتگی تھی اور وہ عشق رسول میں دیوان رہتے تھے مگر اس کے باوجود الوہیت ونبوت کے دقیق ونازک فرق کو کبھی نظر انداز نہ کرتے تھے، اسی طرح تصوف سے بھی ان کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی اور اولیا وصوفیہ سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے مگر کبھی کسی ولی کا درجہ انبیائے کرام کے مساوی قرار دینے کی غلطی ان سے سرزد نہ ہوئی، اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''اس باب میں یہ ضابطہ نگاہ میں رہنا چاہیے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام یہ ہے کہ جو چیزیں مرتبہ الوہیت اور حق تعالیٰ کے صفات میں داخل ہیں ان کے سوا اور ان سے کمتر جو کمال ومنقبت بھی ہوسکتی ہے وہ سب آپ کے لیے ثابت ہے، تمام مرتبے اور صوری ومعنوی کمالات اللہ کے بندے اور اس کے رسول میں موجود ہیں مگر عبادت وبندگی جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے وہ اس کامل اور حقیقی بندہ کے لیے بھی نہیں کی جاسکتی کیوں کہ خدا خدا ہے اور آپ اس کے بندے ہیں، رہے دوسرے لوگ تو وہ سب کے سب اللہ کے طفیلی بندے ہیں۔''(۱)

الوہیت ونبوت کی نکتہ شناسی اور اس بارہ میں عدم افراط وتفریط کا ثبوت ان کے اس شعر میں بھی ملتا ہے۔

مخواں اورا خدا از بہر امر شرع وحفظ دیں
دگر ہر وصف کش میخواہی اندر مدحش انشا کن(۲)

سلاطین وامراء سے تعلقات اور ان کی اصلاح کے لیے سعی وکوشش: شاہ عبدالحق محدث دہلوی کو کئی سلاطین کا زمانہ ملا، وہ سلیم شاہ سوری کے عہد میں پیدا ہوئے اور شاہجہاں کے سنہ جلوس میں وفات پائی، اکبر اور جہانگیر کے دور کو انہوں نے اچھی طرح دیکھا تھا مگر وہ

(۱) مکتوب نمبر۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۰۴۔ (۲) اخبار الاخیار، ص۳۰۲۔

اپنی طبعی عزلت گزینی اور گوشہ پسندی نیز علمی ذوق و مشغلہ کی وجہ سے سلاطین و امرا سے دور رہنا چاہتے تھے، جوانی میں اکبر کے دربار میں فتح پور بھی غالباً اپنے علمی ذوق کی تسکین ہی کے لیے گئے تھے لیکن وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ایسے کبیدہ خاطر ہوئے کہ حجاز ہی میں جا کر سکون ملا، وہاں سے واپسی کے بعد بھی درباری ماحول سے وحشت و بیزاری کم نہ ہوئی، چنانچہ فیضی کی طلب و اصرار کے باوجود وہاں جانا پسند نہ کیا۔

اس طرح اکبر کے دور میں وہ دربار سے نہ کسی طرح متوسل ہوئے اور نہ اس سے کوئی واسطہ و تعلق رکھا، البتہ فتح پور میں قیام کی وجہ سے بعض امرا سے ان کے ذاتی مراسم و تعلقات ہو گئے تھے جو آخر تک باقی رہے، ان امرا سے تعلق اس لیے بھی رکھا کہ یہ اکبر کی بے دینی کے باوجود دیندار تھے اور بادشاہ کی بے دینی کے مخالف تھے مگر اس کے دباؤ کی وجہ سے خاموش رہتے تھے، شیخ نے ان لوگوں کی جانب توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی اور ان کی اصلاح اور ان کے عقائد کی تصحیح کی فکر میں لگ گئے، انہیں خطوط لکھ کر ترویج دین پر آمادہ کرتے اور حکومت کی بے دینی کے خلاف سرگرم عمل ہونے کی ترغیب دیتے، انہوں نے خواجہ باقی باللہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی اس عہد کے فتنوں کا ذکر کر کے ان کے بارہ میں تشویش ظاہر کی ہے۔

عہد اکبری کے امرا میں نواب مرتضیٰ خان فرید سے شیخ کے نہایت مخلصانہ روابط تھے، ان کے مجموعۂ مکاتیب میں ان کے نام کے متعدد خطوط ہیں جن میں ان کو فرائض منصبی بجالانے اور ان کی دینی حمیت کو برانگیختہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے، اسی طرح نواب عبدالرحیم خانخاناں کو بھی انہوں نے متعدد اصلاحی خطوط لکھے، خانخاں بھی اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہے اور اکبری الحاد سے کنارہ کش تھے، ان دونوں کے علاوہ شیخ عبداللہ نیازی، ملا عبدالقادر بدایونی اور مرزا نظام الدین احمد بخشی سے بھی انہوں نے اصلاح معاشرت اور اشاعت دین کے جذبہ کے ماتحت تعلق رکھا، اس طرح وہ امرا کی اصلاح اور اکبر کی بے دینی

کے خلاف انہیں اکسانے کے لیے پوری طرح سرگرم عمل تھے مگر ان کی یہ اصلاحی سرگرمیاں احتیاط واعتدال کے ساتھ ہوتی تھیں، وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں ''سخن مبالغہ گفتہ نہ شود واز حیطہ احتیاط کہ روش ایں فقیر است بیرون نیفتم۔''(۱)

شیخ کی یہ کوششیں رائیگاں نہ گئیں، فیضی اور ابوالفضل کی وفات کے بعد الحاد اور بے دینی کا اثر کم ہونے لگا اور اکبر کا دین الٰہی کے لیے جوش وخروش بھی زیادہ نہیں رہا، اس طرح اس کے آخری دور میں دیندار امرا کا اثر بڑھنے لگا، شیخ فرید اس کے خیالات میں تبدیلی لانے میں بھی کامیاب ہوئے، اس کی موت کے بعد ان کے خاص اثر کی وجہ سے جہانگیر تخت نشین ہوا تو اکبر کے دور کی بے دینی کا خاتمہ ہوگیا۔

جہانگیر کے دور میں ''دین الٰہی'' نے دم توڑ دیا (۲) اور بہت کچھ حالات میں بھی اصلاح وتغیر رونما ہوا مگر اکبر کے دور میں ملحد فلسفیوں، دین فروش علما اور مکار صوفیہ نے جو فتنے پھیلا رکھے تھے وہ آسانی سے ختم ہونے والے نہ تھے، ان کی سرکوبی کے لیے اس وقت جو لوگ میدان عمل میں زیادہ سرگرم عمل رہے، ان میں حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام بھی ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، شیخ نے کتاب وسنت کا نور پھیلانے اور روشن کرنے کے لیے ایسی مفید کتابیں لکھیں جن سے لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح ہوئی، ان کے ذہن وفکر بدلے اور ان کے خیالات ونظریات کا رخ صحیح سمت میں ہوگیا۔

جہانگیر عملاً جیسا بھی رہا ہو مگر الحاد اور بے دینی سے اس کو واسطہ نہ تھا، اس لیے شیخ کے اس سے یک گونہ روابط رہے، شیخ کا حضرت خواجہ باقی باللہ سے بھی تعلق تھا، حضرات نقشبندیہ کا اصول ودستور یہ ہے کہ خرابیوں کی اصلاح کے لیے ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کے بجائے ان سے ربط وضبط پیدا کیا جائے، چنانچہ اس اصول کے مطابق شیخ عبدالحق

---

(۱) بحوالہ تاریخ ادبیات، ج ۴، ص ۲۲۵۔ (۲) تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان وہند، جلد دوم، عربی ادب مضمون مولانا عبدالقدوس ہاشمی، ص ۲۲۳ و ۲۲۴۔

نے بھی جہانگیر سے کنارہ کش رہنا پسند نہیں کیا، اس کے لیے رسالہ نوریہ سلطانیہ تصنیف کیا، جس میں قواعد وارکان سلطنت پر مفصل بحث کی ہے اور اسے اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کیا ہے، جہانگیر کی تخت نشینی میں نواب مرتضیٰ خان فرید کو بڑا دخل تھا، اس بنا پر شیخ محدث نے جہانگیر کے تخت نشین ہونے کے بعد ہی نواب صاحب کو ایک مکتوب لکھا جس میں اصلاح احوال کی طرف خاص توجہ دلائی اور یہ تاکید بھی کی کہ اسے بادشاہ کی نظر سے گزارا جائے (۱) جہانگیر نے تزک میں جس انداز سے شیخ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے شیخ سے عقیدت تھی اور وہ ان کی عظمت، بزرگی اور علمی بلند پائیگی کا معترف تھا اور اس سے متاثر ہو کر ملاقات کے وقت اس نے ان کو بہت سی عنایات ونوازشات کے ساتھ رخصت کیا اور جاگیر کے طور پر ایک گاؤں بھی نذر کیا۔ (۲)

جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا تو شیخ نے اس کی رہنمائی اور خیر خواہی کے لیے بھی ایک رسالہ "ترجمة الاحاديث الاربعين فى نصيحة الملوك والسلاطين" تالیف کیا، شاہجہاں کا لڑکا شہزادہ داراشکوہ بھی شیخ کا معتقد تھا اور اس نے ان سے فرمائش کی کہ زبدۃ الآثار کو فارسی میں لکھیں۔ (۳)

مولانا غلام معین الدین عبداللہ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار میں شیخ کو اس قدر رسوخ اور تقرب حاصل تھا کہ وہ ضرورت مند لوگوں کی ان بادشاہوں سے سفارش کر کے ان کی حاجت روائی بھی کرتے تھے اور مجرم لوگوں کو سزا بھی دلاتے تھے۔

چوں درزمان جہانگیر وشاہجہاں بادشاہ قبولیت   جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں چونکہ ان کو

---

(۱) مرآۃ الحقائق، ص ۶۵ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۰ و تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند، جلد دوم، عربی ادب، ص ۱۷۳۔ (۲) مرآۃ الحقائق، ص ۸۹ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۸۔ (۳) مقدمہ نوریہ سلطانیہ ڈاکٹر سلیم اختر، ص ۱۴۔

تمام داشت اکثر حاجات فقرا و مساکین بعرض می رسانید و بانجاح مرادات و اسعاف مقتضیات و اصل می گردانید و در دفع زندقہ و الحاد بسیاری کوشید و قائل شطحیات را بحد و تعزیری رسانید۔(۱)

بڑی مقبولیت حاصل تھی اس لیے اکثر فقرا و مساکین کی ضرورتوں کے لیے ان لوگوں کی خدمت میں عرض گزار ہوتے اور ان کی حاجت روائی اور مطلب برآری کرتے، شیخ زندقہ والحاد کو دفع کرنے کے لیے بھی بہت کوشاں رہتے تھے، چنانچہ شطحیات کی طرف مائل لوگوں پر حد و تعزیر بھی جاری کراتے۔

اتباع سنت کی دعوت: فلسفہ و عقلیت پسندی اور دوسرے باطل افکار و رجحانات کی مذمت و تردید کے ساتھ ہی انہوں نے اتباع سنت اور طریقۂ محمدی کو اختیار کرنے کی تلقین و ترغیب بھی دی، وہ خود اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے اور اسی کی اشاعت و دعوت ان کی زندگی کا مقصد رہا، ان کی تصنیفات و مکاتیب میں بھی اس پر خاص زور دیا گیا ہے، ان کے نزدیک تصوف کا مقصد و منشا بھی یہی ہونا چاہیے، اس میں اصلی کمال سنت و طریقۂ محمدی کے اتباع ہی کے ذریعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کے بغیر سلوک و طریقت بے حقیقت و لاحاصل ہے، ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اصلی اور بنیادی بات اصول کے ساتھ تعلق، اس منبع انوار سے اقتباس نور، اس کی محبت میں استغراق اور اس کی سنت کی متابعت کا اہتمام کرنا تاکہ سالک فروع میں الجھ کر اصل سے باز نہ رہ جائے اور وسایط اصل مقصود کو اس کی نظر سے اوجھل نہ کر دیں اور یہ کہ اپنے افعال، اقوال اور احوال کی ترازو رسول کی سنت اور صحابہ و تابعین کے طریقہ کو بنائیں اور اپنی تمام چیزوں کو اس کے مطابق کریں، نہ یہ کہ اس کی طلب ہی

(۱) مقدمہ نوریہ سلطانیہ، ڈاکٹر سلیم اختر، ص ۱۴۔

نہ کریں، اس کی تحصیل میں کوشاں نہ ہوں اور اس کا اہتمام نہ کریں بلکہ
اس سے بے خبر ہوں اور اصل کو فرع کا تابع بنائیں اور فرع کے مقابلے میں
اصل کی تاویل کریں، یہ طریقہ یا تو بطالت ہے یا الحاد و بے دینی ہے۔"(۱)

ایک اور مکتوب گرامی میں رقم طراز ہیں:

"اور لازم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن سنت کا اتباع
کرنا، عبادات میں بھی، عادات میں بھی اور اعتقادات میں بھی اور اس
بات کا اعتقاد کرنا چاہیے کہ جو کچھ ان کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ
باطل ہے۔"(۲)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انسان دین وملت کی تقویت، سنت کی تائید و ترویج و اشاعت
میں کوشش کرے اور سنت کی اشاعت کرنے والوں کی اعانت کرے، خواہ
وہ اکیلا اور تنہا ہی کیوں نہ ہو۔"(۳)

ان کے نزدیک عبادت کی اصل حقیقت بھی امر خداوندی کی تعمیل اور سنت کی موافقت ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ سنت کی موافقت اور اقتدار کے خیال سے قیلولہ کے وقت قیلولہ کرنا ذکر اور نفل نماز پڑھنے سے افضل و بہتر ہے۔(۴)

وہ اس پر بھی خاص زور دیتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی تفسیر و تشریح سنت نبوی کے موافق کرنی چاہیے اور اہل سنت والجماعت کے عقائد کو مضبوطی سے اختیار کرنا چاہیے اور اس معاملہ میں کسی شک و تذبذب کو راہ نہ دینی چاہیے۔

حدیث نبوی ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة کی تشریح کرکے

---

(۱) مکتوب نمبر ۵ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۲۔ (۲) مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۳۔ (۳) المحدثان، ص ۱۷ و ۱۸۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۱۰۔

واضح کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اختیار کرنا نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بہتر ہے، فرماتے ہیں:

> ''جب احداث بدعت (دین کی نئی باتیں وضع کرنا) رافع سنت (سنت کو ختم کرنا) ہے تو اس پر یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقامت سنت (سنت کو قائم وزندہ کرنا) قامع بدعت (بدعت کا قلع قمع کرنا) ہے، مثلاً چنگ کو توڑنا سنت اور بہتر ہے اور اس کی مرمت کرنا بدعت اور غلط ہے، اتباع سنت سے نور پیدا ہوتا ہے اور بدعت میں گرفتاری سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، پس خلا وا ستنجا کے آداب کی سنت کے مطابق رعایت کرنا سرائے اور مدرسہ کی تعمیر سے بہتر ہے. جب سالک سنت کے آداب کی رعایت و اہتمام میں ترقی کرتا ہے تو وہ مقام قرب حاصل کر لیتا ہے اور اس کو چھوڑنے سے وہ انحطاط وتنزل کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ چیز ہلاکت کا باعث ہوتی ہے، افضل کے ترک سے قساوت قلب میں مبتلا ہوتا ہے، اسی کو ''دین''، ''ختم'' اور ''طبع'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور آدمی ترک افضل سے ان سب حالتوں تک پہنچ جاتا ہے، نعوذ باللہ من ذلک۔''(۱)

رد بدعت: اتباع سنت کی دعوت وتلقین کے ساتھ ہی وہ رد بدعت میں بھی پیش پیش تھے، اوپر کی تحریروں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس لیے یہاں دو ایک مثالیں پیش کرنے ہی پر اکتفا کی جاتی ہے، شیخ عبدالحق کا ارشاد ہے:

> ''اور اس بات کا اعتقاد کرنا چاہیے کہ جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ باطل ہے اور جس شخص نے بھی کوئی ایسی نئی بات پیدا کی ہے جس سے سنت رسول کی مخالفت ہوتی ہے یا

(۱) تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار، ص۱۱۲و۱۱۳۔

اس میں تغیر پیدا ہوتا ہے، چاہے یہ مخالفت وتغیر قول میں ہو یا عمل میں یا
اعتقاد میں وہ گمراہی ہے اور مردود ہے۔"(۱)

۔ مشہور حدیث "جس نے ہمارے اس امر (دین) میں وہ بات پیدا کی جو اس سے نہیں ہے وہ مردود ہے" نیز آپؐ نے فرمایا کہ "ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے" کو نقل کر کے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"ارباب دین نے کہا ہے کہ اس دل میں جو گرفتار بدعت ہے ولایت
کا نور داخل نہیں ہوتا۔"(۲)

بعض اعمال واشغال جو صوفیہ ومشائخ کے حلقوں میں رائج اور عام ہو گئے ہیں گو ان کی حلت وحرمت کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں تاہم ان کو جس شکل وطور سے اور جن جذبات ومیلانات کے تحت انجام دیا جاتا ہے، شیخ ان کی بھی مذمت کرتے ہیں اس سے بھی ان کے اتباع سنت ورد بدعت کے جوش وجذبہ کا اندازہ سے ہے، اس لیے یہاں مسئلہ سماع کے بارہ میں ان کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں:

"مسئلہ سماع میں مشائخ طریقت کے افعال واقوال متعارض ہیں، جو جماعتیں اس کو جائز سمجھتی ہیں ان کے داعیے واسباب مختلف ہیں، بعض جماعتیں تو اس کام میں اس لیے مشغول ہیں کہ ان پر خواہش نفس کا غلبہ ہے، وہ نہ تو احکام شریعت کی پروا کرتی ہیں نہ انہیں صدق نیت کی دولت ملی ہے اور نہ انہیں احسن الامر کے اتباع اور اولیٰ وارجح کے اخذ کی طرف کوئی توجہ ہے، یہ جماعت خارج از بحث ہے، اس لیے کہ اس کے افعال و احوال میں کوئی ضبط وقید نہیں، یہ جانوروں کے حکم میں داخل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہے، نفس پرستوں کی دوسری جماعت وہ ہے جو طاعت و

---

(۱) مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۳۔ (۲) ایضاً، ص ۱۰۴۔

عبادت کے ذوق، ذکر و تلاوت کی لذت اور خلوت و مناجات کی دولت سے محروم ہے، نغمہ بالطبع جذبات باطن کا محرک اور پریشان خیالی کو یکسو کرنے والا ہے، ان لوگوں کو سماع نغمہ سے لذت و سرور اور مطلوب کا ایک شعور حاصل ہوتا ہے بس اسی چیز پر یہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں، اس حالت کو غنیمت سمجھتے ہیں اور تسویلات نفس و شیطان کی وجہ سے اس کو عبادت و ریاضت پر ترجیح دیتے رہتے ہیں اور عابدوں زاہدوں کے فضل کا انکار کرتے ہیں اور ان کو ذوق ولذت عشق سے محروم سمجھتے ہیں، اس فریب نفس کی جزا ان کو یہ ملتی ہے کہ روز بروز یہ لوگ دین و دیانت کے طریقے سے بیگانہ اور دور ہوتے جاتے ہیں اور جس کام میں یہ مشغول ہیں اس میں ان کا انہاک بڑھتا جاتا ہے، نماز سے ان کو بجز نشست و برخاست اور کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ نمازیں محض مخلوق کے زجر و تشنیع کے خوف سے دکھاوے اور تکلف کی پڑھتے ہیں، نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کی مجلسوں میں گانے والی خوبصورت عورتیں راہ پاتی ہیں اور حسن صوت کے ساتھ حسن صورت کے انضمام سے ان کا ذوق وشوق حد کمال تک پہنچ جاتا ہے۔"(۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کی نظر مفاسد کے سرچشموں پر کیسی گہری تھی، جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے اس کے بارہ میں اپنے مرشد و شیخ عبدالوہاب سے ایک مرتبہ انہوں نے دریافت کیا کہ "ہمارے علاقہ میں سماع کی رسم عام ہے، اس موقع پر لوگ جمع ہوتے ہیں جس میں اہل و نااہل، فاسق و صالح ہر قسم کے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں اور اس طرح کے کام کرتے ہیں، سماع کی یہ صورت جو ہندوستان میں رائج ہے اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ شیخ نے جواب میں ارشاد فرمایا "اس طرح پر یہ کام اصلاً جائز نہیں، اس کو نہیں کرنا چاہیے بلکہ

(۱) مکتوب نمبر، بنام حضرت خواجہ باقی باللہ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰۸و۱۰۹۔

اس سے اجتناب وقت کا ضروری تقاضا ہے، طالب حق کو اس صورت میں قطعاً سہولت و مسامحت سے کام نہیں لینا چاہیے۔"(۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ: حضرت شیخ عبدالحق کے عہد میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی شخصیت علمی و دینی حیثیت سے بڑی اہم اور ممتاز تھی، ان کے مہتم بالشان اصلاحی و تجدیدی کارنامے کسی تفصیل و بیان کے محتاج نہیں، ڈاکٹر محمد اقبال کا ایک شعر ہی ان کی عظمت و علوئے مرتبہ کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار (۲)

حضرت شیخ عبدالحق کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ علمی و دینی حیثیت سے ان کا پایہ بھی کم نہ تھا، اسی لیے یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے مداح و قدردان بھی تھے مگر اس کے باوجود دونوں میں اختلاف رائے بھی ہوا، چنانچہ مکتوبات امام ربانی کے بعض مندرجات پر شیخ عبدالحق کو اعتراضات و شبہات ہوئے تو انہوں نے بڑے غور و تامل اور بار بار استخارہ کرنے کے بعد ان شبہات و اعتراضات کو ایک طویل مکتوب میں قلم بند کر کے حضرت مجدد صاحب کے پاس دریافت و تحقیق کی غرض سے بھیجا تاکہ جن خیالات کے بارے میں ان کو اعتراض ہے مجدد صاحب اس کا ازالہ کر دیں اور ان کے متعلق ان کی خلش دور کر کے ان کی تسلی و تشفی فرما دیں، چنانچہ مکتوب کے شروع ہی میں لکھتے ہیں:

دردِ دل دارم بسے از خوئے آں زیبا نگار
فرصتے یارب کہ دل را پیش وے خالی کنم

سالہا است کہ بعضے از کلمات و مکالمات کہ برسوں سے مکتوب شریف میں مذکور بعض

(۱) اخبار الاخیار، ص ۲۵۶۔ (۲) ضرب کلیم۔

درمکتوب شریف مذکور است واز قبیل موہمات است می خواہد کہ استفسار کند و استکشاف نماید میسر نشد ۔(۱)	اقوال و بیانات کے بارہ میں استفسار کرنا اور ان کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سہولت میسر نہ آئی ، یہ باتیں بڑی اہم اور وہم وشک میں مبتلا کرنے والی ہیں ۔

آخر میں اس کے متعلق مزید وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں:

ایں کلمات بقصد استفسار و استکشاف حال و دفع تالم عارض بال تسکین فرقہ صدر نوشتہ شد ، قصد آں داشت کہ چیزے بنویسد و بالزام نفس راضی باشد ......وایں را از چند مجلس املانمودہ ہر بار استخارہ بجناب سعادۃ از شر نفس ۔(۲)	یہ باتیں استفسار اور کشف حال کی وضاحت چاہنے کے لیے لکھی گئی ہیں تا کہ دل کو جو خلش اور الم لاحق ہو گیا ہے وہ رفع ہو جائے اور قلب کو قرار و سکون حاصل ہو جائے ، آپ جو کچھ تحریر فرما کر نفس قبولیت و رضا کے لیے مجبور کر دیں ..... اس مکتوب کو کئی نشستوں میں املا کیا اور ہر دفعہ درگاہ الٰہی میں شر ورنفس سے بچنے کے لیے استخارہ کیا ہے۔

یہ مکتوب بد نیتی یا کسی غلط جذبہ کی وجہ سے نہیں لکھا گیا ہے اور نہ اس کا مقصد حضرت مجدد صاحب کی ذات سے کدورت وعداوت کا اظہار ہے بلکہ یہ تمام تر خیر خواہانہ اور اچھے جذبہ کے ماتحت لکھا گیا ہے اور اس کا مقصد اطمینان وشرح صدر اور زیر بحث مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنا ہے جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

اصل غرض نصیحت و خیر خواہی و کشف حال است الدین النصیحۃ (۳)	خط کی اصل غرض نصیحت و خیر خواہی اور کشف حال ہے کیوں کہ دین نصیحت ہے۔

(۱) حیات عبدالحق شیخ محدث دہلوی، ص ۳۱۳، مکتوب شیخ عبدالحق بنام شیخ احمد سرہندی۔ (۲) ایضاً ص ۳۴۳۔

(۳) حیات عبدالحق شیخ محدث دہلوی، ص ۳۱۳۔

یہاں اس کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اعتراض و اختلاف کے باوجو نہ حضرت مجدد صاحب سے شیخ عبدالحق کے اخلاص و محبت میں کوئی کمی آئی تھی اور نہ ان کی عظمت و منزلت اور علو ے مقام میں کوئی فرق آیا تھا بلکہ خط تحریر کرنے کے وقت بھی ان کے دل میں حضرت شیخ احمد سرہندی کا مقام و مرتبہ پوری طرح جاگزیں تھا، خط کی عبارت ان عربی کلمات سے کرتے ہیں:

ایها الشیخ العالم الفاضل العارف الذی اجتباه الیه وخصه بفضله واعطاه من المعارف مالم یعط غیره من العالمین (۱)	اے شیخ! عالم و عارف فاضل جس کو اللہ نے اپنے فضل سے برگزیدہ و مخصوص کیا ہے اور اسے وہ معارف عطا کیے ہیں جن سے دنیا کے کسی اور شخص کو نہیں نوازا ہے۔

اور آخر میں ان سے اپنے حسن ظن اور غیر معمولی محبت و یگانگت کا ذکر ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

ظن فقیر بشیخ جمیل است ایں مقدار کہ مرا بشما نسبت محبت و اتحاد است کم کسے را خواہد بود.....نزد ایں فقیر شما ہم عزیزید و ہم طریقہ شما۔(۲)	فقیر کو شیخ سے حسن ظن ہے اور ان سے جس قدر محبت و الفت اور اتحاد و یگانگت کا تعلق ہے کم ہی کسی سے ہوگا.....اس فقیر کے نزدیک آپ بھی عزیز ہیں اور آپ کا طریقہ بھی عزیز ہے۔

اس محبت و اخلاص اور اعتراف فضل و کمال کے باوجود انہوں نے خیر خواہی کے جذبہ سے حضرت مجدد صاحب کے مکتوب میں مجددیت و نبوت کے متعلق ظاہر کیے گئے خیالات کے بارہ میں وضاحت طلب کر کے اور استفسار فرما کر اپنے شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے کے لیے یہ طویل مکتوب لکھا، ان کے خیال میں مجدد صاحب کی باتوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت کم ہوتی ہے اور ان کی عظمت مجروح ہوتی ہے نیز ان کے خیالات

(۱) حیات عبدالحق شیخ محدث دہلوی، ص ۳۱۳۔ (۲) ایضاً ۳۴۳۔

کے ڈانڈے مہدویت کے عقائد سے بھی جا ملتے ہیں، اس کے علاوہ ان کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ مجدد صاحب کے اقوال و بیانات سے بعض بزرگوں کی تنقیص وتحقیر ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی مرید کا درجہ چاہے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے اور وہ اپنے پیر سے برتر ہی کیوں نہ ہو جائے مگر ادب واحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سے اپنے کو کمتر ہی تصور کرے اور اس کی عظمت واحترام کو نظر انداز نہ کرے۔

اگر چہ بایں اصطلاح ایں قوم ممکن است کہ مریدے در کمال از پیر در گزرد لیکن در رعایت ادب و بندگی و نیازمندی و فروتنی وحق شناسی باقیست شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کہ در کشف تحقیقات معاملات ووقائع آیتے بود و معلوم می شود کہ دریں باب از پیران خود گزرانیدا ست می گوید کہ اگر سر من بآسماں سایہ ہنوز خاک آستانہ شیخ عبدالرحمٰن اسفرائنی وشیخ علی بالا شد۔

بلند مرتبہ زیں خاک آستاں شدہ ام
غبار کوئے توام گر برآسماں شدہ ام (۱)

گو ان لوگوں کی اصطلاح میں یہ ممکن ہے کہ کمال میں کوئی مرید پیر سے آگے نکل جائے لیکن پھر بھی ادب و بندگی اور نیاز مندی وفروتنی کی رعایت کرنی چاہیے، شیخ علاء الدولہ سمنانی معاملات و وقائع کی تحقیقات کے کشف میں خدا کی ایک نشانی تھے اور یہ معلوم ہے کہ اس حیثیت سے وہ اپنے پیروں سے بڑھے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود فرماتے تھے کہ اگر میرا سر آسمان پر بھی ہو جائے تو بھی شیخ عبدالرحمٰن اسفرائنی اور شیخ علی کے آستانہ کی خاک اس سے بلند و بالا رہے گی۔

شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ ایسے مقدس بزرگوں کی شان میں بے ادبی و گستاخی کو طبیعت پر جبر کر کے گوارا کیا جا سکتا ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ظاہر کیے گئے خیالات کو برداشت کرنا طاقت سے باہر ہے۔

اما سخنان کہ نسبت بحضرت کائنات ﷺ — سرور کائنات ﷺ کے متعلق مکتوب شریف

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۳۴۳۔

می گویند آنہارا تاب ندارد وانچہ نسبت بمشائخ گفتند کرہاو جبرا برداشتہ شدہ است اما برداشت ایں کلمات از طاقت حال ایں فقیر بیرونست وہمیشہ دعائے فقیر درخلوت وجلوت بعداز صلوٰۃ درسائر اوقات ایں بودہ است اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ اللّٰھم اجب(۱)

میں جو باتیں کہی گئی ہیں انہیں برداشت کرنے کی کوئی تاب و طاقت نہیں، خواہ مشائخ کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے اسے کرہاو جبرا برداشت کرلیا جائے البتہ نبوت کی شان میں نازیبا کلمات کو گوارا کرنا اس فقیر کی طاقت سے باہر ہے، اس فقیر کی تمام وقتوں کی نماز کے بعد خلوت وجلوت میں ہمیشہ یہ دعا رہتی ہے کہ اے اللہ تو ہمیں حق کو حق اور باطل کو باطل دکھا اور ہمیں حق کے اتباع اور باطل سے اجتناب کی توفیق عطا فرما! اے اللہ تو ہماری یہ دعا قبول فرمالے۔

اس تفصیل یہ واضح ہوتا ہے کہ دونوں بزرگوں کا اختلاف علمی ودینی تھا، اس میں ذاتی عناد، مخالفت اور بدنیتی کا کوئی شائبہ نہ تھا اور یہ معاصرانہ رشک وحسد سے پاک اور اخلاص وللہیت پر مبنی تھا مگر متاخرین اور تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس اختلاف کی وجہ سے دونوں بزرگوں کے تعلقات خراب ہوگئے تھے، ان لوگوں نے ان واقعات کو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جس سے شیخ عبدالحق کی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت مجدد صاحب کے خیالات پر گرفت کرکے بڑی غلطی کی تھی، حالاں کہ عموماً ایک ہی عہد کے نادرۂ روزگار اشخاص میں اکثر علمی ودینی مسائل میں اختلافات رہے ہیں، تاریخ کی کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں، اس بنا پر حضرت شیخ دہلوی اور حضرت مجدد صاحب میں اختلاف رائے کا ہونا نہ تو تاریخ کا کوئی نادر واقعہ ہے اور نہ تعجب انگیز، اس کی

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۳۴۳۔

وجہ سے شیخ عبدالحق کو مطعون کرنا اور دونوں بزرگوں کے تعلقات کو کشیدہ بتانا غلط ہے کیوں کہ حضرت شیخ کے مکتوب سے پوری طرح عیاں ہے کہ اسے تحریر کرنے کے وقت بھی ان کے دل میں مجدد صاحب کی عظمت واہمیت کارفرما تھی اور مجدد صاحب بھی شیخ کے معترف ومداح رہے۔

یہاں یہ بات ضرور تحقیق طلب ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق کو حضرت مجدد صاحب کی جانب سے جو شکوک وشبہات ہو گئے تھے کیا وہ دور ہوئے یا نہیں؟ اور شیخ نے اپنے خیالات سے رجوع کیا تھا یا نہیں؟

اس کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے شیخ عبدالحق کو غلط فہمی ہو گئی تھی مگر جب وہ رفع ہو گئی تو انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی اور اپنے خیالات سے رجوع کر لیا، مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''شیخ عبدالحق کی مخالفت کسی غلط بیانی کی بنیاد پر یا کسی غلط فہمی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور اس کا پردہ چاک ہونے یا غلط فہمی کے دور ہو جانے کے بعد رفع ہو گئی۔''(۱)

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم رقم طراز ہیں:

> ''معاصرت کی وجہ سے دونوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جو بشریت کا تقاضا ہے اور ہر زمانہ میں ہوتا ہے...... یہاں تو معمولی سوئے تفاہم ہوا تھا جو بعد کو رفع ہو گیا اور تعلقات استوار ہو گئے۔''(۲)

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی فرماتے ہیں:

> ''حضرت شیخ کی مخالفت چوں کہ بدنیتی کے ساتھ نہ تھی، لہٰذا حق تعالیٰ نے ان کو بہت جلد تنبیہ عطا فرمایا اور مخالفت سے رجوع کی توفیق دی بالآخر

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم، ص ۳۳۶۔ (۲) الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۳۸۔

وہ بھی حضرت امام ربانی کے غایت درجہ معتقد ہو گئے۔''(۱)

شیخ کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

''عارضی طور پر شیخ محدث کو مجدد صاحب کے نظریات سے کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور انہوں نے مجدد صاحب کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا جو ضمیمہ کے طور پر اس کتاب میں شامل ہے، اختلاف کی نوعیت کا اندازہ اس رسالہ کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے، بعد کو جب شیخ مجدد نے اپنے خیالات کی وضاحت کی اور ان کے متعلق سب شبہات دور ہو گئے تو شیخ محدث کی رائے بھی بدل گئی، ان کا اختلاف نیک نیتی اور تحفظ شرع وسنت پر مبنی تھا، چنانچہ مشکوک وشبہات رفع ہو جانے کے بعد انہوں نے انتہائی وسعت قلب کے ساتھ حضرت کے کارناموں کا اعتراف کیا۔''(۲)

اس کے برخلاف شیخ محمد اکرام کے نزدیک غلط فہمی دور ہو جانے اور شیخ کے اپنے خیالات سے رجوع کر لینے کی بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی، وہ فرماتے ہیں:

''ابھی تک جو مواد ہمیں ملا ہے اس کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق نے رسالے کے مضامین سے رجوع نہیں کیا بلکہ جس مقصد سے انہوں نے یہ رسالہ لکھا تھا اسی کی تکمیل کے لیے اپنی ضخیم کتاب مدارج النبوۃ لکھی اور فی الواقع یہ مقصد شیخ کی علمی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔''(۳)

دوسری جگہ وہ مدلل طور پر لکھتے ہیں:

''رجوع کی روایت کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ یہ روایت صرف مجددی حلقوں میں مشہور ہے یا شیخ کی (بعد کی) کتابوں سے ملتی ہے،

---

(۱) الفرقان، مجدد الف ثانی نمبر، ص ۷۷۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۰:۲۔ (۳) رود کوثر ص ۳۶۹۔

شیخ محدث کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر نہیں، ان کے خاندان میں بیسیوں
صاحب علم، صاحب تصنیف گزرے ہیں، ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق
ممتاز اہل قلم تھے، ان کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا جاتا، آج سے ساٹھ ستر سال
پہلے ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے شیخ محدث کی ایک مبسوط سوانح عمر
ی مرأۃ الحقائق کے نام سے شائع کی، اس میں شیخ کی تصنیفات کے ضمن میں
رسالے کا اندراج بالوضاحت ہے، ''جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف
ثانی قدس سرہ'' (ص ۴۶، ۴۷) لیکن رجوع کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔''(۱)

مجددی سلسلہ کے لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق کے مکتوب میں حضرت مجددؒ کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں وہ محرف اور غلط ہیں، یہ ایک نجی مکتوب تھا، حضرت شیخ نے اس کو اپنی کتاب المکاتیب والرسائل میں درج نہیں کیا، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ارشاد کے مطابق شیخ نے اس مکتوب کو ضائع کرنے کی وصیت کی لیکن اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مکتوب کے مندرجات غلط و محرف تھے اور شیخ نے واقعی اپنے اعتراف سے رجوع کر لیا تھا تو پھر مجددی حضرات کو اس مکتوب کے جواب میں کتب و رسائل تالیف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''اس مکتوب کے جواب میں بکثرت رسالے لکھے گئے جن میں شیخ
بدرالدین سرہندی شیخ محمد یحییٰ (فرزند اصغر حضرت مجدد) شیخ محمد فرخ، شاہ
عبدالعزیز محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی کا
نام لیا جا سکتا ہے، مولانا وکیل احمد سکندر پوری نے ''ہدیہ مجددیہ'' کے نام سے ایک
مستقل کتاب اسی کے رد میں لکھی ہے جو ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔''(۲)

جن لوگوں کے خیال میں حضرت شیخ عبدالحق نے مجدد صاحب کے بارہ میں اپنی

(۱) رود کوثر، ص ۳۷۵۔ (۲) تاریخ دعوت و عزیمت، جلد چہارم، ص ۳۴۷ حاشیہ۔

رائے سے رجوع کرلیا تھا ان کی اہم دلیل وہ مکتوب ہے جو انہوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید و خلیفہ حضرت خواجہ حسام الدین دہلوی کو تحریر فرمایا تھا اور جو اخبار الاخیار کے آخر میں درج ہے مگر اس سے بھی رجوع کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب سے آج کل ان کا قلبی تعلق بہت بڑھ گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر یا مکتوبات امام ربانی کے مندرجات پر شیخ کے اعتراضات کی وجہ سے کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ دونوں بزرگوں میں صلح و صفائی نہیں ہے، شیخ عبدالحق اس کے ازالہ کی غرض سے فرماتے ہیں کہ میرے ان کے درمیان اس طرح کی کوئی بات ہی نہیں ہے بلکہ آج کل تو میرا دل ان کی جانب سے ہر قسم کے غل وغش سے پاک اور صاف ہے، میرے قلب کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ:

دریں ایام صفائی فقیر بخدمت میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ از حد متجاوز است و اصلاً پردۂ بشریت وغشاوہ جبلیت بمیان نماند قطع از رعایت طریقہ وانصاف وحکم عقل کہ باایں چنیں عزیزاں و بزرگان بد نہ باید بود و در باطن بطریق ذوق و وجدان وغلبہ چیزے افتادہ است کہ زبان از تقریر آں لال است سبحان اللہ مقلب القلوب ومبدل الاحوال شاید ظاہر بیناں استبعاد کنند من نمی دانم کہ حال چیست وبچہ منوال است۔“(۱)	میاں شیخ احمد سلمہ اللہ کی طرف سے آج کل فقیر کے دل میں صفائی بہت زیادہ ہے، بشریت کا کوئی پردہ اور افتاد طبع کا کوئی شائبہ درمیان میں حائل نہیں رہا، اس سے قطع نظر انصاف و معقولیت کی رعایت اور عقل کے فیصلہ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ برا خیال نہیں ہونا چاہیے، میرے دل میں ذوق و وجدان اور غلبہ کی بنا پر ایسی کیفیت ہوگئی ہے کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے، دلوں کو پلٹنے اور احوال کو تبدیل کرنے والا اللہ پاک ہے، شاید

(۱) خاتمہ اخبار الاخیار، ص ۳۰۵۔

ظاہر بینوں کو اس پر یقین نہ ہو، میں خود بھی
نہیں جانتا کہ کیا حال ہے اور کیوں ہے۔

شیخ محمد اکرام نے اس مسئلہ پر بہت مفصل اظہار خیال کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اس واقعہ میں رجوع کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، ان کے تین نکات قابل توجہ ہیں لکھتے ہیں:

"یہ روایت مجددیہ سلسلے میں کافی پرانی ہے لیکن معاصرانہ اور معتبر تذکروں میں یعنی زبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں نہیں، اس کا سب سے قدیمی بیان جو ہماری نظر سے گزرا ہے روضۃ القیومیہ میں (دفتر اول ص ۲۱۱ پر) ہے جہاں حضرت خواجہ کلاں (خلف ارشد حضرت خواجہ باقی باللہ) کی کلیات کے حوالے سے شیخ محدث کا ایک رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا درج ہے جس کا مضمون تتمہ اخبار الاخیار والے مندرجہ بالا رقعہ سے ایک حد تک ملتا ہے چونکہ حضرت خواجہ کلاں نے خواجہ حسام الدین کی سوانح عمری لکھی تھی اس لیے ان کی کلیات میں موصوف کے نام کے رقعات کا ہونا مستبعد نہیں (ممکن ہے کلیات خواجہ کلاں کا کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے اور حقیقت حال پر زیادہ روشنی پڑ سکے) روضۃ القیومیہ میں مندرجہ رقعہ میں صرف ایک حد تک اشتراک ہے (شاید اختلاف مضمون کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے سامنے روضۃ القیومیہ کا صرف اردو ترجمہ ہے) لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ روضۃ القیومیہ میں یہ رقعہ کسی "رجوع" کی تائید میں نقل نہیں ہوا بلکہ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ محدث آنجناب (یعنی حضرت مجدد الف ثانی) کی تجدید اور قیومیت کے معترف تھے۔

"اس کے بعد "رجوع" کی روایت عام ہونی شروع ہوئی اور شیخ عبدالحق محدث کے رقعہ بنام خواجہ حسام الدین کو اس روایت کی تائید میں

پیش کیا گیا، تتمہ اخبار الاخیار (مجتبائی) میں لکھا ہے" رجوع شیخ مشہور در السنۂ ثقات مذکور" مجتبائی پریس سے اخبار الاخیار ۱۳۳۲ھ (یعنی ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوئی، اس کے بعد عام طور پر اس روایت کو دہرا دیا جاتا ہے، چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اسی خیال کا اظہار کیا۔" (۱)

آگے اس کو مزید صراحت سے لکھتے ہیں:

"جہاں تک خواجہ حسام الدین کے نام کا رقعہ ہے، روضۃ القیومیہ کی عبارت دیکھنے کے بعد یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جو رقعہ تتمہ اخبار الاخیار میں نقل کیا گیا اس سے ملتا جلتا کوئی رقعہ شیخ محدث نے کسی وقت خواجہ حسام الدین کے نام لکھا، یہ رقعہ ہم نقل کر چکے لیکن اس رسالے سے" رجوع" اخذ نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ صفائی کا خیال ہو سکتا ہے ..... شیخ محدث نے جس طرح کا رسالہ لکھا تھا اور مشتہر کیا تھا، اگر اس کو وہ غلطی سمجھتے تھے تو اعتراف سہو بھی علانیہ ہونا چاہیے تھا، اس کے علاوہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رقعہ رسالے کی تالیف کے بعد لکھا گیا۔" (۲)

پھر تحریر فرماتے ہیں:

"اخبار الاخیار (مجتبائی) والے رقعہ کی نسبت یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں حضرت مجدد سے جتنی ارادت کا ذکر ہے اس سے زیادہ شیخ محدث رسالہ لکھتے وقت ظاہر کر چکے تھے لیکن یہ ارادت رسالہ لکھنے میں مانع نہ ہوئی، اس خط میں بھی" میاں احمد سرہندی" کو مجدد نہیں کہا گیا اور بہرکیف اگر کسی باطنی اشارے کی بنا پر حضرت شیخ مجدد سے شیخ کی عقیدت بڑھ گئی ہو تب بھی رسالے میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے شیخ عبدالحق جیسا

---

(۱) رود کوثر، ص ۳۶۳، طبع چہارم۔ (۲) ایضاً، ص ۳۶۶۔

عاشق رسول ''رجوع'' کرے۔''(۱)

شیخ محمد اکرام کا خیال یہ بھی ہے کہ شیخ عبدالحق کے اس رسالہ کی تالیف کا جو مقصد ہے اسی کی تکمیل کے لیے انہوں نے مدارج النبوۃ بھی لکھی تھی، ان کے زمانے میں مہدویت قیومیت اور عقلیت کے طرف داروں نے عقائد و خیالات میں الجھنیں ڈال رکھی تھیں، شیخ نے ان سب کا علاج یہی سوچا کہ نبوت کی عظمت وحقیقت کو نمایاں کیا جائے، شیخ محمد اکرام نے مدارج النبوۃ کے بعض اقتباسات نقل کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان کا روئے سخن حضرت مجدد صاحب ہی کی طرف ہے گویا اس کی تصنیف کا مقصد بھی حضرت مجدد صاحب کے خیالات کی تردید تھا۔

رجوع کے مسئلہ سے قطع نظر اب بھی یہ ایک اہم اور ضروری سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا شیخ عبدالحق کے اعتراضات بجا تھے؟ اور واقعی مجدد صاحب کے اقوال و بیان میں قابل اعتراض اور لائق تردید باتیں تھیں اور ان سے عقیدۂ نبوت ورسالت پر زد پڑتی تھی۔

عام خیال یہی ہے کہ شیخ عبدالحق کو اس معاملہ میں غلط فہمی ہوگئی تھی جس کا باعث مجدد صاحب کا ''اظہار مقامات'' تھا، ان کے خیال میں ''مکاشفات باطنی'' کا اس طرح اظہار نامناسب اور خلاف مصلحت تھا، حضرت شاہ غلام علی کا خیال ہے کہ شیخ محدث نے اعتراضات بطریق علمائے ظاہر کیے تھے، حضرت مجدد کے متعلقہ بیانات بطور اہل باطن کے تھے۔(۲)

لیکن یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت شیخ عبدالحق کا پایہ تصوف وسلوک میں بھی بہت بلند تھا اس لیے ان کو اس طرح کے مکاشفات اور اظہار مقامات کی وجہ سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی، اس لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک اور انداز ہ سے اس کی توجیہ کی ہے حالانکہ شیخ عبدالحق کی شریعت وطریقت اور علم ظاہر و باطن دونوں کی جامع تھی، مولانا فرماتے ہیں:

(۱) رود کوثر، طبع چہارم، ص ۳۶۹۔ (۲) ایضاً، ص ۳۶۸۔

"نیز انہوں نے جن نئے علوم وتحقیقات کا اپنے مکتوبات اور مجالس کے ذریعہ افاضہ فرمایا، جن میں بہت سے عوام تو عوام خواص کے لیے بھی نامانوس اور ایک حد تک (اگر موجب وحشت نہیں تو) موجب حیرت ضرور تھے اوران میں بہت سے ان حلقوں کے مسلمات کے خلاف تھے جو نسل درنسل منتقل ہوتے چلے آرہے تھے اور یہ معاملہ اکثران نادرۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے جو کسی علم وفن کی مجتہد اور کسی سلسلہ وطریق کی بانی اور اپنے زمانہ عام علمی، ذہنی وباطنی سطح سے بلند ہوتی ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ علوم وکمالات وہبی سے نوازتا ہے اور وہ عام اصطلاحات اور قدیم تعبیرات کے دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں۔"(۱)

تقلید میں شدت اور حنفیت میں غلو وتعصب کا الزام: نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اپنی مختلف کتابوں میں حضرت شیخ محدث کا تذکرہ کیا ہے اور گو عموماً انہوں نے ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے مگر ہر جگہ حنفیت میں ان کے غلو وتعصب کا ذکر بھی کیا ہے، باوجود یکہ انہیں اس کا اعتراف ہے کہ حضرت محدث ہی کی بدولت ہندوستان میں احادیث کی عام نشر واشاعت ہوئی (۲) مگر پھر بھی وہ انہیں حدیث میں قلیل البضاعت بتاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شیخ کو زیادہ دستگاہ اور اصل مہارت فقہ حنفی میں تھی، ہم حدیث میں شیخ عبدالحق محدث کی بلند پائیگی پر مفصل بحث کر چکے ہیں، اس سے اس اعتراض کی مکمل تردید ہوجاتی ہے، اس بنا پر یہاں صرف فقہی عصبیت ہی کے بارہ میں مختصر بحث وگفتگو کی جائے گی، نواب صاحب فرماتے ہیں:

"حنفی مذہب کے معاملہ میں وہ متعصب تھے ..... تقلید میں شدت

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت، ج۴، ص۳۳۵و۳۳۶۔ (۲) الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ، ص۷۰، مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۳ھ۔

اور مجرد رائے سے اپنے مذہب و مسلک کے تحفظ کی خاطر احادیث کی
تاویل کرنے پر اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔"(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں ان کی تصنیفات نہایت مشہور ہیں اور یہ سب کی
سب مفید اور نافع ہیں مگر مذہبی تعصب سے خالی نہیں ہیں۔"(۲)

یہاں تک کہ وہ حضرت مجدد صاحب سے ان کے اختلافات کو بھی تقلید مذہب اور ان کے غیر معمولی تعصب ہی کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"اختلاف کا سبب یہ تھا کہ حضرت شیخ فقہی مذہب کی تقلید میں بڑے
متعصب تھے اور حضرت مجدد صاحب اتباع سنت، رد بدعت اور شریعت و
طریقت کے معاملہ میں متعصب اور سخت تھے، یہ دونوں چیزیں ایک ہی
موڑ پر کیسے یک جا ہو سکتی ہیں۔"(۳)

تقصار جیود الاحرار میں بھی انہیں اہل رائے کے معاملہ میں جانبداری کرنے والا اور پیچ سے کام لینے والا بتایا ہے۔(۴)

ان اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ شیخ عبدالحق متشدد و متصلب، مقلد اور غالی و متعصب حنفی تھے۔

۲۔ اپنے مذہب کی حمایت کے جوش میں محض قیاس و رائے سے حدیث کی بیجا تاویل و توجیہ کرتے تھے۔

۳۔ اسی غلو اور حنفی عصبیت کی بنا پر انہوں نے مجدد الف ثانی کی مخالفت کی تھی۔

۱۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیخ عبدالحق دہلوی مسلکاً حنفی تھے اور وہ تقلید کے بھی قائل تھے، انہوں نے حنفی مذہب کو عقلاً و نقلاً قوی، مرجح اور حدیث کے موافق ثابت کرنے کی بھی

(۱) ابجد العلوم، ص ۹۰۱۔ (۲) اتحاف النبلا، ص ۳۰۴۔ (۳) ایضاً، ص ۳۰۵۔ (۴) ایضاً، ص ۱۱۲۔

کوشش کی ہے اور اس عام خیال کی تردید بھی کی ہے کہ فقہ حنفی مجرد رائے اور ظن وقیاس پر مبنی ہے اور یہ بتایا کہ وہ کتاب وسنت کی روح کے مطابق اور ان سے قریب تر ہے۔

شیخ عبدالحق نے حنفی مذہب کی تائید وترجیح کے باوجود دوسرے ائمہ ومجتہدین کے مذاہب اقوال اور دلائل بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے بلکہ بعض مسائل میں انہوں نے حنفی مذہب ہی کی طرح دوسرے مذاہب کے دلائل کی قوت ووزن کو بھی تسلیم کیا ہے، ان کے نزدیک تمام فقہی مذاہب کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور برحق ہیں، وہ جن مسائل میں حنفی مذہب کی پرزور تائید کرتے ہیں ان میں بھی اعتدال وتوازن کی شاہراہ پر قائم رہتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور فقہائے احناف کی طرح دوسرے ارباب فقہ اور فقہی مذاہب کے ائمہ واساطین کا ذکر بھی بڑے ادب واحترام سے کرتے ہیں، انہوں نے ان ائمہ کے تذکرے بھی اپنی کتابوں میں قلم بند کیے ہیں۔

اپنے مذہب کی تائید وترجیح کے باوجود جب وہ دوسرے بزرگوں کی تنقیص وتحقیر نہیں کرتے تو ان کو متشدد وغالی قرار دینا بیجا ہے۔

اسی طرح شیخ کی جانب تقلید کے مسئلے میں شدت کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ جزئی وفقہی مسائل پر بحث وگفتگو کرتے وقت آنکھ بند کر کے حنفی مذہب کی تائید نہیں کرتے بلکہ ہر موقع پر کتاب وسنت کے دلائل کا بھی انبار لگا دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شیخ کے زمانہ میں جو فقہی تعصب وجمود عام تھا اور جس کی وجہ سے حدیث وسنت کا علم تھا پس پردہ ہو گیا اور اس سے بعد بہت بڑھ گیا تھا، شیخ نے کتب حدیث کے درس ومطالعہ کو رواج دے کر اور ان کے شروح وحواشی قلم بند کر کے اس جمود وتعطل کو ختم کرنے کی کوشش کی، اس طرح وہ مقلد ہونے کے بجائے جامد اور متشدد مقلد نہ تھے۔

۲۔ حدیثوں کی من مانی تاویل کی بات بھی صحیح نہیں ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی کوشش تو ضرور کی ہے کہ حنفی مذہب کو نقلی حیثیت سے بھی مدلل کر کے پیش کریں اور یہ

دکھائیں کہ وہ حدیث کے خلاف نہیں ہے مگر اسے کھینچ تان کر حدیث کو اپنے مذہب کے موافق بنانا نہیں کہا جا سکتا، اگر کہیں غیر شعوری طور پر بلا قصد وارادہ ایسا وقتہً ہوا بھی ہو تو چونکہ شیخ کا عام طریقہ اس کے برعکس ہے اس لیے محض چند مثالوں کی وجہ سے یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مجرد رائے وقیاس سے حدیث کی تاویل کرتے تھے اور یہ ان کا عام شیوہ تھا، نواب صاحب خود ایک مذہب ومسلک سے وابستہ تھے ممکن ہے ان کا یہ تاثر اسی مذہب سے وابستگی کا نتیجہ ہو۔

۳۔ حضرت مجدد صاحب خود مسلکاً حنفی تھے، ان سے شیخ کا اختلاف حنفیت میں غلو وتعصب کی بنا پر نہیں تھا بلکہ دراصل مجدد صاحب کے نظریہ قیومیت اور نبوت کے متعلق ان کے بعض آراو خیالات کی وجہ سے انہیں اختلاف تھا، معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے مکتوب کا علم نواب صاحب کو نہ تھا ورنہ وہ اس طرح کا بے بنیاد الزام عائد نہ کرتے۔

وفات اور مقبرہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات دوشنبہ ۲۳ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو دارالسلطنت دہلی میں ہوئی، فخر العالم سے تاریخ وفات نکلتی ہے، وفات کے وقت آپ کی عمر چورانوے (۹۴) برس تھی، بختاور خان لکھتے ہیں:

در سنہ یک ہزار و پنجاہ و دو رحلت فرمود، فخر العالم تاریخ وفات ست، علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل نیز از انتقال آنصاحب کمال خبر میدہد۔(۱)	۱۰۵۲ھ میں شیخ عبدالحق نے رحلت فرمائی ......فخر العالم تاریخ وفات ہے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" سے بھی اس صاحب کمال کے انتقال کا پتہ چلتا ہے۔

شاہنواز خان نے بھی مرأۃ آفتاب نما میں یہی تاریخ لکھی ہے، متاخر تذکرہ نگاروں نے بھی یہی لکھا ہے (۲) مگر مفتی غلام لاہوری کا بیان ہے:

وفات شیخ عبدالحق بقول صاحب مخبر الواصلین	صاحب مخبر الواصلین کے قول نیز دوسرے

(۱) مرأۃ العالم، ج ۲، ص ۴۴۴۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۱۰۔

ودیگر اقوال صحیح درسال یک ہزار و پنجاہ و	صحیح اقوال کے مطابق شیخ عبدالحق کی وفات
یک است بعہد شاہجہانی (۱)	شاہجہاں کے دور میں ۱۰۵۱ھ میں ہوئی۔

صاحب مخبر الواصلین کے علاوہ (۲) مولوی کبیر احمد صاحب پھلواروی نے شیخ محدث کی تاریخ وفات میں جو اشعار کہے ہیں ان سے ۱۰۵۱ھ ہی نکلتا ہے۔ (۳)

خافی خان نے سب کے برخلاف ''زیادہ از صد سال مرحلہ عمر طے نمودہ'' (۴) لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتقال کے وقت ان کا سن ۱۰۰ برس سے بھی زیادہ تھا مگر بختاور خاں کے بیان ہی کو عام طور پر صحیح اور مرجح مانا جاتا ہے۔

ان کی وصیت کے مطابق ان کے فرزند شیخ نور الحق نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور حوض شمسی کے قریب پاک اور مغفور لوگوں کے پہلو میں دفن کیے گئے، قبر پر ایک لوح لگانے کی وصیت بھی فرمائی تھی، شیخ نور الحق نے یہ تختی بھی لگائی اور اس میں تاریخ وفات اور مختصر حالات بھی جامعیت کے ساتھ تحریر فرمائے، ان کی قبر آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے، نواب صدیق حسن خاں نے دوبار اس کی زیارت کی تھی اور انہیں اس جگہ عجیب کشش اور دلبستگی حاصل ہوئی تھی (۵) لکھتے ہیں:

ولما وردت بدهلي حضرت على	میں دہلی گیا تو ان کے مزار پر حاضر ہوا اور
مزاره وزرته فوجدت موضع القبر	قبر کی زیارت کی، قبر کی جگہ پر مجھے بڑی
مونسا بردا (٦)	انسیت اور ٹھنڈک نصیب ہوئی۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بندہ عاجز در دہلی بر تربت شریف او رسیدہ	یہ عاجز بندہ دہلی میں ان کی تربت پر پہنچا تو
نمی تواند گفتن کہ کدام روح وریحان برکاتش	کہہ نہیں سکتا کہ ان کی برکتوں کی کیسی

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج۱، ص۱۶۴۔ (۲) مخبر الواصلین، ص ۲۷۔ (۳) تاریخ الکملا، ص۴۰۔ (۴) منتخب اللباب، ج۱، ص۲۴۰۔ (۵) اتحاف النبلا، ص۳۰۴۔ (۶) ابجد العلوم، ص۹۰۱۔

مشاہدہ نمودہ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ (۱) فرحت بخش خوشبو اور لذت مشاہد میں آئی۔

الیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں تحریر کیا ہے کہ شیخ عبدالحق نے اپنا مقبرہ خود ہی تعمیر کرایا تھا اور وہ اسی میں دفن ہوئے مگر سرسید احمد خان کا بیان ہے کہ یہ مقبرہ آپ کے انتقال کے بعد بنا ہے (۲) مرأۃ الحقائق میں ہے کہ مہابت خان سپہ سالار افواج شاہجہانی نے یہ مقبرہ شیخ کی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا۔ (۳)

اولاد و احفاد: شیخ محدث کی نسل کے ذریعہ ان کے بعد بھی ان کا علمی فیض جاری رہا ان میں متعدد ایسے اصحاب فضل و کمال ہوئے جنہوں نے تصنیف و تالیف اور درس و افادہ کا سلسلہ شیخ کے بعد مدتوں جاری رکھا، سات پشتوں تک مسلسل ان کی اولاد علمی و دینی خدمات انجام دیتی رہی اور اس کی بدولت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں دینی علوم خصوصاً حدیث کی اشاعت و ترویج ہوئی، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے ''از اعقاب او ہفت تن تحصیل علوم نمودہ بافادہ مشغول اند'' (۴) ذیل میں ان کے اولاد و احفاد کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، ان میں جو لوگ علم حدیث میں زیادہ ممتاز اور صاحب تصنیفات تھے، ان کا علاحدہ سے آگے تذکرہ ہوگا۔

شیخ محدث کی جسمانی یادگار تین فرزند تھے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ شیخ نور الحق: یہ حضرت شیخ عبدالحق کے سب سے بڑے صاحبزادے اور ان کے علمی کمالات کے وارث اور جانشین تھے، ان کا شیخ کے تذکرہ کے بعد علاحدہ سے کسی قدر مفصل ذکر آئے گا اور اسی ضمن میں ان کے اولاد و احفاد کا تذکرہ بھی ہوگا۔

۲۔ شیخ علی محمد: یہ شیخ عبدالحق کے دوسرے فرزند تھے جو اپنے زمانہ کے فضلا میں شمار کیے جاتے تھے، ان کی ولادت و نشو و نما دہلی میں اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ ہوئی، یہ

(۱) تقصار جیود الاحرار، ص۱۱۳۔ (۲) آثار الصنادید، ص۹۵، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔ (۳) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۷۲۔ (۴) بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، ص۳۴۴۔

برابر ان کے ساتھ رہتے تھے اور انہوں نے ان سے بڑا فیض بھی حاصل کیا تھا، درسی کتابیں بھی اپنے والد ہی سے پڑھی تھیں، ان کی مندرجہ ذیل تین کتابیں متداول رہی ہیں:

ا۔ خزائن الدرر، عربی فارسی اور ترکی زبانوں کا لغت ہے۔

۲۔ رسالہ احوال پنج پیران چشت: اس میں مندرجہ ذیل پانچ بزرگان چشت کے حالات تحریر کیے ہیں: ا۔ خواجہ معین الدین چشتی ۲۔ قطب صاحب ۳۔ بابا فرید ۴۔ محبوب الٰہی ۵۔ چراغ دہلوی

۳۔ نجات المریدین: مرأۃ الحقائق کی صراحت کے مطابق یہ رسالہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات پر مشتمل ہے۔(۱)

شیخ علی محمد کے بیٹے شیخ ابوالمفاخر تھے، ان کے تین بیٹے ہوئے۔(۲)

۳۔ ابوالمکارم تقی الدین محمد ہاشم: یہ شیخ محدث کے تیسرے صاحبزادے تھے جو جید عالم اور زاہد مرتاض بزرگ تھے، علم کی طرح عمل میں بھی بلند تھے، دارالسلطنت دہلی میں ولادت اور نشو ونما ہوئی، اپنے والد کی صحبت میں رہ کر علم وفن کی تحصیل کی، فقہ وحدیث میں بڑی مہارت تھی، والد ہی نے ان کو اجازت وسند عطا کی تھی (۳) شیخ عبدالحق محدث نے اپنی تصنیف تالیف القلب الالیف میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''فرزند عزیز محمد ہاشم بھی علم وفضل میں اپنے بھائی نورالحق کے پیچھے پیچھے ہیں، جودت وسلامتی طبع کے علاوہ علم وعمل خصوصاً حدیث شریف کے علم میں موصوف وممتاز ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بلند مراتب پر فائز کرے۔''(۴)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۸۸۔ (۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ علی محمد کے اولاد واحفاد کا شجرہ دیا ہے، ملاحظہ ہو حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۵۵۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۳۹۴۔ (۴) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۲۷۔

شیخ محمد ہاشم کے ایک فرزند محمد عاصم کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے ایک گرامی نامہ میں شیخ نورالحق کو جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے پوتے سے خاص تعلق اور دل بستگی تھی۔(۱)

محمد عاصم سے محمد محتشم اور ان سے محمد معتصم تولد ہوئے۔(۲)

تصنیفات: شیخ عبدالحق کو اللہ تعالیٰ نے تصنیف و تالیف کا بڑا اچھا ذوق عطا کیا تھا، ان کی زندگی کا زیادہ حصہ تصنیف و تالیف میں بسر ہوا، بڑھاپے میں بھی ان کے علمی انہماک اور تصنیفی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ "جلوس کے دسویں سال ۱۰۴۷ھ میں ان کی عمر ۹۰ سال کی ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے ظاہری و باطنی حالات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا، عبادات، اوراد، ذکر و تلاوت نیز تعلیم و تصنیف اور تصحیح کتب کا التزام اسی نہج پر جاری تھا جیسے جوانی میں تھا" اسی لیے انہوں تصنیفات کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو بتائی جاتی ہے، گو ان میں سے بعض کتابوں کا نام اب بھی معلوم نہیں ہے اور متعدد کتابیں ناپید اور معدوم ہیں، تاہم اس سے ان کے تصنیفی کام کی وسعت و کثرت کا اندازہ ہوتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ اللہ نے ان کو کیسی غیر معمولی قوت و صلاحیت بخشی تھی اور ان کے وقت میں کتنی برکت عطا کی تھی، اسی لیے وہ مصنفین اور علمائے اسلام میں تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے منفرد اور یکتا خیال کیے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق کی تصنیفات علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہیں، ان میں بڑی تلاش و جستجو کافی محنت و کاوش اور پوری تحقیق و تدقیق سے مواد فراہم کیا گیا ہے، انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے، زیر بحث موضوع کی تمام کتب اور اس سے متعلق سارا مواد ان کے پیش نظر ہوتا تھا اور جو کچھ لکھتے تھے بڑے غور و مطالعہ کے بعد لکھتے تھے

---

(۱) کتاب المکاتیب والرسائل مکتوب آخر بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۲۸۔(۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شجرہ ۲۵۵۔

اس لیے ان کی تصنیفات موضوع کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کا احاطہ کر لیتی تھیں، خصوصاً فن حدیث سے متعلق انکی تصنیفات بڑی محنت و تحقیق اور کدو کاوش کا نتیجہ ہیں، ان کی کوئی بھی کتاب علمی و تحقیقی حیثیت سے کمتر اور ساقط الاعتبار نہیں ہے۔

شیخ نے بکثرت موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے ہی سے ان کے ذوق کے تنوع، علمی تبحر، ذہن رسا، جودت طبع اور تصنیف و تالیف کے سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی کتابوں کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ ان میں ان کے عہد کے میلانات ورجحانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور جو شکوک و شبہات دین کے بارہ میں اس عہد میں پیدا ہورہے تھے ان کی تردید کی گئی ہے، اسی لیے ان کی تصنیفات میں اکبر کے فتنوں اور اس زمانہ کے باطل افکار کا جواب بھی دیا گیا ہے اور مشائخ وصوفیہ کو ان کے احکام وفرائض بھی یاد دلائے گئے ہیں اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ مریدوں کی باطنی اصلاح وتزکیہ پر پوری توجہ مبذول کریں، امراو حکام کو بھی احیائے دین اور بدعات کے سدباب کی تلقین کی گئی ہے۔

شیخ کا طرز نگارش باوقار، عالمانہ اور سلیس وشگفتہ ہے، مضمون کے مناسب زبان ہوتی ہے، وہ اگرچہ مواد پر زیادہ زور دیتے ہیں تاہم طرز تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، کتابوں کی ترتیب وتبویب میں بھی بڑے سلیقہ سے کام لیتے ہیں، عربی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا استعمال قارئین کو گراں نہیں گزرتا بلکہ اس سے فارسی عبارت کے زور ووقار میں اضافہ ہوتا ہے، ان کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت اور کمال حاصل تھا اور اس حیثیت سے وہ اپنے زمانہ میں یکتا اور منفرد تھے، ان کی تصنیفات کی تین نوعیتیں ہیں:

۱۔ خود براہ راست کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔ ۲۔ کتابوں کے شروح وحواشی لکھے۔ ۳۔ ترجمے کیے یعنی فارسی میں عربی کتابیں منتقل کیں۔

ان کی تحریریں ماقل ومادل اور حشو وزوائد سے پاک ہوتی تھیں اور ان میں بڑی

سلاست وروانی ہوتی تھی، کہیں کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہوتی تھی، وہ کم سے کم لفظوں میں اختصار کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتے ہیں، اتنی ساری کتابیں لکھنے کے باوجود کہیں بیجا اطناب اور نامناسب طول بیان نہیں ہوتا، ان خوبیوں کی وجہ سے ان کی تصنیفات کو بڑی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور اہل علم نے بھی ان کو بہت پسند کیا اور ان کی جانب خاص توجہ واعتنا کی، ان کے فرزند شیخ نور الحق لکھتے ہیں ''فنون علمیہ بالخصوص فن حدیث میں معتبر کتابیں تصنیف کیں، علمائے زمانہ نے ان کی جانب اس قدر اور اس حد تک اعتنا کیا کہ اس کو اپنا دستور العمل بنایا اور خاص وعام لوگوں نے ان کو حرز جان بنایا۔

بعد کے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی تصنیفات کی مقبولیت اور حسن قبول کا اعتراف کیا ہے، ذیل میں حروف تہجی کی ترتیب سے ان کے نام نقل کیے جاتے ہیں اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا جاتا ہے، مشکوٰۃ کی شرحوں کا ذکر آخر میں آئے گا۔

ا۔ **اجازۃ الحدیث فی القدیم والحدیث:** اس رسالہ میں اپنی اسناد حدیث درج کی ہیں مگر یہ دستیاب نہیں، مرأۃ الحقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق کے کتب خانہ میں تھا، بعض لوگوں نے اسی رسالہ کا نام ذکر اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث لکھا ہے (۱) مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی مرحوم نے اسماء الاساتذہ کے نام سے بھی ان کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

۲۔ **اجوبۃ الاثنا عشر فی توجیہ الصلوٰۃ علی سید البشر:** یہ مختصر رسالہ شیخ نے ایک ہی نشست میں سحر کے وقت تحریر کیا تھا، اس میں درود شریف اللّٰھم صل علی محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم کی تشبیہ پر بحث وگفتگو کی ہے، اس کا قلمی نسخہ بھی مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں ۱۹۰۲ء تک موجود تھا۔ (۳)

۳۔ **احوال الائمۃ الاثنا عشر:** یہ رسالہ حضرت خواجہ محمد پارسا کی مشہور کتاب

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۴۔ (۲) ایضاً۔ (۳) بحوالہ مرأۃ الحقائق، ص ۴۸۔

فصل الخطاب سے ملخص ہے(۱) اس کا قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں بارہ ائمہ کے حالات درج ہیں، اس کا تاریخی نام ''دم خاندان کرم'' ہے جس سے ۱۰۱۰ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔(۲)

۴۔اخبار الاخیار: یہ ہندوستان کے علماو مشائخ کا ایک مستند تذکرہ ہے، اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے زمانہ سے لے کر اپنے دور تک کے صوفیہ واخیار کے حالات لکھے ہیں، ابتدا میں تبرکاً اور عقیدت کی وجہ سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے سلسلۂ قادریہ میں شیخ کئی بزرگوں سے بیعت تھے، اخبار الاخیار میں ہندوستانی بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں اور اس کی ترتیب مندرجہ ذیل تین طبقوں پر ہے، پہلے طبقہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور ان کے معاصرین اور مریدین وخلفا کے حالات دیے ہیں، دوسرے میں بابا فرید گنج شکر اور ان کے ہم عصر بزرگوں اور مریدوں کا تذکرہ ہے اور تیسرے طبقہ میں حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی اور ان کے سلسلہ کے بزرگوں اور معاصرین کے تراجم قلم بند کیے ہیں، پھر مجاذیب اور اصحاب عرفان خواتین کا ذکر کیا ہے، آخر میں ایک تکملہ ہے،اس میں اپنے آباواجداد اور خود اپنے نجی وذاتی حالات لکھے ہیں۔

اخبار الاخیار کو شیخ عبدالحق نے بڑی محنت وتحقیق اور غیر معمولی کاوش اور دیدہ ریزی سے لکھا ہے اور اس سے ان کے وسعت مطالعہ اور علمی تبحر کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱۔حتی المقدور مستند واقعات لکھے ہیں اور کشف وکرامات کے قصوں اور خرافات سے پرہیز کیا ہے، بزرگوں کے حالات وواقعات کے بیان میں عموماً غلو وافراط سے کام لیا ہے لیکن شیخ نے اس سے اپنے کو محفوظ رکھا ہے، عقیدت کے باوجود انہوں نے واقعات کی تحقیق

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۵۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۰۴۔

اور چھان بین میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔

۲۔ مصنف نے صرف سادہ حالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ صاحب تصانیف صوفیہ کی کتابوں کے اقتباسات بھی دیے ہیں اور بعض بزرگوں کے اقوال و ملفوظات اور مکتوبات وغیرہ بھی نقل فرمائے ہیں، اس کی وجہ سے جہاں مصنف کے ذوق و رجحان کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کے تذکرہ کے مستند اور بلند پایہ ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

۳۔ یہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اور مختلف علاقوں کے صوفیہ کا تذکرہ ہے۔

۴۔ یہ کتاب محض بزرگان دین کا تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے علم و معرفت کی گوناگوں مفید باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں اور تصوف و سلوک کی دقیق اصطلاحات اور رموز و اسرار کے بارہ میں واقفیت ہوتی ہے۔

۵۔ عبارت سلیس و فصیح اور طرز ادا نہایت بلیغ و مؤثر ہے۔

۶۔ غیر ضروری تفصیل اور جزئی واقعات کو نظر انداز کرنے کے باوجود کوئی اہم اور ضروری بات چھوڑی نہیں گئی ہے۔

اخبار الاخیار شیخ کی اہم، کامیاب اور مقبول کتابوں میں ہے، اس کی شہرت ان کے زمانہ ہی میں پورے طور پر ہو گئی تھی، جہانگیر جیسے نکتہ شناس بادشاہ نے بھی ان کی اس کاوش کو پسند کیا تھا اور اس کی داد دی تھی، اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ گئے ہیں اور اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

بعض مصنفین کا خیال ہے کہ یہ شیخ کی سب سے پہلی تصنیف ہے (۱) اور خود شیخ نے بھی اپنی کتاب تالیف القلب الالیف میں اس کی صراحت کی ہے مگر وہ اس کی تالیف میں اس کے بعد بھی برسوں محنت شاقہ فرماتے رہے اور اس میں برابر حک و اضافہ بھی کرتے رہے،

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۰۵۔

یہی وجہ ہے کہ پہلے اس کی ضخامت زیادہ تھی، بعد میں برابر کمی ہوتی رہی، غالباً اسی وجہ سے اخبار الاخیار کے بعض نسخوں میں عبارت مختلف ہے۔

۵۔ **آداب الصالحین:** شیخ محدث کے زمانہ میں اخلاقی ومعاشرتی حیثیت سے جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو دور کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں اسلامی طرز حیات اور اصول اخلاق کو پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب امام غزالی کی احیاء العلوم کے اکل وشرب اور منام ومعاشرت وغیرہ چند ابواب کا خلاصہ ہے (۱) اس کا فارسی متن اور اردو ترجمہ ہادی الناظرین کے نام سے چھپ گیا ہے (۲) مگر دستیاب نہیں ہے۔

۶۔ **آداب اللباس:** اس میں رسول اللہؐ کے ملبوسات کی تفصیل لکھی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ مکروہ ممنوع لباس کیا ہیں، رسالہ کے قلمی نسخے بانکی پور برٹش میوزیم اور برلن وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے (۳) بعض لوگوں نے اس کا نام رسالہ فی آداب اللباس اور رسالہ آداب رسول اللہؐ بھی لکھا ہے۔

۷۔ **آداب المطالقه و المناظره:** یہ ایک منظوم مثنوی ہے، اس میں گفتگو اور مناظرہ کے آداب بتائے ہیں۔ (۴)

۸۔ **اسماء الرجال و الرواة:** اس کا پورا نام **اسماء الرجال و الرواة المذکورین فی کتاب المشکوٰة** ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام **کتاب اسماء الرجال المشکوٰة المصابیح** بھی لکھا ہے (۵) اور بعض نے **الاکمال فی اسماء الرجال** لکھا ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے، اس میں مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کے راویوں کا مختصر تذکرہ ہے پھر آل رسول کا، اس کے بعد دیگر صحابہ کرام اور راویان حدیث کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر ہے، علاوہ ازیں بعض اکابر محدثین اور ائمہ اربعہ نیز امام اعظم کے چند مشہور وممتاز تلامذہ کا حال،

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۸۔ (۳) ایضاً۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵۔ (۵) معارف دسمبر ۴۲ء، ص ۴۳۱۔

بھی لکھا ہے، اس کا قلمی نسخہ خدا بخش خان لائبریری پٹنہ میں ہے۔ (۱)

۹۔ **استیناس انوار القبس فی شرح دعاء انسؓ:** یہ رسالہ شیخ کے مکتوبات کے مجموعہ میں طبع ہو چکا ہے۔ (۲)

۱۰۔ **افکار الصافیہ فی ترجمۃ کتاب الکافیہ:** اس کا نام بعض لوگوں نے صرف افکار لکھا ہے، یہ فن نحو کی کتاب ہے، اسے شیخ نے طالب علمی کے زمانہ میں ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر میں لکھا تھا، وہ خود فرماتے ہیں ''بچپن میں طالب علمی کے ابتدائی دور میں ایک شخص کی تقریب سے جس سے معنوی نسبت اور قوی رابطہ تھا، منصوبات کے آخر تک اس کی تسوید مکمل ہو گئی تھی اور مرفوعات کی بحث بیاض تک پہنچ چکی تھی، راقم کی عمر اس وقت ۱۵ یا ۱۶ برس تھی۔'' (۳)

۱۱۔ **التعلیق الحاوی علی تفسیر البیضاوی:** قاضی بیضاوی کی مشہور و مقبول تفسیر بیضاوی کی جز اول کے ربع کی شرح و تعلیق ہے، اس میں تفسیر کے بعض اغلاط و نقائص دکھائے ہیں، یہ تعلیق ناپید ہے۔ (۴)

۱۲۔ **الجواھر المضیہ فی شرح الدرۃ البھیہ:** فن منطق میں آٹھ صفحے کا مختصر رسالہ ہے جو چھپ گیا ہے اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ (۵)

۱۳۔ **الفوائد:** فقہ و عقائد سے متعلق یہ رسالہ ہے، قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں بتایا جاتا ہے۔ (۶)

۱۴۔ **انتخاب المثنوی المولوی المعنوی:** یہ مولانا روم کی مشہور و مقبول مثنوی کا انتخاب ہے (۷) شیخ نے فہرس التوالیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔

---

(۱) معارف دسمبر ۴۲ء، ص ۴۳۱ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث، ۱۸۴ و ۱۸۵، نیز The Contribution of Inida in arbic litrature. P256 (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۱۔ (۳) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۱۳ و نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶۔ (۴) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۱ و ۱۶۲۔ (۵) ایضا، ص ۲۰۴۔ (۶) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (باقی اگلے صفحہ پر)

۱۵۔**الانوار الجلیہ فی احوال المشائخ الشاذلیہ:** اس فارسی رسالہ میں سلسلۂ شاذلیہ کے مشائخ کا ذکر ہے، اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں تھا۔(۱)

۱۶۔**ایراد العبارات لبیان اھل الاشارات:** فوائد جامعہ میں اس کا ذکر ہے۔(۲)

۱۷۔**البناء المرفوع فی ترصیص مباحث الموضوع:** فن منطق کی کتاب ہے جس میں شرح شمسیہ و شرح مطالع اور ان کے حواشی سے عمدہ مباحث بھی نقل کیے ہیں اور جا بجا اپنی جانب سے بھی کچھ دلچسپ نکات شامل کر دیے ہیں۔(۳)

۱۸۔**تالیف القلب الالیف بذکر فھرس التوالیف:** اس میں شیخ محدث نے اپنی تصانیف کی فہرست درج کی ہے، اس کی ابتدا میں دہلی کے بعض شعراو مصنفین کے حالات بھی دیے ہیں، یہ پہلے مطبع عزیزی رامپور سے، پھر مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوئی تھی، سید شمس اللہ قادری نے حیدر آباد سے اس کا ابتدائی حصہ تذکرہ مصنفین دہلی کے نام سے شائع کیا تھا اور ایلیٹ نے بھی اپنی تاریخ میں اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ دیا ہے۔(۴)

۱۹۔**تجلیۃ القلوب القدس الملکوت بشرح دعاء التضوت:**

۲۰۔**تحصیل البرکات والطیبات ببیان معنی التحیات:** یہ دونوں شیخ کے مکتوب ہیں جو ان کے المکاتیب والرسائل میں طبع ہو چکے ہیں۔(۵)

۲۱۔**تحصیل التعریف فی معرفۃ الفقہ والتصوف:** یہ شیخ کا اہم علمی کارنامہ ہے، اس میں فقہ و تصوف یا شریعت و طریقت میں تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔(۶)

سابقہ حاشیہ: ص ۱۸۱۔(۷) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶۔

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۳۔(۲) ایضاً، ص ۱۴۳۔(۳) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۳۔(۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ...... و حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۸ و رود کوثر، ص ۳۸۵۔(۵) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۴۔(۶) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۱۔

۲۲۔ **تحصیل الغنائم والبرکات بتفسیر سورہ والعادیات**: یہ سورہ والعادیات کے فوائد و برکات پر مختصر نوٹ ہے جو ان کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے۔(۱)

۲۳۔ **تحقیق الاشارۃ الی تعمیم البشارۃ**: اس میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے جن میں عشرۂ مبشرہ کے علاوہ دوسرے بزرگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جنت کی بشارت صرف عشرۂ مبشرہ کے لیے مخصوص نہیں، اس ضمن میں اس سے متعلق بعض اور امور و مباحث بھی قلم بند کیے گئے ہیں، کتاب کے مقدمہ میں اہل بیت کے فضائل اور اصول حدیث کے بعض قاعدے بھی بیان کیے گئے ہیں۔(۲)

۲۴۔ **ترجمۃ غنیۃ الطالبین**: غنیۃ الطالبین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مشہور تصنیف ہے جو مختلف دینی مسائل پر ہے، شیخ عبدالحق نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا مگر وہ ناپید ہے۔(۳)

۲۵۔ **ترجمہ مکتوب النبی الامی فی تعزیۃ ولد معاذ بن جبل**: یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مکتوب گرامی کا ترجمہ ہے جو حضرت معاذ بن جبلؓ کے نام آپ نے ان کے فرزند کی تعزیت کے سلسلہ میں لکھا تھا، شیخ کا ترجمہ مجموعہ مکاتیب میں شامل اور چھپ چکا ہے۔(۴)

۲۶۔ **ترجمہ منہج السالک الی اشرف المسالک**: یہ نایاب ہے، اصل کتاب منہج السالک کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے۔(۵)

۲۷۔ **ترغیب اھل السعادات علی تکثیر الصلوٰۃ علی سید الکائنات**: اس رسالہ میں درود شریف کے فضائل فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں، اس کا ذکر شیخ نے

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۲۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵ و معارف دسمبر ۴۲ء، ص ۴۲۹۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۳۔ (۴) ایضاً، ص ۱۶۵ و تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۱۸۴۔
(۵) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۲۰۰۔

فہرس التوالیف میں بھی کیا ہے اور اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ لائبریری میں بھی ہے۔(۱)

۲۸۔تسلیۃ المصاب لنیل الاجر والصواب فی الصبر: مصائب و آفات میں صبر کی تلقین و تاکید سے متعلق رسالہ ہے، اس کا نام بھی شیخ نے اپنی تصنیفات کی فہرست میں گنایا ہے۔(۲)

۲۹۔تکمیل الایمان و تقویۃ الایمان: یہ عقائد کے موضوع پر اہم اور مشہور کتاب ہے، مصنف پہلے عربی عبارت نقل کرتے ہیں، پھر فارسی میں اس کی شرح تحریر فرماتے ہیں، علاوہ ازیں خود بھی عمدہ فوائد اور دلچسپ نکات لکھے ہیں، اس طرح اہل سنت والجماعت کے اصول پر اس میں تفصیل سے اسلامی عقائد کا ذکر ہے اور مسئلہ خلافت پر بھی مبسوط گفتگو کی گئی ہے، اس کے دیباچہ میں شیخ نے خود لکھا ہے کہ یہ کتاب ہر طالب صادق مومن کے لیے لکھی گئی ہے اور اس میں مذہب حق اور قول صحیح کے بیان پر اختصار کیا گیا ہے اور مذاہب رائغہ اور اقوال باطلہ کے ذکر سے پرہیز کیا گیا ہے اور بحث و جدال کا راستہ اور قیل وقال کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، کلامی دلائل اور فلسفیانہ موشگافیاں بھی اس میں نہیں آنے پائی ہیں تاکہ طالب ورطہ حیرت و تذبذب میں نہ پڑے، یہ کتاب متنوع مضامین کا مجموعہ اور نہایت جامع ہے، سلیس اور سلجھے ہوئے انداز بیان کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ متعدد بار طبع ہوئی، اس کا اردو ترجمہ بھی سبیل الجنان کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔(۳)

۳۰۔تنبیہ العارف بما وقع فی العوارف: یہ کتاب عربی زبان میں ہے، اس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے اس قول کہ ''قدمی علی رقبۃ کل ولی اللہ'' (میرا قدم ہر ولی اللہ کے گردن پر ہے) کے متعلق حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے

---

(۱) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۲۰۰ و حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۰۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۰۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۰ و نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶۔

اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ یہ حالت سکر میں کہا گیا ہے، شیخ عبدالحق دہلوی کا خیال ہے کہ یہ حالت صحو تھا اور انہوں نے بحکم الٰہی یہ ارشاد فرمایا تھا، اس سلسلہ میں صوفیہ سکر وصحو اور غلبہ حال سے تحدیث نعمت کے طور پر جو باتیں کہتے ہیں یا جو احوال واخبار ان سے ظہور میں آتے ہیں ان کا حکم بھی بیان کیا ہے، یہ رسالہ رضا لائبریری رام پور میں ''الرسالة في بيان قول قدمي هذا على رقبة كل ولي الله'' کے نام سے موجود ہے۔(۱)

۳۱۔**توصيل المريد الى المراد ببيان احكام الاحزاب والاوراد :** فارسی میں ایک مفید رسالہ ہے، فہرس التوالیف میں شیخ نے اس کے متعلق خود تصریح کی ہے کہ اس میں اوراد ووظائف اور احزاب کے علوم وقواعد بیان کیے گئے ہیں اور محدثین ومشائخ کے مذہب کی توثیق کی گئی ہے کیوں کہ اس سلسلہ کے بعض اعمال کی تصحیح وتصنیف میں دونوں گروہوں کا اختلاف ہے، یہ رسالہ ۱۲۹۹ھ میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوا تھا اور اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔(۲)

۳۲۔**جامع البركات:** اس میں اپنی کتاب شرح مشکوٰۃ کا خلاصہ کیا ہے جو دو جلدوں میں ہے، ہر باب میں صرف ایک یا دو حدیثیں نقل کی ہیں اور باقی حدیثوں کے صرف مضمون بیان کرنے پر اقتضا کیا گیا ہے، یہ کتاب گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، اس کے بعض قلمی نسخے مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھے۔(۳)

۳۳۔**جذب القلوب الى ديار المحبوب :** یہ فارسی زبان میں مدینہ منورہ کی تاریخ ہے اسی لیے ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کا نام ترجمہ تاریخ ہند سکینہ لکھا ہے، اس کی تالیف میں نورالدین سمہودی کی مشہور کتاب وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ سے خاص مدد لی ہے اور اپنے دلکش اور مؤثر انداز بیان کی وجہ سے مخصوص کیفیت اور تازگی پیدا کردی ہے، مدینہ منورہ

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۴ وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۸۱۔ (۲) ایضاً باختلاف صفحات۔

(۳) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۴ وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۷۰۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے انہیں جو والہانہ تعلق تھا، اس کا اظہار اس کتاب سے پوری طرح ہوتا ہے اس کی ابتدا ان اشعار سے کی ہے ۔

صد شکر کہ از تشنگی غم رستم
چوں قطرہ بدریائے کرم پیوستم
بر کشتی توفیق ازل نشستم
و زمزم قدس چہرہ دل شستم

اس کتاب کو بڑی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور یہ کلکتہ، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی تاریخ مدینہ منورہ کے نام سے نولکشور پریس سے شائع ہوا ہے، اس کے قلمی نسخے بھی متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، بانکی پور پٹنہ کا قلمی نسخہ ۱۰۴۸ھ کا ہے، گویا یہ مصنف کی زندگی ہی کا ہے۔

شیخ عبدالحق نے اس کی تالیف کا سلسلہ ۹۹۸ھ میں مدینہ منورہ ہی میں شروع کر دیا تھا اور ۱۰۰۱ھ میں اس کو دہلی میں مکمل کیا تھا۔(۱)

۳۴۔جواب بعض کلمات شیخ احمد سرہندی: یہ رسالہ نایاب اور غیر مطبوعہ تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب حیات شیخ عبدالحق میں اسے بطور ضمیمہ شائع کیا ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم نے اس کو رسالہ فی الرد علی بعض اقوال الشیخ احمد بن عبدالاحد السرھندی کہا ہے۔(۲)

۳۵۔حاشیہ الفوائد الضائیہ: علم نحو سے متعلق رسالہ ہے۔(۳)

۳۶۔الدرۃ البھیہ فی اختصار الرسالۃ الشمسیہ: منطق میں مختصر وجامع رسالہ ہے(۴) برٹش میوزیم میں قلمی نسخہ ہے۔(۵)

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۹۳و۱۹۴۔(۲) نزہۃ الخواطر، ج۵ص۲۰۹۔(۳) ایضاً ص ۲۰۶۔(۴) ایضاً۔(۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۱۹۱۔

۳۷۔الدرۃ الفرید فی بیان قواعد التجوید: فن تجوید میں ہے، اس میں متن، شرح ممزوج ہے۔(۱)

۳۸۔دفاتر: اوراد پر مشتمل رسالہ ہے، فہرست کتب خانہ رامپور میں اس کا ذکر ملتا ہے۔(۲)

۳۹۔ذکر سلوک: اس کا نام تاریخ حقی اور تاریخ سلاطین ہند بھی ہے، یہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ ہے، اس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور کے اپنے زمانہ تک کے واقعات وحالات قلم بند کیے ہیں، اس کا آغاز معزالدین بن حسام کے دور سے اور اختتام اکبر کے عہد پر کیا ہے، یہ ۱۰۰۵ھ میں مکمل ہوئی اور اس میں اکبر کے چالیسویں جلوس ۱۰۰۴ھ تک کے حالات درج ہیں، بہلول لودھی کے زمانہ تک کے واقعات طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی وغیرہ کی مدد سے لکھے ہیں، اس کے بعد سے اپنے دور تک کے واقعات سماعی اور ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، اس کی ابتدا میں ایک دیباچہ ہے جو اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ الی قولہ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ سے شروع ہوا ہے اور اختتام اس شعر پر ہوا ہے۔

مقصود اہل ذوق ز د گذشتگان

تنبیہ عبرت است چہ مسکیں چہ بادشاہ

یہ ابتدائی عبارت اور شعر دونوں اہم اور پر معنی ہیں۔

پہلے باب میں اکبر کے زمانے تک کی دہلی کی تاریخ دی ہے، پھر جونپور، بنگال، مانڈو، دکن، ملتان، سندھ اور کشمیر کے سلاطین کے حالات اختصار سے لکھے ہیں۔

نواب مرتضی خاں شیخ فرید نے ان سے فرمائش کی کہ بعد کے واقعات کا بھی اس میں اضافہ کر دیں مگر شیخ عبدالحق کو دوسرے علمی کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے اس کا موقع

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵،ص۲۰۶ وتذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص۱۷۸۔ (۲) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص۲۰۱۔

نہیں ملا اس لیے انہوں نے اپنے فرزند شیخ نور الحق سے اس کو مکمل کرایا، انہوں نے زبدۃ التواریخ کے نام سے اکبر کے دور کے مزید حالات اور بعد کے واقعات کا اضافہ کیا، اس کے بعد بھی اس کتاب کے تکملے اور تتمے لکھے گئے، ایک تکملہ مولوی حاجی رفیع الدین خاں مراد آبادی کا لکھا ہوا ہے، اس میں ۱۱۹۴ھ تک کے واقعات درج ہیں، یہ کتاب طبع نہیں ہوئی ہے، ہندستان کے متعدد کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے ہیں۔(۱)

۴۰۔**رسالہ اثبات توقیت:** یہ غالباً علم الفقہ میں ہے، بروکلمن نے اس کا ذکر کیا ہے۔(۲)

۴۱۔**رسالہ اقسام الحدیث:** یہ اصول حدیث میں ہے اور اس میں حدیث کی اصطلاحات اور اقسام وغیرہ پر عام فہم انداز میں گفتگو کی ہے، یہ نہایت مفید و مقبول رسالہ ہے، شیخ نے عربی میں مشکوٰۃ کی جو شرح لکھی ہے یہ غالباً اس کے مقدمے کے طور پر ہے، مشکوٰۃ کے ساتھ یہ بھی عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہے، اس کے کئی اردو ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں اور مشکوٰۃ کے ساتھ اس کا عربی متن بھی کئی دفعہ چھپا ہے۔(۳)

۴۲۔**رسالہ تنبیہ اهل الفكر برعاية آداب الذكر۔**

۴۳۔**رسالہ ذكر الاحوال والاقوال بهته على رعاية طريق الاستقامة والاعتدال:** دونوں رسالہ کا ذکر عجالہ نافعہ کے حواشی فوائد جامعہ میں مولانا عبدالحلیم چشتی نے کیا ہے۔(۴)

۴۴۔**رسالہ شب برات:** فارسی زبان میں شب برات پر مختصر رسالہ ہے۔(۵)

۴۵۔**رسالہ عقد انامل:** اوراد کو انگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق یہ رسالہ لکھا تھا۔(۶)

---

(۱) رود کوثر، ص ۳۸۶ و ۳۸۷، حیات شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۹۶، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۵۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۶۔ (۳) ایضاً، ص ۱۸۵ و نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۹۔ (۴) فوائد جامعہ، ص ۱۴۔ (۵) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۹۔ (۶) ایضاً۔

۴۶۔رسالہ فی اسرار الصلوٰۃ۔ ۴۷۔رسالہ فی الوظائف : مولانا حکیم سید عبدالحی نے دونوں رسالوں کا ذکر کیا ہے۔(۱)

۴۸۔رسالہ نوریہ سلطانیہ، یہ سیاست مدن سے متعلق رسالہ ہے جو اصلاً شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر کے لیے لکھا گیا تھا، اس میں اس کے لیے سلطنت کے قواعد وضوابط، حکمرانی کے اصول وآداب اور دوسرے مفید امور ومسائل بیان کیے گئے ہیں، مصنف نے خود دیباچہ میں لکھا ہے:

کلمہ چند از احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واخبار وآثار سلف کرام وحکایات ومآثر سلاطین عظام وبرائے انچہ متضمن خیر وصلاح دنیا وآخرت باشند ترجمہ نمودہ است۔	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ، اسلاف کرام کے ارشادات بڑے بڑے بادشاہوں کے واقعات وحالات اور دین ودنیا کے خیر وصلاح سے متعلق دوسری کچھ مفید باتوں کا اس رسالہ میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ حال ہی میں ڈاکٹر سلیم اختر نے پاکستان سے اپنے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تالیف میں متعدد کتابوں سے مدد لی ہے، جیسے سیرت ابن ہشام، تاریخ آل برمک، جوامع الحکایات عوفی، تاریخ گزیدہ حمداللہ مستوفی، گلستاں بوستاں ونصیحۃ الملوک شیخ سعدی اور اخلاق محسنی، ملا حسین واعظ کاشفی سے بھی پورا استفادہ کیا گیا ہے لیکن یہ صرف اخذ واقتباس ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ہر جگہ بقدر ضرورت حذف واختصار اور انتخاب سے بھی کام لیا ہے اور صفحوں پر پھیلے ہوئے مواد کو مختصر عبارت میں سمیٹ لیا ہے اور اپنی جودت طبع اور حسن ذوق سے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ مضمون اچھوتا اور دلکش ہو گیا ہے، ایک جگہ دادرسی کے لیے سلاطین کے زنجیر بنانے کا ذکر بھی کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کے بادشاہوں میں

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۹۔

میں بھی اس کا رواج تھا، ممکن ہے جہانگیر کو زنجیر عدل بنانے کا خیال شیخ کے اسی رسالہ کی وجہ سے ہوا ہو۔

۴۹۔ رسالہ وجودیہ: مرآۃ الحقائق میں اس کا ذکر ہے اور مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ (۱)

۵۰۔ زاد المتقین: اس مفید اور دلچسپ کتاب میں اپنے ان اساتذہ و شیوخ کا ذکر کیا ہے جن سے سفر حجاز میں استفادہ کیا تھا اور خصوصیت سے شیخ علی متقی اور ان کے شاگرد اور اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب کا تذکرہ لکھا ہے، علاوہ ازیں مکہ معظمہ میں قیام کے دوران کے واقعات بھی درج کیے ہیں، اس کے دیباچہ میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

"میں دو سال سے زیادہ عرصہ تک مکہ معظمہ میں رہا، اس میں وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا اسے اس میں ضبط کیا ہے۔"

اور فہرس التوالیف میں لکھا ہے کہ "اس کے احوال مکہ معظمہ میں ضبط کیے گئے تھے اور ۱۰۰۳ھ میں اس کو تفصیل سے لکھا" وہ فرماتے ہیں کہ "اگر اس کا نام صراط مستقیم اور منہج قویم بھی رکھوں تو مناسب ہو اور میزان، عدل و دین حق اس کا لقب رکھوں تو درست ہو، اگر سالک اس رفتار پر چلے تو منزل مراد کو پہنچ جائے اور اگر حاکم وقت اسے دستور حال بنائے تو جادہ سے تجاوز نہ کرے، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد اور برٹش میوزیم میں ہیں۔ (۲)

۵۱۔ زبدۃ الآثار منتخب بهجة الاسرار: بہجۃ الاسرار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک مفید و مستند کتاب ہے، اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس کے مصنف شیخ نور الحسن ابوالحسن علی بن یوسف (۶۴۴ھ تا ۷۱۳ھ) ایک جید عالم اور سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے اور ان کے اور عبدالقادر جیلانی کے درمیان صرف دو واسطے ہیں، شیخ عبدالحق کو شاہ جیلانی سے والہانہ عقیدت و تعلق تھا، اس لیے انہوں نے زبدۃ الآثار کے نام سے

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۶۔ (۲) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۸۔

یہ خلاصہ عربی زبان میں لکھا جس میں اصل کتاب کا عطر کھینچ لیا ہے، یہ کتاب بمبئی سے ۱۳۰۴ھ میں شائع ہوئی تھی اور اس کا اردو ترجمہ بھی کحل الابصار کے نام سے چھپا تھا، اس کے قلمی نسخے بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہیں (۱) داراشکوہ کی فرمائش پر خود شیخ نے اس کا فارسی ترجمہ بھی کیا تھا۔(۲)

۵۲۔شرح اسماء الرجال بخاری: مولوی رحمٰن علی نے تذکرہ علمائے ہند میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۳)

۵۳۔شرح سفر السعادۃ: سفر السعادۃ شیخ محمد بن یعقوب مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس کی تصنیف ہے جو دراصل حافظ ابن قیم کی شہرہ آفاق تصنیف زاد المعاد کا خلاصہ ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی یہ مبسوط شرح لکھی، اس کا نام الطریق القویم فی شرح صراط مستقیم بھی، حافظ ابن قیم کی تصنیف اپنے موضوع پر بے نظیر ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادات، حالات، معمولات زندگی اور معاش ومعاشرت کے آداب وغیرہ بہت خاص انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اس کی اہمیت کی وجہ سے فیروز آبادی نے اس کا خلاصہ تیار کیا، ائمہ اربعہ وغیرہ کے یہاں جو باتیں ان کو صحیح احادیث اور آپ ؐ کے معمولات کے برخلاف نظر آئیں ان کی تصریح ووضاحت بھی کی ہے، شیخ نے جہاں تک ممکن ہوا ہے ائمہ اور خصوصاً حنفی مذہب کا دفاع کیا ہے، فہرست التوالیف میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا مجد الدین کا مقصد اس کتاب میں یہ ہے کہ ذات نبوی کے عبادات وعادات سے متعلق اعمال شریفہ کو حدیث سے ثابت کریں، اس کے مخالف اگر مذاہب اربعہ کا مذہب ہوتا ہے تو اس کی تصریح کر کے اس کا ردو انکار کرتے ہیں، شرح میں مذاہب اربعہ خصوصاً حنفی مذہب کی تاکید کی گئی ہے اور مصنف کے کلام سے معارضہ کیا گیا ہے جو ان کے دعوے کے

(۱) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۰۸۔(۲) نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲۰۹۔(۳) تذکرہ علمائے ہند، ص۱۱۔

مطابق احادیث کے موافق ہے، راقم نے اس کے برخلاف ثابت کیا ہے۔"(۱)

اس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں حنفی مذہب کی بے جا تائید کی گئی ہے، صاحب دراسات اللبیب اور نواب صدیق حسن خاں وغیرہ نے اسی حیثیت سے اس پر ردوکد کی ہے۔(۲)

شیخ عبدالحق نے شرح کو تین حصوں میں مرتب کیا ہے، پہلے میں علامہ فیروز آبادی کی نقل کردہ حدیثوں پر محدثانہ کلام کیا ہے اوران کی تحقیق وتوضیح فرمائی ہے، ان کے ماخذ واسناد پر بھی گفتگو کی ہے، دوسرے میں ائمہ ومجتہدین کو موضوع بحث بنایا ہے اور خاص طور پر حنفی مذہب کی بھی تائید وتقویت فرمائی ہے، یہی کتاب کا خاص حصہ ہے، تیسرے حصہ میں شرعی احکام کو مفصل طور پر بیان کیا ہے، ہر مبحث میں گوناگوں فوائد اور علمی نکات بھی تحریر کیے ہیں۔

یہ شرح بھی بڑی تحقیق وکاوش سے لکھی گئی ہے اوراس میں اسماء الرجال، تاریخ وسیر، تفسیر وحدیث اور شروح حدیث سے پوری مدد لی ہے، یہ کتاب بھی شیخ کی اہم اور مفید کتابوں میں ہے، مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"فیروز آبادی کی فارسی سفر السعادۃ کی فارسی شرح لکھی جو حافظ ابن القیم کی زاد المعاد کے لگ بھگ ہے۔"(۳)

اس کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، بانکی پور پٹنہ کے نسخہ کو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے اور یہ کلکتہ اور لکھنؤ سے چھپ بھی گئی ہے۔

۵۴۔شرح الشمسیہ: منطق میں ہے اور تصور وتصدیق کے مباحث پر مشتمل ہے۔(۴)

۵۵۔شرح الصدور بتفسیر آیۃ النور: یہ کتاب سورۂ نور کی آیت اَللّٰهُ نُوْرُ

(۱) بحوالہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۲۔ (۲) اتحاف النبلاء، ص ۸۸۔ (۳) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۳۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ کی تفسیر ہے (۱) اس کا نسخہ مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا مگر اب پتہ نہیں۔ (۲)

۵۶۔ شرح فتوح الغیب: شیخ عبدالقادر جیلانی کے ملفوظات و مواعظ کو ان کے صاحبزادے شرف الدین ابو عبدالرحمٰن عیسیٰ نے فتوح الغیب کے نام سے جمع کیا تھا جو تصوف کی مشہور و مقبول کتابوں میں ہے، شیخ عبدالحق کو ان کی ذات سے جو والہانہ عقیدت تھی اس کی بنا پر انہوں نے اس کی یہ عمدہ شرح لکھی اور فرط ادب و احترام سے نہ اس پر اپنا نام دیا اور نہ مقدمہ تحریر فرمایا، شیخ نے شرح بڑی شستہ و سلیس زبان میں اور نہایت موثر انداز میں لکھی ہے، اس کے متعلق خود ان کا بیان ہے کہ ''مقالات دین اور اہل یقین کے کمالات کی تحقیق میں لسان رسالت و زبان نبوت کے موافق ہے کہ صدیقین کے معارف کی شان ہوتی ہے۔'' (۳)

فتوح الغیب سے ان کو رغبت سے اور دلچسپی اپنے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی کی اس تاکید کی وجہ سے بھی ہوئی تھی کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ اس کو حاصل کر کے بغور پڑھو اور جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرو، چنانچہ حجاز سے ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے اس کا نسخہ حاصل کیا اور مرشد کی ہدایت کے مطابق اسے بغور ملاحظہ فرمایا، اس کے بعد شاہ ابوالمعالی کے حکم سے اس کی شرح و ترجمہ کا کام کیا اور ۱۰۲۳ھ میں اس کو مکمل کیا اور مفتاح الفتوح تاریخی نام رکھا، یہ شرح بھی نولکشور پریس سے چھپ چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۵۷۔ شرح القصیدہ الجرزیہ: یہ فن تجوید میں ایک رسالہ ہے اور اس کا قلمی نسخہ پشاور کے کتب خانہ میں ہے۔ (۴)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۶۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق، ص ۱۶۲۔ (۳) فہرس التوالیف قلمی بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۸۱۔ (۴) فہرست لباب المعارف الاسلامیہ۔

۵۸۔**صحیفة المودة** :یہ مجموعہ خطوط اصل میں ایک مثنوی ہے مگر نایاب ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی نے اس کا نام **ارجوزۃ فی المکاتبات الیٰ اعزتہ واحبابہ** لکھا ہے۔(۱)

۵۹۔**فصول الخطب لنیل اعالی الرتب** (۲): خطبات کا مجموعہ ہے جو نایاب ہے۔

۶۰۔**کتاب الفوائد والصلوٰۃ** : فارسی زبان میں اوراد پر ایک کتاب ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، علما و اولیا سے منقول دعائیں جمع کی ہیں اور تعویذات بھی دیے ہیں۔(۳)

۶۱۔**ماثبت بالسنة فی ایام السنة** : یہ تصنیف عربی میں ہے، اس میں سال کے بارہ مہینوں سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں، اس کی ابتدا ماہ محرم سے کی ہے اور محرم و عاشورہ، محرم کے مذہبی اعمال و مناسک کے بارہ میں صحیح حدیثیں اکٹھا کی ہیں، پھر ان کے بارہ میں جو غلط رسوم و توہمات رائج ہو گئے ہیں ان کی تردید کی ہے، مثلاً یہ خیال کہ عاشورے کے دن سرمہ لگانے سے درد نہیں ہوتا یا اس روز غسل کرنے سے آدمی بیمار نہیں ہوتا، اسی طرح شہادت حسینؓ سے متعلق احادیث پر بھی نقد و تبصرہ کیا ہے، ماہ صفر کے ذکر میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ یہ نامبارک مہینہ ہے، ماہ ربیع الاول کا تذکرہ کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیا ہے، ربیع الثانی کی بحث میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا مختصر حال لکھا ہے، اسی طرح شعبان، رمضان، شوال اور ذی الحجہ کے سلسلہ میں روزہ، تراویح، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ اور حج و قربانی سے متعلق احادیث یکجا کی گئی ہیں (۴) اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں اور یہ کلکتہ و لاہور سے شائع بھی ہوئی ہے اور دہلی سے مع ترجمہ چھپی ہے۔(۵)

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۵،ص۲۰۶۔(۲) ایضاً،ص۲۰۴۔(۳) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص۲۰۱۔

(۴) معارف دسمبر۴۲،ص۴۲۸۔(۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی،ص۱۷۱۔

۶۲۔مدارج النبوۃ: یہ فن سیر کی معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں سیرت نبویؐ پر محققانہ بحث کی گئی ہے، یہ کتاب شیخ محدث کا مہتم بالشان علمی کارنامہ اور رسول کریمؐ کی حیات طیبہ کا مکمل مرقع ہے، اس کا مقصد اس زمانہ کے فتنوں کا استیصال اور نظریہ الفی وغیرہ کی تردید ہے، ان کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے تعلق کو توڑنے اور ختم کرنے کی جو مختلف النوع سازشیں ہو رہی تھیں ان کا پردہ چاک کر کے آپؐ کی ذات سے مسلمانوں کا تعلق توڑنے اور ختم کرنے کی جو مختلف النوع سازشیں ہو رہی تھیں ان کا پردہ چاک کر کے آپؐ کی ذات سے مسلمانوں کا تعلق برقرار رکھنے اور جوڑنے کی مکمل کوشش کی گئی ہے، چنانچہ اس کے ایک باب ''حقوق مصطفیٰ'' میں رسالت محمدی پر ایمان کی ضرورت و اہمیت واضح کی گئی ہے اور اس امر کی تردید کی گئی ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ہے، شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''حدیث کے علاوہ شیخ عبدالحق نے سب سے زیادہ توجہ سیرت اور مدینۃ النبی کی تاریخ پر (جسے سیرت کا تکملہ کہنا چاہیے) مبذول کی، مقصد ساری کوششوں کا یہ تھا کہ مہدویہ تحریک، بعض درویشان مغرور کے دعاوی اور مقام اقدس محمدی کے عدم ادراک، نظریہ الفی، دربار اکبری میں توحید بلکہ عقلیت کے مقابلہ میں نبوت سے کم نگہی، رسول اکرمؐ کے صحیح واقعات زندگی سے عام ناواقفیت ان تمام اسباب کی بنا پر عوام جادۂ محمدی سے دور جا رہے تھے اس کا سد باب ہو جائے، چنانچہ شیخ نے اسلامی ہندوستان کی پہلی مبسوط سیرت نبوی مدارج النبوۃ کے نام سے بارہ سو صفحات میں ترتیب دی جواب بھی مقبول ہے۔''(۱)

ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل

(۱) رود کوثر، ص ۳۸۴۔

ہے، اس نے پہلے نہ صرف ہندوستان بلکہ فارسی زبان میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر ایسی مفصل اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی تھی شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

> ''مدارج النبوۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، سیرت شامیہ اور مواہب لدنیہ سیرت کی کتابوں میں سب سے بڑی کتابیں ہیں۔''(۱)

اس کتاب کو شیخ نے مواہب لدنیہ اور دوسری کتب سیر کی مدد سے لکھا تھا اور یہ پانچ حصوں میں منقسم اور دو جلدوں پر مشتمل ہے، یہ متعدد بار چھپ چکی ہے اور منہاج النبوۃ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی اس کی جلد اول کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کے آخر میں کاتب کا نام صاحب خاں لکھا ہوا ہے، غالباً بارہویں صدی ہجری میں اس کی کتابت ہوئی ہے، کتاب کے آخر میں رمضان ۱۴۱ھ کتابت کا سنہ دیا ہے، تاریخ بھی لکھی ہے، مگر روشنائی پھیل جانے کی وجہ سے پڑھی نہ جا سکی، پھر تصحیح کا سال ۴۲ھ دیا ہے اور تاریخ ۱۸ رمضان لکھی ہے مگر صدی دونوں جگہ نہیں تحریر ہے، خیال یہی ہے ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۴۲ھ ہوگا۔

۶۳۔ مرج البحرین: اس کا پورا نام مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین ہے، یہ دراصل قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ کی شرح ہے جو حضرت شیخ احمد المغربی معروف بہ شیخ رزق اللہ کی تصنیف ہے، شیخ نے شرح کے علاوہ اس کا ترجمہ بھی کیا ہے، اس کے مطالعہ کی ہدایت انہیں خاص طور پر ان کے شیخ عبدالوہاب متقی نے کی تھی، اس کے متعلق انہوں نے خود یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''یہ رسالہ جامع طریقین ہے، یعنی فقہ وتصوف اور شریعت وطریقت، ظاہر وباطن، صورت ومعنی، قشر ولب، علم وخال، صحو وسکر، مذہب ومشرب اور عقل وعشق، اگر اسے صراط مستقیم وطریق قویم کہیں تو جائز ہے، دین خالص

---

(۱) عجالہ نافعہ مع فوائد، ص ۴۸۔

اور سبیل اسلم اس کا لقب رکھا جائے تو روا ہے، دعوت حق و منہج ارشاد کہنا درست ہے اور میزان عدل و دستور العمل گردانا ٹھیک ہے۔"(۱)

اس کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

"یہ ایک عجیب کتاب ہے جو فقہ، تصوف، علم اور حال کی جامع ہے، اس سے وہ فقیہ فائدہ اٹھائے گا جو اللہ سے محبت کرنے والا اور اپنے احوال کی نگرانی کرنے والا ہو اور وہ صوفی بھی جو محقق اور مقید بہ اعمال ہو، اس سے وہ فقیہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو راہ اعتدال سے ہٹ جانے والا اور معاند ہے اور نہ وہ صوفی جو راہ اعتدال سے ہٹ جانے والا اور اعمال و طاعات سے بے نیاز ہو۔"(۲)

مرج البحرین مختصر ہونے کے باوجود ایک مفید کتاب ہے، شیخ نے شریعت و طریقت تصوف و فقہ اور علم و عقل پر نہایت دلنشیں بحث کی ہے، قرآن و حدیث اور کتب تصوف کے بکثرت حوالے دیے ہیں، ان کے شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے موضوع کی خشکی تری میں بدل گئی ہے۔

مرج البحرین کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے جو اس لحاظ سے قیمتی اور اہم ہے کہ اس کی تصحیح خود حضرت شیخ نے کی ہے، اس کی پشت پر شیخ کی یہ تحریر بھی ثبت ہے۔(۳)

هذه سبع رسائل تاليف الفقير الحقير	یہ سات رسالے فقیر حقیر اور ضعیف ترین
اضعف عباد الله القوى عبدالحق	بندۂ خدا عبدالحق بن سیف الدین دہلوی
بن سيف الدين الدهلوى عفا عنهما	عفا اللہ عنہما کی تصنیف ہیں۔

مرج البحرین ۱۲۶۵ھ میں مطبع عبدالرحمٰن سے اور ۱۲۷۴ھ میں مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی تھی، وصال السعدین کے نام سے اس کا اردو ترجمہ مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے

---

(۱) مرج البحرین، ص ۳ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق۔ (۲) تذکرہ شیخ عبدالحق، ص ۱۹۴۔ (۳) ایضاً، ص ۱۸ و ۱۹۔

کیا تھا جو مطبع نامی لکھنؤ سے ۱۳۱۴ھ میں چھپا تھا، مولوی شیخ عبدالقادر صدیقی نے اس کی شرح فارسی زبان میں شرح البحرین کے نام سے کی تھی۔(۱)

۶۴۔ مکتوبات ورسائل: اس کا نام کتاب المکاتیب والرسائل بھی ہے، یہ اڑسٹھ [۶۸] خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت باقی باللہ، شیخ عبداللہ نیازی، شاہ ابوالمعالی، نواب مرتضی خان (شیخ فرید)، نواب خانخاناں، شیخ ابوالخیر مبارک اور فیضی وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے جن میں شرح وبسط کے ساتھ بعض اہم مسائل ومباحث پر گفتگو کی گئی ہے اور جس موضوع پر گفتگو کی ہے اس میں بڑی تلاش وتحقیق سے کام لیا ہے، اس حیثیت سے ہر مکتوب بڑا اہم ہے جو قدر وقیمت میں ایک رسالہ سے کم نہیں ہے، مکتوبات کا یہ مجموعہ ۱۳۳۲ھ میں چھپا تھا، اس کے قلمی نسخے کم ہیں اور جو ہیں ان میں مضامین کی کمی بیشی ہے۔(۲)

۶۵۔ نکات الحق والحقیقة من معارف الطریقة: یہ فارسی زبان میں ایک مختصر لیکن بیش قیمت تصنیف ہے، اس کی تقسیم نکات پر کی گئی ہے اور ہر نکتہ لطیف خیالات سے پر ہے، اس کو مولوی سید محمد لطیف مرادآبادی نے مطبع احتشامیہ مرادآباد سے ۱۸۹۱ء میں شائع کیا تھا، مولوی انوارالحق صاحب نے جو شیخ کے ہم خاندان تھے ۱۳۱۹ھ میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ دہلی سے خان بہادر خدا بخش خان کو ہدیۃً بھیجا تھا جو ان کی لائبریری میں موجود ہے، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں مطبوعہ اور قلمی دونوں نسخے موجود ہیں۔(۳)

۶۶۔ نکات العشق والمحبة فی تطیب قلوب الاحبة: شیخ نے اپنی فہرست میں اس ادبی کتاب کا ذکر کیا ہے۔(۴)

۶۷۔ وصیت نامہ: اس میں شیخ کی وصیتیں درج ہیں (۵) اس کا ایک قلمی نسخہ

---

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۵۔ (۲) ایضاً، ص ۲۱۱۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۶ وتذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۹ و ۲۰۰۔ (۴) تذکرہ شیخ عبدالحق دہلوی، ص ۲۰۴۔ (۵) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۱۰۔

مولوی انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ (۱)

۶۸۔ **ھدایة الناسک الی طریق المناسک**: اس رسالہ میں زیارت حرمین اور مناسک واعمال حج پر بحث کی گئی ہے، شیخ فہرس التوالیف میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''اس راہ کے سالکوں اور اس درگاہ کے قاصدوں کے لیے مناسک حج وآداب زیارت کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ (۲)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے اہم اور قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کی فارسی اور عربی زبان میں شرحیں لکھ کر حدیث وسنت کو فروغ دیا، اس کتاب کی شرح لکھنے کا خیال انہیں اسی لیے ہوا ہوگا کہ اس میں صحاح کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں، اس لیے وہ صحیح حدیثوں کا منتخب مجموعہ ہے اور اس کو پڑھ لینے کے بعد آدمی یک گونہ دوسری کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس لیے اس کی شرح دراصل صحاح ہی کی شرح ہے، کتب حدیث میں مشکوٰۃ جامعیت وترتیب کے لحاظ سے بھی اہم ہے، اس میں اسناد حذف کر کے صرف صحابی کا نام دیا ہے اور آخر میں مآخذ کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔

پہلے ہم شیخ کی فارسی شرح کا اور آخر میں عربی شرح کا ذکر کرتے ہیں:

۶۹۔ **اشعة اللمعات**: یہ فارسی زبان میں مشکوٰۃ المصابیح کی جامع ومکمل شرح ہے اس کی تالیف کی تقریب بیان کرتے ہوئے شیخ نے دیباچہ میں لکھا ہے:

''حرمین کے اساتذہ وشیوخ حدیث سے استفادہ کے بعد ہندوستان واپس ہوا تو اللہ نے حدیث شریف کے علم کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اس کی بدولت مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، کیوں کہ اس وقت یہ ایک متبرک کتاب ہے، شرح لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے جو

---

(۱) مرأة الحقائق، ص ۶۰ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۸۔ (۲) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۵ و ۱۸۶۔

فوائد مشائخ وقت سے سنے ہیں یا ان کی کتابوں میں دیکھے یا جو اپنے
خیال میں آئیں انہیں طلبہ تک پہنچادوں، بعض جلیل القدر اصحاب صفا اور
اہل تعلق ومحبت نے فرمایا کہ اگر شرح فارسی میں ہو تو اس کا نفع زیادہ عام
ہوگا، شروع کرنے پر ایسی باتیں مطالعہ میں آئیں کہ جن کو فارسی شرح میں
لکھنا مناسب نہ تھا، لیکن لوگوں کی فرمائش سے ہاتھ اٹھا لینے کی بھی گنجائش
نہ تھی، اس لیے عربی شرح بھی اسی کے ساتھ شروع کردی جو پہلے مکمل ہوگئی
اور فارسی درمیان میں ہی رک گئی، پھر امر ہوا کہ فارسی بھی پوری کروں، اس
طرح جو کچھ تحریر ہوچکی تھی وہ بیاض میں لایا اور باقی کی تکمیل شروع کی۔''(۱)

کہا جاتا ہے کہ شرح کی تکمیل کے لیے شیخ کے مرشد حضرت شاہ ابوالمعالی کی جانب سے برابر تقاضا اور اصرار ہو رہا تھا، ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا ''شرح مشکوۃ کو مکمل کیجیے انشاء اللہ اس سے ایک عالم مستفید ہوگا''(۲) شاہ صاحب نے انہیں اس کی بھی ہدایت کی تھی کہ ''شرح میں موقع کی مناسبت سے اشعار بھی لکھے جائیں''(۳) شیخ نے اس پر بھی عمل کیا۔

اس طرح چھ برس میں یہ شرح مکمل ہوئی، ابتدا ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں کی تھی اور ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، گو عربی شرح دقیق علمی وفنی بحثوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم اور فائق ہے مگر خود شاہ صاحب کا بیان ہے کہ:

''مشکوۃ کی یہ فارسی شرح گو قدر ومنزلت میں عربی شرح سے فروتر
ہے لیکن تنقیح وترتیب اور ضبط وربط میں اس سے فائق اور قابل ترجیح ہے،
حجم وضخامت میں بھی اس سے بڑھ گئی ہے، تائید الٰہی اور نصرت باری سے
نفیس، عمدہ، مرتب، پسندیدہ اور مقبول کتاب تیار ہوگئی۔''(۴)

---

(۱) دیباچہ ج ۱ ص ۲۔ (۲) کتاب المکاتیب والرسائل، ص ۳۰۲ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۵۔
(۳) حیات عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۵۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰۴ بحوالہ تالیف القلب الالیف۔

اس میں مشکل لفظوں اور دقیق بحثوں کی عمدہ شرح کی گئی ہے اور یہ شرح ترتیب و تہذیب میں عربی شرح سے بہتر اور اختصار و جامعیت اور افادیت میں اس سے سوا ہے، نواب صدیق حسن خان رقم طراز ہیں:

> ''یہ شرح تنقیح و تہذیب اور معانی کے ضبط و ربط کے لحاظ سے عربی شرح کے مقابلہ میں فائق و برتر، اس سے زیادہ مفصل اور ضخامت میں بڑھ کر ہے، اخذ و استفادہ کی سہولت، غریب کی شرح، مشکل کے ضبط اور فقہ حنفی کے مسائل کے بیان میں اشعۃ اللمعات بے نظیر کتاب ہے، اس کی شہرت و مقبولیت بیان سے مستغنی ہے۔''(۱)

ہندوستان میں اس شرح کی وجہ سے علم حدیث کا چرچا ہوا، حدیث کا ذوق پیدا ہوا اور اس سے اشتغال بڑھا۔

ترتیب و تبویب: اشعۃ اللمعات چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے، اس میں فن حدیث کے اصول و مصطلحات اور علم حدیث کے اقسام وغیرہ پر مفید بحث کی ہے اور بعض کبار محدثین کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں، چاروں جلدوں کے مندرجات کی تقسیم اس طرح کی ہے:

پہلی جلد میں ۵ کتب کا ذکر ہے: کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز، دوسری جلد چھ کتب پر مشتمل ہے: کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب فضائل القرآن، کتاب الدعوات، کتاب اسماء اللہ تعالیٰ، کتاب المناسک۔

تیسری جلد ۹ کتب کا مجموعہ ہے، کتاب البیوع، کتاب العتق، کتاب الحدود، کتاب الامارۃ والقضاء، کتاب الجہاد، کتاب الصید والذبائح، کتاب الاطعمہ، کتاب اللباس، کتاب الطب والرقی۔

---

(۱) اتحاف النبلاء۔

چوتھی جلد میں کتاب الآداب اور کتاب الفتن کے ابواب درج ہیں:

شرح کی قدر و قیمت اور اصل نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں، محدثین نے کتاب الایمان میں یہ مشہور حدیث نقل کی ہے:

''عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ''

مشکوٰۃ میں یہ حدیث مذکور ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی شرح کرتے ہوئے پہلے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی روایت کرنے والے صحابی کے متعلق یہ تحریر کیا ہے:

> ''عبداللہ بن عمرو بن عاص بن وائل سہمی، سہمی بن عمر کی جانب نسبت ہے جو قبیلہ قریش کا ایک بطن ہے، حضرت عبداللہ عابد و عالم تھے، دن میں روزہ رکھتے تھے اور رات میں قیام کرتے تھے، وہ اپنے والد سے ۱۲ سال چھوٹے تھے، وہ آنحضرتؐ کی حدیثوں کو قلم بند کر لیتے تھے۔''(۱)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے تھے کہ میرے اور ان کے درمیان یہ فرق تھا کہ وہ احادیث کو قلم بند کرتے تھے اور میں حدیثیں نقل نہیں کرتا تھا۔

حضرت عبداللہ اہل بیت سے بھی محبت کرتے تھے، گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے والد کی رضا جوئی کی خاص طور پر وصیت اور تاکید کی تھی، اس وجہ سے اہل بیت سے تعلق و محبت کے باوجود حضرت امیر معاویہؓ اور اپنے والد بزرگوار کی صحبت میں بھی رہتے تھے، ان کا اصل نام عاص تھا جو ان کے دادا کا بھی نام تھا مگر رسول اللہؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھا تھا، شیخ محدث نے حدیث کا جو ترجمہ کیا وہ قابل توجہ ہے، فرماتے ہیں:

''کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے عام مسلمان سلامت رہیں'' حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

---

(۱) حضرت عبداللہؓ نے حدیثوں کا ایک مجموعہ قلم بند کیا تھا جو صحیفہ عمرو بن عاص کہلاتا تھا۔

''مسلمان زبان سے گالی نہیں دیتا، غیبت نہیں کرتا، ناروا اور ناگفتنی باتیں نہیں کرتا اور ہاتھ سے مارتا نہیں، رنج نہیں دیتا اور غصب نہیں کرتا، حدیث میں زبان اور ہاتھ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے آیا ہے کہ ایذا کی اکثر صورتوں کا باعث یہی دونوں عضو ہوتے ہیں، انسان کے اندرون اور باطن کی تعبیر و ترجمانی بھی زبان ہی کرتی ہے اور ہاتھ سے بہت سارے کام انجام پاتے ہیں، زبان کا پہلے اسی لیے ذکر کیا ہے کہ اس کی ایذا زیادہ تکلیف دہ اور سخت ترین ہوتی ہے اور اس کی زد گذشتہ، موجودہ اور آئندہ آنے والے سب ہی لوگوں پر پڑتی ہے مگر ہاتھ کی ایذا صرف حاضر اور موجود لوگوں ہی پر اثر انداز ہوتی ہے، تحریر و کتابت کی ایذا کا تعلق بھی زبان ہی سے ہوتا ہے بلکہ اس کے موجب ہاتھ اور زبان دونوں ہوتے ہیں، مسلمان کی تخصیص باعتبار غالب ہے ورنہ ذمی اور فرماں بردار غیر مسلم بھی اس حکم میں شامل ہیں، چنانچہ ابن حبان کی روایت میں من سلم الناس (کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے عام لوگ سلامت رہیں) کے الفاظ وارد ہیں جو اس روایت کے مقابلہ میں زیادہ عموم کو شامل ہے جیسا کہ سیوطی نے بیان کیا ہے۔

یہاں مراد ناحق ایذا سے ہے ورنہ جو ایذا شریعت کے حکم کے مطابق ہو وہ جائز ہے اور ایسی صورت میں زجر، ضرب اور شتم وغیرہ بالکل روا ہے بلکہ بعض اوقات واجب بھی ہے۔

بے حکم شرع آب خون خطا است
واگر خون بفتوی بریز در رواست

حدیث کا مقصود و منشا یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے اوصاف و خصائص

یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو ایذا نہیں دیتے اور ہر مسلمان کو اسی وصف کا حامل ہونا
چاہیے اور جس کے اندر یہ وصف نہ پایا جائے وہ گویا مسلمان نہیں ہے،
اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ محض یہ وصف رکھنے والا ہی کامل مسلمان ہے خواہ
دین کے باقی احکام وارکان میں وہ کمی اور کوتاہی ہی کیوں نہ کرے جیسا
کہ کہا گیا ہے ۔

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو شخص حقوق اللہ کو ادا کرنے کے ساتھ ہی حقوق العباد
کو بھی ادا کرتا ہے وہ کامل مسلمان ہے۔''(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل کے باب کی فصل اول کی پہلی
روایت یہ ہے:

عن انس قال خدمت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر سنین فما قال لی اف ولا لم صنعتہ ولا لا صنعت	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دس برس تک خدمت کی مگر آپ نے نہ مجھ سے اف کہا اور نہ یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہیں کیا۔

اس حدیث کا مطلب خیز ترجمہ جس طرح کیا ہے اس سے اس کا مفہوم اچھی
طرح واضح ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی دس برس تک خدمت کی، آپ جب مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے
تو حضرت انسؓ کی والدہ اور قبیلہ انصار کے ان کے بعض اعزہ نے انہیں

(۱) اشعۃ اللمعات مطبوعہ کلکتہ، ج۱، ص۲۷ و۲۸۔

آنحضرتؐ کی خدمت کے لیے پیش کیا، ان کی عمر اس وقت آٹھ یا دس برس تھی، اس میں اختلاف ہے، البتہ وہ دس سال تک جو آپ کے قیام مدینہ کی مدت ہے آپ کی خدمت میں رہے لیکن اس طویل زمانہ میں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارا آپؐ نے ان سے اف نہیں کہا۔

اف میں الف کو پیش ہے اور ف مشدد و مکسور ہے جو تنوین کے ساتھ بھی ادا کیا جاتا ہے اور بلا تنوین بھی، یہ لفظ کراہت پر دلالت کرتا اور کسی ناگوار امر کو دیکھنے پر اس کے ذریعہ زجر و توبیخ کی جاتی ہے یا چیخ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح کبھی آپ نے مجھ سے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور نہ ہی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا، یعنی جو دنیوی خدمت ان کے سپرد تھی یا دینی امور کے بارے میں بھی آپ نے ان کو کچھ نہیں فرمایا۔

اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال سماحت اور حسن خلق کا اندازہ ہوتا ہے مگر مشکوٰۃ کے شارح علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ''اس سے حضرت انسؓ کا مقصد خود اپنی مدح و تحسین بھی ہے کہ میں نے ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے آپ مجھ پر اعتراض و نکیر فرماتے، مگر یہ بات اہل نظر سے مخفی نہیں ہے کہ پہلا مفہوم موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ مناسب و موافق ہے جو آپؐ کی مدح و ستائش اور شرافت و کرامت نیز حضرت انسؓ پر لطف و شفقت کا متضمن ہے۔''(۱)

تسویۃ الصفوف کے باب میں جماعت کی صفوں کو درست نہ کرنے پر اس وعید کا ذکر ہے:

---

(۱) اشعۃ اللمعات، ج ۴، ص ۲۶۸۔

او لیخالفن اللہ بین وجوھکم — اللہ تمہارے اندر مخالفت پیدا کر دے گا۔

اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے شیخ رقم طراز ہیں:

''حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں بھی اس قسم کی بات بیان ہوئی ہے کہ اختلاف نہ کرو کہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں، یہ اس وجہ سے کہ اختلاف یا بعض لوگوں کے اظہار تفوق سے قلوب میں باہم نفرت پیدا ہوتی ہے، کینہ کپٹ اور عداوت بھڑکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں دین کے کلمہ میں اختلاف ہوتا اور اسلام کی شوکت میں ضعف و انحلال واقع ہوتا ہے، یا خدا اور رسول کے حکم کو ترک کرنے اور اس کی نافرمانی کی وجہ سے قلوب پر ظلمت و کدورت طاری ہوتی ہے جو انسان کے ظواہر میں بھی سرایت کر جاتی ہے اور یہ غالباً اختلاف کی خصوصیت ہے۔

حدیث کے سیاق سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ مخالفتِ وجوہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہروں کو ان کی پشت کی جانب کر دے گا یا ان کی شکل مسخ کر کے حیوانات کی صورت کا بنا دے گا جیسا کہ امام کی مخالفت کے سلسلہ میں وارد ہے کہ امام سے پہلے اپنا سر اٹھانے والا کیا اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کے سر کی طرح کر دے گا۔''(۱)

اس حدیث کی تشریح میں جس دوسری حدیث کا حوالہ ہے اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

اما یخشی الذی یرفع راسہ قبل الامام ان یحول اللہ راسہ راس الحمار (۲) — کیا وہ شخص جو امام سے پہلے (رکوع وسجدہ) میں اپنا سر اٹھاتا ہے اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کے سر سے پلٹ دے گا۔

---

(۱) اشعۃ اللمعات، ج۱، کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف، ص۲۳۳۔(۲) ایضاً باب ما یجب علی الماموم۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ایسے آدمی کی صورت کو اللہ تعالیٰ گدھے کی صورت جیسا بنا دے گا، شیخ عبدالحق اس روایت کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''امام غزالی فرماتے ہیں کہ یہ آدمی کی نافہمی اور بلادت سے کنایہ ہے اور اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ وہ کس قدر نافہم اور بلند ہے کہ امامت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا، ان کی نزدیک حدیث کی یہی تاویل متعین ہے، چنانچہ وہ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم برابر یہ دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام سے سبقت کرنے والے کسی شخص کا چہرہ یا صورت گدھے کے چہرے یا صورت میں تبدیل نہیں ہوتا، حدیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ تحویل کی خشیت ہے نہ کہ اس کا وقوع، طیبی کا بیان ہے کہ گدھے کی صورت میں تبدیل کیے جانے سے مراد بلادت اور بیوقوفی ہے، مسخ اس امت میں روا نہیں ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ تحویل کا تعلق دنیا کے بجائے آخرت سے ہے اس امت میں مسخ کے وقوع کے بارے میں اختلاف ہے۔''(۱)

ان مثالوں سے ترجمہ و تشریح کی نوعیت وخوبی کا اندازہ ہوا ہوگا، اب ہم اس کی بعض نمایاں خصوصیات تحریر کرتے ہیں۔

خصوصیات: اس کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ ترجمہ و تشریح میں سہل، عام فہم اور دلنشیں انداز و پیرایہ اختیار کیا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے حدیث کا مطلب و مفہوم اچھی طرح واضح ہو گیا ہے اور عام لوگوں کے لیے بھی اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو گیا ہے۔

۲۔ اس میں اہم مباحث و مسائل سے بقدر ضرورت تعرض کیا گیا ہے لیکن ان پر اس طرح بحث کی ہے کہ پڑھنے والا دقیق امور میں الجھے بغیر حدیث کی روح و منشا سے واقف

(۱) اشعۃ اللمعات باب مایجب علی الماموم۔

ہو جاتا ہے، ایسے موقع پر تفصیل واطناب اور غیر متعلق مباحث سے بھی پرہیز کیا گیا ہے تاکہ قاری کو اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہو۔

۳۔ اختصار کے باوجود مطلب ومفہوم کو سمجھنے میں خلل اور دشواری نہیں ہوتی۔

۴۔ مصنف نے احادیث سے دلچسپ استنباط کیا ہے۔

۵۔ دفع تعارض بھی کیا ہے اور مختلف یا متضاد حدیثوں میں جمع وتطبیق کی ہے۔

۶۔ تشریح وتفہیم کے لیے آیات قرآنی واحادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے اور ائمہ دین، محدثین اور شراح کے اقوال بھی پیش کیے ہیں۔

۷۔ حنفی مذہب کو شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور اس کے دلائل نقل کیے ہیں اور اسے حدیث کے مطابق قرار دیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے فقہا ومجتہدین کے اقوال و دلائل بھی ذکر کیے ہیں۔

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور راویوں کے بارہ میں معلومات تحریر کیے ہیں۔

۹۔ یہ جس طرح عام لوگوں کے لیے کارآمد اور مفید شرح ہے، اسی طرح اہل علم اور خواص کے لیے بھی مفید ہے، اس بنا پر اساتذہ وطلبہ سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ اہل علم میں ہمیشہ قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھی گئی، چونکہ مشکوٰۃ اکثر مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس لیے اس شرح سے بھی خاص طور پر استفادہ کیا جاتا ہے اور شیخ کا مقدمہ تو عموماً مدارس کے نصاب کا جز ہی ہے۔

اس شرح کی اہمیت ومقبولیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں اور یہ متعدد بار شائع بھی ہو چکی ہے، پہلے کلکتہ کے مطبع احمدی سے ۱۲۵۱ھ کے لگ بھگ چار ضخیم جلدوں میں چھپی، پھر بمبئی سے طبع ہوئی اور مطبع نول کشور سے اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔

۷۰۔ لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح: شیخ عبدالحق محدث دہلوی

کو حدیث کی کتابوں میں مشکوٰۃ المصابیح سے خاص دلچسپی تھی، اس لیے انہوں نے فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں اس کی شرح لکھی، یہ پہلے گزر چکا ہے کہ فارسی شرح لکھتے وقت چند ایسے اہم علمی مسائل و نکات ان کے سامنے آئے جن کو فارسی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا، اس لیے انہوں نے عربی میں شرح لکھنا شروع کیا (۱) اور فارسی سے پہلے یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

یہ شیخ کی تالیف انیق اور شرح احادیث میں ایک مکمل، جامع، مفید و نافع اور عظیم و جلیل کتاب ہے جو مفید تحقیقات، لطیف نکات، دقیق مباحث اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے (۲) اس میں لغوی و نحوی مشکلات اور فقہی مسائل کو بہت خوبی سے حل کیا ہے، علاوہ ازیں احادیث سے فقہ حنفی کی مطابقت بھی کامیابی سے دکھائی ہے، خود فرماتے ہیں کہ اس شرح کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت امام شافعیؒ اصحاب رائے میں سے ہیں اور حضرت امام اعظم اصحاب ظواہر میں سے، انہوں نے شرح میں ایک ہی حدیث کے مختلف طرق روایات بھی جابجا بیان کر دیے ہیں اور راویوں کے اسماء والقاب صحت کے ساتھ منضبط کیے ہیں، شروع کا مقدمہ نہایت جامع و مفید ہے جو مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ اور علاحدہ رسالہ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے (۳) اس کے چند اردو تراجم بھی ہوئے ہیں، یہ مقدمہ حدیث کے اقسام و اصطلاحات اور اصولی مباحث پر مشتمل اور نہایت مقبول ہے، افسوس ہے کہ شیخ کی یہ تالیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے مگر اس کے قلمی نسخے بانکی پور پٹنہ، رام پور، حیدر آباد، پشاور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، دہلی، علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

شیخ کی اولاد و احفاد: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد بھی ان کے خاندان میں علمی روایات باقی رہیں اور ان کی اولاد و احفاد علم کی خدمت اور احادیث کی نشر و اشاعت

---

(۱) تعارف مخطوطات دارالعلوم دیوبند، ص ۱۱۵، بحوالہ دیباچہ لمعات۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۴، بحوالہ تالیف قلب الالیف۔ (۳) معارف دسمبر ۴۲ء مضمون ڈاکٹر زبید احمد صاحب۔

میں مشغول رہی، ان کے کارنامے بھی اہم ہیں، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے:

''از اعقاب او ہفت تن تحصیل علم رسیدہ نمودہ بافادہ مشغول اند۔''(۱)

ہم ان سب کا مفصل حال تحریر کرنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ تلاش وتفحص کے باوجود ان کے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہو سکے، تاہم اس نسل وخانوادہ کے لوگوں کے جس قدر حالات معلوم ہو سکے ہیں ذیل میں وہ پیش کیے جاتے ہیں۔

☆☆☆

(۱) بادشاہ نامہ، جلد اول نصف آخر، ص ۳۴۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء۔

شیخ نور الحق دہلوی رحمہ اللہ

(المتوفی ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء)

نام، خاندان، پیدائش، وطن اور تعلیم: یہ شیخ عبدالحق کے سب سے بڑے بیٹے تھے، ان کا نام نور الحق، کنیت ابو السعادات اور لقب جمال تھا، ان کا خاندان بخارا (ترکستان) سے دہلی آیا تھا اس لیے ترکی، بخاری اور دہلوی کی نسبتوں سے مشہور ہوئے، شیخ نور الحق شاعر تھے اور مشرقی تخلص کرتے تھے، اس لیے اس نسبت سے بھی مشہور ہیں۔

ان کی ولادت ۹۸۳ھ میں دہلی میں ہوئی، انہوں نے ساری تعلیم از ابتدا تا انتہا اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالحق محدث سے حاصل کی اور حدیث کی سند بھی انہی سے لی۔(۱)

درس و تدریس: اپنے والد کے انتقال کے بعد سرکاری عہدہ سے مستعفی ہوکر ان کی مسند درس پر فروکش ہوئے اور اپنے خاندانی مدرسہ میں درس حدیث کی خدمت اور فرائض صدارت انجام دینے لگے، محمد صالح کنبوہ کا بیان ہے:

وپس از رحلت آں جناب نور الحق خلف الصدق کہ در علم وفضل شہرۂ آفاق بود مدت مدید صدر آرائی مدرسہ استفادہ گشتہ۔(۲)	آنجناب (عبدالحق) کے رحلت فرمانے کے بعد ان کے خلف الصدق نور الحق جو علم وفضل میں شہرۂ آفاق تھے، مدرسہ کے صدر نشین ہوکر

(۱) مآثر الکرام، ج۱، ص۲۰۲ و نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۴۲۴۔ (۲) عمل صالح، ج۳، ص۳۷۸، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

عرصہ دراز تک لوگوں کو مستفید فرماتے۔

مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کن لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا، شیخ اکرام نے صرف ایک شاگرد قطب المحدثین مولانا سید مبارک حسین واسطی بلگرامی (متوفی ۱۷۰۵ء) کا نام تحریر کیا ہے۔(۱)

شیخ مبارک کے والد کا نام فخر الدین تھا، یہ شعبان ۱۰۳۳ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم کی ابتدا ہوئی اور بعض درسی کتابیں پڑھنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور خواجہ عبداللہ بن عبدالباقی نقش بندی کے حلقہ درس سے وابستہ ہوئے، یہیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند رشید شیخ نور الحق اور نواسے شیخ ابو رضا بن اسماعیل سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۰۶۴ھ میں اپنے وطن واپس آئے اور درس و تدریس کے مشغلہ میں لگ گئے، وہ ایک باوقار اور پر رعب شخص تھے جن کے سامنے کسی کو منکر و معصیت کے ارتکاب کی جرأت نہیں ہوتی تھی، اچھے مقرر و خطیب اور بڑے خلیق بھی تھے، ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ میں انتقال ہوا۔(۲)

جامعیت اور علمی کمالات: شیخ نور الحق اپنے والد ماجد کی طرح علم و فضل میں یکتا اور ان کے دینی و علمی کمالات کے وارث و جانشین تھے، آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ:

> ''یہ یگانۂ روزگار حضرت شیخ کے خلف الصدق، ان کے شاگرد اور ان کے صوری و معنوی کمالات کے وارث تھے۔''(۳)

خود ان کے والد بزرگوار کو بھی ان کے علم و فضل کی بنا پر ان سے بڑا انس تھا اور وہ اپنا خلیفہ و جانشین کہتے تھے، اپنے رسالہ وصیت میں ان کے بارے میں اس کی تلقین فرماتے ہیں کہ:

> ''فرزند عزیز نور الحق کو فقیر کا خلیفہ و جانشین سمجھا جائے اور ان کے ساتھ تعظیم و تقدیم سے پیش آیا جائے۔''(۴)

---

(۱) رود کوثر، ص ۳۸۸۔ (۲) مآثر الکرام، ج ۱، ص ۲۰۲۔ (۳) ایضاً۔ (۴) بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۸۔

وہ حدیث وفقہ میں یگانہ اور بلند پایہ مؤرخ ہونے کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے، صاحب طبقات شاہجہانی نے انہیں ''جامع علوم متداول'' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

ولد ارشد مخدوم الانامی شیخ عبدالحق دہلوی است از علوم صوری ومعنوی فراواں بہرہ دارد ومنظور ومقبول پدر بزرگوار خود است او از برکات آں نظر باعلی مرتبۂ دانش وفضل برآمدہ ومقبول خاص وعام است۔(۱)	شیخ نورالحق مخدوم الانام شیخ عبدالحق دہلوی کے فرزند رشید ہیں، ان کو صوری ومعنوی علوم سے بہرہ وافر ملا ہے، وہ اپنے پدر بزرگوار کے منظور نظر اور مقبول ہیں، ان کی نظر کی برکتوں کی وجہ سے فضل ودانش کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز اور خاص وعام ہر طبقہ میں مقبول ہیں۔

محمد صالح کنبوہ کا بیان اوپر گزرا ہے کہ ''در علم وفضل شہرۂ آفاق بود'' صاحب فرحت الناظرین رقم طراز ہیں:

فاضل محدث وعالم متبحر بود خلیفہ وجانشین پدر خود شیخ عبدالحق دہلوی است۔(۲)	شیخ نورالحق متبحر عالم وفاضل محدث اور اپنے والد شیخ عبدالحق کے جانشین ہیں۔

بختاور خاں نے بھی ان کو ''فاضل محدث وعالم متبحر'' لکھا ہے(۳) مولوی فقیر محمد جہلمی لاہوری رقم طراز ہیں:

> ''شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق دہلوی فقیہ محدث جامع کمالات صوری ومعنوی فاضل متبحر عالم تھے اور تلمیذ ومرید ومقبول اپنے والد بزرگوار یگانہ روزگار کے تھے۔''(۴)

---

(۱) طبقات شاہجہانی، ص۲۱۹ مخطوطہ نمبر۲۲۶، فارسیہ اخبار یونیورسٹی کلکشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔(۲) اقتباس فرحت الناظرین، ص۵۸ مطبوعہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور۔(۳) مرآۃ العالم، ج۲، تصحیح ومقدمہ ساجدہ علوی، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور۔(۴) حدائق الحنفیہ حدیقہ یازدہم، ص۴۱۸ مطبع نول کشور۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے فضل وکمال کا اعتراف کیا ہے اور ان کی علمی عظمت و برتری اور جامعیت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

فقہی مسلک: اپنے والد کی طرح مسلکاً حنفی تھے، ان کی زندگی اس مسلک کی تائید و ترجیح اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے وقف رہی، اپنی تصنیف شرح بخاری شریف میں بھی اس مذہب کی تائید وتقویت کی ہے، صاحب فرحت الناظرین لکھتے ہیں:

درتقویت مذہب امام ابوحنیفہ جہد بلیغ نمودہ واحادیث مخالف ایں مذہب را تاویلات نجستہ فرمودہ۔ (۱)	امام ابوحنیفہ کے مذہب کو قوی قرار دینے میں جہد بلیغ سے کام لیا ہے اور اس مذہب کی مخالف حدیثوں کی تاویل وتوجیہ کی ہے۔

بختاور خاں کا بھی بیان ہے کہ "درتقویت مذہب امام ابوحنیفہ جہد بلیغ نمودہ۔"

زہد واتقا: علم کی طرح عمل کے جامع، ورع وتقویٰ میں ممتاز اور پاکیزہ خو تھے، سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس کی خرابیوں سے محفوظ اور قابل ستائش سیرت کے مالک تھے، ان کے والد بھی ان کی سیرت و پاکیزگی وطہارت اور صلاح وتقویٰ کے معترف تھے اور انہیں اپنی نجات کا وسیلہ خیال کرتے تھے، فرماتے تھے کہ:

> "مجھ سے کوئی عمل ایسا نہیں ہوا جو عاقبت میں میری نجات کا سبب و واسطہ ہے، سوائے اس فرزند مسعود کے وجود کے، کیوں کہ لڑکا باپ کے اعمال خیر میں شمار ہوتا ہے۔" (۲)

خافی خان کا بیان ہے کہ:

از فضلائے نیک سیر آں عہد بود۔ (۳)	اس زمانہ کے نیک سیرت فضلا میں تھے۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے **محمود السیرۃ فی القضا** تحریر کیا ہے۔ (۴)

---

(۱) اقتباس فرحت الناظرین، ص ۵۸، ۵۹۔ (۲) مکتوب شیخ عبدالحق بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۸۸۔ (۳) منتخب اللباب، حصہ اول، ص ۵۵۱، کلکتہ ۱۸۶۹ء۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۴۔

سلوک و معرفت: شیخ نور الحق کا درجہ سلوک و عرفان میں بھی اونچا تھا، اپنے والد سے بیعت تھے، ان سے خلافت بھی پائی تھی، علم کی طرح تصوف و معرفت میں بھی ان کی جانشینی کی، سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہوکر گو ہمہ تن حدیث کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے مگر اسی کے ساتھ ارشاد و ہدایت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

تصوف سے اشتغال کی وجہ سے وہ صوفیوں اور درویشوں کے بارے میں حسن ظن اور اچھا اعتقاد رکھتے تھے، صاحب طبقات شاہجہانی کا بیان ہے:

اعتقادے صاف اخلاق درست بدرویشاں وعارفاں دارد علی الخصوص بقدوۂ عارفاں و زبدۂ خدا شناساں خواجہ محمد باقی نقشبندی اویسی قدس سرہ و حضرت خواجہ نیز بوئے التفاتے خاص و توجہے تمام داشتہ چندگاہ در خانقاہ پدر بزرگوار خود بدرس قیام می نمودہ۔(۱)

درویشوں اور عارفوں کے بارے میں صاف عقیدہ رکھتے تھے خصوصاً عارفوں اور خداشناسوں کے نمونہ خواجہ محمد باقی نقشبندی سے انہیں بڑا اخلاص تھا اور حضرت خواجہ بھی ان کے ساتھ بڑا اعتنا فرماتے تھے. شیخ نور الحق کچھ عرصہ تک اپنے والد کی خانقاہ میں درس میں بھی مشغول رہے۔

مولوی رحمٰن علی نے ان کو خواجہ محمد معصوم مجددی کا مرید بتایا ہے(۲) مگر بعض اہل علم کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، دراصل وہ اپنے والد ہی کے مرید و خلیفہ تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت عاشق محمد نبیرہ حضرت خواجہ شاہ نظام الدین نارنولی سے عقیدت و ارادت رکھنے لگے تھے۔(۳)

عہدۂ قضا: اپنے علمی و دینی کمالات، ورع و تقویٰ، علوم و فنون میں مہارت خصوصاً فقہ و حدیث میں امتیاز کی بناپر عہد شاہجہانی میں اکبر آباد کے قاضی مقرر ہوئے، شاہجہاں کو

---

(۱) طبقات شاہجہانی قلمی، ص ۶۱۹، ۶۲۰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (۲) تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۶۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۸۔

اپنے ایام شاہزادگی ہی سے شیخ نور الحق کے علم و کمال سے واقفیت تھی، اس لیے وہ ان کے ساتھ بڑی خصوصیت کا معاملہ کرتا تھا اور جب دکن روانہ ہونے لگا تو اکبر آباد کا محکمۂ قضا سپرد کیا، وہ اس عہدہ پر والد کی زندگی تک فائز رہے، انہوں نے اس نازک اور بھاری ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی اور نہایت دینداری کے ساتھ انجام دیا، طبقات شاہجہانی کے مصنف کا بیان ہے:

چوں حضرت صاحبقران ثانی از جوہر استعداد عالی وے از ایام شاہزادگی مطلع بودند وقتیکہ متوجہ دکن شدند اورا قاضی اکبر آباد کردند الیوم بقضاے قیام دارد و حق قضا چنانکہ باید ادا کردہ۔(۱)

چونکہ بادشاہ شاہزادگی کے زمانہ ہی سے شیخ نور الحق کی بلند استعداد سے واقف تھے، اس لیے جب دکن روانہ ہونے لگے تو انہیں اکبر آباد کا قاضی مقرر کیا، اس وقت شیخ قضا کے منصب پر فائز ہیں اور اس ذمہ داری کو جیسا چاہیے تھا ادا کر رہے ہیں۔

آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں:

وھو ادی ھذا المنصب العالی فی نھایة الدیانة والسداد (۲)

اور شیخ نور الحق نے اس بڑے عہدہ کو نہایت دیانت داری اور بڑی خوبی سے ادا کیا۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کا بیان ہے:

"شاہجہاں ایام شاہزادگی سے آپ کے جوہر استعداد عالی سے اطلاع رکھتا تھا جب دکن کو جانے لگا تو آپ کو اکبر آباد کا قاضی مقرر کر دیا گیا، چنانچہ آپ نے ایک مدت تک قضا کے منصب کو جیسا کہ چاہیے ادا کیا۔"(۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور وہ اس بارے میں

(۱) طبقات شاہجہانی، ص ۶۱۹ و ۶۲۰، مخطوطہ علی گڑھ۔ (۲) سبحۃ المرجان، ص ۱۴۱ تحقیق الدکتور فضل الرحمن ندوی معہد الدراسات الاسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (۳) حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۸۔

حق وانصاف سے کام لیتے تھے اور کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔

سلاطین سے تعلقات اور ان کی قدردانی: شیخ نورالحق اپنے فضل وکمال اور حسن سیرت کی بنا پر علما ومشائخ کی طرح سلاطین میں بھی مقبول ومحبوب تھے، اوپر بتایا جاچکا ہے کہ شاہجہاں اپنے بچپن ہی سے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے واقف تھا اس لیے انہیں اس نے عہدۂ قضا پر مامور کیا، وہ ان پر بڑا اعتماد کرتا تھا اور ان کا بہت قدرداں تھا، شیخ عالمگیر کے دربار میں بھی باریاب ہوتے اور انعامات سے نوازے جاتے، صاحب فرحت الناظرین لکھتے ہیں:

بارہا بہ ملازمت اقدس عالمگیر بادشاہ رسیدہ بعنایات پادشاہانہ ممتاز گردیدہ بود۔(۱)	کئی بار عالمگیر بادشاہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور شاہی انعامات سے ممتاز ومفتخر ہوئے۔

شعر وسخن: شیخ نورالحق شعر وادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، خود بھی موزوں طبع تھے اور نثر ہی کی طرح نظم پر بھی ان کو بڑی قدرت تھی، بختاور خاں کا بیان ہے کہ نظم ونثر دونوں میں یکتا تھے، مگر ان کی خاص توجہ نثر ہی کی طرف رہی، البتہ بمقتضائے طبیعت کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، مشرقی تخلص تھا، ان کے والد محترم کو بھی ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف تھا، اپنی کتاب اخبار الفضلا میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی طبیعت میں جودت تھی اور انہیں ذوق سلیم ملا تھا، بڑے صاحب ذوق اور ذی فضل وکمال تھے، کبھی کبھی شعر کہتے اور مشرقی لقب تھا، اگر ساری توجہ شعر ہی کی طرف ہوتی تو نظامی وخسرو کے خمسہ کا تتبع کرسکتے تھے لیکن انہوں نے علم وصلاح سے اصل سروکار رکھا اور یہی اصلی اور بنیادی چیز بھی ہے۔''(۲)

صاحب طبقات شاہجہانی لکھتے ہیں:

---

(۱) اقتباس فرحت الناظرین، ص ۵۸و۵۹۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۴۔

از شعر و انشا نیز بخطے او فر مختطی است (۱)   انہیں شعر و انشا میں سے بھی بڑا وافر حصہ ملا ہے۔

ایک مثنوی تحفۃ العراقین اور ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا، تذکرہ نگاروں نے ان کی بعض رباعیاں اور اشعار نقل کیے ہیں، ایک رباعی ملاحظہ ہو:

از شیوہ ہمدماں ایں دور خلاف

گویم رمزی اگر نگیری بگزاف

چوں شیشہ ساعت اند پیوستہ بہم

دلہا ہمہ پر غبار و رہا ہمہ صاف

ان کا ایک شعر یہ ہے:

با آنکہ شرقی ہمہ تن دیدہ چوں گل است

باہیچ کس چو چشم حباب آشنا بود (۲)

صاحب طبقات شاہجہانی نے بھی چند اشعار نقل کیے ہیں۔ (۳)

وفات: نوے برس کی عمر میں ۹ شوال ۱۰۷۳ھ کو انتقال کیا، فیض العلم سے تاریخ وفات نکلتی ہے، بعض تذکروں میں ۱۰۸۳ھ لکھ گیا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، اپنے والد کے مقبرہ میں ان کے جوار میں دفن ہوئے۔ (۴)

اولاد و احفاد: شیخ نورالحق کے ایک ہی بیٹے تھے جن کا نام نوراللہ تھا، ان کے چار فرزند تھے۔

تصنیفات: شیخ نورالحق اپنے والد ہی کی طرح بلند پایہ مصنف تھے اور اس حیثیت سے بھی وہ الولد سر لابیہ کا مصداق تھے، ان کی تحریر سلیس اور زبان شستہ ہوتی تھی، اس کا اندازہ اس کتبہ سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے والد کے مقبرہ کے لیے لکھا تھا، ان کی بحث و

---

(۱) طبقات شاہجہانی، مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص ۶۱۹ و ۶۲۰۔ (۲) فرحت الناظرین، ص ۱۰۵۔ (۳) طبقات شاہجہانی، ص ۶۱۹ و ۶۲۰۔ (۴) اقتباس فرحت الناظرین، ص ۵۸ و ۵۹ و مآثر الکرام، ج ۱، ص ۲۰۲۔

استدلال میں قوت اور زور ہوتا تھا، ان کی تصنیفات کو بڑا حسن قبول نصیب ہوا، مولانا حکیم سید عبدالحی کا بیان ہے کہ ان کی کتابوں سے فیض ربانی کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔ (۱)

جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ اثبات رفع المسبحة في التشهد: یہ ایک مختصر رسالہ ہے (۲) موضوع نام سے ظاہر ہے۔

۲۔ تحفة العراقين: یہ شیخ نور الحق کی مثنوی کا نام ہے۔ (۳)

۳۔ تعليقات على شرح المطالع:

۴۔ تعليقات على شرح هداية الحكمة۔

۵۔ تعليقات على العضدية: یہ سب درسی کتابوں کے شروح و حواشی ہیں۔ (۴)

۶۔ تفسير سوره فاتحه: اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ (۵)

۷۔ حاشيه على شرح الجامي: پشاور اور حیدر آباد میں قلمی نسخے موجود ہیں، پشاور کا نسخہ خوش خط ہے۔ (۶)

۸۔ ديوان مشرقي: پانچ ہزار اشعار پر مشتمل دیوان تھا۔ (۷)

۹۔ رساله در بيان رويا: (۸)

۱۰۔ زبدة التواريخ: یہ کتاب نواب مرتضیٰ خان کی فرمائش پر لکھی گئی، بعض تذکرہ نگاروں نے اسے ان کے والد کی تصنیف بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ نواب صاحب نے ان کے والد سے اس کے لکھنے کی فرمائش کی تھی مگر وہ اپنی مشغولیتوں کی بنا پر اس کے لیے فرصت نہیں نکال سکے اس لیے شیخ نور الحق نے نواب صاحب کی فرمائش کی تکمیل کی اور یہ کتاب

---

(۱) نزهة الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۵۔ (۲) ایضاً۔ (۳) فرحت الناظرین، ص ۱۰۵۔ (۴) ایضاً، ص ۵۸ و ۵۹۔ (۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۰۔ (۶) لباب المعارف الاسلامیہ پشاور، ص ۲۵۲۔ (۷) فرحت الناظرین، ص ۱۰۵۔ (۸) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۰۔

لاھی، شیخ اکرام کے خیال میں یہ کتاب فی الحقیقت شیخ عبدالحق کی کتاب ذکر الملوک کا ترمیم شدہ نسخہ ہے لیکن اس میں عہد اکبری کے حالات اضافہ کیے گئے ہیں (۱) سی، اے، اسٹوری کا بیان ہے کہ معزالدین محمد بن سام غوری کے عہد سے لے کر جہانگیر کی تخت نشینی ۱۶۰۵ء تک کے حالات ان کے والد نے لکھے، اس کے بعد کا حصہ شیخ نورالحق نے لکھا۔ (۲)

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ ہے اوراس میں محمد غوری کے زمانہ سے جہانگیر کے زمانہ تک کے حالات درج ہیں اور نواب مرتضیٰ خان کا حال بھی تحریر کیا گیا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ شیخ نورالحق نے اس میں اپنے والد کی تصنیف ذکر الملوک کے بڑے حصہ کا خلاصہ دے دیا ہواور کہیں کہیں معمولی ردوبدل بھی کیا ہو، باقی آخری دور کے حالات خودان کے قلم سے ہوں گے، اسی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دراصل ان کے والد کی تاریخ حقی کا ایک بڑا ایڈیشن ہے (۳) اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور برلین میں موجود ہیں (۴) ایلیٹ نے اپنی ہسٹری آف انڈیا میں اس کا کچھ حصہ شامل کیا ہے۔ (۵)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں دکن کی تاریخ بہت مختصر ہے اور بعض علاقوں کی تاریخ سرے سے غائب ہے، صرف دہلی، مالوہ، گجرات، دکن، کشمیر، سندھ، ٹھٹھ، ملتان، بنگال اور جونپور کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۶)

۱۱۔ شرح بخاری: اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۲۔ شرح شمائل: یہ فارسی میں شمائل ترمذی کی شرح ہے (۷) قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ (۸)

---

(۱) رودکوثر، ص ۳۸۸۔ (۲) پرشین لٹریچر، جلد اول، ص ۴۲۲۔ (۳) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند، ج ۴، ص ۵۰۴، فارسی ادب دوم۔ (۴) اسٹوری، ص ۴۴۲۔ (۵) حواشی تذکرہ علمائے ہند محمد ایوب قادری ص ۵۳۵۔ (۶) اسٹوری، ص ۴۴۱ وایلیٹ، ج ۶، ص ۱۸۳۔ (۷) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، طبع دوم، ص ۱۵۳۔ (۸) حیات شیخ عبدالحق، ص ۲۵۹۔

۱۳۔ **شرح صحیح مسلم** : اس کا ذکر مولوی رحمٰن علی نے کیا ہے(۱) اور استوری نے بھی کیا ہے اور نام منبع العلوم بتایا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے لڑکے فخر الدین محب اللہ نے اس کو ترتیب دیا (۲) معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیخ نور الحق ہی کی تصنیف ہے۔ جس کو فخر الدین نے از سر نو مرتب کیا اور اس میں کچھ اضافے بھی کیے۔

۱۴۔ **محی القلوب**: (۳)

۱۵۔ **نور العین شرح قران السعدین** : یہ خسرو کی مشہور مثنوی قران السعدین کی شرح ہے (۴) جس میں کیقباد اور بغرا خان کی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، شیخ نور الحق نے اس کی شرح لکھی جس کو ان کے والد نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا اور اس میں انہوں نے بعض اضافے بھی کیے تھے (۵) اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ (۶)

مولانا یوسف بنوری نے شیخ نور الحق کو شارح مؤطا بھی لکھا ہے (۷) مگر کسی اور تذکرہ نگار نے ان کی شرح مؤطا کا ذکر نہیں کیا ہے، دراصل شیخ شارح بخاری تھے، غالباً یہ مولانا کا وہم ہے۔

تیسیر القاری : اس کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن چونکہ یہ شیخ نور الحق کی سب سے اہم اور ممتاز تصنیف ہے اس لیے اس پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

شیخ کے والد بزرگوار شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے مشکوۃ المصابیح کا ترجمہ و تشریح کر کے فارسی زبان میں احادیث نبوی کی شرح و ترجمے کے جس کام کی ابتدا کی تھی ان کے

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۶۔ (۲) بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، ج ۴، ص ۵۰۴، فارسی ادب دوم۔ (۳) حیات شیخ عبد الحق، ص ۲۶۰۔ (۴) استوری، ص ۲۴۲۔ (۵) معارف اکتوبر ۴۶ء، ص ۲۸۷۔ (۶) حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص ۲۶۰۔ (۷) المقدمات البنوریہ، ص ۲۸، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء کراچی۔

فرزند اور خلف الرشید نے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا اور فارسی زبان میں بخاری شریف کا ترجمہ اور اس کی شرح لکھی جس کو شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے معنون کیا، اس کا وہی طرز و انداز ہے جو ان کے والد کی تصنیف شرح مشکوٰۃ کا ہے، یہ شرح دراصل انہی کے ایما سے لکھی گئی تھی، مولانا نور الحق تحریر فرماتے ہیں:

> ''والد ماجد چاہتے تھے کہ صحیح بخاری کی شرح و تعلیق بھی اسی رنگ کی فارسی زبان میں لکھی جائے جیسی کہ وہ خود مشکوٰۃ المصابیح کی لکھ چکے تھے اور جس کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور تمام مسلمان اس کے فیوض سے بہرہ مند ہوئے لیکن چونکہ ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے اس لیے ان کی زندگی میں اس اہم اور عظیم الشان کام کو انجام دینے کی توفیق میسر نہیں ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد استخارہ کر کے ان کے حکم کی تعمیل میں کمر ہمت باندھی گئی۔''(۱)

شیخ نور الحق نے بخاری کی مروج و متداول شرحوں کرمانی، فتح الباری، عینی، سیوطی اور قسطلانی وغیرہ کو اپنا ماخذ بنایا اور ان سے مکمل استفادہ کیا، لیکن اس میں ان شرحوں کی طرح زیادہ اطناب و تفصیل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ فارسی زبان میں ضروری مقاصد و مطالب مکمل طور پر اس طرح بیان کر دینے کی کوشش کی ہے کہ پایہ کمال دانش سے قاصر طالبین کے لیے بھی مطالعہ بخاری سہل اور آسان ہو جائے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم لکھتے ہیں:

> ''گو بخاری شریف کی مفصل و مختصر شرحیں لکھی جا چکی تھیں لیکن زبان کے فرق کی وجہ سے اہل عجم صحیح بخاری کی تحصیل اور اس کے اسرار و دقائق سے کما حقہ واقفیت سے قاصر و مرحوم تھے، تا آنکہ مولانا نور الحق نے اس کی فارسی شرح لکھی جس کا نام انہوں نے تیسیر القاری رکھا جس میں مفید مطالب،

---

(۱) تیسیر القاری، ج۱ص۲۔

عمدہ فوائد، لطیف مباحث اور دقیق غرائب بیان کیے، اللہ تعالیٰ ان کی سعی
کو مشکور بنائے اور انہیں جزائے خیر دے کیونکہ انہوں نے تمام لوگوں
کے لیے صحیح بخاری کی تحصیل کو آسان کر دیا اور ہر قاری و سامع کے لیے
اسے سہل بنا دیا۔"(۱)

شرح کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں امام بخاری کے حالات و سوانح، حدیث میں ان کے علوئے مرتبت اور دوسرے کمالات وغیرہ پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد پہلے بخاری شریف کی مرویات کا معنی خیز ترجمہ کیا ہے، پھر ان کی مختصر اور جامع تشریح کی ہے، یہ شرح و ترجمہ متن کے ساتھ نواب محمد علی خاں بہادر صولت جنگ والی ریاست ٹونک کی توجہ سے مطبع علوی محمد علی بخش لکھنؤ سے ۵ جلدوں میں شائع ہوا ہے جن کی تصحیح و تہذیب کی خدمت مولوی محمد معشوق علی نے انجام دی ہے، حواشی پر اسی خانوادہ کے ایک بزرگ شیخ الاسلام کی شرح بخاری، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ ترجمۃ الابواب اور ایک رسالہ اسماء الرجال بھی درج ہے، پہلی جلد کے شروع میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور بعض دوسرے حضرات کی تقریظیں بھی دی گئی ہیں، دوسری جلدوں کے آخر میں میں منثور و منظوم تقریظیں شامل ہیں، ذیل میں اس شرح کی خوبیوں اور خصوصیات کو پیش کیا جاتا ہے۔

کتب کی ابتدا کے نوٹ: تیسیر القاری میں بخاری شریف کی کتب و ابواب کے شروع میں بطور تمہید شارح نے مختصر نوٹ تحریر کیے ہیں جو عموماً قابل غور اور لائق توجہ ہیں اور ان سے اس شرح کی خصوصیتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

امام بخاری نے اپنی صحیح کے ابتدائی باب **کیف کان بدء الوحی** سے کی ہے اور کتاب الوحی کا عنوان نہیں قائم کیا ہے، مولانا نورالحق اس کے شروع میں یہ نوٹ تحریر فرماتے ہیں:

"مؤلف نے کتاب کی ابتدا میں وحی اور اس کے آغاز کے بارے میں

---

(۱) تیسیر القاری، جلد اول آغاز۔

جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کی حیثیت کتاب کے مقدمہ کی ہے، انہوں نے اس کو پسند نہیں کیا کہ خطبہ یا کسی اور قسم کی بات کو ابتدا میں لا کر دوسرے لوگوں کی طرح کلام رسول پر اپنے کلام کو مقدم کریں، انہوں نے بہت سے ابواب میں یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے کہ حدیثوں ہی کو ان کا عنوان بنایا ہے اور ان کی تائید کے لیے یا ان سے ربط کی بنا پر آیتیں نقل کی ہیں، اس باب کے عنوان میں بھی انہوں نے آیت نقل کی ہے اور اس کے تحت جو حدیثیں لائے ہیں ان میں آپؐ کی جانب کی جانے والی وحی کی صورت و کیفیت اور آپؐ تک اس کے پہنچنے اور اترنے کی شکل بیان کی گئی ہے، علاوہ ازیں مصنف نے اس سے بھی آگاہ کیا ہے کہ وحی تمام انبیا و رسل کی ایک مستمر خصوصیت و امتیاز ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح حدیث کا آغاز حدیث الاعمال بالنیات سے کر کے یہ واضح کیا ہے کہ صحیح نیت اور تقرب الی اللہ کے جذبہ کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا یہ مجموعہ مرتب کرنے میں خود ان کی نیت پاکیزہ اور ارادہ صحیح رہا ہے، اس طرح حدیث کی طلب و تحصیل کرنے والوں کو انہوں نے بتایا ہے کہ وہ درست اور صحیح ارادہ سے اس کتاب کو شروع کریں۔"(۱)

شارح کے اس نوٹ میں جن نکتوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس میں صحیح بخاری کے ابواب و کتب کی بعض منفرد اور انوکھی نوعیتیں اور خصوصیتیں بتائی گئی ہیں۔

۲۔ شروع میں خطبۂ کتاب نہ تحریر کرنے کی وجہ بتائی ہے۔

(۱) تیسیر القاری، ج ۱، ص ۶۔

۳۔ صحیح بخاری کا آغاز وحی سے متعلق روایتوں سے کیوں کیا گیا ہے؟ نیز ان حدیثوں میں کس امر کا ذکر ہے؟

۴۔ الاعمال بالنیات سے صحیح بخاری کے آغاز کی وجہ کیا ہے؟

کتاب الایمان اور کتاب العلم کے شروع میں بھی مختصراً نوٹ قلم بند کیا گیا ہے اور کتاب الوضو کی ابتدا میں جو نوٹ تحریر کیا گیا ہے اس میں پہلے اور بعد کی کتب وابواب سے صحیح بخاری کی باہمی مناسبت اس طرح واضح کی ہے:

> ''مصنف نے کتاب کو احادیث وحی سے شروع کیا تھا جو دینی احکام کی اصل الاصول اور بنیادی سرچشمہ ہے، اس کے بعد ایمان کی حدیثیں لائے ہیں کیونکہ تمام احکام کی اصل و بنیاد یہی ہے، اس کے بعد احادیث علم کو بیان کیا ہے کیوں کہ احکام اسی سے وابستہ ہوتے ہیں اور جب احکام وعبادات کا بیان شروع کیا تو نماز کا ذکر دوسری عبادتوں سے پہلے اس لیے کیا ہے کہ وہ تمام عبادتوں میں سب سے افضل ہے اور نماز سے پہلے طہارت کی حدیثیں اس لیے بیان کی ہیں کہ نماز کی سب سے اہم اور بڑی شرط یہی ہے اور قاعدہ ہے کہ شرط مشروط پر مقدم ہوتی ہے۔'' (ج اول ،ص ۷)

بعض کتب کے شروع کا نوٹ قدرے طویل ہے، ان میں مختلف لغوی، فقہی اور علمی مسائل زیر بحث آئے ہیں، اس سلسلہ میں کتاب التہجد کا نوٹ لائق مطالعہ ہے مگر طوالت کے سبب سے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

استنباط واخذ نتائج: شارح نے احادیث کی شرح وتوضیح کرتے ہوئے ان سے کہیں کہیں مفید استنباط اور دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں ہے کہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت عدیؒ کو لکھا کہ ایمان کے فرائض، شرائع،

حدود و اور سنن ہیں، جس نے ان کو کمال تک پہنچایا اس نے ایمان کو کمال تک پہنچایا اور جس نے ان کو تمام و کمال تک نہیں پہنچایا اس نے ایمان کو تمام و کمال تک نہیں پہنچایا، اس سے شارح کا یہ استنباط ملاحظہ ہو:

''حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ تصدیق و اعمال ایمان کامل میں داخل ہیں جیسا کہ معمولی فہم و دانش سے یہ بات ظاہر ہے۔'' (ج اول، ص ۱۷)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس قول کے بعد مصنف حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اجلس بنا نؤمن ساعة	ہمارے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھو تا کہ ہم امور آخرت و احکام دین کا ذکر کر کے ایمان کی زیادتی کا سامان کریں۔

مولانا نورالحق فرماتے ہیں:

''اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امور دین ایمان میں داخل ہیں، نؤمن سے ظاہر ہے کہ تجدید ایمان مراد ہے۔'' (ص ۱۷)

آگے امام بخاری حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ ''بندۂ مومن کی رسائی تقویٰ کی حقیقت تک اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ان چیزوں کو بھی نہ چھوڑ دے جو اس کے سینہ میں کھٹکیں اور خلجان پیدا کریں'' اس کے متعلق حضرت شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ:

''اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض مومنین ایمان کی حقیقت اور کنہ تک پہنچ جاتے ہیں اور بعض نہیں پہنچتے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان متجزی ہے، اس کے اجزا ہو سکتے ہیں۔'' (ص ۱۷)

امام بخاریؒ نے تحویل قبلہ کے بیان میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ ''نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے کعبہ کی جانب رخ کر کے سب سے پہلے عصر کی نماز پڑھی، آپؐ کے ساتھ اس نماز کو پڑھنے والے لوگوں میں سے ایک صاحب کسی اور مسجد کے پاس سے گزرے جہاں لوگ رکوع میں تھے تو انہوں نے فرمایا کہ میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی ہے، شیخ نور الحق اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

''یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دیانات میں خواہ وہ فرائض ہی کیوں نہ ہو ایک شخص کی بات پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔'' (ج ۱، ص ۳۰)

امام بخاریؒ نے کتاب الایمان میں ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ ''فتنہ اور آزمائش کی جگہ سے فرار اختیار کرنا بھی دین و ایمان میں داخل ہے'' اس سلسلہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ حدیث درج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں کا وہ گلہ ہو جس کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں میں گوشوں اور صحراؤں میں بھاگ جائے تا کہ وہ اپنے دین کو فتنوں اور آزمائشوں سے بچا لے۔''

شیخ نور الحق اس کی شرح میں ان نکتوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

''اس میں سلف کا اختلاف ہے کہ خلق سے عزلت وانزوا بہتر ہے یا ان کے درمیان رہنا، بعض لوگوں نے عزلت کے فائدوں کو مدنظر رکھ کر کہا ہے کہ خلق سے انقطاع میں شر و فساد سے سلامتی رہتی ہے اور طاعت و عبادت، جمعیت باطن اور ذکر الٰہی کے لیے وقت فارغ رہتا ہے، اس میں آدمی کو اپنی حالت کے لحاظ سے اخلاص و عمل کا موقع ملتا ہے، اس لیے عزلت ہی بہتر ہے لیکن جن لوگوں کی نظر اختلاط و صحبت کے ان فوائد پر ہے کہ اس میں علم دین کو سیکھنے اور سکھانے کی توفیق ملتی ہے، لوگوں کی داد و تحسین نصیب ہوتی ہے، ان کی جفا و ایذا پر صبر و تحمل کا اجر ملتا ہے اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آنے، بیماروں کی عیادت، جنازہ میں شرکت و مشایعت،

جمعہ اور فرض نمازوں کی جماعت میں حاضری کا موقع میسر آتا ہے وغیرہ وغیرہ، تو وہ لوگ ان دینی فوائد و مصالح کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط اور خلق کے اندر رہنا ہی پسندیدہ اور بہتر ہے، کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ'' (ج ا، ص ۲۱ و ۲۲)

دفع تعارض: شیخ نور الحق نے اپنی شرح میں احادیث کے ظاہری تضاد کو بھی رفع کیا ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب حضرت جبرئیلؑ پہلی بار وحی لے کر آئے تو آپؐ پر جو اضطرابی کیفیت طاری ہوئی اس کے ازالہ کے لیے حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دینے اور آپ کی وحشت کو دور کرنے والی جو باتیں فرمائیں ان میں آپ کے ان مکارم اخلاق اور عمدہ اوصاف کا خاص طور پر ذکر کیا جو آپؐ میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے اور جن کا انہوں نے اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا، حضرت خدیجہؓ کا استدلال اس طور پر تھا کہ آپ کے ان اوصاف حمیدہ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو بے سہارا نہ چھوڑے گا اور نہ آپ جیسے عمدہ اطوار و عادات کے آدمی کو وہ ذلیل و خوار اور بے یار و مددگار چھوڑے گا، شیخ نور الحق اس حدیث سے اولاً تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی اگر کسی کے اندر مدح و ستائش کے لائق باتیں ہوں تو انہیں اس کے سامنے بیان کرنا روا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، رہی وہ حدیث جس میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ:

''اپنی تعریف کرنے والے کے منہ میں خاک ڈال دو۔''

تو یہ حکم ایسے شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو مدح و ستائش کو اپنا شیوہ اور شعار بنا لے یہ بلاشبہ ایک نامناسب فعل ہے۔ (جلد اول، ص ۹)

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطہ سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ ''ایک نیکی کا بدلہ دس سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے'' شارح فرماتے ہیں کہ عدد کی اس صراحت و قطعیت سے اس کے سوا کی نفی مقصود نہیں ہے، اس بنا پر یہ حدیث

اس حدیث کے معارض نہیں ہے جس کو مصنف باب رقاق میں لائے ہیں کہ "سات سو سے بہت زیادہ گنا تک اجر ملتا ہے کیوں کہ تضعیف کا معاملہ اللہ کے فضل و ارادہ سے جڑا ہوا ہے، وہ جس کو جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ (ص ۳۰)

مشہور حدیث ہے کہ جبرئیلؑ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام اور احسان کے بارہ میں سوال کیا، امام بخاریؒ نے اسلام کے متعلق ایک ایسی روایت نقل کی ہے جس میں حج کا ذکر نہیں ہے جب کہ دوسری حدیثوں میں اور عبادات کی طرح اس کا بھی ذکر ہے، اس کو بعض لوگوں نے راوی کے سہو و نسیان کا نتیجہ بتایا ہے، شیخ نور الحق فرماتے ہیں:

> "بخاری کے رواۃ میں اس طرح کے احتمال کو راہ دینا نامناسب اور بعید ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس وقت آپ نے یہ فرمایا تھا اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا، اس سے ابن مندہ کی وہ تصریح باطل ہو جاتی ہے جس کو انہوں نے ایسی سند سے بیان کیا ہے جو امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے اور جس میں وضاحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری زمانہ میں تشریف لائے تھے، حضرت جبرئیلؑ کے اس واقعہ سے متعلق بعض روایتوں میں کچھ مزید اعمال کا ذکر بھی ہے لیکن بعض میں ان سے کم اعمال کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف سائل کے سوال اور مقتضائے حال کے اعتبار سے تھا، واللہ اعلم۔" (ج ا، ص ۳۵)

اشکالات کے جواب: شیخ نور الحق نے بعض جگہ شکوک و شبہات اور اشکالات کے جواب بھی دیے ہیں جس میں وہ عام شارحین کی رائے سے یک گونہ اختلاف کرتے ہیں، مثلاً حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی سچے دل سے گواہی دینے والا کوئی شخص ایسا نہیں جس پر اللہ آگ کو حرام نہ کر دے۔

حضرت معاذؓ نے آپ کا یہ ارشاد سن کر فرمایا ''اے اللہ کے رسول کیا میں اس سے لوگوں کو مطلع نہ کردوں تاکہ وہ بشارت سن لیں'' آپؐ نے فرمایا تب تو لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے اور عمل سے دستکش ہو جائیں گے'' اس کے بعد اسی روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ نے اپنی وفات کے وقت کتمان علم کے گناہ کے اندیشہ سے یہ بات بیان کردی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بھی تو ایک گناہ ہے، حضرت معاذؓ نے جب اس کی خبر دے دی تو وہ اس گناہ کے مرتکب ہوگئے، شیخ نورالحق اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آپؐ کی نہی تحریمی کے بجائے تنزیہی تھی اور کتمان علم کی نہی تحریمی ہے، حضرت معاذؓ مجتہدین صحابہ میں تھے اس لیے آخر میں انہوں نے اس کو ترجیح دے کر اس پر عمل کیا۔

شارحین کہتے ہیں کہ امر ایجابی ہے اور نہی اتکال (تکیہ اور بھروسہ کرنے) سے مقید و مشروط ہے، حضرت معاذ چونکہ دین میں کوہ راسخ تھے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ مژدۂ جانفزا سنایا اور ہر شخص کو اسے سنانے سے منع فرمایا، چنانچہ انہوں نے اس کی خبر ایسے شخص کو دی ہوگی جس کے بارے میں انہیں اس کا اندیشہ نہ رہا ہوگا کہ وہ اس پر بھروسہ کرے گا مگر شیخ نورالحق کے نزدیک یہ جواب پر از تکلف ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آخر حضرت معاذ نے کیوں مدۃ العمر اس سے ان لوگوں کو مطلع نہیں کیا جن کے بارے میں بھروسہ کر لینے کا وہم وگمان نہیں تھا، ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے لوگ ان کے زمانے میں بے شمار رہے ہوں گے، دوسری بات یہ ہے کہ بالآخر یہ اطلاع خاص و عام ہر شخص کو ہو ہی گئی، پس جس نے بھی اس کو مشتہر کیا ہو اس نے گویا اس ایجابی حکم کی خلاف ورزی کی۔'' (ج ا ص ۶۹)

شارحین کے اقوال سے بے اطمینانی: اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نورالحق نے اپنی شرح میں صرف شارحین کے اقوال و آرا ہی نہیں تحریر کیے ہیں بلکہ ان پر بحث وتبصرہ کیا ہے اور ان کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور جہاں ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے وہاں اپنی

رائے و تحقیق کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے، مثلاً امام بخاری نے کتاب التیمم میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

اعطیت خمسًا لم یعطهن احد قبلی — مجھے ایسی پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔

مولانا نور الحق فرماتے ہیں کہ کتب سیر میں آپ کے بے شمار خصائص مذکور ہیں، ان پانچوں کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ شارحین کہتے ہیں کہ کسی چیز کو عدد کے ساتھ متعین کرنے سے ماسوا کی نفی و تردید نہیں ہوتی، پس یہ حدیث ان حدیثوں کے معارض نہیں ہے جن میں آپ کی مزید خصوصیات کا ذکر ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسری خصوصیات کی اطلاع آپ کو اس کے بعد ہوئی ہو۔

شیخ نور الحق کو ان دونوں باتوں سے تشفی نہیں ہوتی، وہ فرماتے ہیں کہ پانچ ہی چیزوں پر اکتفا کی یہ کوئی مناسب توجیہ نہیں ہے۔ (ج۱؛ ص۱۲۹)

کتاب الجنائز کی ایک حدیث کا فقرہ ہے:

واللّٰہ ما ادری وانا رسول اللّٰہ ما یفعل بی — بخدا اللہ کا رسول ہوتے ہوئے بھی مجھ کو معلوم نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔

شیخ فرماتے ہیں کہ یہ بات محض جذبہ عبودیت اور تقاضائے ادب و بندگی کی وجہ سے آپ نے فرمائی ہے اور اس واسطے بھی کہ دوسرے لوگ متنبہ ہو جائیں اور فضول کاموں کے مرتکب نہ ہوں، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علوئے شان و منزلت، وحی متلو و غیر متلو دونوں میں وارد ہے اور آپؐ بالیقین جانتے تھے کہ آپؐ قیامت کے دن تمام نبیوں سے معزز اور شافع و مشفع ہوں گے۔

شارحین کا خیال ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ سے پہلے کی ہے جب آپؐ کو اپنے اچھے برے انجام کی خبر نہیں تھی،

بعد میں تو آپ کو نہ صرف اپنے عشرۂ مبشرہ کے حسن انجام کا بھی علم ہوگیا تھا لیکن جس وقت آپؐ نے یہ فرمایا تھا اس زمانے میں آپ اپنی مغفرت کے بارے میں متردد تھے۔

شیخ نورالحق اس توجیہ پر بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات اہل ایمان کے عقیدت مند دل میں کبھی متمکن نہیں ہوسکتی کہ آپؐ کے آخری دور میں ہونے والی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والی اس آیت سے پہلے آپ اپنے انجام کے بارے میں متردد رہے ہوں، باوجودیکہ آپؐ خدا کے مقرب اور اس کے گوناگوں انعامات کے مورد تھے، آپؐ سے اس قسم کا سوئے ظن رکھنے والا ہی اس توجیہ کو پسند کرسکتا ہے، کرمانی وغیرہ کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے کیوں کہ اس حدیث میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ خبر ہے جس میں نسخ نہیں ہوتا۔

قرطبی وغیرہ نے کہا ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہے کہ مجھے خبر نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ دنیا میں نفع وضرر کا کیا معاملہ ہوگا، واضح رہے کہ اس توجیہ سے حدیث کا سیاق ابا کررہا ہے، بیضاوی کے نزدیک اس سے دارین کے احوال کی تفصیل مراد ہے کیوں کہ آپ کو تفصیل کے بارے میں کوئی واقفیت نہ تھی، اس بناپر کہ غیب کی تمام باتوں کا علم اللہ کے لیے مخصوص ہے، بعض روایتوں میں **ما یفعل بی** کے بجائے **بہ** آیا ہے، اس صورت میں ضمیر کا مرجع حضرت عثمانؓ کی طرف ہوگا، فتح الباری میں لیث کے واسطہ سے اس روایت کی صحت میں کچھ کلام کیا گیا ہے، غرض اس کی متعدد تکلف پر مبنی توجیہات کی گئی ہیں، **واللہ اعلم** (ج۱، ص۲۱۶)

فقہی اختلاف کا ذکر اور حنفی مذہب کی تائید وترجیح: وہ اس شرح میں فقہا کے اقوال وآرا اور مختلف فقہی مذاہب کو بھی جابجا بیان کرتے ہیں اور چونکہ خود حنفی المذہب تھے اس لیے اس مذہب کو دلائل سے مرجح وافضل بتاتے ہیں، چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوایوب انصاریؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ

"قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ نہیں کرنی چاہیے" اس کے متعلق شیخ نورالحق ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ اس حدیث میں نہی عام ہے جس میں صحرا وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اسی کو امام ابوحنیفہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور ایک روایت کے مطابق امام احمد نے اختیار کیا ہے اور قیاس بھی اسی کا متقاضی ہے کہ نہی قبلہ کی تعظیم کی وجہ سے ہے جس کا استقبال و استدبار صحرا میں بھی ہوتا ہے اور عمارت کے اندر بھی اگر اس میں حائل کا اعتبار کیا جائے تو صحرا میں بھی پہاڑ اور عمارتیں حائل ہو سکتی ہیں۔

امام شافعی و امام مالک نے اس عموم کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث سے خاص کر دیا ہے جس سے مکانوں میں اس کا لحاظ نہ کیے جانے کی گنجائش ملتی ہے لیکن عروہ بن زبیرؓ اور ابوداؤ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو منسوخ مانتے ہیں۔" (تیسیر القاری، جلد اول، ص۷۴،۷۵)

تیمم کے بیان میں شارح لکھتے ہیں:

"مصنف اس کتاب میں جو حدیثیں لائے ہیں ان میں ایک ہی ضربہ اور مسح کفین (ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مار کر اسی سے منہ اور دونوں ہتھیلیوں کو پوچھ لینے) کا ذکر ہے، محدثین اور امام احمد کا یہی مذہب ہے، ان حضرات کے نزدیک دوسری ضرب اور مسح ذراعین واجب نہیں ہے لیکن مشہور مسلک یہ ہے کہ تیمم میں دو ضربہ ہے، ایک منہ کے لیے اور دوسری کلائیوں سے کہنیوں تک کے لیے ہے، اس کے ثبوت میں بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں، بعض ناقدین فن کا خیال ہے کہ پہلا مذہب دلیل کے لحاظ سے اور دوسرا قیاس کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، امام خطابی فرماتے ہیں

کہ کفین پر اکتفا کرنا حسب روایت صحیح ہے اور اصول و قیاس کے اعتبار سے تیمم میں ذراعین کا وجوب اشبہ ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ قیاس کو نص کے مساوی قرار دینا غلط اور فاسد ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہمارا دارو مدار صرف قیاس پر نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک وجہ ترجیح ہے، کیوں کہ جو روایت قیاس کے موافق ہو اس کو اس روایت پر ترجیح حاصل ہوگی جو قیاس کے موافق نہ ہو، ثانیاً یہ کہ حضرت عمارؓ کی حدیث مضطرب ہے جو لائق احتجاج نہیں، ان کی ایک روایت میں کفین اور دوسری میں ذراعین کا ذکر ہے، ابوداؤد نے ان سے جو روایت کی ہے اس میں یدین سے نصف ذراع تک کا ذکر ہے اور وہ مرفق (کہنی) کے ذکر سے خالی ہے مگر دوسری میں مرفقین (دونوں کہنیوں) تک کا ذکر ہے، ابوداؤد اور نسائی کی ایک روایت میں ابطین (بغلوں) اور مناکب (کندھوں) تک کا ذکر بھی ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تیمم کے مسئلہ میں جس قدر حدیثیں مروی ہیں ان میں ابوجہیم اور عمار کی حدیثوں کے سوا سب ضعیف اور مختلف فیہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً اسی قدر مذکور ہے، شرح سفر السعادۃ میں اس پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے اور ضربتین کے بارے میں حدیثیں صحاح سے منقول ہیں۔" (ص ۱۳۱)

شیخ نور الحق غالی حنفی نہ تھے: عموماً شیخ عبدالحق اور ان کے خلف الصدق شیخ نور الحق کو غالی اور متشدد حنفی کہا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں بزرگ حنفی المذہب تھے اور اپنے مذہب کی تائید و حمایت بھی کرتے تھے اور دلائل و شواہد سے دوسرے مذاہب پر اسے ترجیح دیتے تھے مگر عام اہل تقلید اور مذاہب کے معاملہ میں غلو اختیار

کرنے والوں کی طرح نہ اپنے مذہب کی جا و بے جا حمایت کرتے تھے اور نہ اس شدت و تصلب کا مظاہرہ کرتے تھے جو مقلدین اور عام اہل مذاہب کا شیوہ ہے۔

ذیل میں ہم ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اپنے مذہب و مسلک سے ان کا شغف وانہماک چاہے جتنا بھی بڑھا ہو مگر اس کے باوجود وہ حق و انصاف پسند تھے۔

رکوع سے پہلے اور اس کے بعد میں رفع یدین (دونوں ہاتھوں کو اٹھانے) کے بارے میں احناف اور دوسرے مذاہب کا اختلاف بہت مشہور ہے، امام بخاریؒ نے رفع یدین کے ثبوت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث نقل کرکے صراحت کی ہے کہ وہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بیان کرتے تھے، شیخ نورالحق اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

> ''معلوم ہونا چاہیے کہ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو اٹھانے کے متعلق جو صحیح حدیثیں وارد ہیں ان میں سے اکثر حضرت ابن عمرؓ کے واسطہ سے مروی ہیں لیکن ہاتھ نہ اٹھانے کے بارے میں بھی صحیح حدیثیں بیان کی گئی ہیں، شیخ نورالحق اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ کی اس روایت کو پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے شیوخ سے بیان کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول بتایا ہے کہ آپ صرف نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، اس کے سوا کسی موقع پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، امام طحاوی صحیح سندوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی صرف نماز کی ابتدا میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔

امام ترمذی نے اپنی جامع میں اس مسئلہ کے متعلق دو ابواب قائم کیے ہیں، ایک میں امام بخاری کی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ کبار صحابہ کی ایک بڑی جماعت اسی کی قائل ہے،

دوسرے باب میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ افتتاح کے علاوہ کسی اور موقع پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے، اس باب میں حضرت بن مسعودؓ کی روایت تحریر کی ہے جس سے صرف افتتاح کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کے قائل بھی علمائے صحابہ و تابعین کی ایک بڑی جماعت ہے اور سفیان ثوریؒ اور اہل کوفہ یعنی حنفیہ کا یہی مذہب ہے، جامع الاصول میں ابن مسعودؓ کی حدیث ابو داؤد اور نسائی کے حوالہ سے منقول ہے اور براابن عازبؓ کی حدیث امام ابوداؤدؒ مرفوعاً لائے ہیں، صحیح روایتوں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے بھی یہی منقول ہے کہ وہ نماز کے شروع میں رفع یدین کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث و آثار صحیحہ دونوں جانب موجود ہیں، علمائے حنفیہ جو عدم رفع کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ رفع والی حدیث منسوخ ہوگئی ہے، خود اس کے راوی حضرت ابن عمرؓ کو اس کے برخلاف کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور منسوخ حدیث کی روایت کرنا ممنوع نہیں ہے، پس جب راوی ہی اپنی روایت کے خلاف عمل کر رہا ہو تو ایسی حدیث کو حجت قرار دینا مناسب نہیں ہے، یہ ایک طے شدہ اصول ہے، ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ مجھ سے اتنی بڑی جماعت نے بیان کیا ہے جس کے ناموں کو شمار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے ابن عمرؓ کو دیکھا کہ وہ صرف نماز کی ابتداہی میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، امام طحاوی نے مشکل الآثار میں مجاہد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ابن عمرؓ کے پیچھے نماز ادا کی وہ صرف تکبیر اولیٰ میں ہاتھ اٹھاتے تھے، نہایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے مسجد حرام میں ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ وہ رکوع میں

جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کر رہا ہے، جب وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو انہوں نے اس سے کہا کہ ایسا نہ کرو کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہلے کیا تھا مگر بعد میں ترک کر دیا تھا، مجاہد کہتے ہیں کہ میں بیس برس تک حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں رہا لیکن میں نے انہیں تکبیر اولیٰ کے سوا اور نماز میں کسی موقع پر ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

شیخ نورالحق ان سب اقوال و توجیہات کو بیان کرنے کے بعد جو کچھ تحریر فرماتے ہیں اس سے ان کی بے تعصبی اور حق پسندی ظاہر ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

''ان تمام آثار و اعمال میں صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے نسخ کا جو قول منقول ہے وہ اشکال سے خالی نہیں، اس باب میں اس سے زیادہ آسان تر بات اور کوئی نہیں ہے کہ رفع (ہاتھ اٹھانے) اور عدم رفع (ہاتھ نہ اٹھانے) دونوں کی سنیت کا قائل ہونا چاہیے، واللہ اعلم، یہ بحث فتح المنان فی تائید مذھب النعمان سے منقول ہے جس میں شیخ المحدثین عبدالحق نے شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔''

شافعیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرنا چاہیے، یہ لوگ تشہد سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قائل نہیں ہیں اور یہ حدیث جسے امام بخاری باب کے آخر میں لائے ہیں اس کے موافق بہت سی صحیح حدیثیں حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے حضرات سے مروی ہیں، اسی بنا پر بعض شوافع اس کو بھی سنت سمجھتے ہیں لیکن یہ امام شافعیؒ سے منقول نہیں ہے، ان کی وصیت یہ تھی کہ اگر میرے فیصلہ کے خلاف کوئی حدیث موجود ہو تو میرے قول کو چھوڑ کر اسی حدیث پر عمل کرو، اکثر شافعیہ کے برخلاف امام نوویؒ نے اس کی سنیت کو صحیح

قرار دیا ہے۔'' (جلد اول، ص ۲۵۴ و ۲۵۵)

بعض اہم بحثیں: امامت و خلافت کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اس کی وجہ سے مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے اور اس سے ان کو شدید نقصانات پہنچے، اس نزاع کا ایک اہم باعث واقعہ قرطاس بھی ہے، اس کو بعض لوگوں نے جس طرح سے پیش کیا ہے اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت مجروح ہوتی ہے اور نعوذ باللہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی دعوت و تبلیغ پر مامور فرمایا تھا ان کو بیان کرنے میں آپ نے کوتاہی سے کام لیا، اگر آپ کے لیے مسئلہ خلافت میں نامزدگی اور صراحت کرنا ضروری ہوتا تو آپ اس میں اخفا سے کیوں کام لیتے، صوفیہ باطنیہ بھی اسی قسم کی گمراہی میں جا پھنسے ہیں جنہوں نے ظاہر و باطن کی تقسیم کر کے یہ کہا ہے کہ علم باطن صرف حضرت علیؓ کو عطا ہوا تھا اس لیے علم باطن کا منبع انہیں کو قرار دیا جاتا ہے، یہاں موقع نہیں، ورنہ ہم دکھاتے کہ یہ کیسی شدید گمراہیاں ہیں جن کے لیے حضرت علیؓ کی ذات کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

واقعۂ قرطاس کے بارے میں شیخ نور الحق نے جو کچھ لکھا ہے وہ اعتدال و توازن کا نمونہ اور بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہے، ملاحظہ ہو:

امام بخاریؒ نے کتاب العلم کے باب کتابۃ العلم میں واقعہ قرطاس کے متعلق جو حدیث نقل کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

> ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدید ہو گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ کاغذ و قلم لاؤ تاکہ میں ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم لوگ گمراہ نہ ہو گے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ پر وجع والم غالب ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے، پھر حاضرین جھگڑ پڑے اور شور و ہنگامہ برپا ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس سے تم لوگ چلے جاؤ، میرے

پاس اختلاف ونزاع مناسب نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ وہاں
سے یہ کہتے ہوئے نکل پڑے کہ آپ کے اور آپ کی تحریر کے درمیان حائل
ہونا ہی ساری مصیبت تھی۔" (تیسیر القاری، جلد اول، ص ۶۱)

شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ یہ حدیث وجہ نزاع اور لوگوں کی گمراہی وکجی کا باعث بن گئی ہے، بعض لوگ نہایت وثوق اور پوری قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپ کا مقصود حضرت علیؓ کے لیے خلافت نامہ تحریر کرنا تھا مگر چونکہ حضرت عمرؓ کو ان سے عداوت اور کد تھی اور وہ آپؐ کی منشا ومراد کو سمجھ گئے تھے اس لیے انہوں نے آپؐ کو خلافت نامہ تحریر کا موقع نہیں دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی چاہتے تھے کہ آپ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں تو آپؐ نے انہیں نماز پڑھانے کا حکم کیوں نہیں دیا جب کہ وہ آپ کی خدمت میں موجود تھے اور حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر میں فروکش تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اصرار کر کے ان کے گھر سے بلوایا اور نماز پڑھانے کا حکم دیا۔

درحقیقت یہ ایک باطل وہم ہے جس کا سرچشمہ وہ تعصب اور بدگمانی ہے جو اساطین دین وملت کی جانب سے ان لوگوں کے دلوں میں متمکن ہے بلکہ یہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سوئے عقیدت کا نتیجہ ہے، اگر آپ کا مقصود وہی ہوتا تو جب آپ نے دیکھا کہ لوگ کتابت کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں تو آپ نے حق کو پوشیدہ رکھنا کیسے پسند کیا اور کیوں نہیں اپنی زبان مبارک سے یہ فرما دیا کہ میرے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں گے۔

یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافرین دین کی اصلاح وہدایت کی جانب سے بھی کبھی بے توجہی نہیں کی جو برسہا برس تک آپ سے بحث ومجادلہ کرتے رہے بلکہ آپ ان میں سے ایک ایک کی رہنمائی کے لیے برابر فکرمند اور سرگرداں رہے تو اپنے ان ساتھیوں کے معاملہ میں کیسے تساہل سے کام لیتے جو ہمیشہ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے بے چین رہتے اور اپنی جان ومال سب کچھ آپ کے لیے نچھاور کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے

اور آپؐ زندگی بھر ان سے خوش رہے تو زندگی کے آخری لمحہ میں ان کے اختلاف سے کیسے اس قدر دل برداشتہ ہو سکتے تھے کہ محض ایک لفظ نہ کہنے کی بنا پر سب کو گمراہ چھوڑ جاتے، اس سے بڑھ کر کون سی بداعتقادی آپ کی شان میں ہو سکتی ہے، اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

دراصل یہ معاملہ مبہم ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا کہ آپ کیا لکھانا چاہتے تھے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے ضروریات دین، اوامر و نواہی پر استقامت، اولوا الامر کی اطاعت اور اہل بیت کی عزت و حرمت کی حفاظت کی تجدید فرمانا چاہتے تھے کیوں کہ ایک بڑی جماعت کے ان امور کی رعایت نہ کرنے کی بنا پر جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن چونکہ یہ ساری باتیں تاکیداً اور تفصیلاً کتاب اللہ سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے حضرت عمرؓ نے اس نور فراست سے جو خدا نے ان کو عطا کیا تھا اور اپنی صائب رائے سے یہ دریافت کر لیا تھا کہ آپؐ کا مقصد و مدعا کیا ہے، اس لیے وہ آپ کی اس شدید تکلیف کی وجہ سے جس میں آپ مبتلا تھے آپ کو مزید زحمت میں ڈالنے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔

موقع و محل اور دوسرے قرائن سے بھی اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی کہ آپ حضرت علیؓ کے لیے خلافت نامہ تحریر فرمانا چاہتے تھے کیوں کہ حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا آپؐ حکم دے چکے تھے اور تمام صحابہ نے ان کی اقتدا میں نماز بھی ادا کی تھی، اس سے بطریق لزوم خود ہی ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ خلافت کبریٰ کے منصب پر بھی انہیں کو فائز کرنا چاہتے تھے اس لیے اگر آپؐ ان کی خلافت کی صراحت فرمانا یا ان کے لیے وصیت تحریر کرنا چاہتے رہے ہوں تو یہ ایک قریبی احتمال ہے اور وہ احتمال جو بیان کیا جاتا ہے بعید تر ہے، کتاب الجہاد کے باب **هل يستشفع الى اهل الذمة** میں شارح قسطلانی تحریر کرتے ہیں کہ آپ نے کاغذ یہ تحریر فرمانے کے لیے مانگا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی صراحت فرما دیں لیکن چونکہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑے اور آپ کو بیماری سے شدید تکلیف تھی اس لیے آپ نے اس کی جانب

سے اس لیے صرف نظر کر لیا کہ آپ حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں اپنا جانشین بنا ہی چکے تھے، امام بخاریؒ کتاب الطب کے باب المریض میں آپ کے اس ارشاد گرامی کو نقل کرتے ہیں:

لقد هممت اردت ان ارسل الی ابی بکر وابنه	میں نے قصد یا ارادہ (راوی کو شک ہے کہ هممت فرمایا یا اردت) کیا کہ ابوبکرؓ اور ان کے صاحبزادے (عبدالرحمٰن) کو بلاؤں۔

امام مسلمؒ کی روایت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ:

واعهد ان یقول القایلون ویتمنی المتمنون	اور (ان کے لیے خلافت کی) وصیت کر دوں تا کہ کسی کو اس (خلافت) کی طلب وتمنا نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے سوا کسی اور کو میرے بعد خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے، یہ مفہوم چونکہ دوسری حدیثوں کے منطوق کے مطابق ہے، اس لیے اس باب میں یہ مختصر حدیث بیان کرنے پر اکتفا کی ہے:

امام مسلم حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ ابوبکرؓ اپنے بھائی کو بلاؤ تا کہ میں ان کے لیے یہ تحریر کر دوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے دعویدار ہو جائیں گے اور اپنے کو خلافت کا زیادہ اہل بتائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے، بزارؒ حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ جس وقت آپ کے مرض نے شدت اختیار کر لی تھی اس وقت آپؐ نے فرمایا کہ دوات، قلم اور کاغذ لاؤ تا کہ میں ابوبکرؓ کے لیے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ لوگ اس معاملہ میں ان سے اختلاف نہ کریں، پھر آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خدا کی پناہ اس بات سے کہ لوگ ابوبکرؓ سے اس بارے میں اختلاف کریں۔

یہاں یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ جو دو حدیثیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا

ہے کہ صحابہ کرام نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس جو لوگ موجود تھے انہوں نے آپ کے اس حکم کو ایجابی (واجب) نہیں سمجھا، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ امر ایجابی ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مانعین کتابت پر ناگواری ظاہر فرماتے اور واجب کا مکلف بتانے میں کسی کی بھی پروا نہ کرتے، علاوہ ازیں خود حضرت عمرؓ کس طرح امر ایجابی کی تعمیل میں توقف فرماتے جب کہ ان کی رائے عموماً وحی قرآنی کے مطابق ہوتی تھی، شارح نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

کتاب الجہاد کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمرؓ کی رائے پسند آئی تھی اور آپؐ نے دوسرے لوگوں کی بات سنی ان سنی کر دی تھی اور ان کے اعتراض کو سرے سے نظر انداز فرما دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں طعن و تشنیع، ذاتی خبث اور طبعی عناد کا نتیجہ ہے، واللہ اعلم بالصواب (جلد۱ص۶۱و۶۲)

اسباب و وجوہ کا ذکر: شیخ نور الحق نے اپنی شرح میں جا بجا کسی حدیث کو لانے کا مقصد اور احادیث میں درج باتوں کے وجوہ واسباب اور مصالح بھی تحریر کیے ہیں، مثلاً امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز اس مشہور حدیث (**انما الاعمال بالنیات الخ**) سے کیا ہے کہ کتاب کا آغاز اس حدیث سے کیا جانا اس کو ظاہر کرتا ہے کہ سچی نیت اور تقرب الٰہی کے ارادہ کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔

آگے وحی کی کیفیت کی تشبیہ آواز جرس سے دیے جانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ''وحی پیہم آتی تھی اور کلمات ایک دوسرے سے منفصل اور جدا نہیں ہوتے تھے یا اس لحاظ سے تشبیہ دی ہے کہ آسانی سے اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے نفس وحی مراد ہے اور آواز سے فرشتہ کے بال و پر کی آواز مراد ہے جو کہ وحی کا دیباچہ ومقدمہ تھی۔ (ص۷)

اسی سلسلہ روایت میں حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ سخت ٹھنڈک کے دنوں میں بھی جب آپ پر وحی آتی تھی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا، اس رنج وتعب کی وجہ سے جو احکام الٰہی کی تبلیغ کی ذمہ داری کو محسوس کرنے کی وجہ سے آپ کو پہنچتا تھا۔

وحی کے سلسلہ کی روایت میں آگے یہ بیان ہوا ہے کہ وحی کی جو پہلی نوع آپ پر نازل ہوئی وہ خواب میں رویائے صالحہ تھے، شیخ کا بیان ہے کہ یہ کیفیت چھ ماہ تک رہی اور اس کی حکمت یہ تھی کہ فرشتہ اگر دفعتاً آجاتا اور یکبارگی بار نبوت آپ پر ڈال دیا جاتا تو آپ کے قوائے بشری اس کے متحمل نہ ہوتے اور بیداری کی حالت میں آپ پر جو ہیبت طاری ہوتی اس کا ذکر اسی روایت کے آخر میں ہے۔ (ص ۷)

اس حدیث کے آخر میں حضرت ورقہ بن نوفل کے اس قول کا ذکر ہے کہ ''یہ وہی ناموس ہے جس کو اللہ نے موسیٰ کے پاس بھیجا تھا'' نصرانی ہونے کے باوجود انہوں نے حضرت عیسیٰ کے بجائے حضرت موسیٰ کا کیوں ذکر کیا، اس کی وجہ شارحین یہ بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی کتاب کا بڑا حصہ احکام پر مشتمل ہے اور یہی حال ہمارے پیغمبرؐ کی کتاب کا بھی ہے، اس کے برعکس حضرت عیسیٰؑ کو جو کتاب دی گئی تھی وہ تمام تر امثال و مواعظ کا مجموعہ ہے، شیخ نور الحق اس توجیہ سے متفق نہیں ہیں کیوں کہ حضرت موسیٰؑ متفقہ طور پر نہایت مشہور و مقرب نبیوں میں تھے، اس کے برخلاف حضرت عیسیٰؑ کی نبوت میں بھی یہود کی ایک جماعت کو اختلاف تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل حضرت موسیٰ کے پاس حضرت عیسیٰؑ کی بہ نسبت زیادہ آتے تھے کیوں کہ توریت احکام پر مشتمل تھی اور احکام نجما نجما اترتے تھے، جس طرح کہ قرآن احتیاج کے وقت اترتا تھا، کشاف میں ہے کہ جنی (جنات) یہودی تھے، اس لحاظ سے حضرت موسیٰؑ کے نام کی تعیین کی گئی ہے اور بیضاوی میں ہے کہ جنیوں کو حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی خبر نہیں ہوئی تھی، شیخ نور الحق کے نزدیک یہ ساری وجہیں نہایت دور از کار ہیں، جنات تو مشرق و مغرب ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، انہیں حضرت عیسیٰؑ کی

بعثت کی بھلا کیوں اطلاع نہ ہوتی ۔ (جلد اول، ص ۹ و ۱۰)

صحیح بخاری کے ابواب کی مناسبت کا ذکر: امام بخاریؒ کا ایک خاص فضل و امتیاز ان کی کتاب کے ابواب و تراجم بھی ہیں، ان کے تحت انہوں نے جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کی مناسبت کے پہلو نہایت دقیق اور مخفی ہیں جن کی حقیقت امعان نظر کے بغیر معلوم نہیں ہوتی، اسی لیے علمائے فن نے ان کو اپنے غور و فکر کا خاص موضوع بنایا ہے اور اپنی شرحوں میں اس پر مفصل بحث و گفتگو کی ہے، شیخ نورالحق نے بھی ابواب و کتب سے احادیث کی مناسبت جا بجا دکھائی ہے، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

صحیح بخاری کے باب بدء الوحی کے آخر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے ابوسفیان و ہرقل کا جو مکالمہ بیان کیا گیا ہے، شیخ نورالحق عنوان باب سے اس حدیث کی مناسبت یوں بیان کرتے ہیں:

> ''قسطلانی کے نزدیک باب مذکور سے حدیث کی مناسبت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں آپ کے ابتدائی حالات اور عمدہ صفات و اطوار کا ذکر ہے جن کی وجہ سے آپ وحی و رسالت سے سرفراز کیے گئے، علاوہ ازیں اس روایت میں ظہور نبوت کی ابتدا کا واقعہ درج ہے، ایک جماعت کے نزدیک عنوان میں مذکور آیت سے ابوسفیان و ہرقل کی گفتگو کی مناسبت اس طرح ہے کہ گزشتہ تمام انبیا علیہم السلام کے حالات جن پر وحی نازل ہوتی تھی اسی طرح کے ہیں۔'' واللہ اعلم (ص ۱۶)

کتاب الایمان کے باب **المعاصی من امر الجاهلية و لا يكفر صاحبها** (گناہ جاہلیت کے امور میں داخل ہے اور گناہ گار کی تکفیر نہ کی جائے گی) میں حضرت ابوذرؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے جس میں ایک شخص کو ان کے گالی دینے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **انک امرء فيک جاهلية** (تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کی خو بو ہے)

اس کے متعلق شیخ لکھتے ہیں:

"عنوان سے حدیث کی مناسبت اس قدر ہے کہ حضرت ابوذرؓ جیسے جلیل القدر شخص سے بھی گناہ سرزد ہوا اور اس کے باوجود وہ مسلمان رہے۔" (ص۲۶)

کتاب العلم کے باب المناوله میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اپنا نامہ مبارک دے کر بھیجا، اس نے جب نامۂ مبارک کسریٰ کے حوالہ کیا تو اس نے اسے چاک کر ڈالا۔

شیخ نے ترجمۃ الباب سے اس حدیث کی مناسبت اس طرح بیان کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خط قاصد کے سامنے پڑھے بغیر اس کے حوالہ کر دیا اور اسے اس کی اجازت دی کہ وہ یہ کہے کہ یہ نامۂ مبارک ہے جس پر عمل کیا جانا چاہیے، مناولت اور اجازت کا یہی ثمرہ اور حاصل ہے۔ (ج ۱، ص ۴۴)

اسی کتاب کے باب من ترک بعض الاختیار مخافة ان يقصر فهم بعض الناس عنه فيقعوا في اشد منه (جو کسی مختار اور پسندیدہ کام کو اس اندیشہ سے ترک کر دے کہ بعض لوگ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے اس سے سخت تر بات میں پڑ جائیں) میں امام بخاریؒ یہ حدیث لائے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تیری قوم کا زمانہ جاہلیت کے دور سے قریب تر نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ کر اس کے دو دروازے کر دیتا تاکہ ایک سے لوگ اس میں داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے، شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ عنوان باب سے حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائے کعبہ کے سلسلے میں ایک مختار امر کو اس اندیشہ کی وجہ سے ترک کر دیا تھا کہ ضعیف الایمان لوگوں کے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ (جلد ۱، ص ۶۸)

شیخ نورالحق نے احادیث سے ترجمہ ابواب کی مناسبت ہی نہیں بیان کی ہے بلکہ

کتب وابواب کی باہم دگر مناسبت بھی بیان کی ہے، جس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔

شیخ نور الحق صحیح بخاری کے نسخوں کے فرق واختلاف کو بھی واضح کرتے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے تراجم ابواب کے اس فرق کو بھی دکھایا ہے جو مختلف نسخوں میں پایا جاتا ہے، اس ضمن میں بھی انہوں نے کہیں کہیں احادیث سے تراجم ابواب کی مناسبت دکھائی ہے، مثلاً امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے **باب علامات الایمان حب الانصار** (ایمان کی علامتوں میں انصار کی محبت بھی ہے) کے بعد جس باب کا ذکر کیا ہے اس کا کوئی عنوان نہیں دیا ہے، شیخ نور الحق کا بیان ہے کہ بعض نسخوں میں یہاں سرے سے باب ہی موجود نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس باب مذکور حدیث کا تعلق سابق باب علامات الایمان سے ہوگا اور پھر حدیث کی اس سے مناسبت واضح کی ہے۔

کتاب الایمان کے ایک باب کا عنوان یہ ہے "**باب المعاصی من امر الجاهلية ولا يكفر صاحبها بارتكابها الا بالشرك**" (گناہ کے کام جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں جن کے مرتکب کی تکفیر نہیں کی جائے گی سوائے شرک کے گناہ کے) اس باب کے آخر میں حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے قتال کریں تو قاتل ومقتول دونوں آگ میں ہوں گے، میں نے عرض کیا کہ خیر یہ تو قاتل ہے لیکن مقتول کیوں آگ میں جائے گا، آپؐ نے ارشاد فرمایا اس لیے کہ وہ بھی اپنے حریف کو قتل کرنے کا آرزومند تھا۔

شیخ نور الحق اس حدیث کی شرح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "یہ کتاب کے بعض نسخوں میں علاحدہ باب میں درج ہے جس کا عنوان یہ ہے "**وَإِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا**" (اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑائی کریں تو ان کے درمیان صلح کراؤ) اس شرح میں اس نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے جو ہمارے شیخ وسید ابو المجد عبد الحق کا تصحیح کیا ہوا ہے۔ (ج ۱، ص ۲۷)

شیخ نے نسخوں کے الفاظ وحروف تک کے فرق واختلاف کو بھی بتایا ہے جیسے کتاب الایمان کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ صحیح بخاری کے بعض نسخوں کی روایات کے مطابق اس کے بجائے من کتاب الایمان مذکور ہے مگر ان کے نزدیک زیادہ صحیح روایت وہ ہے جس کو انہوں نے اختیار کیا ہے، اس کے معا بعد امام صاحب جو باب لائے ہیں وہ یہ ہے باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم شیخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق عنوان اس طرح ہے باب الایمان و قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم مگر مختار اول ہے۔

اس باب میں امام بخاریؒ نے جو آیتیں نقل کی ہیں ان میں دوسرے آیت وَزِدْنَاهُمْ هُدًى کے متعلق شیخ دہلوی نے لکھا ہے کہ ''ہم کو کسی نسخہ میں اس آیت سے پہلے قال اللہ نہیں ملا، نیز بعض نسخوں سے یہ آیت ساقط ہے، اس صورت میں اس باب میں یہاں کل سات ہی آیتیں ہوں گی۔ (ص ۱۶ و ۱۷)

امام بخاریؒ نے بعض ابواب میں کوئی حدیث نہیں بیان کی ہے بلکہ چند آیتیں نقل کر دی ہیں مثلاً کتاب العلم کا پہلا باب فضل العلم (علم کی فضیلت) قائم کیا ہے اور اس میں دو آیتیں نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کوئی حدیث نہیں درج کی ہے، شیخ نور الحق نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ زیر نظر باب میں ان کو اپنی شرائط کے مطابق کوئی حدیث نہیں ملی ہے، اس لیے انہوں بہتر یہی سمجھا کہ آیتوں کو نقل کر دیں کیوں کہ یہ سب سے بڑی دلیل اور صریح ثبوت ہیں۔ (ج ۱، ص ۴۰)

شکوک وشبہات کا جواب: اس سے پہلے اشکالات کے جواب دینے کا ذکر آچکا ہے، ذیل میں یہ دکھایا جائے گا کہ شیخ نور الحق نے شکوک وشبہات کا ازالہ کس طرح کیا ہے۔

منافقین کے استغفار کے مسئلہ پر بڑی مفصل بحث کر کے اس کے متعلق شکوک و شبہات کا جواب دیا ہے، پہلے وہ حدیث ملاحظہ ہو جس کے ضمن میں یہ بحث کی گئی ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ مجھے اپنی قمیص عطا کیجیے تاکہ میں اسے اپنے باپ کا کفن بناؤں اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھیے اور ان کے لیے استغفار کیجیے چنانچہ آپؐ نے ان کو اپنی قمیص دے دی اور فرمایا کہ جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے بتلانا تاکہ میں نماز پڑھوں، پس جب انہوں نے خبر دی اور آپؐ نے نماز کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپؐ کا دامن کھینچ لیا اور کہا کہ اللہ نے آپؐ کو منافقین کی نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ مجھے دونوں کا اختیار دیا گیا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْلَهُمْ ۚ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۚ (توبہ ۹:۸۰)	چنانچہ منافقین کے لیے استغفار کیجیے یا نہ کیجیے اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں تو اللہ ہرگز ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔

چنانچہ آپؐ نے ان کی نماز پڑھی جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۚ (توبہ ۹:۸۴)	منافقین میں سے اگر کوئی مرجائے تو آپ کبھی بھی نہ اس کی نماز پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے متعلق دل میں کچھ خلجان پیدا ہوتا ہے جس کو رفع کرنا ضروری ہے:

ابن ابی کے صاحبزادے اسلام کے مخلص وفدائی تھے، انہیں اپنے والد کے نفاق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل اسلام سے ان کی شدید عداوت کا علم تھا، ان کو اہل نفاق کی تکفیر وتقبیح اور سوئے عاقبت سے متعلق نصوص سے بھی پوری واقفیت تھی، اسی بنا پر جب ان کے کانوں میں ان کے والد کے یہ الفاظ پڑے کہ ”ہم جیسے ہی مدینہ پہنچیں گے تو ہم عزت والے لوگ ان ذلیل وخوار لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے“ تو برسر راہ انہوں نے

باپ کو پکڑا اور تلوار کھینچ لی کہ آپ یہ کہیے کہ ہم جیسے لوگ ذلیل وخوار ہیں اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی تمام لوگوں سے زیادہ معزز و برتر ہیں، اگر آپ یہ نہیں کہیں گے تو اسی تلوار سے آپ کا سر آپ کے تن سے جدا کردوں گا، چنانچہ جب تک ان سے اس کا اقرار نہ کرالیا انہیں نہیں چھوڑا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس منافق کے حال سے قطعی طور پر واقف تھے، اس کے باوجود آپؐ نے کس طرح اس کے لیے درخواست کو منظور کرلیا جب کہ اس کے پہلے ابو طالب کی وفات کے بعد مکہ ہی میں یہ آیت نازل ہو چکی تھی کہ:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (توبہ ۹:۱۱۳)	نبی اور مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے، آپؐ عربی زبان کے استعمال کے سب سے بڑھ کر عارف اور اللہ کی مراد ومنشا کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ایسی صورت میں اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سے استغفار وعدم استغفار میں تخییر کا مفہوم آپؐ نے کیسے سمجھ لیا، مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں مراد اس برابری سے ہے جو ان دونوں امور کے غیر مفید ہونے میں ہے جیسا کہ آیت میں بتصریح کہا گیا ہے کہ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (اگر ان آپؐ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں گے تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔)

شیخ فرماتے ہیں کہ قسطلانی نے خلجان کو دور کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارا ہے، ہم اس کے بعض مقدمات کو جو اس وقت ذہن میں اور نوک قلم پر آرہے ہیں اللہ کی توفیق سے قلم بند کرتے ہیں:

ابن ابی کی ظاہری حالت اہل اسلام کے [illegible] تھی اور ان کے صاحبزادے

راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کو اپنے والد کے عام حالات کی وجہ سے ایک طرح کی پشیمانی اور ندامت رہتی تھی، انہی احساسات و جذبات نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی خواہش کے اظہار پر آمادہ کیا ہوگا کہ آپ کے ظاہری و باطنی برکات ایمانی اور مغفرت کی دعا سے ان کے والد محروم نہ رہیں، عبدالرزاق نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ خود ان کے والد نے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ التماس کرنے کے لیے بھیجا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بندگان خدا سے شدید محبت و رافت کی بنا پر ان کی ہدایت کے نہایت حریص اور مشتاق رہتے تھے، نیز آپ کو ابن ابی کے صاحبزادے سے بڑا تعلق خاطر بھی تھا اس لیے آپؐ تشریف لے جانے کے لیے تیار ہو گئے اور ان کے صاحبزادے سے فرمایا کہ یہودی کی محبت نے تجھے ہلاک کیا، انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں تو فرستادہ ہوں، آپؐ میری خاطر استغفار فرما دیجیے اور اپنا پیراہن مبارک کفن کے لیے عطا کیجیے اور میری سرزنش نہ کیجیے، فتح الباری میں اس حدیث کو مرسل مگر اس کے تمام رجال کو ثقہ کہا گیا ہے، اس کی تائید طبرانی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے واسطہ سے مروی ہے کہ جب ابن ابی بیمار ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ پر احسان کیجیے، میری تکفین کے لیے اپنا پیراہن عطا کیجیے اور میری نماز جنازہ ادا کیجیے۔

شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان کی ان گزارشات نے ان کی موت کے بعد ان کے لڑکے اور خاندان والوں کے شرم و عار کو ختم کر دیا، کیوں کہ انہوں نے اخبات و انقیاد کا ارادہ کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ ظاہری حالات دیکھ کر ان کی جانب رغبت ہو گئی مگر جب یہ وحی نازل ہوئی کہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا تو آپ کو تنبہ ہوا اور آپ پر سارے حالات منکشف ہو گئے، قسطلانی کے خیال میں اس واقعہ کے تعلق سے یہ بہترین جواب ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت عباسؓ کو غزوۂ بدر میں برہنہ قیدی بنا کر

لایا گیا اور کوئی کپڑا موجود نہ تھا جو ان کی قامت پر راست آتا تو عبداللہ بن ابی نے جوان کا ہم قامت تھا انہیں اپنا کپڑا پہنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بدلے میں اپنا پیراہن اس کو دیا تاکہ منافق کا کوئی احسان آپ پر نہ رہ جائے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص بھی سوال کرتا تھا تو آپ انہیں نہ کہتے تھے اور یہاں تو سوال کرنے والے ایک مخلص مسلمان تھے، پھر پیراہن دینے میں بخل سے کام لینا آپؐ کے کرم و سخاوت کے منافی تھا، اس لیے آپ کو پیراہن دینے میں تامل نہیں ہوا، چنانچہ جو آیت بعد میں نازل ہوئی اس میں آپ کے پیراہن کی بخشش کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ آیت کریمہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ الخ اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور اس میں نماز جنازہ کے بجائے صرف استغفار کی ممانعت ہے تو اوپر بیان کی گئی توجیہ سے خلجان کیسے دور ہو سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس استغفار سے منع کیا گیا ہے جس کی اجابت کی امید ہو اور جو واقعتاً تحصیل مغفرت کی غرض سے کیا گیا ہو، حضرت ابو طالب کے معاملہ میں آپ نے اسی لیے استغفار کیا تھا لیکن اس منافق کے لیے آپ نے جو استغفار کیا تھا اس کا مقصد یہ نہیں تھا، بلکہ یہ اس کے صاحبزادے اور اہل خاندان کی تالیف قلب اور دل جوئی کے لیے کیا تھا، روایت کی گئی ہے کہ اس کریمانہ خلق نبویؐ کا مشاہدہ کر کے خزرج کے ایک ہزار آدمی ایمان سے مشرف ہو گئے تھے اور انہوں نے کہا کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف و کرم اور دعا و استغفار کا یہ حال ایک ایسے شخص کے ساتھ جو زبان سے تو ایمان ظاہر کرتا ہے لیکن اندر سے اس کے برعکس تھا تو جن کا ظاہر و باطن یکساں اور جو واقعی ایمان و اسلام میں مخلص ہوں ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ کتنا عمدہ اور اچھا ہوگا۔

جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس کی نماز اس لیے پڑھی تھی کہ آپ امت کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ احکام شرع ظواہر حال پر مترتب ہوتے ہیں، چنانچہ جس

نے اقرار شہادت کرلیا اس پر باتفاق احکام جاری ہوں گے، رہی آیت لَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ (الخ) جو اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی تو یہ ان منافقین کے لیے مخصوص ہے جن کے کفر کا یقین آپ کو اللہ تعالیٰ کے خبر دے دینے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔

آگے شیخ نور الحق نے آیت استغفار سے آنحضرتؐ کے تخییر کا مفہوم لینے پر جس تردد اور خلجان کا اظہار کیا گیا ہے اس کا جواب دیا گیا ہے مگر یہ جواب خود ان کے نزدیک بھی شافی اور دشواری سے خالی نہیں ہے۔

اس طرح کے شکوک و شبہات کا جواب انہوں نے اور جگہوں پر بھی دیا ہے، مثلاً کتاب الایمان کے باب علامات المنافق میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں: ۱۔ جب کوئی بات کرے تو جھوٹ کہے ۲۔ وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے ۳۔ جب کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

شیخ نور الحق اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اوصاف بد تو مومنین میں بھی پائے جاتے ہیں، پس ان کو نفاق کی علامت کیسے مانا جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان اوصاف بد کو اپنی عادت بنالیں اور یہ حالات ان کے لوازم میں داخل ہو جائیں وہ مخلص مومن نہیں ہیں بلکہ پکے منافق ہیں جیسا کہ دوسری حدیث اس مفہوم میں بالکل صریح ہے۔

یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ یہ عادتیں نفاق کی علامت ہیں جس شخص میں یہ جمع ہو جائیں ظاہر حکم کے مطابق اس کے اندر نفاق کی علامتیں جمع ہو گئیں، رہی دل کی تصدیق تو اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نفاق سے عمل میں نفاق مراد ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ لغت میں باطن سے ظاہر کی مخالفت کا نام نفاق ہے، اگر یہ مخالفت ایمان و عقیدہ میں ہو تو اسے نفاق کفر کہا جائے گا، ورنہ یہ نفاق عمل کہلائے گا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ عمل عقیدہ کے مطابق نہیں ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث کسی خاص اور متعین

شخص کے بارے میں ہے جو منافقین کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ اشارہ وکنایہ میں گفتگو کرتے تھے، مثلاً فرمایا ما بال اقوام یا اسی طرح کے اور فرمودات بھی ہیں، یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ جس طرح اخلاص کے مقامات و درجات ہیں اسی طرح اس کے مقابل نفاق کے بھی مراتب ودرجات ہیں، چونکہ ان صفات کے ہوتے ہوئے آدمی کمال اخلاص کے مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا اور جب ان مذموم باتوں میں وہ بہت آگے نکل جائے گا تو منافق کہلائے گا، اسی کی طرف حدیث نافق حنظلة الخ میں بھی اشارہ ہے۔ (جلد اول، ص ۲۷)

اصول ومصطلحات حدیث کی تشریح: شیخ نورالحق نے جا بجا احادیث کے اصول ومصطلحات پر بھی بحث وگفتگو کی ہے، یہاں ہم بعض مثالوں سے اس کو واضح کریں گے، محدثین کی ایک اصطلاح متابعت ہے، اس کے متعلق شیخ کی وضاحت کو سمجھنے کے لیے یہ پس منظر پہلے جان لینا چاہیے۔

امام بخاریؒ نے کتاب کے پہلے باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله صلی الله علیه وسلم میں جو تیسری حدیث نقل کی ہے اس کی سند ملاحظہ ہو:

"حدثنا یحیٰ بن بکیر قال اخبرنا اللیث عن عقیل بن شهاب عن عروۃ بن الزبیر عن عائشة ام المومنین رضی الله عنها انها قالت اول ما بدئ به رسول الله صلی الله علیه وسلم من الوحی الخ

حدیث کو ختم کرنے کے بعد امام بخاری فترۃ الوحی کے متعلق ابن شہاب کے واسطہ سے جابر بن عبداللہ انصاری کی حدیث کے بعض حصے نقل کر کے لکھتے ہیں:

تابعه عبدالله بن یوسف و ابو صالح عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح نے یحیٰی بن بکیر کی متابعت کی ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

وتابعه هلال بن رداد عن الزهری — زہری سے روایت کرنے میں عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے کی ہے۔

اس کے بعد شیخ نورالحق کی تقریر ملاحظہ ہو:

''اہل حدیث کی اصطلاحات میں ایک متابعت بھی ہے، مصنف نے اپنی جامع میں سے اکثر تعرض کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی نے ایک روایت اپنے شیخ سے کی اور اسے کسی دوسرے شخص سے بھی بیان کیا جس نے اس کے شیخ کے شیخ سے اسی کو روایت کیا ہے، اب اگر یہ دوسرا راوی معتبر ہے اور صحابی تک اس کی سند کے تمام رواۃ متفق علیہ ہیں تو اس قسم کو متابعت تامہ (مکمل متابعت) کہتے ہیں، مثلاً امام بخاری نے اس روایت کو یحییٰ کے واسطہ سے بیان کیا ہے اور انہوں نے اسے لیث کے واسطہ سے بیان کیا ہے اور اس کی تائید عبداللہ وابو صالح کی روایت سے کی ہے جو معتبر و متفق علیہ ہیں، متابعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو راوی اس کی روایت کی تائید کرتا ہے وہ شیخ کے شیخ سے روایت کرنے میں اوپر کے راوی کا شریک ہے، اس کو متابعت ناقصہ کہتے ہیں، اگر یہ دور تر ہو تو متابعت انقص کہلائے گی، اس اعتبار سے کہ بعض رجال نے اس کی عدم موافقت کی ہے جیسا کہ مصنف نے دوسری بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے کی ہے، یعنی جس طرح عقیل نے ابن شہاب سے روایت کی ہے جو تابعی ہیں، اسی طرح ان سے ہلال بن رداد نے بھی کی ہے اور چونکہ ہلال وعقیل دونوں ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں، اسی لیے بلاشبہ ہلال کی روایت عقیل کی روایت کی متابع ہوئی۔

متابعت میں بعض لوگوں نے یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ متابعت

کرنے والے دونوں افراد کے متن کو لفظاً متحد ہونا چاہیے مگر کچھ لوگ
صرف معنی کے اتحاد کو کافی سمجھتے ہیں، متابعت کے شاہد کے نام سے بھی
موسوم کیا جاتا ہے۔'' (جلد اول، ص ۱۰۱۱)

محدثین کی ایک اصطلاح تعلیق ہے جس کی مثالیں صحیح بخاری میں بکثرت ملتی ہیں، شارح نے کہیں کہیں اس کی نشاندہی کی ہے، مثلاً کتاب الایمان میں باب الصلوٰۃ من الایمان (نماز ایمان میں شامل ہے) کا باب باندھا ہے اور اس میں جو حدیث نقل کی ہے اس کے خاتمہ سے قبل لکھا ہے ''قال زهير حدثنا ابو اسحاق عن البرانی حديثه هذا'' اور اس کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ مقولہ بھی اسی حدیث کا جز ہے جو سند مذکور سے وارد ہے مگر ان کے نزدیک اس کا احتمال بھی ہے کہ مصنف اسے زہیر کے واسطے سے بطریق تعلیق لائے ہوں۔ (ج ۱، ص ۳۰)

ایک جگہ تعلیق کی نشاندہی کر کے اس کا مفہوم مثال سے واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تعلیق کا مطلب ہے کہ راوی حدیث کو ایسے شخص کی طرف
منسوب کرے جس کا زمانہ اسے نہ ملا ہو، چنانچہ امام بخاریؒ نے حدیث
مذکور کی طرف دو دیگر طرق سے جو کہ تعلیقات میں ہیں اشارہ کیا ہے، جیسے
ابو معاویہ نے ۱۹۵ھ یا ۱۹۴ھ میں وفات پائی اور عبدالاعلیٰ نے ۱۸۹ھ میں
جب کہ امام بخاری کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی۔'' (جلد ۱، ص ۱۹)

ایک جگہ وہ امام بخاری کے اس طریقہ تخریج کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں اس بنا پر لاتے ہیں کہ ہر باب سے اس کی مناسب جزء ہوتی ہے، محدثین کی اصطلاح میں ایک ہی متن اگر متعدد طرق سے آئے اور ایک راوی بھی اس کی پوری سند میں متغائر ہو تو اسے دو حدیث کہا جائے گا، یہ حدیث اسی قبیل سے ہے جس کو مؤلف نے ایک بار قتیبہ اور انہوں نے اسماعیل کے واسطے سے بیان کیا ہے اور دوسری مرتبہ

خالد سے جو اسے سلیمان سے بیان کرتے ہیں لائے ہیں۔

کہیں کہیں ان حدیثوں کو جنہیں امام بخاری نے بلا سند نقل کیا ہے، شیخ نور الحق نے بتایا ہے کہ انہیں کس مصنف نے سنداً نقل کیا ہے، مثلاً کتاب الایمان کے پہلے باب کی اس حدیث الحب فی اللہ والبغض فی اللہ عز وجل من الایمان (اللہ کے لیے حب وبغض ایمان میں داخل ہے) کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''مصنف اس حدیث کو سند کے لائے بغیر لائے ہیں لیکن ابوداؤد نے اسے ابوامامہ کے واسطہ سے اور امام ترمذی نے معاذ بن جبلؓ کے واسطے سے بیان کیا ہے۔'' (جلد ۱، ص ۱۷)

شارح نے سلسلۂ سند میں مذکور عطف ومعطوف کی وضاحت کی ہے، مثلاً کتاب الایمان کے باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (ایمان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے) کی پہلی سند یہ ہے حدثنا مسدد قال حدثنا یحی عن شعبۃ عن قتادۃ عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن حسین المعلم ''حدثنا قتادۃ عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' اس میں شیخ نور الحق وعن الحسین المعلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ اس کا عطف شعبہ پر ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ یحیٰ کو یہ حدیث دو شیوخ شعبہ وحسین المعلم سے پہنچی ہے اور یہ دونوں حضرات اسے قتادہ سے بیان کرتے ہیں مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا عطف حدثنا مسدد پر ہے، اس طرح یہ حدیث تعلیق کے قبیل کی ہوگی۔ (جلد ۱، ص ۱۹، ۲۰)

امام بخاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی وہ حدیث کا متن پہلے بیان کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی سندوں کو لاتے ہیں، اس سے ان کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ حدیث کی سندیں ضعیف ہیں، مثلاً کتاب العلم کے باب کا عنوان یہ ہے ''من خص بالعلم

قوما دون قوم کراهية ان لا يفهموا '' (جو شخص علم کے معاملہ میں تخصیص سے کام لے اور کچھ لوگوں کو اس سے واقف کرے اور کچھ لوگوں کو اس اندیشہ سے مطلع نہ کرے کہ وہ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جائیں گے) امام بخاری نے اس میں پہلے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

حدثوا الناس بما يعرفون اتحبون ان يكذب الله ورسوله	لوگوں سے وہی باتیں بیان کرو جن سے وہ مانوس اور واقف ہوں اور وہ ان کی فہم سے بالا نہ ہوں، کیا تم لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کا جھٹلایا جانا پسند ہے۔

اس کے بعد وہ اس کی یہ سند بیان کرتے ہیں ''حدثنا عبيد الله بن موسى عن معروف بن خربوذ عن ابى الطفيل عن على رضى الله عنه بذلک۔''

اس کے متعلق مولانا نور الحق تحریر فرماتے ہیں:

''مصنف حدیث مذکور کا متن اس کی سند سے پہلے لا کر یہ متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی سند میں ضعف ہے، ابن معین نے خربوذ کو ضعفا میں شمار کیا ہے، بعض حدیثوں کو انہوں نے ابواب کا عنوان قرار دیا ہے، گو یہ صحیح ہیں مگر ان کی سندیں امام بخاری کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں، اس لیے انہیں بھی اسی انداز پر لائے ہیں، یہ حدیث اور اس کی سندیں اسی نوعیت کی ہیں۔'' (جلد اول، ص ٦٨)

بعض جگہ راویوں کے کچھ اہم خصوصیات بھی شیخ نور الحق نے بیان کیے ہیں، مثلاً کتاب الایمان کے باب المعاصي من امر الجاهلية ولا يكفر صاحبها (ص ٢٥) کے ضمن میں حضرت ابوذرؓ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''وہ اکابر صحابہ میں تھے اور ان کا مسلک یہ تھا کہ ضرورت سے زیادہ

مال واسباب کا ذخیرہ کرنا حرام ہے۔'' (ج۱،ص۲۶)

آگے چل کر ایک راوی ابوبکرہؓ کے متعلق رقم طراز ہیں ''یہ بھی صحابی ہیں اور مصنف نے ان سے چودہ حدیثیں روایت کی ہیں۔'' (ایضاً)

زبان کے اسلوب، بلاغت اور عربیت کے مباحث: شیخ نورالحق عربی زبان وادب کے بھی ماہر تھے، اس لیے اس شرح میں جابجا زبان کے اسلوب واستعمال اور بلاغت وعربیت کے نکتوں کو بھی واضح کرتے گئے ہیں جیسے کتاب الایمان کے باب اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقة میں حضرت سعدؓ کے واسطہ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو
اعطی رھطا و سعد جالس عطا کیا اس حال میں کہ سعد بھی بیٹھا ہوا تھا۔

شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ سعدؓ جالس'' خود حضرت سعد کا قول ہے، اپنے آپ کو اس طرح ذکر کرنا اور اپنے نام کی صراحت کرنا بطریق التفات ہے۔ (ص۲۴)

تَرِبَتْ یَمِیْنُکَ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ عربوں کا مالوف طریقۂ استعمال ہے، اس سے مقصود بددعا نہیں بلکہ یہ اسلوب زجر کے لیے آتا ہے۔ (ج۱،ص۶۹)

ابواب الاستقا کے باب ماقیل فی الزلازل والآیات میں ایک فقرہ یتقارب الزمان آیا ہے، یعنی قیامت نہ ہوگی یہاں تک کہ زمانہ نزدیک ہونے لگے، اس کے متعلق شیخ نورالحق لکھتے ہیں:

''تقارب زمانہ کنایہ ہے بے برکتی و بے فیضی اور اس بات سے کہ لوگ اچھے کاموں سے بے بہرہ ہو جائیں گے، یہ کثرت ہموم اور بہت زیادہ حوادث وشدائد سے بھی کنایہ ہوسکتا ہے......اور یہ جو جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ سال جب ماہ اور ماہ ہفتہ اور ہفتہ دن

اور دن گھنٹہ اور گھنٹہ لحظہ کی طرح ہو جائے تو یہ بھی اسی معنی میں ہے لیکن حقیقت
پر اسے محمول کرنا خفا سے خالی نہیں ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ تقارب زماں
سے رات اور دن کا برابر ہونا مراد ہے، یعنی دنیا کے آخری دور میں روز و شب
میں یہ تفاوت نہ ہوگا اور اس کی کثرت آخرت کی علامتوں میں سے ہے،
بعض لوگوں کے نزدیک اس سے مراد دنیا کی مدت کا آخر ہونا ہے۔

کتاب الایمان کی ایک حدیث میں ہے کہ چار باتیں جس کے
اندر ہوں وہ خالص منافق ہوگا یعنی اس کے اندر ایمان کی خو بو نہ ہوگی، شیخ
اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ بظاہر آپ کا یہ ارشاد تہدید و تشدید کے لیے
آیا ہے ورنہ اہل ایمان کا حال سخت دشوار ہو جائے۔'' (ص ۲۸)

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ نے کہیں کہیں لفظوں کی تحقیق بھی کی ہے جس میں ان کے معنی بتانے کے علاوہ ان کے اعراب و حرکات کی وضاحت کی ہے اور جن لفظوں کی روایت یا ان کے معنی میں اختلاف ہے ان میں مرجح کی تصریح کی ہے، مثلاً باب بدء الوحی میں لفظ ''بدء'' کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''بدء میں با موحدہ پر فتحہ اور دال مہملہ پر سکون ہے اور آخر میں ہمزہ
جس کے معنی آغاز کے ہیں اور بُدُوٌّ کے آخر میں واو ہے جو مشدد ہے اور با
و دال دونوں مضموم ہیں، اس کے معنی ظہور کے ہیں، بدء کے علاوہ بدو کی
روایت بھی کی گئی ہے لیکن مشائخ سے مسموع بدء ہے۔'' (جلد ا، ص ۶)

ایک ہی مشتق سے بنے ہوئے لفظوں کی حقیقت و خصوصیت بیان کر کے ان کا فرق واضح کیا ہے، مثلاً رویا کے متعلق لکھتے ہیں:

''رؤیا کا لفظ رجعی کی طرح مصدر ہے جو خواب میں دیکھنے کے لیے
مخصوص ہے جس طرح رائی دل کے دیکھنے کے لیے اور رؤیت آنکھ سے

دیکھنے کے لیے مخصوص ہے۔" (ج ا، ص ۷)

ناموس اور جاسوس کے معنی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اول الذکر حضرت جبرئیلؑ سے کنایہ اور لغت میں صاحب سر خیر (اچھے رازدار) کے لیے آتا ہے جس طرح جاسوس صاحب سر شر (برے رازدار) کے لیے مخصوص ہے۔" (ج ا، ص ۹)

جنائز کے بارے میں لکھتے ہیں "یہ جنازہ کی جمع ہے جس کی جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں آتا ہے اور یہ اس مردہ کو کہتے ہیں جو نعش کے اندر ہو، دوسرا قول یہ ہے کہ جب جیم مفتوح ہو تو اس سے مردہ مراد ہوتا ہے اور مکسور کی صورت میں اس سے وہ نعش مراد ہے جس میں میت ہو، بعض لوگوں نے اس کے برعکس کہا ہے، یعنی مفتوح سے نعش اور مکسور سے میت مراد ہے۔

لفظ "عصابہ" کے متعلق لکھتے ہیں کہ "عین مکسور ہے اور اس کا اطلاق ۱۰ سے ۴۰ افراد پر ہوتا ہے، اس لفظ کا واحد نہیں آتا۔" (۲۱)

اسی طرح شہروں اور پہاڑوں وغیرہ کے ناموں کے تلفظ واعراب بتائے ہیں اور کہیں کہیں نحوی وصرفی بحثیں کی ہیں، نیز معطوف علیہ اور معطوف کی تعیین کی ہے۔

مقدمہ میں شیخ نور الحق نے ان کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں جو ان کا ماخذ رہی ہیں اور جن کا ذکر اس تذکرہ کی ابتدا میں ہو چکا ہے، ان کے علاوہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالحق کی شروح وتحقیقات سے بھی بڑا استفادہ کیا ہے، ان کتابوں میں فتح المنان اور شرح سفر السعادۃ کے بکثرت حوالے دیے ہیں۔

☆☆☆

شیخ نور اللہ

یہ شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے چار بیٹے ہوئے، سیف اللہ، علیم اللہ، محب اللہ اور جار اللہ۔(۱)

ان کے مزید حالات نہ معلوم ہو سکے، البتہ بعض بیٹوں کے بارے میں کچھ معلومات درج کیے جاتے ہیں۔

شیخ سیف اللہ

یہ شیخ نور اللہ کے بیٹے، شیخ نور الحق کے پوتے اور شیخ عبدالحق کے پڑپوتے تھے جو عہد عالمگیری کے ممتاز اور جید عالم تھے، ان کو حدیث وفقہ میں عبور تھا، ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں شمائل النبی کی ایک شرح فارسی زبان میں لکھی جس کا نام اشرف الوسائل فی شرح الشمائل ہے۔(۲)

شرح مکمل کرنے کے بعد مصنف نے اسے اورنگ زیب عالمگیر کو پیش کیا تھا۔(۳)

شیخ محب اللہ

یہ بھی شیخ نور اللہ کے بیٹے اور شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے اور علم فضل میں فائق وبرتر تھے، انہوں نے منبع العلم کے نام سے صحیح مسلم کی ایک شرح لکھی تھی

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۵۵۔(۲) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۰۲۔(۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۱ حاشیہ۔

مگر آخر عمر میں شروع کرنے کی وجہ سے وہ اس پر نظر ثانی نہیں کر سکے تھے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے یہ کتاب کتب خانہ مولوی انوار الحق میں موجود تھی مگر اس کے بعد مفقود ہو گئی۔(۱)

شیخ محب اللہ کے دو بیٹے ہوئے جن کا ذکر آگے آرہا ہے، شیخ نور اللہ کے اور بیٹوں سے بھی ان کی بڑھی اور پھلی پھولی۔

حافظ فخر الدین

ان کا نام عبد الصمد اور کنیت ابو المکارم تھی، یہ شیخ نور الحق کے پڑپوتے تھے، شجرۂ نسب اس طرح ہے:

''فخر الدین بن محب اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن عبد الحق۔''

شیخ فخر الدین کو اپنے والد سے فخر تلمذ حاصل ہوا جو اپنے دادا شیخ نور الحق کے براہ راست شاگرد تھے، شیخ فخر الدین نے اپنے والد ہی سے صحاح ستہ کا درس لیا تھا اور ان کو حدیث میں کامل دستگاہ تھی۔(۲)

شیخ فخر الدین کے بعد کی نسل کا ذکر آگے آئے گا، ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

۱۔شرح صحیح مسلم: اوپر گزر چکا ہے کہ ان کے والد نے منبع العلوم فی شرح صحیح مسلم کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس پر وہ نظر ثانی نہیں کر سکے تھے، اس لیے وہ غیر مرتب و غیر مدون تھی، حافظ فخر الدین نے اسے از سر نو مرتب کر کے اس میں مناسب رد و بدل اور حذف و اضافہ کیا، وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''والد نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری ایام میں لکھی تھی جس پر وہ نظر ثانی نہیں کر سکے تھے، اس لیے میں نے اس پر نظر ثانی کی اور مناسب

(۱) حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص ۲۶۱ بحوالہ مرأۃ الحقائق، ص ۱۱۵۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۸۔

ترمیم و اضافہ کیا۔''(۱)

کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔(۲)

۲۔شرح عین العلم: یہ محمد بن عثمان بلخی کی تصنیف عین العلم کی فارسی شرح ہے، اس میں بحث کا دارو مدار قرآن مجید اور احادیث نبوی کو بنایا گیا ہے، اول الذکر کے لیے ق اور مؤخر الذکر کے لیے ح کے رموز استعمال کیے گئے ہیں، شیخ فخر الدین کا بیان ہے کہ:

''شیخ عبدالحق نے اپنے وصایا میں تحریر فرمایا ہے کہ عین العلم کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے اور سفر و حضر میں کبھی اپنے سے دور نہ کیا جائے، اس لیے بچپن ہی سے میں اس کا شیفتہ رہا اور وہ ہمیشہ میرے مطالعہ میں رہی، اب فارسی کا رواج ہے اس لیے عربی سے ہر شخص استفادہ نہیں کر سکتا، اس بنا پر عام فائدہ کے لیے اس کی شرح فارسی میں لکھی۔''(۳)

شرح میں حدیث روایت کرنے والے صحابیوں کے ناموں کے ساتھ ان کتابوں کے نام بھی دیے گئے ہیں جن میں یہ احادیث درج ہیں، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ پٹنہ میں ہے۔(۴)

۳۔شرح حصن حصین: یہ علامہ جزری کی مشہور و مقبول کتاب حصن حصین کی فارسی شرح ہے جو مطبع نولکشور سے چھپ چکی ہے۔(۵)

☆☆☆

---

(۱)علم حدیث میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ، ص۱۸۵و۱۸۶۔(۲)مقالات سلیمان، ج۲،ص۲۴۔(۳) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۲۸و۲۲۹بحوالہ قلمی نسخہ، کتب خانہ خدا بخش۔(۴)محبوب الالباب، ص۴۳۹۔(۵)حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص۲۶۲،ان سب کتابوں کا ذکر نزہۃ الخواطر، ج۶،ص ۲۱۸، حدائق الحنفیہ، ص۳۶۸اور تذکرہ علمائے ہند، ص۷۶پر بھی ہے۔

شیخ نور الحق ثانی

یہ بھی شیخ محب اللہ کے بیٹے اور حافظ فخر الدین کے بھائی تھے، گویا شیخ نور اللہ کے پوتے اور شیخ نور الحق بن عبدالحق اول کے پڑپوتے تھے، انہوں نے اپنے والد سے تحصیل علم کی تھی اور متبحر عالم، مفتی اور فقیہ تھے۔

شیخ عبدالحق کی عربی تصنیف ماثبت بالسنة فی ایام السنة کی شرح فارسی میں لکھی تھی (۱) ان کے ایک بیٹے محب اللہ سے ان کی نسل کو فروغ ہوا۔

حافظ محمد محسن دہلوی اور شیخ محمد احسان

(المتوفی ۱۲۴۷ھ/۱۷۳۴ء) ...... (المتوفی ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء)

ان دونوں کا تعلق بھی خانوادۂ حقی سے تھا، اول الذکر کو صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ عبدالحق کے اسباط (۲) (نواسوں) اور دوسروں نے اولاد (۳) واحفاد (۴) میں بتایا ہے، یہ عالم وفقیہ تھے، ارباب تذکرہ نے جامع منقول میں لکھا ہے (۵) کہ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور یہیں نشو ونما بھی ہوئی، خواجہ محمد معصوم بن شیخ احمد سرہندی سے خلافت پائی، خواجہ کی خدمت میں مدت دراز تک رہنے کی بنا پر مجددی ونقشبندی کی نسبتوں سے مشہور ہوئے (۶) مفتی غلام سرور کا بیان ہے:

"حافظ محمد محسن نے پہلے علوم ظاہری کی تحصیل کی اور اس میں نہایت

---

(۱) نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۸۹، اصل کتاب کا اردو ترجمہ بھی ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۲۶ھ میں چھپ گیا ہے جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، فہرست، ج ۱، ص ۵۰ و ۵۱ و فہرست، ج ۳، ص ۲۶۲ و ۲۶۳۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۴۷، (۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۶۴۔ (۴) تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۲۔ (۵) ایضاً۔ (۶) ایضاً۔

بلند پایہ اور صاحب کمال ہوئے، دہلی میں کوئی ان کا ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا،
اس کے بعد ہدایت ربانی کی کشش سے شیخ محمد معصوم کی خدمت میں
باریاب ہوئے اور علوم باطنی سے مالا مال ہوئے، طریقہ عالیہ مجددیہ میں
کامل ومکمل ہونے کے بعد خرقۂ خلافت پہنا، ورع وتقویٰ اور زہد وریاضت
میں یکتائے روزگار تھے۔"(۱)

شیخ نور محمد بدایونی اور دوسرے حضرات نے ان سے کسب فیض کیا (۲) ۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔ (۳)

شیخ محمد احسان: شیخ محمد محسن کے صاحبزادے اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے کبار خلفا میں تھے، اوائل عمر میں منحرف العقیدہ اور صراط مستقیم سے روگرداں تھے، پھر حضرت میرزا مظہر جان جاناں کی توجہ و برکت سے توبہ وانابت کی توفیق ملی اور اپنی غیر معمولی استقامت اور ثابت قدمی سے اس راہ میں بڑی ترقی کی اور سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ میں بلند مقامات پر فائز ہوئے۔

غایت محبت کی وجہ سے جس وقت اللہ کا نام شیخ محمد احسان کے حق نیوش کانوں میں پڑتا تو بے ہوش ہو جاتے، ان کے مرشد حضرت مظہر جان جاناں فرماتے ہیں:

"احمد شاہ درانی کی غارت گری کے زمانہ میں میں شیخ محمد احسان
اپنے کوچہ کے دروازہ پر پوری ہمت وبہادری سے بیٹھے اور جمے رہے، اللہ
کے فضل سے کوئی غارت گر اس کوچہ میں نہیں آیا اور تمام اہل کوچہ کا جان و
مال سلامت رہا، شیخ محمد احسان کی وفات ۱۲۰۶ھ میں ہوئی۔"(۴)

☆☆☆

---

(۱) خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۶۴۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۳۴۷۔ (۳) ایضاً و تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۲ و خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۶۵۔ (۴) خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۸۸۔

شیخ الاسلام محمد

یہ حافظ فخر الدین کے فرزند تھے، انہی سے تحصیل علم کی اور صحاح ستہ نیز دوسری کتب حدیث کی اجازت پائی، شیخ الاسلام کو علمی فضیلت کے ساتھ دینی وجاہت بھی حاصل تھی، محمد شاہ کے عہد میں صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے (۱) جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا تو وہ شاہجہاں آباد (دہلی) میں مقیم تھے (۲) یہ بڑا پر آشوب دور تھا، سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کی شورش نے قیامت بپا کر رکھی تھی، اسی زمانہ میں وہ بخاری کی شرح تحریر فرما رہے تے، انہوں نے شرح کے نصف اول کے آخر میں اپنے زمانہ کے ابتر حالات کا بڑے دکھ سے ذکر کیا ہے۔

شیخ سلام اللہ رامپوری شیخ الاسلام کے فرزند تھے، ان کا ذکر آگے ہوگا۔

تصانیف: شیخ الاسلام کی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ **رسالہ کشف الغطا عما لزم للموتی علی الاحیاء:** اس میں تجہیز و تکفین سے متعلق امور کا ذکر ہے، یہ دہلی سے طبع ہو چکی ہے۔ (۳)

۲۔ **رسالہ طرد الاوھام عن اثر الامام الھمام:** امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے اثبات پر ہے۔ (۴)

---

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۳۰ بحوالہ خاتمہ شرح بخاری، جلد چہارم بر حاشیہ تیسیر القاری۔

(۲) مقالات سلیمان، جلد ۲، ص ۲۵۔ (۳) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۲۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۸۔

۳۔ شرح بخاری: شیخ الاسلام کی یہ سب سے اہم تصنیف ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی اور شیخ نور الحق کی شرح بخاری فارسی تیسیر القاری کے حاشیہ پر چھپی ہے، اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دو جلدوں میں موجود ہے (۱) ان جلدوں میں تقریباً نصف بخاری کی شرح آ گئی ہے، غالباً آخری نصف حصہ وہ اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکے اور اس کی تکمیل ملا احسن الملقب بحافظ پشاوری نے کی۔ (۲)

شرح دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شیخ نور الحق کی شرح کے مقابلہ میں زیادہ مفصل ہے۔

شروع میں ایک مقدمہ، اس میں حدیث کی اصطلاحات، امام بخاری کے حالات، صحیح بخاری کی خصوصیات، وجہ تصنیف، صحیح کے شرائط، تعداد احادیث، تراجم ابواب، تعلیقات، اس کے طرق و روایات اور اسناد وغیرہ پر بحث و گفتگو کی ہے، شرح میں احادیث کے ترجمہ و تشریح کے ضمن میں لفظوں کی تحقیق، قریب المعنی لفظوں کے معنوی فرق کی وضاحت، نحو و اعراب کے مسائل، راوی کے ناموں کا صحیح تلفظ اور ان کے سنین وفات دیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک آ گیا ہے تو آپ کا پورا نسب نامہ تحریر کیا ہے، فقہی و کلامی مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، ابواب سے احادیث کی مناسبت اور نسخوں کے فرق و اختلاف کو جا بجا واضح کیا ہے، شرح کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس میں امام نووی کی شرح مسلم، حافظ ابن حجر کی فتح الباری، شیخ عبدالحق کی شروح مشکوٰۃ اور شیخ نور الحق کی شرح بخاری سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، وہ شیخ عبدالحق کا ذکر بڑی عقیدت و احترام سے کرتے ہیں، انہیں ''شیخ اجل'' لکھتے ہیں اور ان کے خیالات جا بجا نقل کرتے ہیں۔

شرح کی مزید خصوصیات کا اندازہ دو چار مثالوں سے ہوگا جو ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۵ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۳۰۔ (۲) تقریظ، جلد اول، ص ۲۰۔

حضرت عروہ بیان کرتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کبھی کبھی وہ آواز جرس کی طرح آتی ہے اور یہ مجھ پر بڑی سخت ہوتی ہے اور مجھے چور چور کر دیتی ہے الخ، حدیث کے اس ابتدائی حصہ کی شرح میں شیخ الاسلام نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے نمبر وار ملاحظہ ہو:

۱۔ حضرت عائشہؓ کو ام المومنین کہنا دراصل آیت کریمہ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ سے ماخوذ ہے جس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں جن سے ان کا نکاح حرام ہے، یہ مقصد نہیں کہ وہ ان سے خلوت میں مل سکتے ہیں یا انہیں دیکھ سکتے ہیں یا ان کی بیٹیوں سے بھی ان کا نکاح ممنوع ہے، حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی بیٹی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں سب سے افضل اور آپ کی چہیتی تھیں سوائے حضرت خدیجہؓ کے، اس بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت عائشہؓ مجتہد تھیں اور خلفائے اربعہؓ کے زمانہ میں فتوے دیتی تھیں، ان کی وفات ۵۵ھ یا ۵۸ھ میں ہوئی۔

۲۔ حارث بن ہشام ابوجہل کے بھائی تھے، یہ فتح مکہ کے روز اسلام لائے، فضلائے صحابہ میں تھے اور معرکہ یرموک ۱۱ھ میں شہید ہوئے۔

۳۔ حارث نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو ممکن ہے کہ حضرت عائشہؓ وہاں موجود رہی ہوں جیسا کہ مشہور اور اکثر لوگوں کا معتمد قول ہے مگر دوسرا احتمال یہ ہے کہ انہوں نے اسے حارث سے سنا ہو اور جمہور کے نزدیک مرسلِ صحابی وصل کے حکم میں ہے۔

۴۔ حدیث میں آواز کے لیے صلصلہ کا لفظ آیا ہے، لوہے پر مارنے سے جو آواز ہوتی ہے اسے صلصلہ کہتے ہیں، بعد میں اس کا اطلاق ہر اس آواز پر ہونے لگا جس میں

طنین (ٹن ٹن) ہو، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پیہم آنے والی آواز کو کہتے ہیں، پہلے قول کے مطابق مفہوم تامل و تحقیق کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔

جرس ایک مشہور آلہ (گھنٹی) ہے جو جانوروں کی گردن میں باندھا جاتا ہے، اس سے وحی کی تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ عام لوگ اسے سمجھ لیں کہ کانوں میں اس کی آواز پیہم پڑتی ہے اور یہ یا تو وحی کی آواز ہوتی ہے یا حضرت جبرئیلؑ کی آواز۔

۵۔ اس طور پر وحی کے سخت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقصود کو سمجھنا میرے لیے مشکل ہوتا ہے کیونکہ خطاب کے معروف طریقوں کے برخلاف اس کی آواز سے مطلب سمجھنا دشوار ہوتا ہے، اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جسمانی حیثیت سے آپ شدید کرب اور بے چینی میں پڑ جاتے تھے اور بشریت کے تقاضے سے ان اوقات میں ایسا مغلوب ہو جاتے تھے کہ سخت ٹھنڈک میں بھی آپ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دکھائی دیتے تھے۔

پہلے اس آواز کے آنے کی حکمت یہ ہے کہ آپ وحی سننے کے لیے متنبہ اور ہوشیار ہو جائیں اور تمام تر اس کی جانب متوجہ ہو جائیں اور جو کچھ سنیں اس کو ذہن نشین کر لیں۔

۶۔ حدیث میں فصم سے مضارع کا جو صیغہ استعمال ہوا ہے وہ معروف و مجہول دونوں طرح سے ہے، صیغہ مجہول کی صورت میں فصم ثلاثی مجرد سے ہے جو شکستن اور بریدن کے معنی میں ہے اور معروف کی صورت میں یہ ثلاثی مزید افصام سے ہوگا جس کے معنی باز ماندن اور رفع دفع کرنا ہوں گے اور یہ تینوں معنی روا ہیں۔ (شرح بخاری، شیخ الاسلام، ص ۲۹ و ۳۰)

ایک مشہور حدیث ہے کہ **الایمان بضع وستون شعبة** (ایمان کے ساٹھ اور چند شعبے ہیں) اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"بعض روایتوں میں ستر اور چند آیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ایمان کے شعبے جیسے اخلاص، اعمال، واجبات، سنن، مستحبات اور آداب وغیرہ حد و شمار سے باہر ہیں، جس طرح ملائکہ و

انبیا کی تفصیل کا علم غیر ضروری ہے اسی طرح اس کی تفصیل کا علم بھی ضروری نہیں ہے، اس کے ذکر کا مقصد حصر و تعیین کے بجائے کثرت و تعدد کو بیان کرنا ہے، مبالغہ اور کثرت کے موقع پر اس طرح سے اعداد کو لانا متعارف ہے، غالباً قواعد و احکام کے اصول کا مجموعہ یہی عدد ہو۔

روایتوں میں عدد کا اختلاف مختلف چیزوں کے اعتبار کی وجہ سے ہے، کبھی ایک بات کا اعتبار کر کے ایک عدد کی صراحت فرمائی ہے اور کبھی دوسری بات کا اعتبار کر کے دوسرے عدد کا ذکر کیا ہے، بعض لوگوں نے اس میں تکلف کی راہ اختیار کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس سے حصر ہی مقصود ہے۔" (جلد اول، ص ۵۸)

اس کے بعد شعب ایمان پر طویل اور اچھی بحث کی ہے۔

ایک اور مشہور حدیث ہے کہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ اس کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پس جب وہ یہ (باتیں) کرنے لگیں تو مجھ سے ان کے جان و مال محفوظ ہو جائیں گے سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔"

اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"نماز و زکوٰۃ کا ذکر ان کی عظمت شان کی بنا پر اور یہ بتانے کے لیے ہوا ہے کہ عبادات بھی کلمہ شہادت کے حکم میں ہیں، پس دوسرے واجبات و فرائض کے ترک پر بھی قتال ثابت ہوگا، یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ سنتیں جو اسلام کے شعائر میں داخل ہیں جیسے اذان اور ختنہ وغیرہ، اگر ان کو چھوڑا جائے اور ان کے ترک پر اصرار کیا جائے تو ایسے لوگوں سے قتال کیا جائے گا، بصورت دیگر ان لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں گے سوائے اسلام کے حق کے کہ ایک شخص دوسرے کو قتل کر دے یا زنا و سرقہ کرے یا دوسرے کا

مال تلف کردے یا اللہ و رسول کے حقوق یعنی عبادات کی ادائیگی اور شریعت کی تعظیم سے باز رہے تو اس وقت یہ عظمت وحرمت اٹھ جائے گی اور شریعت کے حکم کے مطابق اسے سزادی جائے گی۔

ان کا حساب ان کی جزا وسزا اوران کے ظاہر و باطن کا معاملہ خدا کے حوالے ہوگا، ہم لوگ احکام ظاہری ہی کے مکلف و مامور ہیں، یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ظاہری اعمال کے قبول پر معاملہ کیا جائے گا اور مقتضائے ظاہر کے مطابق حکم وفیصلہ عائد ہوگا اوران اہل بدع کی تکفیر نہ کیا جائے گی جو توحید کو ضرر پہنچانے والے کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس حدیث کے فوائد کے ضمن میں نووی نے تحریر کیا ہے کہ وجوب کا اعتقاد رکھنے کے باوجود قصداً نماز ترک کرنے والا قتل کردیا جائے گا، یہی جمہور کا نظریہ ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ فوراً قتل کیا جائے گا یا تین روز کی مہلت دینے کے بعد اسے قتل کیا جائے گا، زیادہ صحیح پہلا قول ہے اور صحیح یہ ہے کہ ایک نماز ترک کرنے پر بھی جب اس کا وقت ختم ہوجائے گا وہ قتل کردیا جائے گا، امام احمدؒ کے نزدیک یہ قتل کفر وارتداد کی وجہ سے ہوگا مگر دوسروں کے نزدیک عدوان وبغاوت کی بنا پر قتل کیا جائے گا امام ابوحنیفہؒ قتل وتکفیر کے بجائے اسے محبوس کیے جانے کے قائل ہیں، روزہ ترک کرنے پر حبس وقید کے ساتھ کھانے سے بھی روکا جائے گا اور زکوٰۃ ترک کرنے پر اس سے زبردستی لیا جائے گا۔

یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیے کہ حدیث کا مقتضا یہ ہے کہ نماز وزکوٰۃ اوراس طرح کے دوسرے اعمال کو ترک کرنے والے سے قتال مباح ہے، اس میں قتل کے مباح ہونے کا پہلو نہیں ہے چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ

نے مانعین زکوۃ سے قتال کیا تھا اور انہیں قتل نہیں کیا تھا۔

قتال جو دو فریقوں کی جانب سے ہوتا ہے اس کی اباحت سے قتل
کی اباحت لازم نہیں آتی۔"

شیخ الاسلام کی بحث و تحقیق کا اندازہ کرنے کے لیے ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے:

امام بخاریؒ نے کتاب الصلوۃ میں ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ "حالت نماز میں چھوٹی لڑکی کو اپنی گردن پر اٹھانے کا بیان" اس باب میں انہوں نے عمرو بن سلیم زرقی کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابوقتادہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور اسی حالت میں وہ اپنی صاحبزادی زینب کی بیٹی امامہ کو اٹھائے ہوئے تھے، یہ ابوالعاص بن ربیعہ بن عبد شمس کی لڑکی تھیں، آپؐ جب سجدہ کرتے تو انہیں اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو انہیں اٹھا لیتے۔

شیخ الاسلام نے اس باب اور حدیث کے رواۃ و متن کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ ہو:

ا۔ باب میں مذکور صورت میں نماز فاسد نہیں ہوگی، ابن بطال فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اس باب کو لانے سے امام بخاری کا منشا یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والے کا بچی اٹھانا مضر نہیں ہے تو اس کے آگے سے بچی کا گزرنا بطریق اولیٰ مضر نہ ہوگا لیکن مصنف نے صغیرہ (چھوٹی) کی قید لگا کر یہ بتایا ہے کہ کبیرہ (بڑی) کی صورت میں یہ بات نہیں ہوگی۔

۲۔ سُلیم کو مصغر اور زُرَقی کا تلفظ بیان کرنے کے بعد وہ حضرت زینب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھیں اور حضرت امامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صغیر السن تھیں، حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت علیؓ کے عقد میں آئیں۔

آگے ابوالعاص، ربیعہ اور عبد شمس وغیرہ کے بارے میں تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

۳۔ مختار قول کے مطابق ابوالعاص کا نام مقسم (بکسر میم وسکون قاف وفتح سین) ہے، ان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے ظہور نبوت سے پہلے کیا تھا، ظہور اسلام کے بعد وہ کافروں کے ساتھ تھے اور بدر میں قیدی ہو کر جب آپؐ کے پاس لائے گئے تو آپؐ نے ان سے عہد لیا کہ زینب کو بھیج دیں، چنانچہ انہوں نے حضرت زینب کو آپؐ کے پاس بھیج دیا اور خود مکہ ہی میں رہے، بعد ازاں وہ اسلام لائے اور ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح دوبارہ کیا، عہد صدیقی میں یمامہ کی لڑائی میں وفات پائی۔

۴۔ حدیث میں صرف سجدہ کے وقت حضرت امامہ کو رکھنے کا ذکر ہے، اس سے مقصود مطلق جھکنا اور پست ہونا ہے، اس لیے رکوع بھی اس میں شامل ہے جیسا کہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔

۵۔ یہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امامہ کو اس طرح اٹھانا اور پھر رکھنا فعل کثیر (۱) میں داخل ہے اور یہ فعل قلیل بھی ہو تو اس کو یقیناً مکروہ ہونا چاہیے، اسی لیے علما نے اس حدیث کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، امام خطابی فرماتے ہیں کہ یہ فعل آنحضرت صلی اللہ کی جانب سے نہیں ہوا تھا بلکہ حضرت امامہ خود آپؐ سے لپٹ جاتی تھیں اور رکوع وسجدہ کے وقت گر پڑتی تھیں اور آپ ان سے شدید تعلق ومحبت کی وجہ سے انہیں دور نہیں کرتے تھے، گویا اس فعل کی نسبت آپ کی جانب مجازاً کی گئی ہے لیکن مسلم، ابوداؤد اور احمد کی روایتوں میں صراحتاً یہ موجود ہے کہ اٹھانا اور اتارنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہوتا تھا نہ کہ امامہ کی جانب سے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فعل کثیر وہ ہوتا ہے جو متواتر اور پے در پے کیا جائے، یہاں

---

(۱) فعل کثیر سے مراد نماز کے اندر غیر متعلق اعمال واشغال ہیں جن کو فقہا نے ممنوع قرار دیا ہے، البتہ فعل قلیل کو جائز کہا ہے مگر دونوں کی تعیین وتحدید میں اختلاف ہے۔

یہ صورت نہیں تھی، علاوہ ازیں آپ کی طمانینت اور ارکان کی ادائیگی میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آیا تھا، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے نفل نماز میں ایسا کیا تھا حالانکہ ابوداؤد کی روایت میں ظہر وعصر اور امامت کی صراحت موجود ہے، امام مسلم کی روایت میں بھی امامت کی تصریح ہے، امام نووی فرماتے ہیں کہ بعض مالکیہ نے حدیث کو منسوخ اور بعض نے اسے آپؐ کے خصائص میں بتایا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسا آپؐ نے ضرورتاً کیا تھا کیوں کہ اس وقت کوئی ایسا شخص آپ کو نہیں ملا جس کے حوالہ آپ امامہ کو کر دیتے۔

یہ سب دعوے مردود و باطل اور بلا دلیل ہیں، حدیث میں کوئی بات شریعت کے اصول وقواعد کے منافی نہیں، اس لیے کہ آدمی پاک ہوتا ہے اور بچوں کے کپڑوں اور بدن کو بھی طہارت ہی پر محمول کرنا چاہیے تا آنکہ نجاست ظاہراً معلوم ہو۔

اعمال سے نماز فاسد نہیں ہوتی جب کہ وہ قلیل ہوں یا متفرق طور پر کیے جائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا صرف بیان وجواز کے لیے کیا تھا۔

(جلد اول، ص ۴۴۷ و ۴۴۸)

شیخ الاسلام کی شرح بخاری کی نوعیت وخصوصیت جاننے کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں۔

☆☆☆

مولانا سلام اللہ محدث رامپوری

(المتوفی ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء)

مولانا سلام اللہ محدث کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کا آخری نامور عالم بتایا جاتا ہے، یہ شیخ الاسلام محمد کے فرزند تھے مگر صاحب نزہۃ الخواطر (۱) کے تتبع میں بعض حضرات نے انہیں حافظ فخرالدین کا بیٹا لکھا ہے (۲) جو صحیح نہیں ہے، شیخ الاسلام کے زمانہ ہی میں دہلی کے حالات نہایت ابتر ہو گئے تھے، غالباً ان حالات سے بددل ہو کر مولانا سلام اللہ نے دہلی کی سکونت ترک کر کے رامپور میں بود و باش اختیار کر لی تھی، اس وقت نواب فیض اللہ خاں کا زمانہ تھا، انہوں نے ان کی اچھی پذیرائی کی اور صلہ و اکرام سے نوازنے کے علاوہ صدارت کے منصب پر فائز کیا۔ (۳)

مولانا شیخ سلام اللہ نے حدیث اور دوسرے مروجہ علوم کی تعلیم اپنے والد شیخ الاسلام اور دوسرے علمائے عصر سے حاصل کی تھی، مولوی رحمان علی کا بیان ہے کہ "علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد سے کی تھی، انہی سے حدیث کی اجازت وسند پائی تھی۔ (۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ونشو ونما اور تعلیم دہلی ہی میں ہو چکی تھی لیکن سن ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔

---

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۱۔ (۲) تعارف مخطوطات دارالعلوم دیو بند از مفتی ظفیر الدین، ص ۱۱۶۔

(۳) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۱ و تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، باب ششم، ص ۳۷۰۔

(۴) تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔

فضل وکمال: علم وفن سے شغف ان کو اپنے آباؤ اجداد سے وراثتاً ملا تھا، شرح مؤطا میں خود لکھا ہے کہ ''مجھے اپنے دادا شیخ عبدالحق کی مصنفات سے بڑا گہرا شغف تھا، میں نے یہیں سے فن حدیث میں استفادہ کیا'' وہ عقلی ونقلی دونوں طرح کے علوم میں فائق تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے، حدیث میں زیادہ ممتاز اور صاحب کمال ہونے کی بنا پر محدث اور محدث رامپور کہے جاتے تھے، مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

> ''فن حدیث میں خاص امتیاز رکھتے تھے اور محدث کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔''(۱)

تذکرہ نگاروں نے ان کی علمی جامعیت اور فضل وکمال کا مکمل اعتراف کیا ہے، مولوی محمد فقیر جہلمی لکھتے ہیں:

> ''فقیہ فاضل، محدث کامل، مفسر تبحر، علامہ عصر، محقق ومدقق تھے۔''(۲)

نواب صدیق حسن خان مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

كان جامعا للمعقول والمعقول عارفا بالحديث مشهورا به (۳)	عقلی ونقلی علوم کے جامع اور حدیث کی معرفت میں مشہور تھے۔

حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری کا بیان ہے:

> ''جملہ علوم سے مناسبت تام تھی اور تمام کتب غیر درسیہ پر مثل کتب درسیہ کے قادر تھے، علوم منقول حدیث، رجال، تاریخ لغت، ادب سب میں کامل تھے اور عربی زبان میں مطالب علمیہ کو لکھنے میں ید طولیٰ تھا۔''(۴)

مولوی رحمان علی نے بھی ان کو فقیہ، محدث اور مفسر لکھا ہے۔(۵)

درس وافادہ: علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد اپنے نامور اسلاف کی طرح

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۷۔ (۲) حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸۔ (۳) ابجد العلوم، ج ۳، ص ۹۲۷۔ (۴) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۱۵۸و۱۵۹۔ (۵) تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۷۔

مسند درس کو رونق بخشی اور علوم کی نشر و اشاعت فرمانے لگے (۱) رامپور میں مدۃ العمران کے درس و تدریس کا کام اعلیٰ پیمانے پر جاری رہا۔ (۲)

وفات: سنہ وفات میں اختلاف ہے، ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء (۳) صحیح معلوم ہوتی ہے، "شیخ شہید" (۴) سے یہی تاریخ نکلتی ہے مگر بعض اہل علم نے ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء بھی لکھا ہے۔ (۵)

ان کا مدفن رامپور میں بغدادی صاحب کے مزار کے احاطہ میں مسجد کے قریب جانبِ جنوب واقع ہے۔ (۶)

اولاد: شیخ سلام اللہ کی جسمانی یادگار دو فرزند تھے، ان کا مختصر حال ہم آگے بیان کریں گے۔

تصنیفات: ان کی معنوی یادگار حسب ذیل کتابیں ہیں:

۱۔ ترجمہ شمائل ترمذی:

۲۔ ترجمہ صحیح بخاری (۷): بعض مصنفین نے اول الذکر کا نام ترجمہ فارسی شمائل ترمذی (۸) لکھا ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں مولانا نے فارسی میں جامع ترمذی کا ترجمہ کیا تھا، اس اعتبار سے اس کا نام ترجمہ ترمذی ہوگا (۹) گویا انہوں نے صحیح بخاری کی طرح سنن ترمذی کا بھی ترجمہ کیا تھا مگر پہلا نام صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ خلاصۃ المناقب: یہ مناقب اہل بیت پر ایک رسالہ تھا۔ (۱۰)

۴۔ رسالہ اصول حدیث (۱۱):

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔ (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۶۳۔ (۳) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۵۔ (۴) حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸ و تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔ (۵) ایضاً۔ (۶) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۱۵۹۔ (۷) مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲۵۔ (۸) حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸ و تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۶۔ (۹) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، ص ۳۷۱۔ (۱۰) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۱۔ (۱۱) مقالات سلیمانی، ج ۲، ص ۲۵۔

۵۔رسالة فی الاشارة بالسبابة عند التشهد فی الصلوٰة : نزہۃ الخواطر میں اس کا ذکر ہے(۱) اور غالباً اسی کی بنیاد پر مولوی محمد ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمہ میں اس کا ذکر کیا ہے(۲) شیخ نورالحق دہلوی کی تصنیفات کے ضمن میں اسی طرح کے ایک رسالہ اثبات رفع المسبحة فی التشهد کا ذکر کیا جا چکا ہے۔(۳)

۶۔ کشف القناع عن اباحة السماع: اس کا ذکر صرف ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے اپنے مقالہ سلطنت مغلیہ کے زوال میں کیا ہے۔(۴)

۷۔کمالین: یہ عربی کی مشہور و متداول تفسیر جلالین کا عربی میں حاشیہ ہے، کتب تفسیر میں جلالین اپنے اختصار و جامعیت کی بنا پر بڑی اہم خیال کی جاتی ہے اور وہ اکثر عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، مولانا سلام اللہ نے اپنا حاشیہ جلالین ہی کے طرز و اسلوب میں مختصر اور جامع لکھا ہے، اس بنا پر اصل تفسیر کی طرح اس کا یہ حاشیہ بھی بہت مقبول ہوا جو مولانا سلام اللہ کی اہم تصانیف میں خیال کیا جاتا ہے، کمالین کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، ۱۲۸۷ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے تفسیر جلالین کے حاشیہ پر جو نسخہ چھپا تھا وہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے(۵) ۱۳۱۰ھ میں بھی یہ جلالین کے ساتھ طبع ہوا ہے، یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے۔(۶)

۸۔ المحلی بحل اسرار المؤطا : یہ شیخ سلام اللہ محدث رامپوری کی سب سے اہم کتاب ہے جو مؤطا امام مالکؒ کی دو جلدوں پر مشتمل ایک مبسوط شرح ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں حدیث کی اصطلاحات کا بیان اور امام مالک کا تذکرہ اور مؤطا کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے(۷) جس سے اس کی اہمیت و خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، ان کے

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۰۲۔ (۲) ترجمہ اردو تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۹۔ (۳) تذکرۃ المحدثین، جلد سوم، ص ۳۲۹۔ (۴) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، ص ۳۷۰۔ (۵) بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۳۳۔ (۶) فہرست کتب خانہ آصفیہ، ج ۳، ص ۲۲۴ و ۲۲۵۔ (۷) معارف دسمبر ۴۲، ص ۴۲۴۔

بیان کے بموجب انہیں یہ شرح لکھنے کا خیال اس بنا پر ہوا کہ:

''موطا امام مالک حدیث کی اہم اور سب سے قدیم کتاب ہے اور وہی ساری کتب حدیث کی اصل و بنیاد ہے گو اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں علامہ زرقانی کی شرح عمدہ ہے مگر وہ ہمارے دیار میں رائج نہیں، علامہ سیوطی کی شرح لوگوں میں متداول ضرور ہے مگر وہ زیادہ قیمتی نہیں، اس لیے میں نے یہ شرح لکھنے کا تہیہ کیا اور اس میں ائمہ فقہ کے مذاہب کے دلائل تحریر کیے اور جن کو میں نے راجح سمجھا مرجح کر کے بتایا، اس سلسلہ میں چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں مطالعہ کیں اور ان سے کام کی باتیں منتخب کر کے اس میں سمو دینے کی کوشش کی، اپنی فہم نے جو کام کیا اسے بھی شامل کر دیا مگر کہیں تعصب کو دخل نہیں دیا۔''(۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے یہ شرح کس قدر محنت اور کدوکاوش سے لکھی ہے، نیز اس شرح کی نوعیت اور غرض و غایت کیا تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پیشتر لکھی جانے والی شرحوں کا انہیں علم نہیں تھا حالانکہ ان سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مسوی و مصفی کے ناموں سے عربی و فارسی میں موطا کی بلند پایہ شرحیں لکھی تھیں مگر ان کا اور یعقوب لاہوری (متوفی ۱۰۹۸ھ) کی شرح کا بھی انہیں علم نہ تھا۔

سب سے پہلے فہرست مضامین دی ہے اس کے بعد اصل شرح شروع ہوتی ہے جو دو جلدوں میں تمام ہوئی ہے، پہلی جلد میں ابتدا سے کتاب الزکوۃ تک کی حدیثوں کی شرح کی گئی ہے اور دوسری میں کتاب الحج سے آخر تک کی شرح ہے۔

محلی موطا امام مالک کی ایک محققانہ شرح ہے (۲) جو زرقانی کی شرح کی طرح ضخیم ہے، اس میں مشکل الفاظ کی لغوی تشریح اور مطالب کو حل کر کے فقہی مسائل سے بھی

(۱) بحوالہ تعارف مخطوطات دار العلوم دیوبند، حصہ اول، ص ۱۱۶۔ (۲) حیات امام مالک، ص ۱۰۲۔

تعرض کیا گیا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ مشہور فاضل ڈاکٹر زبید احمد کے اس بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے:

> ''مُحلّی مسوی سے زیادہ جامع ہے مگر مسوی کی ترتیب محلی کی ترتیب سے بہتر ہے۔''(۱)

ممکن ہے اس بیان میں کسی قدر مبالغہ ہو، عام اہل نظر کے نزدیک شاہ صاحب کی شرح حسن ترتیب اور عمق نظر کے اعتبار سے محلی سے بدرجہا بہتر ہے(۲) تاہم یہ مسلم ہے کہ شیخ سلام اللہ کی شرح اہمیت [illegible] دہ سے خالی نہیں، مصنف کو اس کی تالیف سے ۱۲۱۵ھ میں فراغت ملی، پہلے [illegible] پر ھو الفضل الکبیر مادۂ تاریخ درج ہے جس ۱۲۱۵ھ تاریخ تالیف برآمد ہوتی ہے۔(۳)

اس شرح کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں (۴) خدا بخش خان لائبریری کا مخطوطہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ خاص مصنف کا نسخہ ہے۔(۵)

☆☆☆

---

(۱) معارف دسمبر ۱۹۴۲ء، ص ۴۲۲۔ (۲) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، ص ۳۷۱۔ (۳) حیات امام مالک، ص ۱۰۲ و حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۸۔ (۴) مثلاً کتب خانہ دارالعلوم دیوبند۔ (۵) حیات امام مالک، ص ۱۰۲۔

مولانا نورالاسلام

یہ شیخ سلام اللہ محدث رامپوری کے صاحبزادے اور جانشین تھے، خود بھی صاحب کمالات تھے، حافظ احمد علی خاں شوق تحریر فرماتے ہیں:

''مولوی نورالاسلام ان (شیخ سلام اللہ) کے جانشین تھے، سلامتِ طبع، رسائی فکر اور اصابت رائے میں مغتنمات روزگار ہیں۔''(۱)

عقلی و نقلی دونوں علوم میں ممتاز اور اچھی دسترس کے مالک تھے، طب و ریاضی میں درجۂ کمال پر فائز تھے، نواب صدیق حسن خان صاحب فرماتے ہیں:

برع فی العلوم العقلية والنقلية لاسيما علم الرياضی (۲)	وہ علوم عقلیہ و نقلیہ خصوصاً علم ریاضی کے ماہر تھے۔

حکیم مولانا سید عبدالحی رقم طراز ہیں:

وصار بارعا فی الهيئة والهندسية والحساب وغيرها من الفنون الرياضية (۳)	ہیئت، ہندسہ اور حساب وغیرہ فنون ریاضی میں ماہر و کامل تھے۔

حافظ احمد علی خاں شوق کا بیان ہے:

''اس وقت رامپور میں ان کے مثل کوئی ریاضی دان نہ تھا، فن ریاضی

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص۱۵ و ۴۲۲۔ (۲) ابجد العلوم، ج ۳، ص ۹۲۷۔ (۳) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔

ان کی وجہ سے رامپور میں شائع ہوا۔"(۱)

صاحب نزہۃ الخواطر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ونشو ونما رامپور میں ہوئی تھی لیکن حافظ احمد علی خان شوق فرماتے ہیں کہ "نواب سید احمد علی صاحب بہادر کے عہد میں دہلی سے رامپور آئے اور سو روپے ماہانہ کے ملازم ہوئے"(۲) نیز "رامپور کے مفتی عدالت رہے۔"(۳)

تعلیم: کتب متداولہ اور طب کا درس اپنے والد اور ملا حسن بن غلام مصطفیٰ اور ملک العلما عبدالعلی بن نظام الدین فرنگی محلی سے لیا۔(۴)

ان کی عظمت اور علمی جامعیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد کامل الفن حضرات ان کے حلقۂ درس سے وابستہ تھے، چند نام یہ ہیں:

حکیم محمد اعظم خان: رامپور کے اچھے طبیب تھے، ان کے آبا و اجداد سوات سے پہلے بدایوں اور پھر رامپور میں وارد ہوئے، شعر وشاعری سے بھی شغف تھا، اکسیر اعظم اور دوسری تصانیف یادگار چھوڑیں، ۱۳۲۰ھ میں اندور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔(۵)

مولانا غیاث الدین: انہوں نے مولانا نور الاسلام سے علم طب حاصل کیا تھا، غیاث اللغات اور دوسری کئی کتابوں کے مصنف تھے، نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکاں اور نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیاں کے استاد تھے، ان کا مولد و مدفن رامپور ہے، ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۶۸ھ کو انتقال ہوا۔(۶)

مولوی حافظ حبیب النبی رقت: ۱۳۰۸ھ میں رامپور میں پیدا ہوئے، تفسیر وحدیث کی سند پہلے مولانا نور الاسلام سے لی، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ سے لی اور وہاں درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دی، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، نمونہ کلام انتخاب یادگار میں درج ہے، اردو

---

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳۶۔ (۲) ایضاً، ص ۴۳۷۔ (۳) ایضاً، ص ۴۱۵۔ (۴) ایضاً، ص ۴۳۶ و نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔ (۵) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳ و ۴۷ و ۴۴۷۔ (۶) ایضاً، ص ۳۰۶۔

میں قصیدہ طحاویہ کی مبسوط شرح لکھی، ترپن برس کی عمر میں ۴ رجب ۱۲۶۱ھ کو کلکتہ میں وفات ہوئی۔(۱)

مولوی نصیر الدین خان صابر: علوم عربیہ کی تحصیل مولانا نور الاسلام سے کی، نہایت ذہین شخص تھے، حافظ احمد علی خان شوق کا بیان ہے کہ "علم ادب میں بڑے ذی کمال، علم معقول میں بے عدیل اور نثر عربی لکھنے میں بے مثال تھے، فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے، انتخاب یادگار میں کلام کا نمونہ دیا ہے، عربی میں کئی رسالے لکھے تھے، حکمائے یونان کے عقائد کی تردید میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، چون۵۴ برس کی عمر میں ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے دادا مولوی غلام جیلانی کی قبر کے متصل ہی مدفون ہوئے۔

مولوی نصیر الدین کے تلامذہ میں رامپور کے مشہور محدث مولانا ارشاد حسین مجددی عالم متبحر حافظ غلام نبی اور نواب خلد آشیاں جیسے لوگ شامل تھے۔(۲)

مولوی عبد العلی خان: یہ ریاضی میں مولانا نور الاسلام کے شاگرد تھے (۳) انہوں نے دہلی جا کر شاہ اسحٰق صاحب سے حدیث کا درس لیا، ان کی ولادت رامپور میں ہوئی، نواب سید کلب علی خان بہادر اور نواب سید یوسف علی خان بہادر ان کے شاگرد تھے، مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس اول رہے، مدرسہ کے علاوہ مکان پر بھی ریاضیات کا درس جاری رہتا تھا، صاحب تصانیف تھے، سرکار سے وظیفہ ملتا تھا، ۱۳۰۳ھ میں انتقال ہوا۔(۴)

وفات: وفات کا سال معلوم نہیں، تاہم ۱۲۴۷ھ تک زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے، ان کی قبر رامپور میں شاہ بغدادی صاحب کے احاطہ مزار میں ہے جہاں ان کے والد ماجد بھی دفن ہیں۔

تصنیفات: شیخ نور الاسلام کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

---

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۱۰۱۔ (۲) ایضاً، ص ۴۱۵، ۴۱۶ و ۴۱۷۔ (۳) ایضاً، ص ۲۴۷۔ (۴) ایضاً، ص ۲۲۸ و ۲۲۹۔

۱۔رسالہ اسطرلاب: فارسی زبان میں ۲۸ صفحات پر مشتمل اس رسالہ کو نواب نصر اللہ خان بہادر کے نام معنون کیا تھا، ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۲۰ھ کو اس کی تالیف سے فارغ ہوئے، کتب خانہ رامپور میں قلمی نسخہ موجود ہے۔(۱)

۲۔رسالہ بحث زماں: یہ ایثار الحق کے نام سے بھی موسوم ہے۔(۲)

۳۔رسالہ بحث مکاں: یہ ۲۴ صفحے کا عربی رسالہ جس کی تالیف سے ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ کو فارغ ہوئے، کتب خانہ رامپور میں قلمی نسخہ موجود ہے۔(۳)

۴۔رسالہ اصول حدیث (۴):

۵۔حاشیہ علی میر زاهد علی الرسالة القطبية: اس کا قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے۔(۵)

۶۔حاشیہ علی شرح السلم(۶):

☆☆☆

(۱) تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳۷۔ (۲) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔ (۳) ایضاً و تذکرہ کاملان رامپور، ص ۴۳۷۔ (۴) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔ (۵) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۳۶۔ (۶) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۱۰۔

شیخ محمد سالم

ابوالخیر محمد سالم، شیخ سلام اللہ کے فرزند اور شیخ نور الاسلام کے بھائی تھے، اپنے عہد کے علما سے کسب فیض کیا، تعلیم مکمل کرنے کے بعد حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین لے گئے، پھر وطن واپس آ کر درس و تدریس میں لگ گئے، ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ اصول الایمان: یہ ایک مقدمہ اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے جو دہلی سے ان کی زندگی میں ۱۲۵۹ھ میں چھپا تھا۔

۲۔ رسالہ در بیان سماع:

۳۔ رسالہ عذب نہر: یہ حزب البحر کا فارسی ترجمہ ہے۔

۴۔ رسالہ نور الایمان:

۵۔ طریق السالم:

۶۔ لطائف الاسرار: یہ تعویذ اور عملیات پر مشتمل رسالہ ہے۔(۱)

ان دونوں بھائیوں کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کی علمی حیثیت باقی نہیں رہی، حدیث سے شغف و انہماک کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، البتہ آخری دور میں دو بزرگ مولانا انوار الحق حقی اور مولانا برکت علی حقی دہلوی ایسے پیدا ہوئے کہ جن کو اپنی خاندانی روایات نہایت عزیز تھیں اور انہوں نے شیخ محدث اور دوسرے بزرگوں کے حالات

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۴۱، بحوالہ مرآۃ الحقائق۔

کی اشاعت اور ان کی تصنیفات کی حفاظت پر بڑی توجہ مبذول کی۔

اول الذکر ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے، دہلی میں تراہہ بہرام خان میں رہتے تھے، انہوں نے مولانا صہبائی سے فارسی، مولانا مملوک علی کے تلمیذ مولوی مشتاق احمد سے حساب و ہندسہ، مفتی صدرالدین خان سے منطق، مولانا حیدر علی فیض آبادی سے علم کلام اور مولانا عبدالرزاق سے شرح وقایہ اور ہدایہ کا درس لیا، شروع میں علم سے اشتغال رہا اور شیخ محدث کی کتابوں کو جمع کیا مگر غدر کے بعد زندگی بدل گئی اور میرٹھ میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور خان بہادر کا خطاب ملا، شیخ محدث کے مکتوبات کی اشاعت کا سہرا انہی کے سر ہے، شاہ کلیم اللہ دہلوی کے حالات میں ان کا ایک مختصر رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں موجود ہے جس کے ساتھ میر حسن علا سجزی صاحب فوائد الفواد کی ایک مختصر لیکن نایاب تصنیف مخ المعنی بھی شامل ہے جو شیخ نظام الدین اولیا کو بہت پسند تھی۔

دوسرے بزرگ مولانا برکت علی حقی نے مرأۃ الحقائق لکھی جو شیخ محدث کے حالات پر مشتمل ہے۔(۱)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فیضان ان کے اولاد و احفاد کے ذریعہ کئی صدی تک جاری رہا اسی طرح ان کے اور ان کے سلسلہ کے تلامذہ کی بدولت بھی ان کے علوم و افکار کی اشاعت مدتوں ہوتی رہی، یہاں ان لوگوں کے ناموں کی ایک مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے، طوالت کے خوف سے ان کے حالات و خدمات کی تفصیل قلم انداز کر دی گئی ہیں۔

۱۔ خواجہ حیدر چلو ربن فیروز کشمیری (۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء)

۲۔ خواجہ خواند معین الدین (م ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء)

---

(۱) یہ معلومات پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تصنیف حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ماخوذ ہیں۔(دیکھیے ص ۲۶۴)

۳۔ بابا داؤد مشکاتی کشمیری (م ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۵ء)

۴۔ میر سید مبارک بلگرامی (۱۰۳۳ھ تا ۱۱۱۵ھ/ ۱۶۲۴ء تا ۱۷۰۳ء)

۵۔ میر عبدالجلیل بن احمد حسینی بلگرامی (۱۰۷۱ھ تا ۱۱۳۸ھ/ ۱۶۶۰ء تا ۱۷۲۵ء)

۶۔ شیخ عنایت اللہ شال کشمیری (م ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۱۳ء)

۷۔ غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ھ/ تا ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۰۴ء، ۱۷۸۵ء)

☆☆☆

گلستانِ حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابلِ رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی! کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار را تکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمت حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

محمد طاہر نقاش

دَارُالابلاغ

کتاب و سنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ